جولائی 2015

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

عید مبارک

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

شعاع

بانی و مدیرِ اعلیٰ — محمود ریاض

مدیرہ — رضیہ جمیل

مدیرِ منتظم — آذر ریاض

مدیرِ اعزازی — امت الصبور

فلم، ٹی وی — شاہین رشید

اشتہارات — خالدہ جیلانی

MEMBER APNS CPNE

رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی

رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

انٹرویو

ناول

مکمل ناول

ناولٹ

افسانے

نظمیں غزلیں

زرِ سالانہ بذریعہ رجسٹری

پاکستان (سالانہ)----- 700 روپے
ایشیا، افریقہ، یورپ------ 5000 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا---- 6000 روپے

مستقل سلسلے

جولائی 2015

جلد 29 شمارہ 11

قیمت 60 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا۔ مقام: ۹۱ بی، پی ای سی ایچ ایس سوسائٹی، کراچی

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رخسانہ نگار

ابتدائیہ

شعاع کا جولائی کا شمارہ آپ کے ہاتھوں میں ہے۔

رحمتوں اور برکتوں کا مہینہ رمضان المبارک سایہ فگن ہے۔ یہ صبر اور اجر کا مہینہ ہے۔ قدرت نے ہمیں نیکیاں بڑھانے اور بخشش کرانے کا نادر موقع عنایت کیا ہے۔ خصوصاً شب قدر جو ہزار مہینوں سے افضل رات ہے۔ آخری عشرہ میں اسے تلاش کریں۔ تلاوت قرآن پاک، نفل پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے بخشش اور عفوودرگزر کی دعا کریں۔ اور اپنی دعاؤں میں ہمیں بھی یاد رکھیں۔

رمضان المبارک کے اختتام پر عید کا دن۔ روزہ داروں کا انعام۔

ہماری طرف سے قارئین کو پیشگی عید مبارک۔

ہماری دعا ہے کہ عید آپ سب کے لیے ڈھیروں خوشیاں لے کر آئے۔ آمین۔

سالگرہ نمبر،

اللہ تعالیٰ کا بے حد کرم اور احسان ہے، جولائی کے شمارے کے ساتھ شعاع نے اپنی عمر عزیز کے تیس سال مکمل کرلیے ہیں (ماشاء اللہ) کامیابی کے تیس سال۔

اگست کا شمارہ سالگرہ نمبر ہوگا۔ سالگرہ نمبر میں پرانی مصنفین کے ساتھ ساتھ نئی مصنفین کی تحریریں بھی شامل ہوں گی۔

سالگرہ نمبر۔ نیا سلسلہ،

ہماری ایک قاری بہن نے لکھا ہے: آپ کے رسالے کے توسط سے تمام والدین تک یہ پیغام پہنچانا چاہتی ہوں کہ بیٹیوں کی شادی کرتے وقت گھر کا ماحول ضرور دیکھ لینا چاہیے کہ لڑکی اس ماحول میں رچ بس سکے گی یا نہیں۔ ان کے میکے میں پڑھا لکھا ماحول تھا جبکہ سسرال میں ان پڑھ، گالم گلوچ اور مذاق اڑانے والا ماحول ہے۔

یہ بات یقیناً بہت اہم اور فکر انگیز ہے ایک لڑکی کا مختلف ماحول میں جا کر گزارہ کرنا بہت مشکل ثابت ہوسکتا ہے۔ ہم چاہتے ہیں ہماری قارئین اس سلسلے میں اپنے تجربات سے ہمیں آگاہ کریں۔

شادی سے پہلے آپ کی زندگی اور گھر کا ماحول کیسا تھا۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں؟ کن مشکلات و مراحل سے گزرنا پڑا۔

اس نئے سلسلے کے لیے سوالات صفحہ 263 پر ملاحظہ فرمائیں۔

اس شمارے میں،

- ایمل رضا کا مکمل ناول۔ تعویذ حب،
- شفق افتخار کا مکمل ناول۔ کہو میرے چاند سے،
- زرین آرزو کا مکمل ناول۔ ہیرا اور پتھر،
- مصباح نوشین اور صائمہ اکرم کے ناولٹ،
- فائزہ رابعہ، نادیہ جہانگیر، میمونہ صدف، سحر ساجد اور فریدہ فرید کے افسانے،
- رخسانہ نگار عدنان اور نبیلہ عزیز کے ناول،
- نازیہ کنول نازی کا بندھن،
- معروف فنکاروں سے گفتگو کا سلسلہ۔ دستک،
- آمنہ مفتی کا سفرنامہ ہند،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

جولائی کا یہ شمارہ آپ کو کیسا لگا؟ اپنی رائے سے ضرور نوازیے گا۔

حمد باری تعالیٰ

تجھ کو خبر ہے کس پہ شمع سی جل رہی ہے
پھر کیوں ہوائے برہم اس سے اُلجھ رہی ہے

تھوڑا ہے رزق میرا مجھ کو نہیں یہ غم ہے
تیری ثنا کی دولت اس سب سے قیمتی ہے

رحمت کی اک نظر ہو ان کے بھی حال پر اب
تقدیر جن کی تُو نے دُکھ درد سے بھری ہے

تیری نوازشوں سے، تیرے کرم سے مولا
رحمت کی سبز چادر ہر ایک پر تنی ہے

کچھ اس ادا سے ہم نے اب کے تجھے پکارا
ہے پُریقین لہجہ اور آنکھ میں نمی ہے

نعمان فاروق

نعت رسول مقبولﷺ

تُو حبیبِ ربِ جلیل ہے تری عظمتوں کا جواب کیا
تُو مقامِ فخرِ خلیل ہے تری حُرمتوں کا حساب کیا

تری اک نگاہ پڑی جہاں وہاں ظلمتوں کا گزر کہاں
ترے ایک جلوہ کے سامنے مہ و مہر کی تب و تاب کیا

تری عظمتوں کے نشاں کبھی نہ مٹیں گے شورشِ کفر سے
یم بے کراں سے اُلجھ سکے گی حقیر جوئے کم آب کیا

جو ترے جمال میں کھو گیا ہوا بے نیازِ غمِ جہاں
وہ رہینِ سود و زیاں ہو کیوں کہ عذاب کیا ہے ثواب کیا

ترے میکدے سے جو پی گیا ترا کیف جس نے سمو لیا
اسے فکر عرصۂ دہر کیوں اسے خوفِ روزِ حساب کیا

کہاں تُو کہ باعثِ کُن فکاں کہاں فکرِ ثاقبِ خستہ جاں
بھلا مدحتِ شہِ انس و جاں کرے مجھ سا خانہ خراب کیا

ثاقب زیروی

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

درود شریف

حضرت اوس بن اوس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"تمہارے دنوں میں سب سے زیادہ فضیلت والا دن جمعے کا دن ہے' پس تم اس دن میں مجھ پر کثرت سے درود بھیجا کرو' اس لیے کہ تمہارا درود مجھ پر پیش کیا جاتا ہے۔"

(اسے ابو داود نے صحیح سند کے ساتھ روایت کیا ہے)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے ایک بات یہ معلوم ہوئی کہ زمان و مکان کے شرف سے عمل صالح میں بھی مزید فضیلت کا پہلو پیدا ہو جاتا ہے' جیسے اس حدیث میں جمعے کے دن زیادہ درود پڑھنے کا حکم ہے۔

2۔ اس دن درود نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا جاتا ہے جس سے یہ معلوم ہوا کہ براہ راست آپ کسی کا درود نہیں سنتے' قریب سے نہ بعید سے۔ قریب سے سننے کی ایک روایت مشہور ہے لیکن وہ صحیح نہیں۔ اس لیے صحیح بات یہی ہے کہ آپ خود کسی کا درود نہیں سنتے' فرشتے ہی آپ تک درود پہنچاتے ہیں۔

3۔ درود کے بہترین الفاظ وہی ہیں جو درود ابراہیمی میں ہیں کیونکہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابہ رضی اللہ عنہم کو بتلایا ہوا درود ہے۔

رات کے قیام کی فضیلت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔

"اور رات کے کچھ حصے میں نماز تہجد ادا کر۔ یہ تیرے لیے ایک زائد عمل ہے۔ امید ہے کہ آپ کا رب آپ کو (قیامت کے دن) مقام محمود پر کھڑا کرے گا۔" (الاسراء۔79)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ "ان (اہل ایمان) کے پہلوان کے بستروں سے دور رہتے ہیں۔" (السجدہ۔16)

اور فرمایا۔ "وہ (اہل ایمان و تقویٰ دنیا میں) رات کو کم ہی سویا کرتے تھے۔" (الذاریات۔17)

فائدہ آیات : نافلتہ لک کا ایک مفہوم یہ بیان کیا گیا ہے کہ اے پیغمبر! یہ تہجد کی نماز تجھ پر ایک زائد فرض ہے' جب کہ دیگر افراد امت پر یہ فرض نہیں۔

اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ یہ تیرے ثواب اور رفع درجات میں زیادتی کا باعث ہے۔

دوسری آیات میں شب بیداری (قیام اللیل) کو اہل ایمان و تقویٰ کی خاص صفت اور ان کا معمول بتلایا گیا ہے جس سے نماز تہجد' یعنی قیام اللیل کی اہمیت و فضیلت بھی ثابت ہوتی ہے اور اس کی ترغیب و تاکید بھی۔

رات کا قیام

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں۔

"نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کو اتنا قیام فرماتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیر مبارک پھٹ جاتے۔ میں نے (ایک دن) آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا۔

"اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم! آپ

کیوں اتنی مشقت برداشت فرماتے ہیں جب کہ آپ کے اگلے پچھلے گناہ بھی بخش دیے گئے ہیں۔"
آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "کیا میں (اللہ کا) شکر گزار بندہ نہ بنوں۔" (بخاری و مسلم)
حضرت مغیرہ بن شعبہ سے بھی بخاری و مسلم میں اسی طرح روایت ہے۔

فوائدو مسائل :

1۔ رات کی نفل نماز پورے اطمینان' سکون اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کی جائے۔
2۔ جس شخص پر اللہ کے جتنے انعامات زیادہ ہوں' اسے اسی حساب سے زیادہ اللہ کی عبادت بھی کرنی چاہیے۔
3۔ بارگاہ الٰہی میں عجز و نیاز کے اظہار کا بہترین وقت آخر شب ہے۔

تاکید

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ان کے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے پاس رات کو تشریف لائے تو فرمایا۔
"کیا تم (تہجد کی) نماز نہیں پڑھتے؟" (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس میں اس امر کی ترغیب ہے کہ دوسرے لوگوں کو بھی شب بیداری اور سحر خیزی کی تاکید کی جائے تاکہ وہ بھی مزید فضیلت حاصل کر سکیں۔

خیر

حضرت سالم بن عبداللہ بن عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ اپنے باپ (عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ) سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"عبداللہ اچھا آدمی ہے اگر یہ رات کو نماز پڑھتا۔"
حضرت سالم کہتے ہیں کہ اس کے بعد (میرے والد) عبداللہ رات کو بہت کم سوتے تھے۔ (بخاری و مسلم)

فوائدو مسائل :

1۔ اس میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کی فضیلت و منقبت کے علاوہ قیام اللیل کی بھی فضیلت کا بیان ہے۔
2۔ ایسے شخص کی مدح و تعریف اس کے روبرو کرنی جائز ہے' جس کی بابت یہ اندازہ ہو کہ وہ اس سے غرور اور اعجاب نفس میں مبتلا نہیں ہوگا۔
3۔ اپنے اور دوسرے کے لیے خیر کی تمنا اور آرزو کرنے کی ترغیب ہے۔

اعمال صالحہ

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"اے عبداللہ! تو فلاں شخص کی طرح نہ ہونا' وہ رات کو قیام کرتا تھا' پھر اس نے رات کو (عبادت کے لیے) اٹھنا چھوڑ دیا۔" (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس میں بھی قیام اللیل کی فضیلت و ترغیب ہے۔ علاوہ ازیں اعمال صالحہ پر مداومت کرنے اور نیکی کرنے والوں کی اقتدا کرنے اور اس میں کوتاہی کرنے والوں کا سا رویہ اختیار نہ کرنے کی تلقین و تاکید ہے۔

ترک

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک آدمی کا ذکر کیا گیا کہ وہ رات کو صبح ہونے تک سویا رہا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"یہ وہ آدمی ہے جس کے کانوں میں۔" یا فرمایا: "کان میں شیطان نے پیشاب کر دیا ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائدو مسائل :

1۔ پیشاب کرنا حقیقتاً" بھی ہو سکتا ہے (گو ہمیں

اس کا ادراک نہ ہو) کیونکہ عدم استعاذہ کی صورت میں شیطان انسان کے کھانے پینے اور دیگر اعمال میں شریک ہو جاتا ہے جیسا کہ احادیث میں بیان ہوا ہے' اس لیے اس کا پیشاب کرنا بھی ممکن ہے۔

1۔ بعض کے نزدیک یہ کنایہ ہے اس بات سے کہ جو شخص سویا رہتا ہے' رات کو اٹھ کر نماز نہیں پڑھتا' شیطان اس کے لیے اللہ کی یاد میں رکاوٹ بن جاتا ہے۔ یا اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اس کی تحقیر و اہانت کرتا ہے۔

3۔ بہرحال اس سے یہ معلوم ہوا کہ قیام اللیل کا ترک ناپسندیدہ ہے' اس سے شیطان کو اپنی کارستانی کا موقع ملتا ہے اور وہ انسان کو اللہ کی یاد سے اور اس کی اطاعت و عبادت سے روکنے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔

تین گرہیں

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''شیطان تم میں سے ہر ایک کی گدی پر' جب وہ سوتا ہے' تین گرہیں لگا دیتا ہے۔ ہر گرہ پر وہ منتر پڑھتا (جادو پھونکتا) ہے: تیرے لیے رات بہت لمبی ہے' پس خوب سو۔ اگر وہ بیدار ہو کر اللہ کا ذکر کرتا ہے تو ایک گرہ کھل جاتی ہے۔ پھر اگر وہ وضو بھی کر لے تو ایک گرہ اور کھل جاتی ہے۔ پھر اگر اس نے نماز بھی پڑھی تو تمام گرہیں کھل جاتی ہیں اور وہ صبح اس حال میں کرتا ہے کہ وہ ہشاش بشاش اور پاکیزہ نفس ہوتا ہے' ورنہ اس کی صبح اس حال میں ہوتی ہے کہ وہ خبیث النفس اور سست ہوتا ہے۔'' (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ یہ گرہ لگانا بھی حقیقتاً ہے اور یہ ایسے ہی ہے جیسے جادوگر اپنا عمل سحر کرتا ہے۔ شیطان اپنے اس عمل سے رات کو اللہ کی عبادت کے لیے اٹھنے سے روکنے کی کوشش کرتا ہے۔

2۔ بہرحال شیطان انسان کو اللہ کی عبادت سے روکنے کے لیے اپنا جتن کرتا ہے' جو شخص رات کو اٹھ کر اللہ کی عبادت کرتا ہے تو وہ شیطان کی چال کو ناکام بنا دیتا ہے' بصورت دیگر شیطان انسان کو اپنے دام میں پھنسا لیتا ہے۔

سلامتی

حضرت عبداللہ بن سلام رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''اے لوگو! سلام کو پھیلاؤ' کھانا کھلاؤ اور رات کو نماز پڑھو جب کہ لوگ سوئے ہوئے ہوں' (اس طرح) تم جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہو جاؤ گے۔''

(اسے ترمذی نے روایت کیا ہے اور کہا ہے: یہ حدیث حسن صحیح ہے۔)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں ان لوگوں کے لیے بشارت ہے' جو ذوق و شوق سے مذکورہ کام کرتے ہیں۔

2۔ جنت میں سلامتی کے ساتھ داخل ہونے کا مطلب ہے کہ جہنم کی سزا بھگتے بغیر ہی ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے جنت میں داخل فرما دے گا۔ واللہ اعلم۔

محرم کے روزے

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

''رمضان کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والے روزے' اللہ کے مہینے محرم کے روزے ہیں۔ اور فرض نماز کے بعد سب سے زیادہ فضیلت والی نماز' رات کی نماز ہے۔'' (مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ محرم کے مہینے کی اضافت اللہ کی طرف کی گئی ہے جس سے اس ماہ محرم کا شرف و امتیاز واضح ہے۔

2۔ اس میں نفلی روزوں میں سب سے افضل روزہ اور نفلی نمازوں میں سب سے افضل نماز کا بیان ہے۔

رات کی نماز

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"رات کی نماز دو دو رکعت ہے، چنانچہ جب تجھے صبح صادق کا اندیشہ ہو تو ایک رکعت کے ساتھ وتر (طاق) بنالے (ایک رکعت وتر پڑھ لے۔") (بخاری و مسلم)

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، نبی صلی اللہ علیہ وسلم رات کو دو دو رکعت ادا فرماتے اور ایک رکعت وتر پڑھتے۔ (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ ان دونوں روایتوں سے معلوم ہوا کہ رات کو نفلی دو دو رکعت کر کے ادا کی جائے اور آخر میں ایک رکعت وتر پڑھ لیا جائے۔

2۔ اس سے ایک رکعت وتر کا جواز ہی نہیں، اس کی افضلیت ثابت ہوتی ہے۔ تین وتر بھی اگر پڑھنے ہوں تو افضل طریقہ یہ ہے کہ دو رکعت پر سلام پھیر دیا جائے اور پھر ایک رکعت بطور وتر پڑھی جائے کیونکہ یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

روزوں کا بیان

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی مہینے میں تو اس طرح روزہ رکھنا چھوڑ دیتے کہ ہم گمان کرتے کہ اس مہینے میں آپ روزہ رکھیں گے ہی نہیں، اور کبھی ایسے روزہ رکھتے کہ ہم گمان کرتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم اس مہینے میں کوئی روزہ چھوڑیں گے ہی نہیں۔ اور (اسی طرح آپ کا حال یہ تھا کہ) اگر ہم چاہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو رات کے وقت نماز پڑھتے ہوئے دیکھیں تو ہم (پڑھتے ہوئے) دیکھ لیتے اور اگر ہم چاہتے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو سویا ہوا دیکھیں تو (سویا ہوا) دیکھ لیتے۔" (بخاری)

فائدہ : مطلب یہ کہ نفلی روزے ہوں یا رات کی نفلی نماز (قیام اللیل) ان میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ایک مستقل معمول نہیں تھا، کسی مہینے ایسا ہوتا کہ آپ روزہ نہ رکھتے حتیٰ کہ مہینہ ختم ہونے کے قریب ہو جاتا تو آخر میں آپ روزے رکھنا شروع کر دیتے اور کبھی مسلسل روزہ رکھتے، حتیٰ کہ گمان ہوتا کہ پورا مہینہ ہی آپ روزے رکھیں گے، مگر آپ روزہ ترک فرما دیتے۔ اسی طرح تہجد کی نماز میں آپ کا معمول تھا، کبھی آپ اسے رات کے پہلے حصے میں، کبھی دوسرے حصے میں اور کبھی آخری، تیسرے حصے میں پڑھتے۔ اس طرح آپ کو رات کے ہر حصے میں نماز پڑھتے ہوئے بھی اور سوئے ہوئے بھی پایا گیا۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

تہجد

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گیارہ رکعت پڑھا کرتے تھے۔ اس سے حضرت عائشہ کی مراد رات کی نماز ہے۔
اپنا سر اٹھانے سے پہلے اتنا (لمبا) سجدہ کرتے کہ جتنی دیر میں تم میں سے ایک آدمی پچاس آیتیں پڑھ لے۔ اور فجر کی نماز سے پہلے دو رکعت پڑھتے، پھر اپنی دائیں کروٹ لیٹ جاتے، یہاں تک کہ آپ کے پاس نماز کی منادی کرنے والا آتا۔ (بخاری)

فائدہ : اس میں فجر کی دو سنتیں پڑھنے کے بعد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دائیں کروٹ پر لیٹنے کے علاوہ نماز تہجد میں لمبے سجدے کرنے کا بیان ہے کیونکہ اس حالت میں انسان اللہ کے بہت قریب ہوتا ہے۔ نیز اس حالت میں غایت خشوع کا بھی اظہار ہے جو اللہ کو بہت پسند ہے۔ علاوہ ازیں سجدے میں دعا کی قبولیت کا امکان بھی زیادہ ہے۔

تہجد کی رکعت

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہی سے روایت ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم رمضان اور غیر رمضان میں (تہجد) گیارہ رکعت سے زیادہ نہیں پڑھا کرتے تھے۔

(پہلے) چار رکعت پڑھتے' پس نہ پوچھو کہ وہ کتنی حسین اور کتنی لمبی ہوتی تھیں۔ پھر چار رکعت پڑھتے' پس ان کے حسن اور لمبائی کے بارے میں مت پوچھو۔ پھر تین رکعت (وتر) پڑھتے۔"

میں نے کہا۔ "اے اللہ کے رسول! کیا وتر پڑھنے سے پہلے آپ سوتے ہیں؟"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اے عائشہ! تحقیق میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن میرا دل نہیں سوتا۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ دل نہیں سوتا' کا مطلب ہے کہ دل بیدار رہتا تھا' اس لیے آپ کا وضو بھی نہیں ٹوٹتا تھا اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے خصائص میں سے ہے۔

2۔ اس حدیث میں نماز کو اس کے آداب و شرائط کے مطابق خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرنے کی تاکید ہے کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ حسنہ یہی ہے۔ سنت کے مطابق اطمینان و سکون کے ساتھ نماز پڑھنا ہی نماز کا حسن ہے۔

3۔ جس شخص کو اپنی بابت آخر شب میں اٹھنے کا یقین ہو تو اسے چاہیے کہ نماز وتر عشاء کے ساتھ نہ پڑھے بلکہ تہجد کے آخر میں پڑھے' بصورت دیگر عشاء کی نماز کے ساتھ ہی پڑھ لے۔

رات کا آخری حصہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات کے پہلے حصے میں سو جاتے تھے اور رات کے آخری حصے میں اٹھتے اور نماز پڑھتے۔ (بخاری و مسلم)

فائدہ :

اس میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اکثریتی معمول کا بیان ہے اور یہی آخر شب تہجد کا سب سے بہتر وقت ہے۔ تاہم آپ نے رات کے ابتدائی اور درمیانی حصے میں بھی قیام کیا ہے جیسا کہ پہلے روایات گزر چکی ہیں۔

طویل قیام

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ بیان فرماتے ہیں کہ میں نے ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نماز پڑھی' آپ صلی اللہ علیہ وسلم برابر کھڑے رہے یہاں تک کہ میں نے ایک برے کام کا ارادہ کیا۔ ان سے پوچھا گیا۔

"آپ نے کس چیز کا ارادہ کیا تھا؟"

انہوں نے جواب دیا: "میں نے یہ ارادہ کیا تھا کہ میں بیٹھ جاؤں اور آپ کو چھوڑ دوں۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل :

1۔ اس سے معلوم ہوا کہ رات کا قیام خوب لمبا ہو' یعنی قرات' رکوع' قومہ' سجدہ ہر رکن طویل اور نہایت اطمینان و سکون کے ساتھ ہو۔

2۔ نفلی نماز باجماعت جائز ہے۔

3۔ زیادہ طوالت کی صورت میں بعض علما کے نزدیک مقتدی کا امام کی اقتدا سے الگ ہونا جائز ہے۔

لیکن حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ نے اسے برے کام سے تعبیر کیا ہے' اس لیے اس کا جواز محل نظر ہے' تاہم احادیث میں ائمہ حضرات کو مقتدیوں کا خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے جن سے اس کا جوز نکل سکتا ہے۔ واللہ اعلم۔

دو رکعت

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جب تم میں سے کوئی شخص رات کو (عبادت کے لیے) کھڑا ہو تو وہ نماز کا آغاز دو مختصر رکعتوں سے کرے۔" (مسلم)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب رات کو قیام فرماتے تو اپنی نماز (تہجد) کا آغاز دو مختصر رکعتوں سے فرماتے تھے۔ (مسلم)

تو نبہ وگجلاوی نا

آمنہ مفتی

"ڈن پروگرام۔"

کچھ صبحیں ایسی ہوتی ہیں کہ لگتا ہے سورج سب حجاب، سارے پردے پار کر کے بالکل کھڑکی میں آ کھڑا ہوا ہے اور اس کے سر پر ٹوکرا بھر کرنوں کے بال ابھی الجھے ہوئے ہیں۔

اگر آپ کا سامنا کسی ایسی صبح سے ہو جائے تو کرنوں کے اس الجھاوے کو سلجھانے کی بالکل کوشش نہ کیجیے گا، یہ کائناتی مسائل، ہم جیسے فانی انسانوں کے بس کا روگ نہیں۔

ایک ایسی ہی صبح جب سورج بے حجابانہ کھڑکی کے سامنے آ کھڑا ہوا، اور چڑیاں گھبرا گھبرا کر اپنے گھونسلے چھوڑنے لگیں تو سرہانے رکھے فون پہ برقی پیغام کی گھنٹی بجی، یہ محب عزیز ڈاکٹر کیول دھیر صاحب تھے۔

"گڈ مارننگ' ذرا اپنا پاسپورٹ تو بھیج دو' ای میل کر دو، اسکین کرا کے۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ اگر ڈاکٹر صاحب کا ارادہ سفر کا بن ہی رہا ہے تو میرے پاسپورٹ کا کیا کریں گے' چند ایک معصومانہ سوالات کیے' جنہیں ہو سکتا ہے کوئی بدخواہ احمقانہ بھی کہہ دے' لیکن لوگوں کا کیا ہے؟

خیر معلوم یہ ہوا کہ ڈاکٹر کیول دھیر جو اردو کے عاشق زار اور پیشے کے حساب سے سچ مچ ڈاکٹر ہیں۔ اس سال لدھیانہ میں ہونے والے 43ویں "جشن ساحر" میں ناچیز کو بلانا چاہ رہے ہیں۔ پہلے تو حیرت ہوئی' کیونکہ دنیائے اردو میں نثر نگاروں' خاص طور پہ ناول نگاروں کو اس قسم کی تقریبات میں کم ہی بلایا جاتا ہے۔ ان تقریبات کی جان شاعر حضرات ہیں اور ساحر کی رعایت سے اس جشن پہ تو خاص ان کا حق بنتا تھا۔

لیکن بہرحال ڈاکٹر صاحب کی محبت اور اپنے جذبہ تجسس کہ دیکھیں تو سہی ہوتا کیا ہے؟ سے مغلوب ہو کے پاسپورٹ اسکین کرایا اور ای میل کر دیا۔

چند روز بعد ڈاکٹر صاحب کا پیغام آیا کہ دیوالی اور "جشن ساحر" کی تاریخیں آپس میں بھڑ گئی ہیں' چنانچہ جشن موخر ہو گیا ہے۔"

جی ہی جی میں خوب ہنسی' وجہ یہ تھی کہ اکثر و بیشتر میرے بنائے ہوئے پروگرام کھنڈت میں پڑ جاتے تھے اور کچھ دوست تو میرے "ڈن" کہتے ہی سمجھ جاتے تھے کہ یہ "ڈن پروگرام" ہے' یعنی ہوگا نہیں۔

حد یہ کہ جس سال مجھے لکس ایوارڈ برائے بہترین ڈرامہ نگار ملنا تھا۔ اس سال یہ فنکشن ہی ملتوی ہو گیا اور ایک نہایت سادہ تقریب میں سب بس اپنے اپنے ایوارڈ خود ہی اٹھا لائے' جن خواتین و حضرات نے اس موقعے پر میری تصاویر دیکھی ہیں' انہیں بخوبی اندازہ ہو جائے گا کہ وہ ہنسی ایوارڈ سے زیادہ پوری ڈرامہ اور فلم انڈسٹری کو اپنے "ڈن پروگرام" کی نذر کرنے کی تھی۔

خیر 43 سال سے بغیر ناغے کے ہونے والے اس جشن کو اپنے "ڈن پروگرام" کے کالے دیو کے سپرد کرنے کے بعد جو پاؤں پسار کے سوئی تو ڈاکٹر صاحب کی پے در پے میلز بھی نہ دیکھیں۔

آخر دسمبر کے دوسرے عشرے میں ڈاکٹر صاحب نے جھنجوڑا کہ "بی بی کس خیال میں ہیں؟ جشن تو ہونا ہے اور بہرصورت ہونا ہے' آپ نیا پاسپورٹ بنوائیں کیونکہ پرانا پاسپورٹ جو ہمارے پاس ہے میعاد پوری کر چکا ہے۔"

پہلے تو ہنسی آئی اور پھر رونا' ہنسی اس بات پہ کہ یہ جو دیوالی پہ جشن کرا رہے تھے ہولی تک پہنچ گئے ہیں' اور روئی اس بات پہ کہ ان بے چاروں کے جشن کا کیا بنے گا؟ خیر خود کردہ را علاج نیست.... اتنے سیانے۔ گنی ہو کر خود اپنا نا سا پیٹنے کو بلائے جا رہے ہیں تو نہا۔

پاسپورٹ کا اجرا کچھ ایسا لمبا کام ثابت نہ ہوا' خدا بھلا کرے ان سب کا جنہوں نے اس گورکھ دھندے کو آسان

اور سیل بنایا ہے۔ پچھلے روز پاسپورٹ ڈاکٹر صاحب کے پاس تھا۔

اس سال سردی نے دسمبر میں بالکل رنگ نہ دکھایا' بلکہ جنوری میں بھی کچھ خاص ٹھنڈ نہ تھی۔ اب ڈاکٹر صاحب نے ایک اور حکم دیا' وہ یہ کہ "خواجہ احمد عباس" پہ ایک مقالہ لکھیں اور دوسرا یہ کہ انڈین ویزا کے لیے درخواست دیں۔

پہلا کام تو آسان تھا۔ ترنت ڈاکٹر حمیدہ شاہین اور ڈاکٹر ضیاء الحسن ضیاء کو فون کیا۔ یہ دونوں اساتذہ میاں بیوی نہ صرف بہت اچھے دوست ہیں۔ بلکہ نہایت قابل انسان بھی ہیں۔ خواجہ احمد عباس پہ کئی کتابیں اور خاص نمبر فوراً بھیج دیے۔

مقالہ تو لکھ لیا' لیکن ویزا کے لیے درخواست دینا ٹیڑھی لکیر تھا۔ بات یوں ہے کہ... چلیے چھوڑیے بات بہت طویل ہے اور اس میں بہت سے پردہ نشینوں کے بھی نام آتے ہیں۔ تو ہم آگے چلتے ہیں۔

ویزے کی درخواست دینے کے لیے اپنے ٹریول ایجنٹ کو کہا۔ دانیال نے بڑی محنت سے فارم بھروایا۔ بلاوجہ کے فالتو کاغذات جو صرف فائلوں کا پیٹ بھرنے کے لیے استعمال ہوتے ہیں ساتھ نتھی کرائے۔ دس ہزار کا بل بنا کے ہاتھ میں پکڑایا اور کہا کہ جائیں اور "ویزا ٹرانکس" سے یہ کاغذات مع اپنے پاسپورٹ کے بھارتی سفارت خانے روانہ کردیں۔

"ویزا ٹرانکس" پہنچی چار پانچ لوگ پہلے سے موجود تھے اپنی باری کا انتظار کرنے بیٹھ گئی۔ میرے ساتھ دو بوڑھے میاں بیوی بیٹھے تھے۔ چوخانہ تہہ بند ملگجا کرتا اور ڈبیوں والا ملگجا کھیس' پاؤں میں اسفنج کے چپل' لیکن ایڑھیاں ایک ایک انگلی پھٹی ہوئی' یہ دونوں ستر پچھتر کے پیٹے میں لگ رہے تھے' خاموش' جھریوں زدہ چہرے۔ جن پہ ایک ابدی بے زمینی اور ازلی لامکانی تحریر تھی۔ اپنی باری آنے پہ جب بزرگوار کاؤنٹر پہ گئے تو وہاں کسی کو ان کی زبان سمجھ نہ آئی' لیکن میرے کان کھڑے ہوئے رہتک کی زبان سننے والوں کو شدید نامانوس لگ رہی تھی۔

بوڑھے نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔ ایک صاحب جلدی سے اٹھ کر گئے اور انہیں بتانے لگے کہ "آپ کے [illegible] آیا خط ہے۔ ایک فارم بھی پر

کرنا ہوگا' آپ سیدھے گنگا رام چلے جائیں وہاں ایجنٹ بیٹھے ہوں گے۔ سات سو لیں گے اور فارم بھر دیں گے۔"

میں چونکی' لیکن ابھی مزید چونکنا باقی تھا' کیونکہ دوسرے صاحب بولے "بابا جی۔ آپ گڑھی شاہو جاؤ' گنگا رام والے تو چھری پھیرتے ہیں۔ گڑھی شاہو میں صرف ڈیڑھ سو لگیں گے۔"

چھری پھر چکی تھی' دس ہزار بڑی محنت سے کمائے جاتے ہیں' خیر صبر کیا سوچا' شاید یہ "ڈن پروگرام" کا صدقہ ہے۔

اب جو کاغذات جمع کرانے لگے تو وہاں موجود صاحب نے پوچھا۔ "اچھا آپ ادیب ہیں؟ کانفرنس پہ جا رہی ہیں۔ کیا لکھتی ہیں؟"

میں نے کہا۔ "ڈرامہ لکھتی ہوں۔" "خوب ہنسے' ادھر ادھر دیکھا اور رازداری سے بولے یہ ڈرامہ "ڈائجسٹ رائٹرز" کیا کہانی ہے سچ ہے کیا؟"

میں خواہ مخواہ مجرم سی بن گئی اور صفائی دینے لگی کہ نہ بھائی! ہمیں تو معلوم ہی نہیں' ڈائجسٹ ہوتا کیا ہے؟ ہاں ایک امتل صاحبہ ہیں اور دوسری کوئی ثمینہ عظمت ان کی محبت کہ زبردستی کچھ لکھوا اور چھپوا دیں۔"

پتا نہیں' ہم لوگوں کی رائے سے اتنے خائف کیوں رہتے ہیں؟

اب سارے مرحلے طے کر کے دھیان آیا کہ یہ تو پوچھ لیں کہ ہم سفر کون کون ہے؟ معلوم ہوا' کشور ناہید' عطاء الحق قاسمی' ڈاکٹر صغریٰ صدف ہدایت کار سید نور کی بیگم رخسانہ نور اور فرحت پروین وغیرہ کو پاکستان سے بلایا گیا ہے' ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا نام بھی شامل تھا' لیکن ان کا ارادہ نہ بنا۔

بہرطور فروری کے آخری ہفتے میں ایک فون آیا کہ اپنا پاسپورٹ اور ویزا لے جائیں۔

ویزہ ملنے کے بعد اچانک دھیان آیا کہ مقالہ تو لکھ ڈالا ہے ذرا پروگرام بھی کنفرم کرلیں' کہیں "ڈن پروگرام" تو نہیں؟

ڈاکٹر کیول دھیر کو پیغام بھیجا کہ ہمارا ویزہ آگیا ہے اب بتایئے' مقالہ لاؤں یا نہ لاؤں؟ اپنی اس اعلیٰ درجے کی ظرافت پر ابھی محظوظ بھی نہ ہونے پائی تھی کہ جواب آیا۔

"سیمینار منسوخ ہوگیا ہے۔"

"لیجیے۔ "ون پروگرام!"

٭ ٭ ٭

"واہگہ کا پیپل۔"

اب جو جی بھر کے قہقہے لگائے تو اگلا پیغام اور اس سے اگلا پیغام بھی نہ پڑھ سکی "سیمینار منسوخ ہوا ہے۔ آپ کا آنا نہیں۔ آپ کو سفر کی تفصیل بذریعہ ای میل بھیج دی ہے۔"

یہ پیغام کہیں اگلے دن شام کو پڑھا تو ساتھ ہی ای میلز دیکھیں۔ اٹاری سے لدھیانہ تک سفر کا ایک تفصیلی چار روزہ منصوبہ اور جشن ساحر کے دعوت نامے' دعوت نامے پہ نہ صرف میرا نام ڈاکٹر آمنہ مفتی چھاپا گیا' بلکہ ایوارڈ کے لیے نامزد بھی ظاہر کیا گیا۔ ظاہر ہے پہلی غلطی کی طرح دوسری بھی فاش اور بقول شخصے "فحش" غلطی تھی۔

لیکن جناب ہم کون ہوتے ہیں اللہ کے کاموں میں ٹانگ اڑانے والے؟ جب اللہ خود ہی لوگوں کو غلط فہمی میں مبتلا کر رہا ہے تو کیا ضرورت ہے اسے درست کرنے کی؟

اسی درویشانہ استغناء سے کپڑے' جوتے اور دیگر سامان سفر سوٹ کیس میں بھرا کتابوں کا تھیلا تیار کیا اور آسمان پہ گھرے بادلوں کو دیکھ کے سوچا کہ ان کا کیا ہے؟ پھاگن کے بادل رات بھر برسیں گے' صبح کہاں ہوں گے؟

ڈاکٹر صاحب اور رخسانہ آپا کا اصرار کہ ساڑھے نو بجے واہگہ پہنچ جایے گا۔

دیگر عادات قبیحہ وغیر قبیحہ کے ساتھ میں نے وقت کی پابندی کی علت بھی پال رکھی ہے۔ چنانچہ پونے نو بجے گھر سے نکل کھڑی ہوئی۔ آسمان پہ بادل پرے جمائے کھڑے تھے اور نہر کنارے ابھی چیل گوشت بیچنے والے نہیں پہنچے تھے۔ بی آر بی کے سرخی مائل مٹیالے پانی میں بادلوں بھرے آسمان کا عکس قید تھا اور بے برگ و بار درخت اس زنگار اکھڑے آئینے میں اپنا عکس دیکھ کے ایک ازلی دہشت کے تحت لب بستہ تھے۔

نہر ختم ہوئی اور بائیں جانب مڑے۔ سڑک کے ساتھ ساتھ مورچے' قدم قدم پہ 65ء کی جنگ کی یادگاریں' باٹا پور پہ 39 شہدا کی یادگار اور بچپن سے آج تک بارہا سنے ہوئے جملوں کی بازگشت "جنٹل مین! بڑا کھانا۔ شالیمار باغ میں اور سیون کورس ڈنر آج رات جم خانہ میں اور پھر کشت وخون' آگ' گولیوں کا دھواں' موت کی خاموشی۔

دل بھاری ہوگیا اور کندھے پہ لٹکے کتابوں کے بستے میں جنگ اور دشمنی کا بھوت یکایک کہیں سے گھس آیا۔ سامنے چیک پوسٹ پہ دمکتے ہوئے چہروں والے جوان' قدم من من بھر کے ہوگئے اور کسی ان دیکھی طاقت نے جیسے گاڑی میں کیل دیا۔

بہت ہی بھاری دل کے ساتھ اتری' پاسپورٹ دکھایا۔ سامان کا بستہ کھولنا چاہا' لیکن میری کولہاپوری چپل اور غریبانہ حلیے کو دیکھ کے مجھے سڑک کنارے لگی قنات کے پیچھے جامہ تلاشی کے لیے بھیج دیا گیا۔ گھاس میں زرد اور کاسنی پھول کھلے ہوئے تھے اور سرد ہوائیں بھر بھر قنات کے تھبے سے گلیارے میں گھسی چلی آرہی تھیں' بارے آگے کھسکنے کا اذن ملا اور پارکنگ میں گاڑی لگائی۔ واہگہ بارڈر پر 20ء میں ہونے والے خودکش دھماکے کے بعد سے سرحد تک گاڑی لے جانے کی ممانعت ہوچکی تھی اب یہیں سے ٹرالیوں میں سامان رکھ کے ایک کلومیٹر سے کم کا فاصلہ پیدل طے کرنا پڑتا ہے۔

یہ پارکنگ ناہموار قطعہ زمین ہے' جہاں ہم نے اپنی قومی عادت کے تحت جوس کے خالی ڈبے' چپس اور منرل واٹر کی بوتلیں جی بھر کے اچھالی ہوئی تھیں۔ دو تین اداس صورت قلی۔ رنگ اکھڑی۔ چرخ چوں بولتی ٹرالیاں لیے کھڑے تھے۔ دور دور تک کوئی درخت نہ تھا۔ ماسوائے ایک چھتنار پیپل کے۔

ساڑھے نو بج گئے' ہم سفروں کا نام نہیں' پونے دس' دس' سوا دس' ساڑھے دس' فون کالز "ہم یہ رہے' ہم وہ رہے' ہم آگئے' ہم پہنچے کہ پہنچے کرتے کراتے پونے گیارہ' رخسانہ آپا' فرحت آپا' ناز اور نبیل نجم پہنچے۔ بارش بار بار ہو رہی تھی مگر ہلکی ہلکی۔ قلی نے میرا سامان معہ رنگین چھتری کے ٹرالی پہ رکھ لیا اور پیپل کے نیچے جا کھڑا ہوا۔

کچھ میرے حلیے اور کچھ میری گفتگو سے وہ پاگیا کہ یہ کس قسم کا ہے۔ پیپل کے درخت کی طرف اشارہ کرکے بولا "معلوم ہے باجی! یہ درخت کتنا پرانا ہے؟"

میں نے کہا "معلوم نہیں۔" بڑی پراسراریت سے آنکھیں چندھی کرکے اور آواز بھینچ کے بولا "پاکستان بننے سے پہلے کا اور 65ء کی جنگ میں انڈین فوج نے سارے درخت کاٹ دیے سوائے اس ایک درخت کے' کیونکہ یہ

ہند ہوتا ہے۔"

میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے اس اونچے پیپل کو دیکھا' کبھی تو مجھے اس پہ 47ء کے فسادات میں مارے جانے والوں کی لاشوں پہ منڈلاتے گدھ دکھائی دیے اور کبھی بیلمنوں میں گھاس اٹھائے فوجی' کوئی تلک کوئی قشقہ کچھ نظر نہ آیا۔

جس وقت میں واہگہ کے بارڈر پہ کھڑے اس سخت کافر قسم کے پیپل پہ ان دیکھی شبیہوں کے سائے ڈھونڈ رہی تھی' ہمارے گروپ میں ایک انکشاف ہوا' اور وہ یہ کہ رخسانہ آپا کا ویزا لیٹر' ڈاکٹر صغری کے پاس رہ گیا ہے فرحت آپا کا رنگ فق' کیونکہ ان کے نیلے امریکن پاسپورٹ کے ساتھ تو ایسا کوئی خط تھا ہی نہیں ساڑھے نو بجے ڈاکٹر کیول دھیر کو جو میسج کیا تھا' اس کا جواب اب آیا۔ "آپ کا منتظر' سرحد کے اس پار۔"

اس افسانوی جواب کے بعد اگر میں یہاں کی حقیقت ان سے بیان کر دیتی تو یقیناً یہ بڑی بے مروتی ہوتی' اب فیصلہ یہ ہوا کہ ہم کسٹم وغیرہ سے نمٹ کے انتظار کرتے ہیں جب تک ڈاکٹر صغری کسی کے ہاتھ وہ کاغذ پہنچا دیں گی۔

جانے کس خیال میں میں نے رنگین چھتری واپس گاڑی میں رکھی اور سرحد کی طرف روانہ ہو گئی۔ بادل ہی ہے نا چھٹ جائے گا ذرا دیر میں۔ خیر کسٹم وغیرہ سے فارغ ہوئے اور انتظار کرنے لگے۔ اس انتظار کے دوران' سب خواتین نے ایک دوسرے سے اس کے پبلشر کے بارے میں اسی طرح چھان بین کی جیسے ساس اور دیگر سسرالیوں کے بارے میں کی جاتی ہے۔ ناز ابھی اس جھنجھٹ سے آزاد تھی' بیٹھی مزے سے چیونگم چباتی اور اپنی لمبی لمبی لٹوں سے کھیلتی رہی۔ مظالم کی داستان اتنی طویل تھی کہ گلا بیٹھ گیا اور اندازہ ہی نہ ہوا کہ ہمیں وہاں بیٹھے دکھ سکھ روتے ایک گھنٹہ ہو گیا ہے۔ ناز اس دوران باتھ روم کا دورہ کر کے واپس آ چکی تھی اور وہاں کے حالات بیان کرتے ہوئے اسے دوبارہ الائچی کا سہارا لینا پڑا۔

رخسانہ کے کاغذات آئے اور ہم پاکستانی چوکی سے نکل کے سرحد کی طرف روانہ ہوئے۔ بادل مزید گھنا ہو گیا تھا اور باقاعدہ برس رہا تھا۔ باب آزادی پہ قلی نے پانچ سو کا نوٹ پھرتی سے مٹھی میں دبایا اور ایک فون نمبر مجھے پکڑاتے ہوئے بڑی لجاجت سے کہا۔

"میرا بیٹا بی اے کر چکا ہے اسے کہیں نوکری دلا دو۔"

میں حیران کہ اسے کیا بتاؤں۔ میں ایم اے کر کے آج تک نوکری حاصل نہ کر سکی تو کسی کو کیا دلاؤں گی۔

کچھ ذکر ناشتے کا

صبح آنکھ کھلی تو انٹر کام ایک عزم صمیم سے بجے جا رہا تھا کہ ان بے ہوش مسافروں کو جگا کے ہی دم لے گا۔ دم سادھے پڑی رہی۔ رخسانہ آپا' شریف انسان' اٹھ کے سنا' ڈائننگ ہال والے دہائی دے رہے تھے کہ للہ ہم پہ کرم فرمایے اور ناشتہ تناول فرمایے۔"

بہت سی جمائیاں' انگڑائیاں لیتے اٹھے' گھر فون کیا بچوں کی خیریت پوچھی' آدھی مندی' آدھی کھلی آنکھوں سے ڈائننگ ہال میں پہنچے سارا ناشتہ چھوڑ کے مسالہ ڈوسا اور سانبھر پہ لپکی۔

ایک حسین خاتون' آم کی پھانک سی لمچوئی آنکھ' لہریے دار لمبے بال' ہمیں ایسے دیکھ رہی تھیں' جیسے پہچان رہی ہوں۔

"آپ پاکستان سے؟"

ہم نے کہا۔ جی بالکل کوئی شک؟"

مسکرائیں تو لگا' جاپان کے سچے موتی شرما جائیں گے۔ یہ ترنم ریاض تھیں جن کا نام اکثر جرائد میں پڑھا تھا۔ ترنم ریاض (دہلی) آج ان حروف میں جان پڑ گئی۔

وہ ہماری میز پہ اٹھ آئیں اور ذرا ہی دیر میں وہ پنجابی بول رہی تھیں اسی دوران' ناز اور فرحت آپا بھی آ گئیں۔ اب جو محفل جمی ہے تو بے چارے بیرے عاجز آ گئے' چائے پہ چائے اور باتوں کے نہ تھمنے والے غم غلے۔ عورتیں جب اکٹھی ہوتی ہیں تو اتنا بولتی کیوں ہیں؟

آخر بے چارے ڈائننگ ہال والوں پہ رحم کھایا اور اٹھ کے لالی میں آئے' تصویروں کا دور شروع ہوا۔ ایک نو عمر بیرے کو بلایا گیا اور باری باری سب نے اپنے فون دیے' ترنم نے اپنا فون بڑھایا اور کہا۔

"کہیں سے بھی چھو لیں۔"

بے چارہ گھبرایا پھر شرمایا اور آخر میں پچھتایا' کیونکہ ہماری ترنم آپا ماشاء اللہ چھبیس سالہ بیٹے کی ماں ہیں۔ یہ اور بات کہ انہوں نے سدا بہار حسین اور جوان رہنے کا کوئی نسخہ کہیں سے اڑا لیا ہے۔

تصویریں کھینچی گئیں اور ہم دوبارہ کمرے میں آ ئے۔ یہاں ڈاکٹر کیول دھیر اور چراغ ہمارے منتظر تھے۔ ہم نے کل دیر سے آنے کی معذرت کی۔

رخسانہ آپا نے کہا کہ "بھئی میں اور آمنہ تو آنے کو تیار تھے مگر ان دونوں کے کپڑے۔"

ڈاکٹر صاحب مسکرائے کہ "اچھا کاغذات کس کے گھر رہے تھے؟"

ایک قہقہہ پڑا اور اب کی بار میں اور ناز بھی دل کھول کے ہنسے۔

کیول دھیر صاحب نے اپنی خود نوشت سوانح دی جو بہت خوب صورت چھپی ہوئی ہے' چراغ ذرا دیر بیٹھ کے انتظامات دیکھنے چلے گئے۔

جب ڈاکٹر صاحب نے مجھے ساتویں بار مشاعرہ پڑھنے کا کہا تو میں نے جھجکتے جھجکتے ہامی بھرلی۔ شاعری کا بھاری پتھر 96ء میں چوم کر چھوڑ دیا تھا' بیاض بھر غزلیں نظمیں جانے یادداشت کے کن خانوں میں دبی ہوئی تھیں۔

ابھی یادداشت ٹٹول ہی رہی تھی کہ دہلی سے آئے ہوئے مشاعرے کے ناظم معین شاداب تشریف لے آئے۔ ادھر ادھر کی باتوں میں معلوم ہوا کہ موصوف بجنور کے ہیں۔ میری ننھیال بجنور کی ہے۔ ہم وطنی کے احساس نے لمحوں میں غیریت دور کردی۔ (ہم وطن بننے کو ہم ہر ایک کے تیار ہیں۔ خواہ وہ جھنجھر سے ہو' بیکانیر' ریواڑی' دہلی یا دیرہ دون اس کے علاوہ وینکوور اور امریکہ کے چند شہروں کو بھی اپنا وطن بے دھڑک تسلیم کرتے ہیں۔)

معین صحارا ٹی وی پہ خبریں پڑھتے ہیں' سمجھ دار شاعر ہیں۔ بات ہندوستان میں اردو کی صورت حال پہ آئی' معین کو بھی وہی شکوہ تھا اردو رسم الخط خطرے میں ہے۔ رومن کوئی حل نہیں اور جو لابی اردو کو دیوناگری میں لکھوانے پہ مصر ہے وہ ہندوستان کے ایک بہت بڑے تہذیبی ورثے کو تباہ کرنے کے درپے ہے' برسبیل تذکرہ مشہور زمانہ "ایک بھاشادو لکھاوٹ" اور "گوپی چند نارنگ" کا ذکر بھی آگیا۔

"تو آپ شام کو مشاعرہ پڑھ رہی ہیں" معین نے بات پلٹی۔

"جی آپ سب کا اصرار ہے تو پڑھ لیتی ہوں۔ مگر صرف ایک غزل اور ایک نظم۔"

"جی بہتر کافی ہے اتنا بھی۔"

اب سوچا کہ کچھ دیر سولیں' کمبل میں گھسے ہی تھے کہ دروازہ بجا میں حسب عادت دم سادھے پڑی رہی۔ رخسانہ آپا نے دروازہ کھولا۔ یہ ڈاکٹر اقبال تھے خاص مالیر کوٹلہ سے۔ ان کی بیگم اور بیٹی بھی ساتھ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا بیٹا' ہسپتال میں داخل تھا۔ لیکن اردو کی محبت انہیں ہمارے پاس کھینچ لائی۔

مالیر کوٹلہ بھی عجیب جگہ ہے۔ یہ ایک ایسی مسلم ریاست ہے جہاں تقسیم کے وقت کسی کا ایک قطرہ خون بھی نہ بہا۔ بلکہ دوسرے علاقوں سے مسلمان یہاں آکر پناہ گزین ہوئے' روایت ہے کہ جب سکھوں کے دسویں گرو گوبند سنگھ کے دو لڑکوں۔ "صاحبزادہ فتح سنگھ" اور صاحبزادہ زور آور سنگھ" کو زندہ درگور کرنے کا حکم دیا گیا تو اس وقت نواب شیر محمد خان آف مالیر کوٹلہ نے' سرہند کے گورنر وزیر خان کی نہ صرف مخالفت کی' بلکہ دربار سے احتجاجاً" واک آؤٹ بھی کر گئے۔ یہ سال 1705ء تھا۔ دونوں صاحبزادے علی الترتیب نو اور سات سال کے تھے۔

نواب کے اس اقدام پہ گورو گوبند نے خوش ہو کے انہیں اپنی کرپان بھیجی' کہتے ہیں کہ اس وجہ سے مالیر کوٹلے میں فسادات نہ ہوئے گو بعد ازاں نواب مالیر کوٹلہ لاہور آ گئے اور میری اطلاعات کے مطابق تاحال ان کا خاندان ماڈل ٹاؤن میں دیگر تارک ہندوستان کے مسلمانوں کے ساتھ کہیں رہ رہا ہے۔ خیر اللہ اعلم بالصواب۔

ڈاکٹر اقبال نے بتایا کہ مالیر کوٹلہ واحد شہر ہے جہاں پنجابی کے ساتھ اسکولوں میں اردو بھی پڑھائی جاتی ہے۔ اور پٹیالہ یونیورسٹی نے یہاں۔ اردو میں پی ایچ ڈی تک کی تعلیم کا انتظام کرا دیا ہے۔ یہاں 55٪ سے بھی زیادہ مسلمان ہیں' جن میں اکثریت آرائیں برادری کی ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے بقول یہ لوگ آریا نسل کے ہیں اور شہاب الدین غوری کے حملے کے بعد مسلمان ہو گئے۔

مالیر کوٹلہ' ہندوستان میں اردو کا ایک جزیرہ ہے۔ اور اقبال صاحب اس جزیرے کے ایسے باسی جس کا واحد عشق اردو ہے۔ اپنے ساتھ کئی کتابیں لائے تھے جن میں دیوان ناں بھی تھا۔ تنقید کی کچھ کتابیں' ڈاکٹر صاحب جیسے لوگوں کو دیکھ کے خیال آتا ہے کہ اردو رسم الخط زندہ رہے

گی۔

مشاعرہ

مشاعرہ "نہرو سدھانت کیندر ٹرسٹ" کے آڈیٹوریم میں تھا۔ یہ ٹرسٹ شری ست پال متل نے 1983ء میں قائم کی تھی' تیار ہو کے لابی میں آئے تو' ہوٹل کے دونوں ہالز میں منگنی اور شادی کی تقریبات جاری تھیں۔ وہی جالی کی ساڑھیاں کام دار دوپٹے' لہنگے' لمبے گاؤن اور میک اپ وہی گانے "گندی بات' گندی بات' گندی بات" کچھ بھی تو فرق نہیں تھا۔

سردی لگتا تھا آج کچومر نکال کے رہے گی۔ سرد ہوائیں بھالے کی طرح لگ رہی تھیں۔ باہر نکلے تو دروازے پہ کھڑے گارڈ نے کڑک کے کہا "ست سری اکال" جواب حلق میں ہی اٹک گیا اور ٹھنڈ کی لہروں نے کپکپا کے رکھ دیا۔

مشاعرہ گاہ میں کملیشور گپتا اور ان کے شوہر ملے۔ یہ پروگرام کی کمپیئر تھیں۔ سنہری کنی کی سفید ساڑھی' ماتھے پہ سفید بندی اور اجالی مسکراہٹ.... رخسانہ آپا لوٹ گئیں۔

"آپ کی ساڑھی.... لدھیانہ سے لی ہے؟"

طلسماتی مسکراہٹ اور گہری ہوئی۔ ماتھے کی بندی سے شعاعیں سی پھوٹیں۔

"ارے نہیں' لدھیانہ میں کچھ نہیں ملتا' یہ تو میں ساؤتھ سے لائی ہوں۔"

اور ہم جی مسوس کے رہ گئے ہندوستان کا سارا جادو تو ساؤتھ میں ہے یہ لدھیانہ تو اپنا فیصل آباد ہی ہے۔

خیر کملیشور نے مجھ سے میرے بارے میں اتنے سوال کیے کہ میں چکرا سی گئی۔ جانے کیا جھوٹ سچ گھڑا' اتنی دیر میں ایک رپورٹر صاحب نے کسی چینل کے لیے انٹرویو ریکارڈ کرنا شروع کیا۔ ساحر لدھیانوی کے بارے میں چار ایک سوال اور پھر پھٹ سے کہہ دیا۔

"ذرا ساحر کا کوئی گیت تو گنگنا دیں۔"

انہوں نے تو گنگنا ہی کہا تھا مگر مجھے غنغنا ہی لگا۔ نزلے سے ناک کان تو بند ہی تھے۔ لیکن خیر' وہی تنبیہی کھنکھار جس میں چودہ سو سال کی عظمت رفتہ اور تلواروں کی جھنکاریں ہیں کام آئی۔

"نہیں معذرت چاہوں گی۔ ہاں تحت اللفظ میں حاضر ہے۔"

پھر جو ساحر کی تاج محل سنانی شروع کی تو رپورٹر بے چارے کو جمائیاں آنے لگیں۔ بھلے آیا کریں۔ ایسی نابکار فرمائشیں کرے گا تو یہی انجام ہو گا ہاں۔

پاکستان اور ہندوستان سے کافی شاعر جمع کیے گئے تھے۔ ہمارے گروپ کا تعارف تو ہو چکا ہے' ہندوستان سے ساغر سیالکوٹی تھے حسیب سوز' معین شاداب' شکیل اعظمی' حسن کاظمی' اشتیاق حسین' ترنم ریاض اور بر گیا و کاس۔

تقریب کا آغاز شش مکھی دیا جلا کر کیا گیا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاءاللہ)

نازیہ کنول نازی ہمراہ محمد نعیم اقبال

شاہین رشید

کہتے ہیں تخیلاتی کہانیاں صرف صفحہ قرطاس پہ ہی بکھیری جاسکتی ہیں' حقیقت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہوتا' افسانہ نگار' فلم' ناول' اور ڈرامہ رائٹر کسی اور ہی دنیا کے باسی ہوتے ہیں۔ مگر مجھے تھوڑا سا اختلاف ہے' میرا نظریہ یہ ہے کہ نقطہ ہوتا ہے تو کہانی بنتی ہے' تخلیق کار اپنے اردگرد جو دیکھتے ہیں وہ ہی تحریر میں لاتے ہیں' یہ اور بات ہے کہ فلموں میں' ڈراموں میں اور افسانوں میں فینٹیسی بھی ڈال دیتے ہیں تاکہ دیکھنے اور پڑھنے والوں کو مزہ آئے۔

تصورات کی دنیا میں لے جانے والے ان لکھاریوں کی اپنی زندگی میں بھی کیا ایسے موڑ آتے ہوں گے کہ یہ خود بھی سوچیں کہ ہم جو لکھا کرتے تھے۔ وہ تو ہمارے ساتھ ہو گیا' کہ ہم نے جس کو چاہا وہ ہمیں مل گیا یا جس نے ہمیں چاہا اسے ہم مل گئے یا مل جائیں گے۔ ہمارے افسانوں میں ہیرو سماج کی ساری دیواریں توڑتا ہوا' اپنی راہ کی ساری رکاوٹوں کو دور کرتا ہوا ہمارے قریب آئے گا اور ہمارا ہاتھ تھام کر کہے گا کہ مجھے تمہاری ہی تلاش تھی۔ آج میری تلاش مکمل ہو گئی ہے۔ میں خوش نصیب ہوں کہ مجھے تم مل گئی ہو۔ کسی اور کی زندگی میں ایسا ہوا یا نہ ہوا ہو' مگر نازیہ کنول نازی کے ساتھ ایسا ضرور ہوا ہے' لیکن کس طرح ان کے "بندھن" میں پڑھیں۔

"کیسی ہیں نازیہ؟"

"جی اللہ کا شکر ہے۔"

"ہماری طرف سے شادی کی بہت مبارک ہو' بلکہ نکاح مبارک ہو۔"

"جی اس کے لیے بہت شکریہ۔"

"نازیہ کنول نازی" کافی لمبا نام ہے۔ تو شادی کے بعد اس میں چینج آیا' یا یہی چل رہا ہے؟"

"بے نظیر بھٹو" ساری زندگی "بے نظیر بھٹو" ہی رہیں۔ یہی ان کی پہچان تھی۔ اس طرح نازیہ کنول نازی کی پہچان ہی اس کا نام ہے۔ اگر میں اپنے والد کا نام اور اپنے شوہر کا نام لگالوں گی تو پھر میری پہچان ختم ہو جائے گی۔ کیونکہ لوگوں کو "نازیہ کنول نازی" سے پیار ہے۔

"میاں صاحب محمد زعیم اقبال نے کہا نہیں کہ آپ اپنا نام تھوڑا چینج کریں اور میرا نام بھی شامل کریں؟"

"انہوں نے ایسا کچھ نہیں کہا' بلکہ انہوں نے مجھے یہ کہا کہ آپ کی زندگی میں جتنی بھی مصروفیات آجائیں' جتنی بھی تبدیلیاں آجائیں آپ نے قلم سے تعلق نہیں توڑنا' کیونکہ یہ آپ کی پہچان ہے۔ ویسے ان کا دل چاہتا تھا کہ ان کا نام میرے نام کے ساتھ لگے تو میں نے انہیں بتایا کہ اگر میں نے آپ کا نام اپنے نام کے ساتھ لگا کر اپنے آپ کو پیش کیا یا اپنا تعارف کرایا تو شاید مجھے وہ پیار نہیں ملے گا جو "نازیہ کنول نازی" کو ملتا ہے۔ تو پھر انہوں نے دوبارہ مجھ سے نہیں کہا۔"

"لیکن آپ کے چاہنے والوں کو تو پتا ہے نا کہ آپ کی شادی ہو گئی ہے' آپ ایک نئے "بندھن" میں بندھ گئی ہیں اور.....؟"

"آپ چاہنے والوں کی بات کر رہی ہیں تو اگر آپ فیس بک یوز کرتی ہیں تو آپ وہاں پر دیکھیں کہ جیسے کوئی طوفان آیا ہوا ہے۔ یا کوئی زلزلہ آگیا ہے" ایسے دنیا میری شادی پہ ایکسائیٹڈ ہو رہی ہے کہ مجھے حیرانی ہو رہی ہے کہ میں تو ایک معمولی سی رائٹر ہوں' مگر اتنا زیادہ پیار اور اتنی زیادہ دعائیں ملی ہیں کہ یقین نہیں آتا' نہ صرف عام قارئین' بلکہ بڑی بڑی رائٹرز نے' بڑی بڑی مدیراؤں نے' بڑے بڑے لوگوں نے مبارک باد کے پیغام دیے۔ مجھ سے چاہت اور پیار کا اظہار کیا کہ میں خود حیران رہ گئی کہ لوگ میری تحریروں کو اتنا پسند کرتے ہیں۔ میں تو اپنے رب کا جتنا بھی شکر ادا کروں اتنا کم ہے۔"

"آج کل کیا مصروفیات ہیں پھر اس طرف آتے ہیں کہ بندھن میں کس طرح بندھیں۔ شادی کی وجہ سے لکھنا کم ہوا یا بند ہوا یا زیادہ ہوا؟"

"آج کل قلم سے تو بالکل کنارہ کشی ہے۔ آج کل تو بی ایڈ کے امتحان کی تیاری ہے اور کالج میں لیکچرار شپ کی جاب لینا میری زندگی کی سب سے بڑی تمنا ہے' خواہش ہے اور اس کے علاوہ ایک ڈائجسٹ میں میں نے ناول "شب ہجر کی پہلی بارش" شروع کیا ہے اور کرن کے لیے ناول "رات کے پچھلے پہر" شروع کیا ہے۔ بس یہی مصروفیات ہیں آج کل اور آج کل انڈین چینل سے دو سیریلز شروع ہوئے ہیں وہ بہت شوق سے دیکھتی ہوں۔"

"انڈین سیریلز کیوں دیکھتی ہیں؟ آپ تو خود اتنی اچھی رائٹر ہیں آپ کے سیریل بھی اسکرین پہ آنے چاہئیں؟ کوشش کی؟"

"میں آپ کو بتاؤں کہ پاکستان کا شاید ہی کوئی انٹرٹینمنٹ کا چینل ایسا ہو گا جس نے میری ڈیمانڈ کے مطابق مجھے سیریل لکھنے کی آفر نہ کی ہو' جیو' ہم' اے آر وائی اور دیگر' لیکن میں ٹی وی اسکرین کے لیے نہیں لکھنا چاہتی' میں ایک رائٹر ہی رہنا چاہتی ہوں۔"

"کیوں؟"

"کیوں؟..... تو جہاں تک "کیوں" کی بات ہے تو میں اللہ تعالیٰ کی پاک ذات سے بہت ڈرتی ہوں۔ میں کہتی ہوں کہ میرے لکھنے سے جتنا گناہ مجھے مل رہا ہے اتنا ہی میں برداشت کرلوں' میرے لیے کافی ہے۔ ٹی وی کے لیے جب ہم لکھتے ہیں تو کرداروں کو ڈائریکٹر کپڑے بھی اپنی مرضی سے پہناتے ہیں اور سین بھی اپنی مرضی سے کرواتے ہیں تو اس کا گناہ بھی تو رائٹر کے سر ہی جاتا ہے۔ تو بس اس وجہ سے اسکرین کے لیے نہیں لکھتی۔ لوگوں کو دو چیزوں کی ہوس ہوتی ہے۔

ایک شہرت کی اور دوسری دولت کی' اور مجھ پر اللہ کا بڑا کرم ہے کہ مجھے شہرت بھی اللہ نے بہت دی ہے اور دولت کی بھی کمی نہیں ہے۔ تو میں بہت مطمئن ہوں الحمدو للہ۔ مجھے مزید کی خواہش نہیں ہے۔"

"چلیں جی اب آپ بندھن کی طرف آجائیں۔ تو کب نکاح ہوا اور رخصتی کب متوقع ہے؟"

"11 اپریل 2015ء کو میرا نکاح ہوا۔ رخصتی ابھی نہیں ہے' لیکن میرے سسرال والوں کے ساتھ میرے تعلقات ایسے ہی ہیں جیسے میں ان ہی کے گھر میں ہوں اور میرے گھر کے اندر بھی کوئی روک ٹوک نہیں ہے اور رخصتی کو اس لیے فی الحال روکا ہوا ہے کہ میری "مما" کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے' لیکن ویسے میں ان کی بہو ہوں اور میاں صاحب اس گھر کے داماد ہیں۔"

"میاں صاحب کرتے کیا ہیں؟ ان سے ملاقات ہوتی ہے نکاح کے بعد؟ کیسا پایا؟"

"زعیم آرمی میں ہوتے ہیں باسکٹ بال کی ٹیم کے کھلاڑی ہیں اور جہاں تک ملاقات کی بات ہے تو ہماری ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ وہ آتے ہیں بیٹھتے ہیں' ہم باتیں کرتے ہیں۔ فیملی کے ساتھ ڈنر کرتے ہیں اور اکیلے میں جو ملاقاتیں ہوئیں تو میں نے ان کو بہت اچھا انسان پایا ہے۔ بہت ہی محبت کرنے والے بہترین انسان ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ وہ میری خواہشات کا احترام کرتے ہیں' میاں صاحب منگلا ڈیم میں جاب کرتے ہیں اور میں بہاول نگر میں ہوں۔"

"ملاقات کب اور کیسے ہوئی' اریج میرج ہے یا لو؟"

"ملاقات تو ہماری ہوئی نہیں تھی' کیونکہ یہ اریج تھی۔ منگنی کے بعد ان کی کال آئی تھی اور انہوں نے مجھے مبارک باد دی تھی کہ ہماری منگنی ہوئی ہے اور مبارک باد کی سب سے پہلی کال بھی زعیم کی ہی آئی تھی۔"

"رشتہ کیسے طے ہوا تھا؟ کوئی ریلیشن تھا دونوں فیملیز کا؟"

"ایک ڈائجسٹ میں (آنچل) میرا ایک سلسلہ چل رہا تھا "بہنوں کی عدالت" اس میں ملک بھر کی قارئین اپنے سوالات میرے لیے بھیجتی تھیں' اور میں انہیں جواب دیتی تھی۔ اسی میں ایک بہن نے مجھ سے سوال پوچھا کہ زندگی کے ہم سفر کے لیے آپ کی کیا ڈیمانڈز ہیں تو میں نے جواب دیا کہ میں چاہتی ہوں کہ میری شادی ایک آرمی مین سے ہو" تو میری ایک فین تھیں ان کے دو بھائی "آرمی" میں تھے' ایک بھائی کی شادی ہو چکی تھی اور ایک غیر شادی شدہ تھے۔ تو میری اس فین نے مجھے تقریباً" گیارہ بارہ صفحات کا خط لکھا کہ میرے بھائی آرمی میں ہیں یہ ان کی کوالٹیز ہیں۔ رنگ روپ اور عمر کے بارے میں لکھا اور ان کے بارے میں ساری تفصیلات لکھیں اور پھر یہ بھی لکھا کہ اگر آپ رشتہ قبول کرلیں گی تو ہمارے گھر میں بہت خوش رہیں گی' تو میں نے انہیں جواب دیا کہ میں یہ ضرور چاہتی ہوں کہ آرمی مین ہو' لیکن یہ بھی چاہتی ہوں کہ وہ میرے شہر میں ہوں یا شہر سے نزدیک ہوں کیوں کہ میں زیادہ دور نہیں جاسکتی۔

لیکن ان کا اصرار بڑھتا ہی چلا جارہا تھا اور بقول ان

کے کہ مجھے آپ کی ذات سے "روحانی عشق" ہے اور میں پانچ سال سے ایک خاکہ دیکھتی آ رہی ہوں خوابوں میں اور مجھے لگتا ہے کہ وہ خاکہ آپ کا ہے۔ مجھے تو پانچ سال پہلے سے ہی آپ کے خواب آ رہے ہیں' جبکہ میں انکار کر رہی تھی کہ ایسا نہیں ہو سکتا کیونکہ ان کی عمر بھی کم تھی یہی کوئی پچیس سال اور میں کہتی تھی کہ شوہر کو عمر میں دس پندرہ سال بڑا ہونا چاہیے۔ اسے میچور ہونا چاہیے۔ اب پچیس سال کا انسان کیا میرے جذبات کو سمجھے گا' کیا قدر کرے گا۔ اسے تو کچھ پتا ہی نہیں ہو گا لیکن ان کا اصرار تھا کہ آپ نے ہی میری بھابھی بننا ہے میں نے ہر طریقے سے انکار کیا اور ہر طریقے سے انہیں ہرٹ کیا کہ وہ پیچھے ہٹ جائیں۔

اس دوران بھاول پور کے ایک ڈاکٹر کا اور ایک بینکر جو بہنوئی کے دوست تھے' ان کے پرپوزل آئے ہوئے تھے۔ انہیں بتایا بھی کہ یہ پرپوزل آئے ہوئے ہیں آپ کے بھائی کی جگہ نہیں بنتی تو کہنے لگی کہ آپ سارے پرپوزلز کو چیک کر لیں اور کہیں بات نہ بنے تو آپ میرے پاس آئیے گا۔ تو اتفاق دیکھیں کہ بھاول پور والے رشتے کو بھی نہ ہو گئی کہ انہوں نے غلط بیانی سے کام لیا تھا اور بینکر کی بھی عادت و اطوار گھر والوں کو پسند نہیں آئیں تو انہیں بھی انکار کر دیا۔ تو اس طرح میری فین کے بھائی کا نمبر لگ گیا۔ وہ بھی اس لیے کہ انہوں نے کہا کہ ہمیں آپ کی کسی بھی بات پر کوئی اعتراض نہیں ہو گا' آپ جیسی بھی زندگی گزارنا چاہیں گی آپ کو کوئی روک ٹوک نہیں ہو گی' آپ جہاں رہنا چاہیں گی ہم منع نہیں کریں گے اور اس بات کو میرے دل نے پسند کیا اور میں نے رشتے کے لیے ہاں کر دی۔"

"آپ کی فین نے آپ کو دیکھا ہوا تھا؟"

"نہیں' مجھے بھی نہیں دیکھا ہوا تھا اور مزے کی بات بتاؤں کہ میری فین جو اب میری نند ہیں ان سے میں نے کہا کہ دیکھیں میں اجنبی لوگوں سے بہت خوف کھاتی ہوں اور آپ نے تو مجھے دیکھا ہوا بھی نہیں ہے اور نہ ہی میں نے' تو کہنے لگیں کہ ہم نے آپ کو دیکھنا ہی نہیں ہے آپ جیسی بھی ہیں' کالی ہیں گوری ہیں۔ آپ کے منہ میں دانت بھی نہ ہوں آپ کے بال بھی سفید ہوں۔ تب بھی میں نے آپ کو اپنی بھابھی بنانا ہے۔ میں نے نہیں دیکھنا کہ آپ کیسی ہیں عشق کی انتہا دیکھیں کہ کہنے لگی میرے گھر والے آئیں گے اور آپ کو دیکھے بغیر پیسے دے جائیں گے۔ آپ ٹینشن نہ لیں اور پھر ان کے گھر والے آئے وہ میرے گھر والوں سے ملے۔ مجھ سے ملے۔ وہ بہت زیادہ ایکسایٹڈ تھے' کہنے لگے ہم تو سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ آپ ایسی ہوں گی' ہم تو سوچ رہے تھے کہ اتنی میچور تحریریں لکھنے والی لڑکی پتا نہیں کتنی میچور ہو گی۔"

"کتنا فرق ہے آپ دونوں کی عمروں میں؟ اور منگنی کتنا عرصہ رہی؟"

"ہماری عمروں میں دو سال کا فرق ہے وہ مجھ سے دو سال چھوٹے ہیں۔ ہماری منگنی تقریباً" 2 ماہ رہی ان کی فیملی ہمارے یہاں سے گئی تو پھر ان کا اصرار تھا کہ ہم لوگ ان کے گھر آئیں اور میری نند کا کہنا تھا کہ آپ بھی آ کر میرے بھائی کو دیکھ لیں۔ میری امی ان دنوں بہت بیمار تھیں اور انہیں ٹینشن تھی کہ اگر خدانخواستہ مجھے کچھ ہو جاتا ہے تو نازیہ تمہارا کیا بنے گا۔ اتفاق سے انہی دنوں "زعیم" بھی ہمارے شہر ہی آئے ہوئے تھے اپنے دوست کی شادی میں' تو امی نے کہا کہ چلو لڑکا جا کر دیکھ آتے ہیں۔ ان سے قبل امی نے جتنے بھی لڑکے میرے لیے دیکھے انہیں پسند نہیں آئے' لیکن زعیم پہلی نظر میں ہی امی کے دل میں اتر گئے۔ وہیں پہ ہی بات پکی کر کے امی گھر آئیں اور وہ تو پہلے ہی بات پکی کر گئے تھے۔"

"آپ نے سوچا کہ جو میں تحریروں میں لکھتی ہوں' میرے ساتھ بھی ویسا ہی ہوا ہے؟"

"سچ بتاؤں' میرے ساتھ بالکل ناولوں اور افسانوں والا کام ہوا ہے۔ ہماری فیملی کا "ملک" فیملی سے تعلق ہے اور اردو بولتے ہیں۔ اور ہمارا رہن سہن زعیم

صاحب کی فیملی سے بالکل مختلف ہے' اور مزے کی بات بتاؤں کہ ہماری برادری میں مرجاتے ہیں' مار دیتے ہیں' مگر اپنی بیٹیاں "آؤٹ آف برادری یا آؤٹ آف کاسٹ" میں نہیں دیتے اور ان کے یہاں بھی یہی حال ہے۔ وہ پنجابی فیملی سے تعلق رکھتے ہیں اور "والہ" کہلاتے ہیں یہ لوگ بھی نہ باہر سے لاتے ہیں اور نہ ہی باہر دیتے ہیں۔"

"آپ دونوں کی تعلیمی قابلیت کیا ہے اور سسرال میں کتنے نمبرز ہیں؟"

"میں نے ایم اے اردو کیا ہے اور بی ایڈ کا ارادہ ہے اور دبئی میں میں نے جاب اپلائی کی ہوئی ہے اور وہاں ایم اے اور بی ایڈ ہونا ضروری ہے اور زعیم نے آئی کام کیا ہوا ہے ان کے چار بھائی اور چار بہنیں ہیں اور زعیم بھی بہنوں بھائیوں میں تیسرے نمبر پر ہیں۔"

"جوائنٹ فیملی سسٹم ہے سسرال میں؟"

"جی' جوائنٹ فیملی سسٹم ہے ان کے دو بھائیوں کی شادیاں ہو چکی ہیں' اور وہ سب مل کر ہی رہتے ہیں اور میری ساس تو بہت ہی اچھی خاتون ہیں' اور بہوؤں کے بہت زیادہ ناز اٹھاتی ہیں اور سب بہت خوش باش رہتے ہیں۔ کوئی ٹینشن نہیں ہے ان کے گھر۔"

"آپ جب رخصت ہو کے جائیں گی تو آپ کو تو بہت خیال رکھنا پڑے گا۔ کیونکہ انہوں نے آنکھیں بند کرکے آپ پر بھروسا کیا۔ تو ایک اچھی بھابی بن کے رہنا پڑے گا.... ایسا ہی ہے نا یا ہوگا؟"

"میں نے اب تک یہی کوشش کی ہے کہ میری نند نے جو اعتماد مجھ پر کیا ہے اسے برقرار رکھوں اور مزے کی بات یہ ہے کہ اگر میرا کوئی قصور بھی ہوتا ہے یا میں کوئی غلطی کرتی ہوں تو ان کے پیار کا یہ عالم ہے کہ میری غلطی کی ڈانٹ بھی زعیم کو ہی پڑتی ہے مجھے نہیں' وہ کہتے ہیں کہ زعیم کی غلطی ہوگی تو نازیہ نے ایسا کیا ہے ورنہ نازیہ غلطی نہیں کرسکتی۔"

"سوچا تھا کہ آرمی مین ہو' کچھ اور آئیڈیل بھی بنایا ہوا تھا اپنے افسانوں کے ہیرو کی طرح؟"

"میں ہمیشہ اپنی ماں سے کہتی تھی کہ میں ایسے انسان سے کبھی شادی نہیں کروں گی جس کے ساتھ میری مینٹل انڈراسٹینڈنگ نہ ہو اور جو دیکھنے میں مجھے اچھا نہ لگتا ہو' میں کہتی تھی کہ نیچر میں بھی اچھا ہو اور دیکھنے میں بھی وہ مجھے "فواد خان" جیسا لگنا چاہیے اور مزے کی بات دیکھیں کہ زعیم بھی دیکھنے میں بالکل فواد خان جیسے لگتے ہیں۔"

"تم بہاول نگر میں ہوتی ہو اور وہ عارف والا میں تو ملاقات کب کب ہوتی ہے؟"

"فون پر تو ہم ہر وقت ہی مصروف رہتے ہیں اور ابھی کوئی زیادہ وقت نہیں ہوا ان کے بھائی کی شادی تھی تو وہ آئے ہوئے تھے بہاول نگر۔ ان کے بارے میں بتاؤں کہ غصے کے تیز ہیں' کیونکہ فوجیوں کا غصہ تو آپ کو معلوم ہی ہے' لیکن وہ بہت محبت کرنے والے اور خیال رکھنے والے انسان ہیں۔ شادی کے بعد میرے پاؤں پہ تھوڑی سی چوٹ لگ گئی تو ان کی جان پر بن آئی کہ نازیہ کو یہ چوٹ کیوں لگی میں ایسا کیا کروں کہ یہ جلدی سے ٹھیک ہوجائے۔"

"سمپل نکاح ہوا' یار سمیں ہوئیں؟"

"بہت ہی اچھی اور بہت ہی پر وقار تقریب تھی۔ جس دن ہمارا نکاح تھا' موسم بہت خوب صورت اور رومینٹک ہو رہا تھا تیز بارش تھی' میں پالر میں تھی۔ دراصل میری بہن کی رخصتی تھی اور میرا نکاح تھا۔ جو لوگ مجھے تحریروں سے جانتے تھے ان کا خیال تھا کہ نازیہ ضرور بڑی عمر کی ہوگی' موٹی ہوگی۔ مگر میں جب پالر سے تیار ہو کر آئی تو لوگ دیکھ کر جیسے بے ہوش ہو رہے تھے کہ اتنی دلہنیں دیکھی ہیں' مگر اتنی خوب صورت دلہن کبھی نہیں دیکھی۔ سسرال والے مجھے دیکھ دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔"

"لفظوں کی تو بادشاہ ہو' گھرداری میں بھی بادشاہ ہو' سگھڑپن ہے کہ نہیں یا صرف قلم سے لگاؤ ہے؟"

"ویسے تو سچی بات بتاؤں کہ میں قلم کار ہی ہوں۔ لیکن مجھے کوکنگ سے بھی بہت زیادہ دلچسپی ہے خود سے

پکانا' نئی نئی ڈشز پکانا' سب کو کھلانا مجھے بہت پسند ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ جو ذہنی مزدوری کرتا ہے وہ جسمانی مزدوری نہیں کر سکتا' لیکن مجھے اچھا لگتا ہے گھر کا کام کرنا اور اگر اتفاق سے گھر میں کوئی کام کرنے والا نہیں ہے تو مجھے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی یا کوئی سستی نہیں آتی کام کرنے میں' میں بلا جھجک کام کر لیتی ہوں۔ ویسے تو زعیم کہتے ہیں کہ آپ کو گھر کے کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے میں آپ کو نوکرانی رکھ کر دوں گا' مگر میں کہتی ہوں کہ ایسا نہیں' جب ہو گا تو میں کام کر لوں گی۔"

"ابھی تو سسرال میں سب اچھے ہیں' جب رخصت ہو کر جائیں گی اور موجودہ باتوں سے الٹ سب کچھ ہوا کہ نہیں لکھو' گھر سنبھالو' بچے سنبھالو تو پھر کیا کریں گی؟"

"لکھنے میں میرا کوئی لالچ تو شامل ہے نہیں' لکھنا تو میرا جنون ہے اور مجھے لگتا ہے کہ میرے اندر ایک بے چین روح بھٹک رہی ہے' اس روح کی تسکین کے لیے مجھے قلم کا سہارا لینا پڑتا ہے۔ انہیں تو پتا ہی نہیں تھا کہ میں ایک رائٹر ہوں۔ وہ حیران ہوتے تھے کیونکہ لوگ آپ سے اتنا پیار کرتے ہیں۔ یہ تو ان کی بہن کو معلوم تھا کہ میں ایک رائٹر ہوں۔ ان کے گھر والوں کو معلوم تھا۔ تو ابھی تو یہی کہتے ہیں کہ میں منع نہیں کروں گا آگے دیکھیں کیا ہوتا ہے۔"

"رخصتی کے بعد والی رسمیں جیسے منہ دکھائی دینا وغیرہ تو نہیں ہوئی ہوں گی؟"

"سب کچھ ویسا ہی ہوا تھا جیسے شادی میں ہوتا ہے۔ میرے سسرال والوں نے بھی پیسے دیے تھے۔ زعیم نے مجھے گولڈ کی بہت خوب صورت رنگ دی' اور خوب صورت ڈیکوریشن پیس دیا' یہ سب منہ دکھائی میں ہی تھا اور حق مہر کے پانچ ہزار بھی دے دیے کہ وہ پاس بھی بیٹھے تھے اور انہوں نے مجھے رنگ بھی پہنائی تھی تو سب رسمیں ہوئی' اب تو بس ایسا ہی ہے کہ جیسے یہاں سے اٹھ کر وہاں جانا ہو گا۔"

"لڑکیوں کے لیے شادی کیوں ضروری ہے؟"

"لڑکیوں کی شادی اس لیے بھی ضروری ہے کہ بچاری ذرا سی اور ایج ہو جائیں تو انہیں بہت باتیں سننا پڑتی ہیں۔ حالانکہ وہ جتنی بھی باکردار ہوں' ماں باپ کی جتنی بھی خدمت گزار ہوں۔ لوگ یہی کہتے ہیں کہ اس کی شادی ہو کیوں نہیں رہی' ضرور اس کا کسی کے ساتھ افیئر ہو گا' یہ کماتی ہے تو ماں باپ کو اس کی کمائی کا چسکا ہو گا۔ اس لیے وہ اس کی شادی نہیں کر رہے۔ حالانکہ میرے ساتھ جو معاملہ تھا وہ میری مما کو معلوم تھا۔ میں ضرورت سے زیادہ حساس ہوں۔ میں لوگوں کی زیادہ باتیں نہیں سن سکتی۔ میں نے اپنی امی سے کہا تھا کہ میرے لیے ایسی فیملی کا انتخاب کیجئے گا جو بہت بڑی نہ ہو' یا اجنبی لوگ نہ ہوں اور چونکہ میری مما مجھ سے بہت زیادہ پیار کرتی ہیں تو وہ ہر رشتے کے لیے بہت زیادہ سوچ بچار کرتی تھیں تو لوگ کہتے تھے کہ اس کی ماں کو اور نازیہ کو تو کوئی پسند ہی نہیں آتا' پتا نہیں کون سا شہزادہ اترے گا آسمان سے اور پھر یہی بات کہ ماں باپ اس کی کمائی کھا رہے ہیں۔ تب پھر میں نے گھبرا کر کہا کہ ٹھیک ہے کہ جو رشتہ ملے کر دیں۔ اگر مجھے میرے خوابوں کا شہزادہ نہیں مل رہا تو جو آپ کو اچھا لگے کر دیں۔ میں لوگوں کی باتیں نہیں سن سکتی۔"

"لوگوں کی تو عادت ہوتی ہے باتیں کرنے کی؟"

"جی بالکل ..... لڑکی جب پیدا ہوتی ہے تب باتیں ہوتی ہیں۔ اس کی شادی نہیں ہو رہی ہوتی تب باتیں

سرورق کی شخصیت	
ماڈل	---------- نیناا ور شیزا
میک اپ	---------- روز بیوٹی پارلر
فوٹو گرافر	---------- موسیٰ رضا

کرتے ہیں لوگ' لڑکی جب بیٹیاں پیدا کرتی ہے۔ لڑکا نہیں پیدا کرتی تو باتیں ہو رہی ہوتی ہیں۔ حالانکہ اکیلی لڑکی کا کوئی قصور اور عمل دخل نہیں ہوتا۔ مرد کی قسمت کی اولاد ہوتی ہے' مگر ہمارے معاشرے میں لڑکی کو جینے نہیں دیا جاتا۔"

"اور آخر میں اور کچھ کہنا چاہیں گی اس "بندھن" کے بارے میں؟"

"میں یہ کہوں گی کہ "بندھن" میں بندھنا لڑکی کے لیے ایک بہت ہی مشکل قدم ہوتا ہے۔ نئے لوگوں میں جا کر اپنا مقام بنانا ان کے ماحول میں ڈھلنا' وہاں جا کر برداشت کرنا ماں باپ کی باتیں اتنی بری نہیں لگتیں جتنی سسرال والوں کی لگتی ہیں۔ تو ہر لڑکی کے لیے اپنا مقام بنانا مشکل ہے' لیکن مجھ جیسی حساس لڑکی کے لیے تو بہت ہی زیادہ مشکل ہو گا۔۔۔ میں ہمیشہ کہتی تھی کہ میں اجنبی لوگوں میں نہیں رہ سکتی' تو میرے سسرال کا جو ماحول ہے اور جس طرح وہ میرا خیال رکھتے ہیں مجھ سے پیار کرتے ہیں تو میرا خیال ہے کہ میں بھی اپنا مقام بنالوں گی۔ قلم کار لوگوں کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ دنیا کے تلخ رویوں پر غور کر سکیں۔ مجھے اگر وہاں ٹینشن بھی ملتی ہے تو میں اپنے قلم کے اندر کھو کر سب کچھ بھول جاؤں گی اور جہاں تک بندھن کی بات ہے تو میں نے جیسا کہ کہا کہ میں چاہتی تھی کہ میرا ہم سفر مجھ سے دس پندرہ سال بڑا ہو جو مجھے گڑیوں کی طرح رکھے۔ مگر شکر ہے کہ میری یہ خواہش ان کے ذریعے سے پوری ہو رہی ہے اور اب میں سوچتی ہوں کہ اگر زعیم کی جگہ کوئی اور ہوتا تو شاید میں اتنی خوش نہ ہوتی اور یہ رشتہ مجھے اتنا خوب صورت نہ لگتا۔"

اور اس کے ساتھ ہی ہم نے نازیہ کنول نازی سے اجازت چاہی اس شکریے کے ساتھ کہ انہوں نے اپنی مصروفیات میں سے ہمیں ٹائم دیا۔

☆

مطالعہ کرتی ہوں اور بس۔
"آج کل کیا مصروفیات ہیں؟"
"دیکھیں مصروفیات تو بہت زیادہ ہیں۔ الحمدو اللہ اور جب تک کوئی کام آن ایر نہ ہو اس کے بارے میں بات کرنا قبل از وقت ہوتا ہے۔ تو جیسے جیسے کام آن ایر ہوتا جائے گا سب کو نظر بھی آتا جائے گا۔"
"او کے۔۔۔ ایک وقت درمیان میں آیا تھا کہ انڈین ڈراموں کا سحر ہر جگہ چھا گیا تھا۔ اب پھر سب نارمل ہو گئے ہیں' وجہ؟"
"وجہ صاف ظاہر ہے کہ ہمارے ڈرامے حقیقت کے بہت قریب ہوتے ہیں' دوسری بات یہ کہ بہت زیادہ طویل نہیں ہوتے۔ سوپ زیادہ سے زیادہ 100 اقساط پر اور سیریل 25' 26 اقساط پر مبنی ہوتے ہیں۔

دستک دستک دستک

شاہین رشید

حنا خواجہ بیات

اس میں کوئی شک نہیں کہ حنا خواجہ بیات ایک اچھی فنکارہ ہیں۔ خوش شکل اسمارٹ اور با اخلاق بھی ہیں' مگر انٹرویو کے لیے آج نہیں کل والی بات تھوڑی پریشان کرتی ہے۔ چونکہ بہت پیار سے بات کرتی ہیں تو شکایت کرنے کو بھی دل نہیں چاہتا۔۔۔ انٹرویو تو ہم کر نہیں سکے' مگر بار بار فون کرنے سے دو چار باتیں ضرور جان چکے ہیں۔
"آپ کا ہر سیریل بہت مقبول ہوتا ہے۔ جیسے "کنکر" ہم سفر' مقدس" "زندگی گلزار ہے اور دیگر کئی تو اس کی کیا وجہ ہے' لیکن پہلے یہ بتائیں کہ آپ کیسی ہیں؟ طبیعت کیسی ہے؟"
"الحمدو للہ بالکل ٹھیک ہوں اور رہی مقبولیت کی بات تو بس یہ اللہ کا کرم ہے' کوئی بھی سیریل سائن کرنے سے پہلے اس کی کہانی اور پھر اپنے کردار کا گہرا

لوگ نئے ڈرامے' نئی کہانیاں دیکھنا چاہتے ہیں۔ طوالت لوگوں کو بے زار کر دیتی ہے اور انڈین ڈرامے سالوں تک چلتے ہیں' ایک تو طوالت بور کرتی ہے پھر کسے فرصت ہے کہ ایک ہی کہانی کے گرد گھومتے رہیں۔"
"یعنی فلمیں انڈین اور ڈرامے پاکستانی۔۔۔"
"بالکل۔۔۔ ایسا ہی ہے۔ فلمیں بہت پسند کی جاتی ہیں انڈیا کی اس میں کوئی شک ہی نہیں ہے۔"
"کہیں پڑھا تھا کہ آپ کو اس فیلڈ میں آنے کے لیے کچھ مشکلات کا سامنا کرنا پڑا؟"
"جی بالکل آپ نے ٹھیک پڑھا۔ میں نے جب اس فیلڈ میں آنے کا ارادہ کیا اور اپنے والدین سے مشورہ کیا تو انہوں نے تو صاف منع کر دیا کہ نہیں آنا کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ جگہ جگہ تمہاری تصاویر ہوں اور لوگ اس پر غلط نگاہ ڈالیں۔ تو میں نے انہیں

یقین دلایا کہ ان شاء اللہ ایسا کچھ نہیں ہوگا۔ تب اجازت ملی۔"

"اس میں تو کوئی شک ہی نہیں کہ آپ نے ہمیشہ سوبر اور ڈیسنٹ کردار کیے ہیں اس لیے بہت پسند کی جاتی ہیں۔"

"جی بہت شکریہ۔"

"جو لڑکیاں آنا چاہیں تو؟"

"ضرور آئیں مگر اپنے امیج کو خراب نہ کریں کوئی ایسا کام بھی نہ کریں کہ والدین کو شرمندگی ہو۔"

"آپ کے میاں صاحب کا تعاون شامل ہے؟"

"بالکل شامل ہے۔ بلکہ بھرپور تعاون شامل ہے اور میں اس فیلڈ میں اگر کامیاب ہوں اور اتنا کام کر رہی ہوں تو انہی کی وجہ سے کر رہی ہوں ورنہ شاید کبھی کبھار ہی نظر آتی.... سوری ریکارڈنگ کے لیے بلاوا آ رہا ہے۔"

"او کے شکریہ.... کبھی انٹرویو کے لیے بھی ضرور ٹائم دیں لوگ آپ کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں۔"

"جی ضرور.... ان شاء اللہ۔"

☼ ☼ ☼

سدرہ بتول

آج کل ہر دوسرے ڈرامے میں نظر آ رہی ہیں خوب صورت خدوخال کی مالک سدرہ بتول کو آپ آج کل "اے زندگی" میں دیکھ رہے ہیں اور "دل کا کیا رنگ کروں" بھی آن ایر ہے۔

"کیا حال ہیں اور کیا مصروفیات ہیں؟"

"جی اللہ کا شکر ہے اور مصروفیات تو ماشاء اللہ کافی ہیں۔ اس لیے تفصیلات رہنے دیں۔"

"جویریہ جلیل جو کہ جویریہ سعود ہیں کے سوپ "یہ زندگی" سے آپ کو شہرت ملی یا سمجھتی ہیں کہ شہرت کا ذریعہ کوئی اور سیریل تھا۔"

"یہ زندگی" نے ہی مجھے شہرت دی اور اس کو دیکھ کر مجھے مزید ڈراموں میں کام کرنے کی آفرز آئیں۔ اس لیے "یہ زندگی" کو ہی میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔"

"اداکاری کی صلاحیت خداداد ہے یا کچھ کہیں سے سیکھا بھی ہے؟"

"اداکاری کی صلاحیت ہوتی تو خداداد ہے مگر پھر کام کر کر کے اس میں نکھار آتا ہے یا پھر آپ کا ڈائریکٹر اچھا ہو تو آپ ان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ تو اللہ کا شکر ہے کہ مجھے شروع سے ہی اچھے لوگ ملے۔"

"مجھے یاد ہے کہ "یہ زندگی" میں آپ نے جنت کا کردار کیا تھا۔ کیسے آمد ہوئی اور یہ کردار آپ کو ملا؟"

"جی آپ بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں۔ مجھے ٹی وی میں کام کرنے کا شوق تو ہمیشہ سے ہی تھا تو جب "یہ زندگی" کے لیے آڈیشنز ہو رہے تھے تو میں نے بھی جا کر آڈیشن دیا اور یوں "جنت" کے کردار کے لیے میرا انتخاب ہوا۔ چونکہ فلمیں اور ڈرامے دیکھ دیکھ کر اور گھر میں پریکٹس کرتی تھی تو شاید اس لیے آڈیشن میں بھی کامیاب ہو گئی۔

"اب تو آپ پھر بھی ڈراموں میں نظر آجاتی ہیں۔

مگر ابتدا میں کبھی کبھار ہی نظر آتی تھیں؟ کیوں؟"

"وجہ یہ تھی کہ ابتدا میں میں اپنی تعلیم پر اپنے آپ کو زیادہ فوکس کیے ہوئے تھی اور پھر یہ بھی نہیں چاہتی تھی کہ ہر کردار کر کے لوگوں کو بور کروں لہٰذا اچھے اور منتخب کردار لیا کرتی تھی۔"

"یہ خیال نہیں آیا کہ پیسہ بہت ہے اس فیلڈ میں کچھ کمالوں؟"

"نہیں جی... پیسے کو کبھی اہمیت نہیں دی۔ ہمیشہ ایسے کرداروں کو اہمیت دی جو مجھے آگے تک لے جائیں تاکہ آپ کی ایک پہچان بن جائے لوگ آپ کو دیکھیں تو یہ ضرور سوچیں کہ یقیناً" اس کا کردار اچھا ہو گا اور سیریل کی کہانی بھی عمدہ ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ آج لوگ میرے ڈراموں کو شوق سے دیکھتے ہیں۔"

"آپ بتا رہی تھیں کہ آڈیشن دیا اور کامیاب ہو گئیں گھر والے خوش ہوئے یا ناراض؟"

"نہیں جی... اللہ کا شکر ہے۔ کسی نے کوئی اعتراض نہیں کیا اور میرے والد میرے سب سے بڑے سپورٹر ہیں' کیونکہ میں ان کی لاڈلی ہوں اور وہ جو کہہ دیں وہی ہوتا ہے۔ انہوں نے مجھے خوشی خوشی اجازت دے دی' اس سے بڑھ کر میرے لیے کچھ نہ تھا۔"

"شہرت کے لیے کیا بہتر ہے۔ ڈرامہ' فلمیں یا پھر کمرشلز؟"

"میں کمرشلز کو کم وقت میں شہرت کا بہترین ذریعہ سمجھتی ہوں'۔ کیونکہ کمرشلز چند سیکنڈ کے ہوتے ہیں اور اتنے زیادہ چلتے ہیں کہ سب کی نظر سے گزرتے ہیں۔ جہاں تک فلموں کی بات ہے تو فلموں میں آنا تو ہر لڑکی کا خواب ہوتا ہے۔"

"آپ کا یہ خواب تو پورا ہو رہا ہے نا؟"

"جی بالکل... الحمدو للہ میں کامران اکبر خان کی ڈائریکشن میں فلم "ہلہ گلہ" کر رہی ہوں اور اس فلم کے سیٹ پہ جن لوگوں نے مجھے دیکھا مزید فلموں کے لیے بک کرنا چاہا' مگر میں نے منع کر دیا' کیونکہ میں چاہتی ہوں کہ پہلے یہ فلم ریلیز ہو جائے اس کے بعد مزید فلموں میں کام کرنے کا سوچوں۔"

"کیا امیدیں ہیں؟ رائٹر کون ہیں؟"

"امیدیں تو بہت اچھی ہیں' کیونکہ یہ ایک ہلکی پھلکی فلم ہو گی اور اس میں میرا کردار بھی یقیناً" لوگوں کو پسند آئے گا۔ اس فلم کی کہانی "راحیلہ مشتاق شاہ" نے لکھی ہے اور اس فلم کے گانے راحت فتح علی' میکا سنگھ اور ممنتی چوہان جن کا تعلق بھارت سے ہے نے گائے ہیں۔"

"لگتا ہے کہ پاکستانی فلموں کا دور واپس آ رہا ہے؟"

"بالکل واپس آ رہا ہے اب تو اچھی فلمیں بن رہی ہیں "نامعلوم افراد" بھی کافی پسند کی گئی... ان شاءاللہ یہ بھی پسند کی جائے گی۔"

"آپ کا رنگ روپ بتاتا ہے کہ آپ شاید پٹھان گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں؟"

ہنستے ہوئے "ہمارے آباؤاجداد کا تعلق ایران سے ہے جہاں سے ہجرت کر کے ہم کوئٹہ آئے میں بھی کوئٹہ میں ہی پیدا ہوئی۔ والد صاحب نے آدھی سے زیادہ زندگی جرمنی میں گزاری' وہ بہت کم عمری میں ہی تعلیم اور جاب کی غرض سے جرمنی چلے گئے تھے۔ چند سال قبل وہ ملازمت کے سلسلے میں کوئٹہ آئے پھر کراچی میں جاب ملی تو ہم سب بھی کراچی آ گئے۔"

"آپ نے کہاں تک پڑھا اور بہن بھائی کتنے ہیں؟"

"میں نے کوئٹہ کے سینٹ جوزف کانونٹ سے میٹرک کیا اور اب میڈیا سائنسز میں ڈگری لینے کا ارادہ ہے۔ ہم تین بہن بھائی ہیں۔ ایک بھائی ایک بہن اور پھر میں' گھر میں چھوٹی ہوں اس لیے لاڈلی ہوں اور مزے کی بات بتاؤں ہم لوگ گھر میں فارسی میں بات کرتے ہیں' مگر اب میری اردو اتنی اچھی ہو گئی ہے کہ کوئی سمجھ ہی نہیں سکتا کہ ہماری مادری زبان فارسی ہے۔"

"سوشل ہیں آپ؟"

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جولائی 2015ء
کے شمارے کی ایک جھلک

- سائرہ رضا کا ہنستا مسکراتا مکمل ناول ''تیرے ہی جیسا ہوں''،
- عمیرہ احمد کا ناول ''آبِ حیات''،
- نمرہ احمد کا مکمل ناول ''نمل''،
- تنزیلہ ریاض کا مکمل ناول ''عہد الست''،
- نایاب جیلانی، آسیہ رزاقی اور فریدہ فرید کے ناولٹ،
- نازیہ جمال، سمیرا افضل، میمونہ صدف اور نور عین کے افسانے،
- ''یادگار عید'' معروف شخصیات سے سروے،
- دل برباد کی ہانیہ ''مریم انصاری'' سے باتیں،
- کرن کرن روشنی، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں عدنان کے مشورے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا جولائی 2015 کا شمارہ آج ہی خریدلیں۔

"زیادہ نہیں بس اپنی فیملی کے ساتھ وقت گزارنا زیادہ اچھا لگتا ہے۔"

"ہوں گڈ... چلیں سدرہ ان شاء اللہ پھر آپ سے بات ہوگی جلدی؟"

"ان شاء اللہ۔"

☼ ☼ ☼
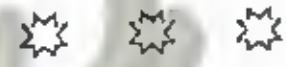
شہزاد شیخ

"کیا حال ہے؟"

"اللہ کا کرم ہے۔"

"سنا ہے آپ بھی فلم میں کام کر رہے ہیں؟ دیس کی یا پردیس کی۔"

"جی الحمدو للہ... دیس کی فلم ہے "کراچی سے لاہور"

"کچھ بتائیں گے اس بارے میں؟"

"جی بالکل، اس کی کہانی ایک مڈل کلاس لڑکے کے گرد گھومتی ہے جو اونچے اونچے خواب دیکھتا ہے اور ان خوابوں کی تعبیر چاہتا ہے۔ اب یہ فلم دیکھ کر ہی پتا چلے گا کہ اس کے خواب سچ ہوئے یا نہیں۔"

"آپ نے ایک ایڈور ٹائزنگ ایجنسی میں کام بھی کیا ہے تو اداکاری بہتر ہے یا جاب؟"

"میرے خیال سے اداکاری زیادہ بہتر ہے۔ میں نے کچھ عرصہ ایڈور ٹائزنگ ایجنسی میں کام کیا لیکن مجھے مزہ نہیں آیا تو چھوڑ دیا۔"

"اور پھر ملک سے باہر چلے گئے؟"

"جی ہاں کیونکہ مجھے اداکاری کا بہت شوق ہے بلکہ اگر آپ جنون کہیں تو زیادہ بہتر ہو گا۔ تو اپنے اس جنون کی وجہ سے نیویارک گیا جہاں سے میں نے فلم میکنگ کورس کیا۔"

"اچھا! تو ڈائریکشن میں بھی آنے کا ارادہ ہے؟"

"جی جی... بالکل، ان شاء اللہ جلد ہی ڈائریکشن کی طرف بھی آؤں گا۔"

"چلیں جی... اللہ آپ کو بہت ترقی دے... آمین۔"

رخسانہ نگار عدنان

ایک تھی مثال

عدیل اور فوزیہ نسیم بیگم کے بچے ہیں۔ بشریٰ ان کی بہو ہے اور ذکیہ بیگم کی بیٹی ہے۔ عمران بشریٰ کا بھائی ہے۔ مثال ذکیہ بیگم کی نواسی اور نسیم بیگم کی پوتی ہے۔ بشریٰ اور نسیم بیگم میں روایتی ساس بہو کا تعلق ہے۔ پانچ سال کی مسلسل کوششوں کے بعد بشریٰ کی نند فوزیہ کا بالآخر ایک جگہ رشتہ طے پاجاتا ہے۔ نکاح والے روز بشریٰ دولہا ظہیر کو دیکھ کر چونک جاتی ہے۔ عدیل سے شادی سے قبل ظہیر کا بشریٰ کے لیے بھی رشتہ آیا تھا مگر بات نہ بن سکی تھی۔ نکاح والے دن فوزیہ کی ساس زاہدہ اور ذکیہ بیگم بھی ایک دوسرے کو پہچان لیتی ہیں۔ بعد ازاں عدیل کو بھی پتا چل جاتا ہے۔ وہ ناراض ہوتا ہے مگر فوزیہ اور نسیم بیگم کو بتانے سے منع کردیتا ہے۔ بشریٰ اور عدیل ایک ہفتے کے لیے اسلام آباد جاتے ہیں۔ وہاں انہیں پتا چلتا ہے کہ بشریٰ کے ہاں سات سال بعد پھر خوش خبری ہے۔

عفان اور عاصمہ اپنے تین بچوں اور والد کے ساتھ کرائے کے گھر میں رہتے ہیں۔ عفان کے والد فاروق صاحب سرکاری نوکری سے ریٹائر ہوئے ہیں۔ گریجویٹی اور گاؤں کی زمین فروخت کرکے وہ اپنا گھر خریدنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈیڑھ کروڑ میں زمین کا سودا کرکے وہ عفان کے ساتھ خوشی خوشی شہر آرہے ہوتے ہیں کہ ڈکیتی کی واردات میں قتل ہوجاتے ہیں۔ عفان کے قریبی دوست زبیر کی مدد سے عاصمہ عفان کے آفس سے تین لاکھ روپے اور فاروق صاحب کی گریجویٹی سے سات لاکھ روپے وصول کرپاتی ہے۔ زبیر گھر خریدنے میں بھی عاصمہ کی مدد کررہا ہے۔

اسلام آباد سے واپسی پر عدیل دونوں مقتولین کو دیکھتا ہے۔ زاہدہ، نسیم بیگم سے بیس لاکھ روپے سے مشروط فوزیہ کی رخصتی کی بات کرتی ہیں۔ وہ سب پریشان ہوجاتے ہیں۔ عدیل بشریٰ سے ذکیہ بیگم سے تین لاکھ روپے لانے کو کہتا ہے۔

عاصمہ کی مجبوری ہے کہ گھر میں کوئی مرد نہیں۔ اس کا بیٹا ابھی چھوٹا ہے اور سارے کام اس نے خود کرنے ہیں۔ وہ جلد از جلد اپنا گھر خریدنا چاہتی ہے۔ عاصمہ کے کہنے پر زبیر کسی مفتی سے فتویٰ لے کر آجاتا ہے کہ دوران عدت، انتہائی ضرورت کے پیش نظر گھر سے نکل سکتی ہے بشرطیکہ مغرب سے پہلے واپس گھر آجائے، سو وہ عاصمہ کو مکان دکھانے لے

جاتا ہے۔ اور موقع سے فائدہ اٹھا کر اسے اپنی ہوس کا نشانہ بناتا ہے اور ویرانے میں چھوڑ کر فرار ہو جاتا ہے۔ وہاں سے وہ عدیل کی مدد سے گھر پہنچ پاتی ہے۔

رقم مہیا نہ ہونے کی صورت میں فوزیہ کو طلاق ہو جاتی ہے۔ نسیم بیگم جذباتی ہو کر بہو اور اس کے گھر والوں کو مورد الزام ٹھہرانے لگتی ہیں۔ اسی بات پر عدیل اور بشریٰ کے درمیان خوب جھگڑا ہوتا ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو دھکا دیتا ہے۔ اس کا ابارشن ہو جاتا ہے۔ عدیل شرمندہ ہو کر معافی مانگتا ہے مگر وہ ہنوز ناراض رہتی ہے اور اسپتال سے اپنی ماں کے گھر چلی جاتی ہے۔ اسی اسپتال میں عدیل عاصمہ کو دیکھتا ہے جسے بے ہوشی کی حالت میں لایا گیا ہوتا ہے۔ عاصمہ اپنے حالات سے تنگ آکر خودکشی کی کوشش کرتی ہے تاہم بچ جاتی ہے۔ نو سال بعد عاصمہ کا بھائی ہاشم پریشان ہو کر پاکستان آجاتا ہے۔ عاصمہ کے سارے معاملات دیکھتے ہوئے ہاشم کو پتا چلتا ہے کہ زبیر نے ہر جگہ فراڈ کر کے اس کے سارے راستے بند کر دیے ہیں اور اب مفرور ہے۔ بہت کوششوں کے بعد ہاشم، عاصمہ کو ایک مکان دلایا تا ہے۔

بشریٰ اپنی واپسی الگ گھر سے مشروط کر دیتی ہے۔ دوسری صورت میں وہ علیحدگی کے لیے تیار ہے۔ عدیل مکان کا اوپر والا پورشن بشریٰ کے لیے سیٹ کروا دیتا ہے بشریٰ کے آنے کے بعد بشریٰ کو مجبور کرتا ہے کہ وہ فوزیہ کے لیے عمران کا رشتہ لائے۔ نسیم بیگم اور عمران کسی طور نہیں مانتے۔ عدیل اپنی بات نہ مانے جانے پر بشریٰ سے جھگڑتا ہے۔ بشریٰ بھی ہٹ دھرمی کا مظاہرہ کرتی ہے۔ عدیل طیش میں بشریٰ کو طلاق دے دیتا ہے اور مثال کو چھین لیتا ہے۔ مثال بیمار پڑ جاتی ہے۔ بشریٰ بھی حواس کھو دیتی ہے۔ عمران بہن کی حالت دیکھ کر مثال کو عدیل سے چھین کر لے آتا ہے۔ عدیل، عمران پر اغوا کا پرچا کٹوا دیتا ہے۔

عاصمہ اسکول میں ملازمت کر لیتی ہے مگر گھریلو مسائل کی وجہ سے آئے دن چھٹیاں کرنے کی وجہ سے ملازمت چلی جاتی ہے۔

انسپکٹر طارق دونوں فریقین کو سمجھا بجھا کر مصالحت پر آمادہ کرتے ہیں۔ ذکیہ بیگم کی خواہش ہے کہ عدیل، مثال کو لے جائے، تاکہ وہ بشریٰ کی کہیں اور شادی کر سکیں۔ دوسری طرف نسیم بیگم بھی ایسا ہی سوچے بیٹھی ہیں۔ فوزیہ کی اچانک شادی کے بعد نسیم بیگم کو اپنی جلد بازی پر پچھتاوا ہونے لگتا ہے۔ انسپکٹر طارق، ذکیہ بیگم سے بشریٰ کا رشتہ مانگتے ہیں۔ ذکیہ بیگم

خوش ہو جاتی ہیں، مگر بشریٰ کو یہ بات پسند نہیں آتی۔

وہ گرین کارڈ کے لالچ میں بشریٰ سے منگنی توڑ کر نازیہ بھٹی سے شادی کر لیتا ہے، پھر شادی کے ناکام ہو جانے پر ایک بیٹے سیفی کے ساتھ ایک طویل عرصے بعد دوبارہ اپنی چچی ذکیہ بیگم کے پاس آجاتا ہے اور ایک بار پھر بشریٰ سے شادی کا خواہش مند ہوتا ہے۔ بشریٰ تذبذب کا شکار ہو جاتی ہے۔

بشریٰ اور احسن کمال کی شادی کے بعد عدیل مستقل طور پر مثال کو اپنے ساتھ رکھنے کا دعوا کرتا ہے مگر بشریٰ قطعی نہیں نتی، پھر احسن کمال کے مشورے پر دونوں بمشکل راضی ہو جاتے ہیں کہ مہینے کے ابتدائی پندرہ دنوں میں مثال، بشریٰ کے س رہے گی اور بقیہ پندرہ دن عدیل کے پاس۔ گھر کے حالات اور نسیم بیگم کے اصرار پر بالآخر عدیل عفت سے شادی کر لیتا ہے۔ والدین کی شادی کے بعد مثال دونوں گھروں کے درمیان گھن چکر بن جاتی ہے۔ بشریٰ کے گھر میں سیفی اور احسن اس کے ساتھ کچھ اچھا برتاؤ نہیں کرتے اور عدیل کے گھر میں اس کی دوسری بیوی عفت۔ مثال کے لیے مزید زمین تنگ۔ بشریٰ اور عدیل کے نئے بچوں کی پیدائش کے بعد پڑ جاتی ہے۔ مثال اپنا اعتماد کھو بیٹھتی ہے۔ احسن کمال اپنی فیملی کو لے کر ملائیشیا چلا جاتا ہے اور مثال کو تاریخ سے پہلے عدیل کے گھر بھجوا دیتا ہے۔ دوسری طرف عدیل اپنی بیوی بچوں کے مجبور کرنے پر مثال کے آنے سے قبل اسلام آباد چلا جاتا ہے۔ مثال مشکل میں گھر جاتی ہے۔ پریشانی کی حالت میں اسے ایک نشئی تنگ کرنے لگتا ہے تو عاصمہ آکر اسے بچاتی ہے۔ پھر اپنے گھر لے جاتی ہے۔ جہاں سے مثال اپنے ماموں عمران کو فون کر کے بلواتی ہے اور اس کے گھر چلی جاتی ہے۔

عاصمہ کے حالات بہتر ہو جاتے ہیں۔ وہ نسبتاً "پوش ایریا" میں گھر لے لیتی ہے۔ اس کا کوچنگ سینٹر خوب ترقی کر جاتا

ہے۔ مثال ' واثق کی نظروں میں آچکی ہے تاہم دونوں ایک دوسرے سے واقف نہیں ہیں۔

عاصمہ کا بھائی ہاشم ایک طویل عرصے بعد پاکستان لوٹ آتا ہے اور آتے ہی عاصمہ کی بیٹیوں اریشہ اور اریبہ کو اپنے بیٹوں بو قار ' وقاص کے لیے مانگ لیتا ہے۔ عاصمہ اور واثق بہت خوش ہوتے ہیں۔

سیفی ' مثال پر بری نیت سے حملہ کرتا ہے تاہم مثال کی چیخوں سے سب وہاں پہنچ جاتے ہیں۔ سیفی الٹا مثال پر الزام لگاتا ہے کہ وہ اسے بہکا رہی تھی۔ احسن کمال بیٹے کی بات پر یقین کرلیتا ہے۔ مثال اور بشریٰ مجبور اور بے بسی سے کچھ کہہ نہیں پاتیں۔ احسن کمال پوری فیملی سمیت دوسرے ملک میں شفٹ ہوجاتا ہے۔ بشریٰ مثال کو مستقل عدیل کے گھر چھوڑ جاتی ہے۔ جہاں عفت اور پریشے اسے خاطر میں نہیں لاتیں۔ واثق کو بہت اچھی نوکری مل جاتی ہے۔ مثال اور واثق کے درمیان ان کہا سا تعلق بن جاتا ہے۔ مگر مثال کی طرف سے دوستی اور محبت کا کوئی واضح اظہار نہیں ہے۔ واثق البتہ کھل کر اپنے جذبات کا اظہار کرچکا ہے۔ واثق ' عاصمہ سے اپنی کیفیت بیان کردیتا ہے۔ عاصمہ خوش ہوجاتی ہے مگر غائبانہ ذکر پر بھی مثال کو پہچان نہیں پاتی۔ واثق عاصمہ کو لے کر مثال کے گھر ملنے جاتا ہے۔ مگر دروازے پر عدیل کو دیکھ کر عاصمہ کو برسوں پرانی رات یاد آجاتی ہے۔ جب زبیر نے عاصمہ کی عصمت دری کرکے اسے ویرانے میں چھوڑ دیا تھا اور عدیل نے عاصمہ کو گھر پہنچایا تھا۔ اگرچہ عدیل نے اس وقت بھی نہیں سمجھا تھا کہ عاصمہ پر کیا بیتی ہے اور اب بھی اس نے عاصمہ کو نہیں پہچانا تھا مگر عاصمہ کو عدیل بھی یاد تھا اور اپنے ساتھ ہونے والا وہ بھیانک حادثہ بھی۔ شرمندگی اور ذلت کے احساس سے عاصمہ کو اچانک اٹیک ہوجاتا ہے۔ واثق دروازے سے ہی ماں کو اسپتال لے جاتا ہے۔ مثال اس کا انتظار کرتی رہ جاتی ہے۔ پھر بہت سارے دن یوں ہی گزر جاتے ہیں۔ ان ہی دنوں عدیل اپنے دوست کے بیٹے فہد سے مثال کا رشتہ طے کردیتا ہے۔ عفت ' مثال کے لیے اتنا بہترین رشتہ دیکھ کر بری طرح جل جاتی ہے۔ اس کی دلی خواہش ہے کہ کسی طرح یہ رشتہ پریشے سے طے ہوجائے۔ مثال بھی اس رشتے پر دل سے خوش نہیں ہے۔ مگر وہ اپنی کیفیت سمجھ نہیں پارہی۔ عاصمہ کی طبیعت ذرا سنبھلتی ہے تو وہ مثال کی طرف جانے کا ارادہ کرتا ہے۔ اتفاق سے اسی دن مثال کی فہد سے منگنی کی تقریب ہو رہی ہوتی ہے۔ وہیں کھڑے کھڑے واثق کی ملاقات پریشے سے ہوجاتی ہے جو کافی ناز و ادا سے واثق سے بات کرتی ہے اور اس بات سے بے خبر ہوتی ہے کہ اس کی کلاس فیلو وردہ جو اسے بہت پسند کرتی ہے ' واثق کی بہن ہے۔ منگنی کے بعد مثال ایک دم شادی سے انکار کردیتی ہے۔ عفت خوش ہوجاتی ہے۔ عدیل بہت غصہ کرتا ہے اور بشریٰ کو فون کرکے مثال کو بھیجنے کی بات کرتا ہے۔ گھر میں ٹینشن پھیلی ہے۔ اسی ٹینشن میں مثال کالج کی لائبریری میں واثق سے ملتی ہے۔ واپسی میں عفت اسے واثق کے ساتھ دیکھ لیتی ہے اور عدیل کو بتادیتی ہے۔ عدیل ازحد پریشان ہوجاتا ہے۔ پریشے ' وردہ سے ملنے اس کے گھر جاتی ہے تو واثق سے ملاقات ہوجاتی ہے۔

۲۷ ستائیسویں قسط

"کیا کہہ رہی ہو یہ تم وردہ!" عاصمہ کے لیے وردہ کا جملہ ہی کسی بم دھماکے سے کم نہیں تھا ' واثق کے بارے میں وہ کچھ بھی ایسا ویسا ' کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کجا وردہ کے منہ سے ایسی بات۔

"جانتی ہو تم نے کیا کہا ہے ابھی؟"

اس بار وہ کڑے لہجے میں پوچھ رہی تھی۔

"واثق ٹھیک کہتا ہے ' وردہ دن بدن آؤٹ اسپوکن (منہ پھٹ) ہوتی جارہی ہے جو اس کے منہ میں آتا ہے بول دیتی ہے مجھے اب اس کے ساتھ تھوڑی سختی کرنا چاہیے۔" وردہ کی خاموشی کے دوران وہ فیصلہ کرچکی تھی۔

"امی! پری ۔۔۔ ہماری غیر موجودگی کی وجہ سے یہاں رکنا نہیں چاہ رہی تھی۔" وردہ جیسے بہت حوصلہ جمع کرکے رک رک کر بولی تھی۔

عاصمہ تو مزید کچھ بولنا ہی جیسے بھول گئی۔

"بھائی نے زبردستی اسے یہاں روکنے کی کوشش کی، جس کی وجہ سے وہ تیزی سے یہاں سے جانے کے لیے بھاگی، لیکن بھائی نے اسے زبردستی... امی! بھائی کو یہ سب نہیں کرنا چاہیے تھا اور کچھ نہیں تو میرا خیال ہی کر لیتے۔" کہہ کر وہ جیسے ضبط ہی کھو بیٹھی دونوں ہاتھوں میں منہ چھپائے سسک سسک کر رونے لگی۔ اور عاصمہ تو جیسے پتھر کی ہو کر رہ گئی تھی۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ کبھی بھی نہیں، میرا دل نہیں مانتا۔" وہ بس روتی ہوئی دردہ کو دیکھ کر صرف یہی سوچے جا رہی تھی۔

"واثق کبھی ایسا نہیں کر سکتا۔ اتنی چھوٹی ہے پری تو... دردہ کی ہم عمر ہی تقریباً" ـــــ بلکہ وہ دردہ سے بھی چھوٹی ہے۔ واثق نہ بری نیت کا ہے نہ گندی نظر رکھنے والا تو پھر یہ سب کیسے ہو سکتا ہے۔"

"میں پری سے نظر ملانے کے قابل نہیں رہی امی! اگر اس کے پیرنٹس کو یا اس کے گھر میں کسی کو معلوم ہو جاتا تو آپ سوچیں، کتنی بڑی قیامت آ سکتی تھی۔"

وہ ماں کی گہری خاموشی پر خود ہی چہرہ صاف کر کے بھاری آواز میں بولی۔

"امی! بھائی کو کیا ہو گیا ہے۔ ہم تو خود چاہتے ہیں میں بھی آپ بھی کہ وہ چاہیں تو پری سے شادی کر لیں۔ ہم ان کا پروپوزل لے جاتے ہیں پری کے گھر۔"

عاصمہ بس اسے دیکھتی رہی۔

"سیدھے راستے کے بجائے انہوں نے یہ برا راستہ کیوں اپنایا میں تو خود جیسے اپنی نظروں میں چھوٹی پڑ گئی ہوں امی! جب پری نے مجھے یہ سب کچھ بتایا۔" وہ پھر سے رونے لگی۔

"دردہ!" عاصمہ کے لہجے میں کچھ تھا۔ لمحہ بھر کو دردہ کی سسکیاں تھم سی گئیں۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے۔ تمہاری سہیلی غلط بیانی کر رہی ہو جھوٹ بول رہی ہو۔" عاصمہ جیسے کسی نتیجے پر پہنچتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"امی!" دردہ تو جیسے شاکڈ سی رہ گئی۔

"تمہیں اس پرائی لڑکی کی سچائی پر بھروسا ہے اپنے بھائی پہ جس نے اتنی زندگی تمہارے ساتھ ایک چھت تلے گزاری ہے۔ اس کو تم غلط سمجھ رہی ہو۔"

"امی! کوئی لڑکی اپنے کردار پر خود سے کیچڑ کیوں اچھالے گی۔ آپ جانتی ہیں نا اس کا مطلب تو؟" دردہ کا اگلا سوال بہت چبھتا ہوا تھا۔

"تم نے خود بتایا تھا نا کہ پری بھی واثق کو پسند کرتی ہے۔" عاصمہ رک کر جیسے اسے کچھ یاد دلانے لگی۔ "ہو سکتا ہے اس نے خود پیش قدمی کی ہو جس پر واثق کو غصہ آ گیا ہو اور..."

"نہیں امی! پلیز نہیں پری ایسی نہیں ہے، وہ ایسا کیوں کرے گی بھلا!" دردہ کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا وہ شدید جذباتی ہیجان میں تھی۔

"واثق کو حاصل کرنے کے لیے۔" عاصمہ وہ بول گئی جو شاید عام حالات میں وہ دردہ کے سامنے ایسی کوئی بھی بات کرنے سے پہلے ہزار نہیں تو سو بار تو ضرور سوچتی۔

عاصمہ کو معلوم تھا جوان ہوتی بیٹیوں کے سامنے کس طرح کی بات کرنا چاہیے۔ اور کس طرح کی نہیں، مگر اب سچویشن ایسی تھی کہ دردہ کو آئینے کے دونوں رخ دکھانا ضروری تھے۔

"امی یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں؟" اس کے لہجے میں نہ ماننے والی ضد اور صدمہ تھا۔
"جو تم شاید سوچنا نہیں چاہتیں۔" عاصمہ کا لہجہ' اس کا انداز ٹھنڈا پڑ چکا تھا' اسے کچھ کچھ پری کا معاملہ سمجھ میں آ رہا تھا۔
"فار گاڈ سیک امی! ایسے تو نہیں کہیں۔ وہ ایسا نہیں کر سکتی' میں جانتی ہوں اسے' وہ جتنی بھی کانفیڈینٹ ہو مگر اس طرح کی حرکت نہیں کر سکتی۔ بس میں نہیں جانتی کچھ بھی' آپ پلیز بھائی سے پوچھیں۔ پوچھیں ان سے کہ انہوں نے ایسا کیوں کیا اور اب میں آپ کو بتا دوں۔"
وہ تیز تیز بولتے لحہ بھر کو تھمی تھی۔
"کیا مطلب؟" عاصمہ کو کچھ ناگوار سا احساس ہوا تھا۔
"اب یہ جو سب کچھ ہو گیا ہے اور اس کے ذمہ دار بھائی ہیں تو انہیں ہی اب یہ سب ٹھیک کرنا ہو گا۔"
وہ اسی جوش میں کہہ رہی تھی۔
"کیا کرے وہ' بتاؤ مجھے" اس لڑکی سے ایکسکیوز کرے جا کر؟" عاصمہ کو غصہ سا آ گیا۔
"واثق بھائی کو اب پری سے شادی کرنا پڑے گی۔ میں آپ کو کہہ رہی ہوں۔" وہ شدید جذباتی انداز میں کھڑے ہو کر دھمکانے والے انداز میں بولی۔
عاصمہ کو جیسے زور کا جھٹکا لگا۔ اتنی بڑی بات کی توقع اسے دررہ سے تو کم از کم نہیں تھی۔ وہ بھی اس کے سامنے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔
"تو یہ سب کچھ تمہاری اس دوست نے تمہیں پڑھا کر بھیجا ہے۔ یہ مقصد تھا اس کا۔ اس سارے ڈرامے کا جو وہ حاصل کرنا چاہتی تھی۔" عاصمہ غصہ ضبط کرتے کرتے بھی طیش میں آ چکی تھی۔
"امی! کسی پر کیوں الزام لگا رہی ہیں؟" وہ ماں کے سامنے تن کر کھڑی تھی۔
"میں الزام لگا رہی ہوں۔ الزام تو اس لڑکی نے میرے فرشتوں جیسے بیٹے پر لگایا ہے۔" عاصمہ سمجھ گئی تھی کہ اب اسے دررہ سے کیسے بات کرنا ہے۔
"امی! مت قسمیں کھائیں کسی کی پاک بازی کی۔" اس کا چہرہ غصے میں سرخ ہو رہا تھا۔
"بھائی ہے وہ تمہارا کسی نہیں میں نے جنم دیا ہے اسے' میری آنکھوں کے سامنے پلا بڑھا ہے وہ' اس کی ایک ایک حرکت کی گواہ ہوں میں..... میں اس کی قسم بھی کھا سکتی ہوں اور گواہی بھی دے سکتی ہوں کہ میرا بیٹا ایسا نہیں کر سکتا۔" عاصمہ مضبوط لہجے میں کہہ رہی تھی۔
دررہ کو جیسے توہین کا گہرا احساس ہوا تھا۔ اس کی آنکھوں میں پانی تیرنے لگا۔
"امی!" وہ بس رونے کو تھی۔
"بہتر ہے تم اپنی سوچ کو ٹھیک کرو اور اس سے بھی زیادہ مناسب یہ بات ہو گی کہ آئندہ تم اس لڑکی سے ملنا جلنا چھوڑ دو۔ وہ لڑکی ٹھیک نہیں ہے۔"
وہ حکمیہ انداز میں بولی اگرچہ عاصمہ بچوں سے ایسے کبھی بات نہیں کرتی تھی۔ لیکن اسے لگا یہ ضروری ہے۔ دررہ کے قدموں کو اس بے مہار دوستی میں آگے بڑھنے سے روکنے کے لیے۔
"یہ آپ کہہ رہی ہیں امی!" عاصمہ کو لگا' دررہ جیسے ابھی دھاڑیں مار کر رونے لگے گی۔
"دیکھو دررہ! دوستیوں میں اتنی جذباتیت' اتنی شدت پسندی ٹھیک نہیں ہوتی۔ تم لڑکی ہو' یہ چیز تمہارے لیے کتنی خطرناک ثابت ہو سکتی ہے آگے چل کر' شاید تمہیں اندازہ نہیں۔" اب کے وہ اسے ٹھنڈا کرنے کو ذرا نرمی

سے بولی۔

"اور لڑکوں کے لیے سب ٹھیک ہے۔ وہ کچھ بھی کر گزریں۔ یہ کہنا چاہتی ہیں آپ؟"

دردہ کا لہجہ' اس کا انداز عاصمہ کو ٹھٹکا گیا۔ اس کے لہجے میں خود سری تھی' بغاوت تھی۔

"بس کرو' اب اس معاملے کو ختم کرو' اور کوئی ضرورت نہیں اس پری سے مزید تعلقات جتانے کی۔" وہ اس سے کہتے ہوئے کوفت بھرے انداز میں اندر جانے لگی۔

"امی! اگر پری کی جگہ میں ہوتی اور اس کا بھائی ایسا کچھ کرنے کی کوشش کرتا میرے ساتھ تو پھر بھی آپ یہ ہی کچھ کہتیں۔" وہ پیچھے سے چبھتے ہوئے لہجے میں بولی تھی اور عاصمہ ساکت کھڑی رہ گئی۔

☆ ☆ ☆

مثال اپنے سامنے بشریٰ کے دیے ہوئے کنگن لیے بیٹھی تھی اس کی نظروں کے سامنے پھر پیچھے کی زندگی جیسے کسی فلم کی طرح چلنی شروع ہو گئی تھی۔

"کاش میری شادی کے وقت ماما میرے پاس ہوتیں' وہ بھلے یہاں نہ ہوتیں' اس گھر میں' اس شہر میں تو ہوتیں۔ میں ان سے مل تو سکتی۔ شادی سے پہلے ایک بار جا کر ان کے گلے سے لگ کر جی بھر کر رو تو سکتی۔"

آج کل اس کا جی بہت بھر بھر آ رہا تھا۔

وہ واثق سے ملنے کے لیے جانا چاہتی تھی' لیکن اس نے خود پر زبردستی بند باندھ رکھا تھا۔

"کوئی بھی تو نہیں ہے۔ جس سے میں دل کی بات کر سکوں، جو مجھے سمجھ سکے' میرے درد کو محسوس کر سکے۔"

وہ افسردگی سے کنگن پاؤچ میں ڈال کر واپس رکھنے لگی۔

"پاپا تو صرف اس بات سے خوش ہیں کہ ان کے کندھوں سے یہ بوجھ اُتر رہا ہے۔"

وہ پاؤچ الماری میں رکھ کر آنکھیں صاف کرتے ہوئے مڑی اسے لگا باہر کوئی تھا۔ وہ لمحہ بھر کو ٹھٹکی۔

"عفت ماما ہوں گی لیکن نہیں وہ تو بازار گئی ہیں۔" وہ آہستگی سے باہر ذرا سا نکل کر دیکھنے لگی۔ برآمدے میں کوئی بھی نہیں تھا۔

پری تو کل سے اپنے کمرے سے نہیں نکلی تھی۔ رات کو فنکشن کے بعد وہ سو بھی جلدی گئی تھی' اسی وقت مثال کا فون بج اٹھا۔ اس کا دل زور سے دھڑکا واثق کی کال ہو گی۔ ایسا ہمیشہ ہوتا ہے' میں جب بھی اسے مس کرتی ہوں۔ اس کا فون ضرور آتا ہے۔ وہ تیزی سے فون کی طرف لپکی کوئی اجنبی نمبر تھا۔ وہ ٹھٹک کر سوچنے لگی۔

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے واثق کسی اور نمبر سے مجھے کال کر رہا ہو۔" اس کے دل نے توجیہہ دی۔ اس نے کچھ سوچ کر کال ریسیو کر لی۔ دوسری طرف سلام کرنے والا لہجہ اور آواز بھی اجنبی تھی۔

"آپ مثال ہیں؟" بھاری آواز میں پوچھا گیا۔

"جی!" وہ رک کر بولی۔

"میں فہد ہوں۔ فہد وقار!"

مثال کے لیے یہ کال غیر متوقع تھی۔ فوری طور پر اس کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا کہ اسے کس طرح سے ردِعمل ظاہر کرنا چاہیے۔

"مثال! آپ سن رہی ہیں نا مجھے۔" اس کی اتنی لمبی چپ پر اسے پوچھنا پڑا۔

"جی!" وہ آہستگی سے بولی۔

''میں آپ سے ملنا چاہتا ہوں۔'' کچھ دیر بعد فہد نے کہا تو وہ بے اختیار پریشان سی ہو گئی۔
''جی!''
''مگر کیوں؟''
''آپ کے خیال میں مجھے کیوں ملنا ہوگا آپ سے۔'' وہ الٹا اس سے پوچھ رہا تھا۔
''مجھے کیسے معلوم ہو سکتی ہے یہ بات۔''
''آپ اندازہ تو لگا سکتی ہیں۔'' دوسری طرف سے فرمائش کی گئی تھی۔
''نہیں۔ مجھے کچھ اندازہ نہیں۔'' وہ قطعیت سے بولی۔
''مجھے آپ سے کچھ ضروری باتیں کرنی ہیں۔'' وہ اس کے انداز پر شاید کچھ بجھ سا گیا تھا۔ محتاط لہجے میں بولا۔
''تو آپ کر لیں' آپ کو جو بات کرنا ہے مجھ سے۔'' وہ سرہلا کر بولی۔
''فون پر نہیں ہو سکتیں وہ باتیں۔'' وہ زور دے کر بولا۔ مثال کچھ بول نہیں سکی۔
''میں جانتا ہوں' ہماری شادی میں اب بمشکل ایک ہفتہ ہے تو ایسے میں ملنا کافی مشکل ہوگا' لیکن میں ایسا چاہتا ہوں۔ آپ آجائیں کسی بھی طرح سے تو میں۔''
''آپ پاپا سے بات کرلیں اگر وہ اجازت دیتے ہیں تو آپ گھر آجائیں' میں آپ کی بات سن لوں گی۔ خدا حافظ۔'' کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔

☼ ☼ ☼

''کل سے دیکھ رہی ہوں' تم نے خود کو کمرے میں بند کر رکھا ہے' کیا مسئلہ ہے تمہارے ساتھ۔'' عفت پری کے کمرے میں آکر اسے لیٹا دیکھ کر پوچھنے لگی۔ پری نے ماں کو آنسو بھری آنکھوں سے دیکھا۔
''آپ کو دوسروں کے مسئلے حل کرنے سے فرصت ملے تو اپنی اولاد کا سوچیں آپ۔'' وہ آنسو ضبط کرتے کڑوے لہجے میں بولی۔
عفت ٹھٹک کر رہ گئی۔
''دانی کے بعد اس لڑکی کا مسئلہ شروع ہونے والا ہے؟'' وہ سوچ کر رہ گئی۔ عفت اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔
''تھکی ہاری آئی ہوں میں مارکیٹ سے' تمہیں اتنا کہا کہ چلو میرے ساتھ اپنے لیے تو شادی کے کوئی کپڑے خرید لو' دن ہی کتنے ہیں اب سلوانے کا بنوانے کا تو ٹائم نہیں ہے۔'' اس بار وہ قدرے نرم لہجے میں بولی تھی۔
''مجھے کچھ نہیں لینا۔'' پری نروٹھے لہجے میں بولی۔ عفت کا جی تو چاہا اسے ایک ہاتھ جڑ دے۔ مگر پھر بعد میں خود ہی منتیں کرنا پڑتیں۔ یہی سوچ کر رک گئی۔
''وجہ بتاؤ گی مجھے اس بے دلی کی؟'' کچھ دیر بعد اپنے غصے پر قابو پا کر کچھ اکتاہٹ سے بولی۔
''دل ہی تو وجہ ہے۔'' پری زیر لب بڑبڑائی' عفت پہلی بار چونکی۔

''کیا کہا تم نے۔'' وہ سیدھی ہو بیٹھی تھی۔
''مجھے نہیں پتا۔'' وہ ماں کے چونکنے پر رخ پھیر کر بولی۔
''بات کرو مجھ سے پری! کیا ہوا ہے تمہارے ساتھ؟'' وہ اسے کندھوں سے پکڑ کر ذرا ترشی سے بولی۔
''کیا ہوگا میرے ساتھ آپ کے خیال میں؟'' وہ اسی بے رخی سے عفت سے پوچھ رہی تھی۔
''تو پھر اس خراب موڈ کی وجہ بتاؤ مجھے' گھر میں اتنے کام ہیں اور نپٹانے والی میں اکیلی اب تم مجھے یوں زچ کرو گی۔''

"تو کیوں کر رہی ہیں غیروں کے کام۔ جس کا کام ہے اس کی ماں تو وہاں مزے سے بیٹھی ہیں' آپ کو سارے زمانے کی تعریفیں سمیٹنے کا شوق ہوا جا رہا ہے۔"

پری تمیزدار اور باادب تو کبھی بھی نہیں رہی تھی 'لیکن آج اس کے لہجے پر عفت کو بہت غصہ آیا۔

"بیٹوں میں اگر کچھ گن نہ بھی ہوں تو بھی ان کے اچھے اخلاق ان کی ساری خامیوں کو چھپا لیتے ہیں۔" اسے پہلی بار اس پتے کی بات کی خبر ہوئی تھی۔

جیسے مثال بھلے وہ بہت خوب صورت نہیں تھی 'بہت سگھڑ' سلیقہ شعار' تیز طرار نہیں تھی لیکن وہ بدتمیز' بدزبان بھی نہیں تھی 'اسی ایک چیز نے عفت جیسی عورت کو بھی مجبوراً" اس کے لیے یہ سب سرورد اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا۔

لیکن یہ پری۔۔۔ اسے تو بات کرنے کی بھی تمیز نہیں۔

"تم اس بات کو چھوڑو' وہ وہاں مزے میں بیٹھی ہے یا اپنی کسی کم بختی میں 'ایسی بدنصیب بھی کوئی ہو گی جسے بیٹی کی خوشیوں میں شامل ہونے کی اجازت ہے نہ حق تو وہاں سے اس کے مزوں کا اندازہ لگالو تم۔" عفت کچھ جتانے والے انداز میں کہہ گئی۔

"تم اس طرح کمرے میں کیوں پڑی ہوئی ہو' آدھے سے زیادہ دن بھی گزر گیا کیا چاہتی ہو۔" وہ اسے آڑے ہاتھوں لیتے ہوئے بول رہی تھی۔

"میرے سر میں درد ہے۔" وہ نروٹھے پن سے بولی۔

"تو چلو پھر ڈاکٹر کے پاس لے جاتی ہوں' اتنا طویل سر کا درد کوئی نہ کوئی وجہ تو ہو گی جب کہ بخار بھی نہیں ہے۔" وہ اس کی کلائی چھو کر بولی۔

"میں ٹھیک ہوں ڈاکٹر کے پاس نہیں جانا مجھے۔" وہ چڑ کر ماں کا ہاتھ پرے کرتے بولی۔

"تو پھر تکلیف بتاؤ اپنی یا پھر تمہارا باپ آ کر پوچھے گا تم سے' اسے کیا وجہ بتاؤ گی 'مثال کی شادی کی جلن؟"

عفت کو واقعی میں پری کی حرکتوں پر اب غصہ آنے لگا تھا وہ اسے سمجھانا چاہ رہی تھی 'مگر پری نے جیسے کچھ بھی نہ سمجھنے کی قسم کھا رکھی تھی۔

"مما!" وہ یک دم غیر متوقع طور پر ہاتھوں میں منہ چھپا کر رونے لگی 'عفت کا سارا غصہ وہیں جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔

"کیا ہوا ہے میری جان پری! کیوں ایسے رونے لگیں 'بتاؤ مجھے' کسی نے کچھ کہا ہے تم سے؟ پری! رونا تو بند کرو۔" وہ اس کے ہاتھ ہٹا کر بے قراری سے پوچھ رہی تھی۔

"میری قسمت بہت خراب ہے مما!" وہ روتے ہوئے یہی کہہ سکی۔

"اللہ نہ کرے میری پری کی قسمت خراب ہو' بتاؤ مجھے کیا ہوا ہے؟" عفت تڑپ کر رہ گئی۔

"جسے میں پسند کرتی ہوں مما! وہ مجھے پسند نہیں کرتا۔" اور عفت جیسے سکتے میں آ گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کیا ہوا شہزاد؟" واثق شہزاد کے آفس میں داخل ہوا اسے آنکھیں صاف کرتا دیکھ کر ایک دم سے چونکا 'شاید وہ رو رہا تھا۔

شہزاد نے رخ پھیر کر نفی میں سر ہلایا۔

"کیا ہوا ہے سب خیریت تو ہے نا؟ کچھ پریشان لگ رہے ہو؟" واثق اس کے پاس کھڑے ہو کر ہمدردی سے بولا

شہزاد چند لمحے جیسے خود کو کمپوز کرتا رہا تھا۔
"میرے فادر ہسپتال میں ہیں واثق!" وہ غم سے بوجھل آواز میں بولا تھا۔
واثق لمحہ بھر کو خاموش ہی رہ گیا۔
پھر اس کے سامنے بیٹھ گیا کہ کیسے اسے تسلی دے' وہ دوست جس نے بڑے کڑے وقت میں اس کا ساتھ دیا تھا۔
"کیا ہوا ہے انہیں؟" وہ بمشکل یہی پوچھ سکا۔
"معلوم نہیں۔" وہ اسی بوجھل لہجے میں پھر سے بولا۔
"کیا مطلب؟ ڈاکٹرز کیا کہتے ہیں ان کے بارے میں۔ کیا ہے انہیں؟" واثق پریشان ہو کر بولا۔
"بس کہتے ہیں' آپ لوگ دعا کریں اللہ ان کی مشکل کو آسان کرے۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
کمرے میں چند لمحوں کے لیے گمبھیر خاموشی چھا گئی۔
"تم جانتے تو ہو' وہ کئی سالوں سے پیرالائز ہیں ہاتھ پاؤں سے معذور' ایک زندہ لاش' وہ خود بھی اپنی زندگی سے تنگ آچکے ہیں' ہر لمحہ موت کی دعا کرتے رہتے ہیں۔ ہر آنے جانے والے کہتے ہیں کہ وہ اس کے لیے موت کی دعا کرے مگر۔۔۔ یہ بھی حکم ربی ہوتا ہے' ان کے سانسیں چل رہی ہیں بغیر حکم کیسے بند ہو سکتی ہیں۔" وہ آنسو ضبط کرتا خاموش ہو گیا۔
"اور اب ہسپتال! طبیعت زیادہ خراب ہو گئی تھی کیا؟" واثق یہی پوچھ سکا۔
شہزاد نے اثبات میں سر ہلا دیا۔
"ہارٹ پرابلم بھی ہو گئی ہے' کڈنی کا مسئلہ بھی ہے بہت ساری چیزیں مل گئی ہیں' مگر ان کی حالت مجھ سے نہیں دیکھی جا رہی۔" وہ خود پر ضبط کر رہا تھا۔
پھر ایک دم سے کھڑا ہو گیا اور چابیاں اور موبائل اٹھا کر جانے لگا۔
"واثق یار! تم دیکھ لو گے نا یہاں سب کچھ؟ مجھے ہسپتال جانا ہے۔"
"آف کورس یار! تم بے فکر ہو کر جاؤ میں دیکھ لوں گا۔"
واثق سر ہلا کر نرم لہجے میں بولا۔
"آج بابا کے کچھ بہت ضروری ٹیسٹ بھی ہونے ہیں' کچھ کنڈیشن بہتر ہوئی تو شاید ایک دو دن میں ڈسچارج کر دیں انہیں۔" وہ گہرے دکھ میں تھا۔
"اللہ کرے ایسا ہی ہو اور ان شاء اللہ ہو گا۔ وہ ٹھیک ہو جائیں گے۔ تم ان کا خیال جو رکھ رہے ہو۔" واثق اسے تسلی دیتے ہوئے بولا۔
"ہوں بس دعا کرنا وہ اس اذیت سے نکل سکیں اب مجھے چلنا چاہیے' فون پر تم سے کانٹیکٹ رکھوں گا اگر کوئی مسئلہ ہو تو مجھے کال کر لینا۔"

وہ کہہ کر تھکے ہوئے قدموں سے باہر نکل گیا۔ واثق اسے جاتا دیکھتا رہا۔
"اللہ اپنے وجود کا احساس ہر جگہ دلاتا ہے۔ اگر دیکھنے والی آنکھ اور محسوس کرنے والی حس ہو۔ پیسے' دولت کی فراوانی کے باوجود دلی سکون اور خوشی صرف اللہ کے اختیار میں ہے۔ اللہ انکل کو صحت عطا کرے یا جس طرح بھی ان کی تکلیف میں کمی ہو سکے۔"
وہ سوچتا ہوا باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"مجھے فوراً" اس لڑکی سے جا کر بات کرنا چاہیے۔" عاصمہ کچن میں کام کے دوران عجیب سوچوں میں الجھی ہوئی تھی۔
"وہ مجھے اب کچھ نہیں بتائے گی۔" وہ رک گئی "مگر مجھے اس کی نیت' اس کے ارادے کا اندازہ تو ہو ہی جائے گا۔"
واثق ایسا کر سکتا ہے اس بات کا یقین کیا ذرا سا گمان ابھی بھی اسے نہیں تھا۔ مگر وہ جس طرح یہ سب بول کر گئی تھی اور اس کی آخری بات عاصمہ جیسے بل کر رہ گئی تھی۔ اس کی اپنی بیٹی اگر پری کی جگہ ہوتی... وہ مر کر بھی ایسا نہیں سوچ سکتی تھی۔
"کیا کروں؟" وہ سر پکڑ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔
"مجھے واثق سے بات کرنا چاہیے۔ اس سے کھل کر پوچھنا چاہیے ورنہ یہ معاملہ سلجھنے کے بجائے مزید الجھتا جائے گا' وہ نے اگر واثق کو کچھ ایسا ویسا بول دیا تو وہ بھی یہ برداشت نہیں کر پائے گا۔"
وہ سر پکڑے گہری سوچ میں گم تھی۔
اسے کچھ دیر بعد احساس ہوا کہ وہ کچن میں چولہے پر دودھ رکھے ہوئے تھی جو ابل رہا تھا۔

☆ ☆ ☆
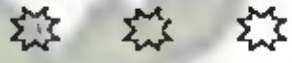
عدیل کی گاڑی بیچ رستے میں خراب ہوئی تھی۔
شام گہری ہو چکی تھی۔
یہ سڑک کچھ ہٹ کر تھی یہاں ٹریفک کا انتا رش بھی نہیں تھا۔
گاڑی چلتے چلتے بند ہوئی تھی' عدیل بونٹ کھولے اس کا نقص تلاش کرنے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ جب کہ اسے بھی جلدی پہنچنا تھا۔
"مے آئی ہیلپ یو سر!" واثق کی گاڑی کب اس کے پاس آ کر رکی تھی' اور کب وہ اس سے اتر کر یہاں تک آیا تھا۔ عدیل اپنی سوچوں میں محو جان نہیں سکا تھا۔
عدیل نے چونک کر اسے دیکھا۔
اور پھر کچھ بے بسی سے بند گاڑی کی طرف اور پھر پیچھے ہٹ کر کھڑا ہو گیا۔
واثق جھک کر بونٹ کو پکڑ کر گاڑی کا نقص تلاش کرنے لگا۔
"پہلے بھی یہ اسی طرح رکتی رہی ہے۔"
"دو ایک بار ایسا ہو چکا ہے۔"

"مجھے لگتا ہے بیٹری کی لائف پوری ہو چکی ہے جس کی وجہ سے اس نے چلنے سے انکار کر دیا ہے۔" وہ کچھ دیر بعد سر اٹھا کر بولا۔
"ہاں کافی ٹائم سے میں سوچ رہا تھا مگر ایک تو وقت نہیں مل سکا' دوسرے مجھے لگ رہا تھا ابھی یہ کچھ ٹائم نکال لے گی۔"
عدیل کو اپنی سستی پر کچھ غصہ آنے لگا تھا۔
شادی کے دنوں میں گاڑی کی جتنی ضرورت تھی اب اتنی ہی پریشانی ہو گی۔
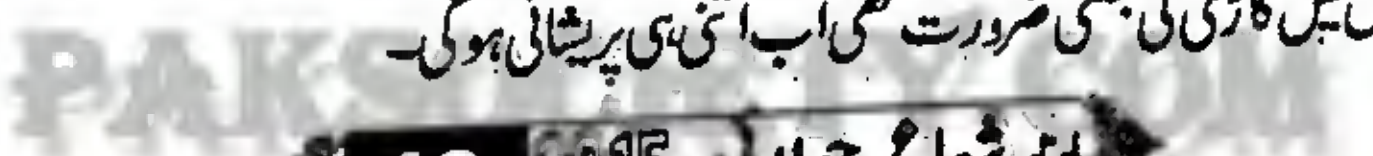
"میں مکینک کو کال کر دیتا ہوں' وہ آکر چیک کرلے گا ورک شاپ لے جانا پڑے گا اسے۔" واثق نے بونٹ بند کرتے ہوئے کہا۔
"ہوں یہی کرنا پڑے گا' اب۔" عدیل سیل فون نکالنے لگا۔
"میرا بڑا اچھا واقف ہے ادھر قریب ہی اس کا ورک شاپ ہے میں اسے کال کر دیتا ہوں' وہ آکر چیک کر لیتا ہے۔" واثق نے آفر کی عدیل کو اثبات میں سر ہلانا پڑا۔
کچھ دیر میں مکینک آکر گاڑی چیک کرتے ہوئے اسے ورکشاپ لے گیا۔
"آیئے میں آپ کو ڈراپ کر دوں گا انکل!" عدیل جو ٹیکسی کی تلاش میں کھڑا تھا۔ باثق اس کے پاس آکر نرمی سے بولا۔
"یوں بھی ہمارا راستہ تو ایک ہی ہے۔" اس کی بات پر عدیل نے اسی چونک کر دیکھا۔
"پلیز انکل آیئے!" اس کے اصرار پر عدیل خاموشی سے گاڑی میں بیٹھ گیا۔
"کچھ دیر کے لیے اندر نہیں آؤ گے چائے کے ایک کپ کے لیے۔"
گھر کے آگے اترتے ہوئے عدیل نے کچھ اپنائیت بھرے لہجے میں آفر کی تھی۔
"شکریہ انکل! آج نہیں ان شاء اللہ پھر کبھی سہی۔ ابھی تو میں لیٹ ہو رہا ہوں' آپ نے لطیف مکینک کا کارڈ رکھ لیا ہے نا' وہ گھنٹے بھر میں گاڑی اوکے کر دے گا۔"
"ہاں کارڈ تو میرے پاس ہے میں اس سے پوچھ لوں گا فون کر کے۔"
"اگر آپ مائنڈ نہیں کریں تو میں آپ کو لے جاؤں گا ورکشاپ؟" وہ کچھ۔۔۔ جھجکتے ہوئے آفر کر کے بولا۔
عدیل لحہ بھر کو چپ ہو گیا۔
بات تو ٹھیک تھی یہاں سے ٹیکسی لے کر جانا پھر کچھ دیر میں شام کافی ہو جاتی دوسرے ورکشاپ والا واثق کا جاننے والا تھا وہ یقیناً کچھ رعایت بھی کروا لیتا۔
"آپ کو زحمت ہو گی بیٹا!" وہ کچھ تکلف سے بولا۔
"نہیں انکل! بالکل بھی نہیں۔ میں آجاؤں گا۔ آپ مجھے کال کر دیجئے گا' یا میں خود سے آجاتا ہوں گھنٹے بعد۔"
"شکریہ بیٹا بہت۔"
عدیل سر ہلا کر اندر چلا گیا' واثق گاڑی لے گیا۔
"پاپا آپ!" مشال جو الماری میں کپڑے سیٹ کر رہی تھی' کپڑے لینے کے لیے مڑی تو دروازے میں کھڑے عدیل کو دیکھ کر چونک گئی۔
"مشال! کیا ہو رہا تھا؟" عدیل نے جیسے کچھ اور کہتے کہتے جملہ بدل دیا۔
"یہ بس کپڑے ہی رکھ رہی تھی۔"
"ہوں.... تم تیار ہو جاؤ ذرا...." وہ پھر کچھ رک کر بولا۔
"جی!" وہ چونکی۔
"کہیں جانا ہے پاپا؟"
"ہاں' وہ کچھ دیر میں فہد تمہیں ---- لینے کے لیے آرہا ہے' وہ تم سے کچھ بات کرنا چاہتا ہے۔ اس نے مجھے کال کر کے کہا تھا تو میں نے اجازت دے دی۔ تم تیار ہو جاؤ۔"
عدیل نے جلدی جلدی بات ختم کی کہ کہیں اس دوران مشال کوئی سوال نہ کر دے۔

"پاپا مگر... میں کیسے جا سکتی ہوں آئی مین!" وہ متذبذب سی اپنا مدعا سمجھا نہیں سکی۔
"زیادہ وقت نہیں رکنا پڑے گا' وہ ادھر آزاد ماحول کا پلا بڑھا ہے' پھر وہیں سیٹل ہے تو ہو سکتا ہے اسے لگا ہو کہ وہ تم سے مل لے تھوڑا مزاج کا پتا چل جاتا ہے۔ وہ آتا ہی ہو گا تم ریڈی ہو جاؤ۔"
وہ کہہ کر تیزی سے مڑا اور پیچھے کھڑی عفت کو دیکھ کر لحہ بھر کے لیے ٹھٹک گیا۔
"انسان وقت کے ساتھ کتنا بدل جاتا ہے عدیل!" وہ کچھ طنز بھرے لہجے میں بولی۔
"بدل نہیں جاتا اسے حالات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھالنا پڑتا ہے۔ یہ ضرور ہوتا ہے عفت خلاف توقع عدیل نرم لہجے میں بولا تھا۔
"پھر بچیوں کے معاملات ایسے ہوتے ہیں کہ آپ کو لچک دکھانی ہی ہوتی ہے۔" وہ خود ہی وجہ بیان کرنے لگا۔
"اچھی بات ہے اگر آپ کو یہ بات سمجھ میں آگئی ہے تو۔"
وہ پھر اسی لہجے میں بولی شاید وہ پری کے لیے ایسے ہی کسی آنے والے وقت کے لیے عدیل کو تیار کر رہی تھی۔
"فہد اچھا لڑکا ہے پڑھا لکھا' مہذب' سمجھ دار اس نے مثال سے ملنے کی خواہش یوں ہی نہیں ظاہر کی۔"
وہ پھر سے جیسے صفائی دینے والے انداز میں کہہ رہا تھا۔
عفت خاموش رہی' وہ اندر چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"ہسپتال!" عاصمہ نے چونک کر واثق کو دیکھا۔
"ہاں میں وہیں سے آرہا ہوں۔" وہ تھکن بھرے انداز میں جوتے اتارتے ہوئے بولا۔
"کل آپ بھی ذرا میرے ساتھ چلیے گا۔ شہزاد کے پاپا کی حالت واقعی اچھی نہیں۔" وہ افسردگی سے بولا۔
"اوہ کیا ہوا انہیں؟" عاصمہ کو افسوس ہوا۔
"بتایا تو تھا آپ کو' پیرالائز ہیں وہ کافی سالوں سے' مگر اب کچھ زیادہ طبیعت بگڑنے پر ہسپتال ایڈمٹ کروا دیا گیا ہے۔" وہ تھک کر صوفے پر ہی نیم دراز ہو گیا۔
"اللہ رحم کرے' صحت عطا فرمائے۔" عاصمہ افسوس سے بولی۔
"اتنی حالت خراب ہے' کوئی بھی رپورٹ ان کی تسلی بخش نہیں آرہی۔ اس کے باوجود ان کی ذہنی حالت بالکل ٹھیک ہے بہت ترس آیا مجھے تو ان پر' بس روتے رہتے ہیں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہتے ہیں۔"
عاصمہ خاموش سی ہو گئی۔
"شہزاد بہت پریشان ہے۔ آج تو سارا دن وہ آفس بھی نہیں آیا۔"
"ظاہر ہے بیٹا! یہ کم دکھ کی بات تو نہیں۔"
"باپ ہسپتال میں ہو تو بیٹا کوئی بھی کام ڈھنگ سے نہیں کر سکتا۔" عاصمہ گہرا سانس لے کر بولی۔
"تو آپ کل چلیں گی میرے ساتھ امی؟"
"دیکھوں گی مجھے کل ایک اہم جگہ اور بھی جانا ہے۔" وہ جیسے خود سے بولی تھی۔
"کہاں جانا ہے آپ کو کل؟" وہ چونک کر بولا۔
"کہیں نہیں' میں چلوں گی تمہارے ساتھ۔" وہ بات ٹال کر بولی۔
"وردہ کہاں ہے امی؟" وہ اندر جاتے ہوئے رک کر بولا۔ گھر کی خاموشی نے اسے یہ پوچھنے پر اکسایا تھا۔

"سو رہی ہے کیا؟"

"ہاں شاید پہلے پڑھ رہی تھی پھر کہنے لگی کہ سر میں درد ہے۔ پین کلر لے کر سو گئی ہے۔" عاصمہ نظریں چرا کر بولی۔

"سر میں کیوں درد ہے اس کے؟" واثق تشویش سے بولا۔

"یونہی شاید پڑھنے سے۔" عاصمہ سرسری لہجے میں بولی۔

"امی!" وہ اس کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔

"آپ مجھ سے کچھ چھپا رہی ہیں۔" وہ ہمیشہ اسی طرح سے عاصمہ کے دل کی بات بوجھ لیا کرتا تھا۔ اب کیسے انجان رہتا۔

"نہیں کیا چھپاؤں گی تم سے۔" وہ پھر نظریں چرا کر بولی۔

"میری طرف دیکھ کر کہیے پلیز۔"

وہ ماں کو کندھوں سے پکڑ کر کچھ ایسے لہجے میں بولا کہ عاصمہ جو واثق سے بات نہ کرنے کا سوچ چکی تھی اسے بات کرنا ہی پڑی۔

"واثق! تمہارے خیال میں یہ پری کیسی لڑکی ہے؟" وہ لمحہ بھر خاموش رہ کر اچانک سے بولی تو واثق فوراً کچھ بول نہیں سکا۔

"میں نے کچھ پوچھا ہے تم سے واثق!" وہ جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں بولی۔ واثق یوں ہی کندھے اچکا کر رہ گیا۔

"مجھے نہیں پتا نہیں کیا کہوں۔"

"نہیں ایسا نہیں ہے۔ میرے خیال میں تمہیں کچھ اندازہ تو ہو ہی گیا ہو گا۔ اس لڑکی کے بارے میں۔" عاصمہ کرید کر پوچھ رہی تھی۔

"آپ یہ سب کیوں پوچھ رہی ہیں؟" وہ کچھ کوفت سے بولا۔

"دردہ کی دوستی اس سے کچھ زیادہ بڑھ رہی ہے تو میں چاہ رہی تھی کہ مجھے بھی کچھ اس کے بارے میں' اس کی فیملی کے بارے میں معلوم ہونا چاہیے۔" وہ بات بنا کر بولی۔

"بہتر ہے' آپ دردہ سے کہیں وہ اس سے کچھ فاصلے پر رہے' کیونکہ وہ اچھی لڑکی نہیں ہے۔" وہ سرد لہجے میں کہہ کر باہر نکل گیا۔

☆ ☆ ☆

"نہیں۔" فہد نے کچھ سرد لہجے میں نفی میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ مشال بس اسے دیکھتی رہ گئی۔

"میں یہاں پاکستان میں کبھی بھی سیٹل ہونے کا ارادہ نہیں رکھتا اور میرے ماما پاپا۔ وہ کسی بھی طرح وہاں سیٹ نہیں ہو سکتے یہ بات طے ہے۔" وہ شاید اپنے لہجے کی بے مہری خود بھی محسوس کر چکا تھا۔ ذرا دیر بعد قدرے نرم لہجے میں بولا۔

مشال نظریں جھکائے کچھ سوچ رہی تھی اور فہد کی نظریں بے ساختہ اس کی رخساروں پر گرتی لمبی سیاہ پلکوں میں اٹک کر رہ گئیں۔

بلیک بلیو امتزاج کے سادہ ایمبر ائیڈ سوٹ میں وہ اتنی پرکشش لگ رہی تھی کہ فہد چند لمحوں کے لیے بھول ہی گیا' وہ اسے یہاں ہوٹل میں کیا کہنے کے لیے ساتھ لایا تھا۔
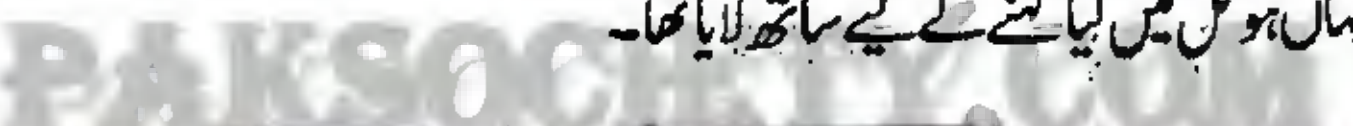
"مثال! آپ کو اسٹڈیز سے کوئی نہیں روکے گا آپ جتنا چاہیں پڑھیے گا۔ کون منع نہیں کرے گا۔"
اس کی گہری چپ پر مثال نے نظریں اٹھا کر دیکھا تو وہ نظروں کا زاویہ بدلتے ہوئے یونہی بولا تھا۔
"اور وہ ضروری بات کیا یہی تھی جو آپ کو مجھے کہنی تھی۔" وہ اس کے چپ ہونے پر بولی۔
یوں بھی اسے کچھ تو بولنا ہی تھا۔
"نہیں یہ بھی نہیں۔" وہ پانی کا گلاس اٹھاتے ہوئے بولا۔
مثال کو کچھ بے چینی سی ہوئی۔
معلوم نہیں یہ کیا کہنے والا ہے اور وہ کہہ بھی سکے گا یا نہیں' جو یہ مجھ سے کہنا چاہتا ہے کیونکہ فہد کی آنکھیں معلوم نہیں کیوں مثال کو لگ رہا تھا' وہ بہت کچھ چھپا رہا ہے یا بتا نہیں پا رہا۔
"آپ شاید.... کچھ ایسا ہے جو آپ کہہ نہیں پا رہے.... کہنا چاہتے ہیں۔" اس نے کچھ جھجک کر بالآخر کہہ ہی دیا۔ فہد اسے دیکھ کر لحہ بھر کو چپ ہی رہ گیا۔
وہ اتنی دیر سے اسی الجھن میں تو تھا جسے مثال نے جان لیا تھا' اسے دل میں کچھ افسوس سا ہوا' اس کے سیل پر میسج ٹون بجی تھی۔
اس نے سیل فون ذرا سا آن کر کے دیکھا اور آف کر دیا۔
"آپ کو یہاں ماما' پاپا کے پاس رہنا ہو گا مثال!" وہ جیسے فیصلہ کن لہجے میں بولا۔
مثال نا سمجھی سے اسے دیکھتی رہ گئی۔
"ابھی تو آپ کے ویزے کا مسئلہ ہو گا اگر وہ سولو ہو جاتا ہے تو بھی ماما' پاپا چونکہ یہیں رہیں گے تو آپ کو بھی ان کے ساتھ یہیں رہنا ہو گا۔"
"اور آپ....؟" وہ کچھ رک کر پوچھنے لگی۔
"میں بتا چکا ہوں۔ مجھے یہاں نہیں رہنا۔ آپ کو یہاں بلانے کا اور پہلے سے بتانے کا میرا مقصد یہی ہے کہ بعد میں آپ مجھ سے گلہ نہیں کریں گی کہ میں آپ کو اپنے ساتھ نہیں رکھ رہا۔" وہ دوٹوک لہجے میں بولا۔
مثال اسے دیکھتی رہ گئی۔
"اس کے تو پھر بہت سارے meaning (مطلب) نکلتے ہیں۔" وہ کچھ دیر بعد رک کر بولی۔
"کیا مطلب؟" اسے مثال سے شاید ایسی بات کی امید نہیں تھی۔
"آپ مجھے کیوں اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہیں گے اور نہ یہاں ہمارے ساتھ رہیں گے تو اس کے مطلب بہت سارے ہو سکتے ہیں۔ کچھ بھی۔" وہ جان بوجھ کر زور سے کندھے اچکا کر جملہ ادھورا چھوڑ کر خاموش ہو گئی۔
"اوہ! اگر آپ کا خیال ہے کہ میں کسی اور کے ساتھ انوالو ہوں جس کی وجہ سے...."
"میں نے ایسا کچھ نہیں کہا۔" وہ آہستگی سے بولی۔
"صرف الفاظ میں نہیں کہا' ورنہ مطلب آپ کا یہی ہے۔" وہ بھی جتا کر بولا۔
مثال خاموش اسے دیکھتی رہ گئی۔
"بہرحال یہ ڈن ہے اور مجھے آپ کو یہی بتانا تھا۔" وہ ڈنر ختم کر چکا تھا۔ مثال کی پلیٹ میں ابھی بھی سب کچھ ویسے ہی رکھا تھا۔
"آپ کھانا ختم کر لیں تو پھر میں آپ کو گھر ڈراپ کر دیتا ہوں۔" وہ اس کی پلیٹ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا

"میں کھا چکی ہوں' چلتے ہیں۔" وہ فوراً" ہاتھ کھینچ کر بولی۔

"نہیں' پہلے یہ پلیٹ میں جو کچھ ہے اسے ختم کریں۔ شاید یہ آپ پاکستانیوں کی عادت تو نہیں فطرت کہیں گے کہ پلیٹ بھر کر یونہی ذرا سا چکھ کر باقی رزق ضائع کرنا۔" وہ عجیب سے طریقے سے اسے ڈانٹ کر بولا۔

"لیکن مجھے بھوک نہیں ہے بالکل بھی۔" وہ کوفت سے بولی۔

"تو پھر آپ کو یہ سب پلیٹ میں نکالنے سے پہلے سوچنا چاہیے تھا بلکہ خود سے پوچھنا چاہیے تھا کہ آپ کو کتنی بھوک ہے اس کے مطابق نکالیں جب تک آپ یہ ختم نہیں کریں گی ہم گھر نہیں جائیں گے اوکے۔" وہ مطمئن انداز میں بیٹھ کر اسے دیکھنے لگا اور مثال کو نہ چاہتے ہوئے بھی کھانا کھانا پڑا۔

کھانا ختم ہونے تک فہد اپنے فیصلے میں کچھ لچک پیدا کر چکا تھا شاید۔

"لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ میں پاکستان آیا ہی نہیں کروں گا' سال میں دو بار تو میں پہلے بھی ایسا ہی کرتا ہوں' ہو سکتا ہے شادی کے بعد چار بار آجایا کروں۔"

وہ شاید مثال کو خوش کرنا چاہتا تھا۔

وہ جواب میں کچھ نہیں بولی۔

اگرچہ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ اسے اپنے پاس کیوں نہیں بلا سکتا مگر ابھی وہ شاید کچھ بھی پوچھنے کی پوزیشن میں نہیں تھی۔

دونوں گاڑی میں بیٹھ رہے تھے جب دوسری طرف بنے میڈیکل اسٹور سے نکلتے واثق نے بے اختیار انہیں دیکھا تھا وہ عاصمہ کی دوائیں لینے نکلا تھا۔ ایک ٹیبلٹ قریب کے کسی اسٹور سے نہیں ملی تھی۔

اسے مجبوراً" یہاں آنا پڑا اور اب مثال کو فہد کے ساتھ دیکھ کر اسے لگا جیسے وہ عمر بھر یہاں سے ہل نہیں سکے گا' گاڑی جا چکی تھی اور وہ وہیں کھڑا تھا۔

☼ ☼ ☼

"نہیں میں نہیں بتا سکتی مما... وہ کون ہے۔"

عفت شام سے کئی بار پری کے سامنے سر پٹخ چکی تھی کہ وہ بتا دے کس کو پسند کرتی ہے۔

مگر ہر بار وہ بڑی ثابت قدمی سے بتانے سے انکار کرتی رہی تھی۔

"پری! کیوں مجھے پریشان کر رہی ہو' جب تک تم مجھے بتاؤ گی نہیں' وہ کون ہے تو میں کیسے کچھ کر سکتی ہوں۔" اب کے عفت جیسے الجھ کر بولی۔

"آپ کچھ نہیں کر سکتیں مما... وہ پتھر کا مجسمہ ہے کم سے کم میرے لیے تو۔" وہ ٹوٹے دل سے بولی۔

اور عفت کا جی چاہا' اپنی اس پھولوں سے نازک بیٹی کو اپنے دل میں چھپا لے' اسے کبھی کوئی غم چھو کر بھی نہ گزرے۔

"پھر کیا چاہتی ہو تم؟" وہ عاجز آکر بولی۔

"کچھ بھی نہیں۔" وہ رنجیدگی سے بولی۔

عفت اسے دیکھ کر رہ گئی کیسے اسے سمجھاؤں کہ وہ کانٹوں بھرے اس رستے پر نہیں چلے جس پر چل کر صرف پاؤں فگار ہوتے ہیں حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا۔

"میرے دل نے اس کو پانے کی قسم کھائی ہے مما! میں اسے حاصل کر کے ہی رہوں گی۔"

اور عفت کو بلانے کے لیے آتا عدیل دروازے میں ہی ٹھٹک کر رک گیا۔

"پری!" عفت کچھ ڈر کر بولی۔
"ممّا! میں اسے حاصل کر کے رہوں گی۔ وہ مجھے پسند کرتا ہے یا نہیں میں اسے مجبور کردوں گی اپنی محبت کی شدت سے کہ وہ صرف میری ہی تمنا کرے گا' صرف میری ہی خواہش اسے راس آئے گی ورنہ۔" اس کی آنکھوں سے وحشت سی چمک رہی تھیں۔
عفت پریشان ہو کر اسے دیکھ رہی تھی۔
اس پری کو تو وہ بالکل نہیں جانتی تھی۔
"ورنہ میں اسے اور خود کو تباہ و برباد کرلوں گی۔ کچھ بھی نہیں بچے گا اگر وہ میرا نہیں ہو سکا تو۔" وہ آنکھوں میں سرخی لیے کہہ رہی تھی۔
اور عفت کو لگ رہا تھا وہ ایک کے بعد ایک بازی ہارتی چلی جارہی تھی۔
اور باہر کھڑا عدیل اس کے کندھے اس بوجھ سے ٹوٹنے والے تھے جو آنے والے دنوں میں اس نے اٹھانا تھا وہ خود کو گھسیٹتا ہوا جارہا تھا۔

☼ ☼ ☼

پری اور عفت کچھ حیران سی عاصمہ کو دیکھ رہی تھیں۔ جو پھلوں کی خوب صورت باسکٹ کے ساتھ پری کی خیریت معلوم کرنے کے لیے ابھی کچھ دیر پہلے یہاں آئی تھی۔
عفت کو یہ سوبر سی عورت اچھی لگی تھی جس میں دکھاوا تو بالکل نہیں تھا۔
وہ یوں ان کے سامنے اپنائیت بھرے انداز میں بیٹھی تھی جیسے وہ پہلے بھی کئی بار مل چکی ہوں۔
"آنٹی! میں ٹھیک تھی بالکل آپ نے خواہ مخواہ زحمت کی۔" پری کے انداز میں کچھ عجیب سی خوشی تھی۔ کھنک سی تھی عفت نے بھی چونک کر پری کو دیکھا تھا۔
"نہیں بیٹا! آج مجھے وردہ نے بتایا کہ آپ کالج نہیں آئیں تو مجھے فکر ہوئی کہ کہیں زیادہ طبیعت خراب نہ ہو گئی ہو' اس لیے میں آپ کی خیریت پوچھنے کے لیے آگئی۔"
وہ بہت محبت سے کہہ رہی تھی۔
"دراصل میں اس کی بہن کی شادی ہے پانچ دن بعد تو تیاری کے سلسلے میں میں نے ہی اس سے کہا تھا کہ یہ اب ہفتہ بھر کالج نہیں جائے اس لیے چھٹی کی تھی اس نے۔" عفت نے چائے کی میز آگے کرتے ہوئے خوش اخلاقی سے کہا۔
"مبارک ہو پھر تو آپ کو بہت.... بڑی بیٹی کی شادی ہے آپ کی؟" عاصمہ نے مسکرا کر پوچھا تھا۔
عفت اور پری لحہ بھر کو خاموش ہوئی تھیں۔
تب ہی مثال اندر آتے ہوئے ٹھٹک کر رک گئی تھی' پھر سلام کر کے آگے آگئی۔
"یہ مثال ہے پری کی بڑی بہن جس کی شادی ہے۔" عفت نے سنجیدہ لہجے میں کہا۔ تو عاصمہ بے اختیار چونک کر مثال کو دیکھنے لگی۔ اور پھر آہستگی سے اٹھ کر مثال کو گلے لگاتے ہوئے چند لمحے وہ یونہی اسے ساتھ لگا کر کھڑی رہ گئی۔
"ماشاءاللہ بہت پیاری بیٹی ہے آپ کی بہت خوش نصیب ہوں گے وہ لوگ جو ایسی اچھی بیٹی کو لے کر جارہے ہوں گے اپنے گھر۔" عاصمہ اس کا چہرہ ہاتھوں میں لے کر کچھ حسرت بھرے لہجے میں بولی تو عفت چونک سی گئی۔
مثال بھی اس کے التفات سے کچھ پریشان سی ہو گئی۔

"بہرحال مبارک ہو آپ کو ایک بار پھر۔" وہ گہرا سانس لے کر کچھ افسردہ سی اپنی جگہ پر بیٹھ گئی۔
"مما! بابا کی کال آئی ہے۔ وہ آفس سے نکل گئے ہیں کہہ رہے تھے آپ تیار رہیے گا۔" مثال کو یاد آیا وہ جس مقصد کے لیے یہاں آئی تھی۔
"ہاں ٹھیک ہے۔ میں تیار ہی ہوں۔"
"شاید میں غلط موقع پر آئی ہوں' ظاہر ہے آپ کے گھر میں شادی کے بہت سے کام ہوں گے' اگر میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ضرور بتایئے گا۔ مجھے خوشی ہو گی اگر میں کچھ بھی کر سکوں گی۔" عاصمہ خوش اخلاقی سے بولی۔
"نہیں بہن! بہت شکریہ۔ تقریباً" سب ہی کام ہو چکے ہیں اب تو یوں بھی چار دن میں تو کچھ ایسا خاص کام نہیں جو رہ گیا ہو۔"
"اچھا اب میں چلتی ہوں' ان شاء اللہ پھر کبھی آؤں گی بلکہ پری بیٹا! آپ اپنی والدہ کو لے کر آیئے گا ہماری طرف۔" وہ پری کو دیکھ کر بولی۔
"جی آنٹی کیوں نہیں ضرور آؤں گی مما کو لے کر۔" پری جوش سے بولی تو عاصمہ کو لگا۔ اس نے پھر کچھ غلط کر دیا ہے جلد بازی میں یہاں آکر۔
اس نے پری کے دل میں نئے سرے سے امید کی شمع روشن کر دی ہے۔
"لیکن بہن اس سے پہلے آپ کو ہماری دعوت قبول کرنا ہو گی یوں تو میں کارڈ بھجواؤں گی۔ آپ کو فون پر بھی تاکید کر دوں گی' لیکن ابھی بھی میں کہوں گی کہ آپ شادی اور مہندی دونوں فنکشنز میں آیئے گا اپنی بیٹی کے ساتھ۔" عفت فراخ دلی سے دعوت دیتے ہوئے کہہ رہی تھی۔
"واثق.... بھائی کو بھی مما۔ ان کے بیٹے ہیں وہ.... دردہ کے بھائی۔" پری نے کچھ ایسی بے ساختگی میں کہا تھا کہ عاصمہ اور عفت دونوں چونکی تھیں۔
"کوشش کروں گی بیٹا!" وہ مروتاً" مسکرائی۔

''کوشش نہیں آنٹی! آپ کو پرامس کرنا ہو گا۔ آپ وردہ اور واثق کے ساتھ دونوں فنکشنز میں آئیں گی ورنہ میں خود آپ تینوں کو لینے کے لیے آجاؤں گی۔ ہے نا مما!'' وہ جوش میں بولتے ہوئے کچھ خیال آنے پر فوراً ہی عفت کو ہم خیال بناتے ہوئے بولی۔

''جی بہن ضرور' پری ٹھیک کہہ رہی ہے۔'' عفت کچھ مدھم سے لہجے میں بولی۔

''ضرور میں کوشش کروں گی۔ وردہ تو آہی جائے گی۔ واثق کا آنا شاید مشکل ہو پھر بھی میں کہوں گی۔'' تینوں باتیں کرتے ہوئے باہر نکل گئیں۔

مثال اور فہد کو اسٹیج پر ایک ساتھ بٹھایا گیا تھا۔

اگرچہ عدیل نے ایسا نہیں چاہا تھا کہ نکاح سے پہلے دونوں کو ایک ساتھ بٹھایا جائے' لیکن وقار اور فائزہ کی یہی خواہش تھی' ان کا مووی میکر کچھ زیادہ ہی پرجوش تھا' اسے زیادہ سے زیادہ دونوں کے شاٹس چاہیے تھے۔

''وقار! میرے خیال میں پہلے نکاح ہو جائے جو ضروری فرض ہے یار! یہ سب کچھ تو بعد میں بھی چلتا رہے گا۔'' عدیل اپنی ناگواری کو۔ چھپاتے ہوئے سنجیدگی سے بولا۔

''بالکل میرا بھی یہی خیال ہے' وہ کدھر ہے بھئی آپ کا نکاح خواں بلائیے جلدی سے تاکہ نکاح تو شروع کیا جائے۔''

وقار نے جیسے ہی کہا عدیل نے فوراً'' ایک لڑکے کو اشارہ کیا جو ایک طرف بیٹھے نکاح خواں کو لے کر اسٹیج کی طرف بڑھ گیا۔

مثال کو عجیب سی گھبراہٹ ہو رہی تھی۔

اس کے سیل پر بشریٰ کی مسلسل کال آرہی تھی۔ وہ اس وقت فون نہیں سن سکتی تھی۔

مگر اسے گھبراہٹ کچھ اور ہی طرح کی محسوس ہو رہی تھی۔

''ماشاء اللہ سے بہت پیاری لگ رہی ہو بیٹی۔ عفت بہن! چاند سورج کی جوڑی ہے' میں تو کہوں گی۔''

جانے کون تھا جو عفت سے مخاطب تھا' مگر مثال تو یہ اس طرح کے تعریفی جملے کافی دیر سے سن رہی تھی' اس کا دل بہت عجیب طرح سے دھڑک رہا تھا۔

''فائزہ بھئی' آجاؤ اسٹیج پر نکاح ہونے لگا ہے۔'' وقار بیوی کا ہاتھ پکڑ کر اسٹیج کی طرف بڑھ گئے۔

عدیل اور عفت پہلے سے وہاں موجود تھے۔

اور دور کھڑا واثق اسے لگا اس کے دل کے اندر کچھ ٹوٹ رہا ہے شاید دل ہی ٹوٹ رہا تھا۔ عجیب طرح کا درد اٹھا تھا وہ برداشت نہیں کر پایا اور بھاگتا ہوا وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے پاس سے گزر کر آتی لیلیٰ لمحہ بھر کو ٹھٹکی تھی۔ پھر اس نے ڈھائی تین سال کی بچی کا ہاتھ مضبوطی سے پکڑا اور اسٹیج کی طرف بڑھ گئی جہاں نکاح شروع ہونے والا تھا۔

''ٹھہریے مولوی صاحب! کسی بھی شخص کی دوسری شادی سے پہلے کیا یہ ضروری نہیں کہ وہ اس شادی کے لیے پہلی بیوی کی اجازت حاصل کرے' میں لیلیٰ ہوں۔ لیلیٰ فہد.... فہد کی پہلی بیوی اور یہ ہماری بیٹی علیزے۔''

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

قانتہ رابعہ

سَو دن

معظم نے اسکائپ آئی ڈی تبدیل کرلی تھی۔ اس کے بعد رابطہ کرنے میں سستی ہی رہی۔ یہ صرف سستی ہی تھی ورگرنہ موبائل فون پر تو رابطہ کی تمام صورتیں میسر تھیں۔ بس اسی آج کل.... آج کل میں پورے سولہ سترہ دن گزر گئے۔ دبے دبے لفظوں میں

عفت نے اپنے میاں مکرم کو یاد بھی کروایا کہ معظم بھائی نے بہت دنوں سے رابطہ نہیں کیا' آپ ہی کرلیں۔

"اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ ٹھیک ہے' مجھے یاد کروادینا۔۔۔" وہ اخبار پڑھتے ہوئے جواب دیتے۔ لیکن سب سے بڑا مسئلہ تو وقت کے فرق کا تھا یہاں دن ہوتا تو وہاں رات' وہاں رات ہوتی تو یہاں دن۔۔۔ اسی میں پورا مہینہ گزر گیا۔۔۔ ابا میاں (سسر) نے بھی کئی دفعہ تاکید کی اور کہا کہ پردیسیوں سے حال احوال پوچھ لینا بھی کار ثواب ہے۔

چلئے جناب اس کار ثواب کے حصول کا دن اللہ کے ہاں جو مقرر تھا اسی دن رابطہ ہوا۔۔۔ پہلے تو تصویر نظر آئی۔ مکرم نے چند منٹ لیپ ٹاپ کی درستی میں لگائے تو تصویر غائب' آواز آرہی تھی۔ اعصاب پر جھنجلاہٹ سی سوار تھی۔

عفت کے اباجی (مرحوم) کہا کرتے تھے کہ رمضان سے پہلے ہر وہ اہم کام سرانجام دے لیا کرو جس کے کرنے سے اللہ راضی اور نہ کرنے پر گرفت ہو سکتی ہے۔ عفت کے سامنے زندگی گزارنے کے جو روشن اصول تھے' وہ اباجی کی زندگی سے ہی لیے گئے تھے۔ رمضان سے پہلے پہلے وہ اڑوس پڑوس کا ایک چکر ضرور لگایا کرتے تھے۔ حلقہ احباب میں فوتگی پر ایک دفعہ جا کر دوسری دفعہ آنے کا بس وعدہ ہی رہتا ہے۔ رمضان کی آمد سے پہلے وہ سال میں ہونے والی فوتگیوں والے مقامات پر بھی ضرور جاتے۔ یتیموں کے سر پر دست شفقت رکھتے (جیب میں بھی لازماً ڈالتے ہوں گے۔) بیواؤں کے ہاں راشن بھجواتے۔۔۔ کسی سے چپقلش کا گزشتہ سال میں شائبہ بھی ہوتا تو دل صاف کرنے اور کروانے کے لیے ضرور جاتے

بقول ان کے حبیب صلی اللہ علیہ وسلم خدا کی حدیث ہے کہ صلح کے لیے جو ہاتھ سلام کرنے میں پہل کرتا ہے ستر رحمتیں اس پر نازل ہوتی ہیں۔ باقی نیچے والے ہاتھ پر۔۔۔ بلکہ اس معاملہ میں تو وہ اتنے حساس تھے کہ ستر کوس کے فاصلہ پر بھی پتا چلتا کہ دلوں میں "بشری تقاضوں کے باعث" رنجش ہے تو صلح کروانے پہنچ جاتے۔

یہ تو آپ جانتے ہی ہیں صلح کروانے والا ہمیشہ سراہا ہی نہیں جاتا تنقید کا نشانہ بھی بنتا ہے۔ مگر انہیں اس کی پروا نہیں تھی۔ وہ ایک اور کام بڑی دلجمعی سے کرتے تھے کہ دوست احباب' عزیز و اقارب میں سے جن سے فاصلوں کی وجہ سے رابطہ نہ ہو سکتا تھا' وہ رمضان سے پہلے پہلے ان سے خط لکھ کر یا فون کال کے ذریعہ رابطہ کرتے تھے۔ اگر مخاطب' کم عمر ہوتا تو دعائیں دیتے اور اگر عمر میں بڑا ہوتا تو دعائیں لینے کے طالب رہتے۔

خیر یہ تو ایک ضمنی بات تھی جو درمیان میں آگئی وگرنہ عفت کو' جھنجلاہٹ اسی بات کی ہو رہی تھی کہ ابھی تک اس نے کسی بیوہ کے راشن ڈلوایا تھا نہ کسی یتیم کے سر پر ہاتھ رکھا تھا۔ دعائیں لینے اور دینے کی نوبت تو بعد میں آنی تھی۔

خیر سے معظم بھائی سے رابطہ ہوا۔۔۔ ابا میاں' مکرم' حمدان' نور العین سب ہمہ تن گوش۔۔۔ سامنے بیٹھے تھے۔ بچوں کو تو چچا سے کیا کام بس چچا کی انگریز تو مسلم بیوی عائشہ اور ان کے تینوں بچوں کی اردو سن کر ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ رہے تھے۔

سلام دعا کے بعد حال احوال پوچھنے کی نوبت آئی' معظم بھائی نے دھماکہ کیا۔

ہم پاکستان آرہے ہیں۔

"ک۔۔۔ کیا۔۔۔" سب کے منہ کھلے رہ گئے۔۔۔ عفت نے پوچھا۔

"کب؟"

"پرسوں کی فلائٹ ہے' یہ دیکھیں ٹکٹ' پاسپورٹ سب تیار ہے۔" انہوں نے اسکائپ کی اسکرین پر کاغذات کی نمائش کی۔

"پرسوں؟ یعنی کہ رمضان سے ایک دن پہلے؟" ابا میاں حیرانی سے بولے۔

"ہاں اباجی! آپ اتنے حیران کیوں ہو رہے ہیں؟" معظم نے پوچھا۔

"اُفوہ! روزے بہت گرمی کے ہیں خواہ مخواہ ہی... لوگ تو روزوں میں یورپ کی یاترا کرتے ہیں تم سڑی گرمیوں میں یہاں آؤ گے۔" ابا میاں اب واقعی باپ بن کر سوچ رہے تھے۔

"نہیں ابا میاں... آپ پریشان نہ ہوں کچھ نہیں ہوتا۔" معظم نے انہیں تسلی دی۔

"اور اگر بچوں کو ڈائریا ہو گیا' بیمار ہو گئے' پھر...؟" اب کے مکرم نے اندیشہ ظاہر کیا۔

"او ہو بھائی جان! کیا آپ گارنٹی دیتے ہیں کہ اگر سردیوں میں ہم لوگ آئے تو انہیں کچھ نہیں ہوگا... جو ہونا ہے وہ تو ہر صورت ہونا ہی ہے خواہ ادھر ہوں یا ادھر... جب صدقہ دے کر آئیں گے اچھی نیت سے آئیں گے تو اللہ بھی ہماری مدد کرے گا۔" معظم بھائی نے بات ہی ختم کر دی۔

ایک ایک کر کے سب کمرے سے رخصت ہو گئے اور عفت بیگم گم صم... اتنی شدت کی گرمی' اوپر سے لوڈشیڈنگ کا تازیانہ' گھر والوں کو روزے رکھنا مشکل ہو رہے ہیں' کجا امریکا پلٹ دیور' دیورانی... سحری' افطاری کے علاوہ بھی سو بکھیڑے ہوتے ہیں' کوئی نہ کوئی ان سے ملنے ضرور آئے گا۔ ضروری تو نہیں کہ آنے والے روزے سے ہوں' سفر اور مرض میں تو روزہ بھی چھوڑنے کی اجازت ہے' ان کی مہمان داری' پھر معظم بھائی کے تینوں بچے' وہ تو ظاہر ہے روزے سے نہیں ہوں گے' ان کا ناشتا' دوپہر کا کھانا' چائے' رات کا کھانا' اس کے بعد ان کے لیے خریداری' تحفے تحائف "یا اللہ! میرا تو حوصلہ نہیں..." اس کا دل رونے کو چاہ رہا تھا۔ یہ بیٹھے بٹھائے معظم بھائی کو کیا سوجھی' زندگی رہی تو سردیوں کے روزوں میں آجاتے۔ گرمیوں میں تو پھر بھی حق دوستی نبھانا نہیں بھولتے۔

بیٹھے بیٹھے اس کے سر میں درد کی ٹیسیں اٹھنا شروع ہو گئیں۔ ایک بات تو ابھی سوچی ہی نہیں' اپنے لیے تو روز پکوڑے' فروٹ چاٹ ہی کافی سمجھی جاتی ہے' ان لوگوں کے لیے روزانہ کیا کیا بنانا ہوگا؟

عفت نے دونوں ہاتھوں سے کنپٹیوں کو دبانا شروع کر دیا۔ مکرم اندر کسی کام سے آیا تو یوں اسے اس طرح دیکھ کر چونکا اور مذاق سے باز نہ آیا۔

"ارے! تم کس کا سوگ منا رہی ہو؟"

"اپنے آرام' نیند' سکون کے پورے مہینے رخصتی کا..." دونوں کا سولہ سترہ سالہ ساتھ تھا... عفت نے اسی کی ٹون میں جواب دیا۔

"مہمان اللہ کی رحمت ہوتے ہیں اور وہ مسلمان جو قریبی رشتہ دار ہوں' وہ باعث برکت بھی ہوتے ہیں۔" میاں نے نہلا مارا۔

"ٹھنڈے علاقے سے آنے والے مہمان' گرمیوں کے روزوں میں باعث زحمت بھی ہو سکتے ہیں۔" عفت نے ترنت جواب دیا۔

"اُفوہ... ! گاؤں سے خالہ جمیلہ اور ان کی بہو کو بلا لو۔ تمہیں کس چیز کی ٹینشن ہے اور روزوں کے لیے جو لوازمات درکار ہیں' وہ آج جا کر لے آؤ... جتنی رقم کی ضرورت ہو اس کے لیے میرا اے ٹی ایم کارڈ حاضر ہے۔" مکرم نے کارڈ بیوی کو پکڑایا۔

ایک لمحے کے لیے عفت مطمئن ہو گئی۔ ارے خالہ جمیلہ کا تو ذہن میں ہی نہیں آیا۔ یہ اس کی سسرالی رشتہ دار تھیں' اکلوتا بیٹا حادثے میں جاں بحق ہو گیا تھا۔ اب بہو' ساس ہی ایک دوسرے کا سہارا تھیں' چونکہ ابا میاں ان کا خیال رکھتے تھے' ہر دو چار ماہ کے بعد گاؤں جا کر ضرورت کا سامان ڈلوا آتے تھے۔ امریکہ سے معظم بھائی یتیموں' بیواؤں کے لیے کافی بھاری رقم سال میں دو تین دفعہ بھجواتے تھے۔ ابا میاں چپکے سے اس میں سے دے کر آتے تو وہ حد درجہ احسان مند ہی رہتی تھیں۔ جب اس کی نند عالیہ کی شادی ہوئی تو پورا مہینہ دونوں ساس' بہو بلالی گئی تھیں اور ہر چھوٹے بڑے کام کی ذمہ داری ان دونوں نے اس طرح سے پوری کی کہ مدتوں وہ دل سے ان دونوں کو دعائیں دیتی رہی۔

کام کے حوالے سے مطمئن ہو کر' سسر کے ساتھ مل کر اس نے مینو بنایا۔ فوری طور پر گیسٹ روم

از سرنو سیٹ کروایا' اے سی کی کولنگ چیک کی۔ بچوں کے لیے فوری طور پر تیار ہونے والی اشیاء برگر' پزا وغیرہ کے بن' نوڈلز' پاستا کا سامان منگوایا۔ اب گھر والوں کو روزوں کے چاند سے بھی زیادہ بے تابی سے "امریکیوں" کا انتظار تھا۔ عائشہ شادی کے بعد ہفتہ کے لیے سسرال یعنی پاکستان آئی تھی۔ اردو وہ بول نہیں سکتی تھی' انگریزی میں قوت کلام عفت کی بھی نہ تھی۔ لہٰذا پورا ہفتہ خیر سگالی میں ہی گزار کر چلی گئی تھی' اب آٹھ سالوں کے بعد ان کا چکر لگ رہا تھا۔ اس کے بچے اپنی ددھیال میں پہلی دفعہ ہی آرہے تھے۔

"وہ کیسے یہاں رہیں گے' ان کی دلچسپیاں کیسی ہوں گی؟ کون کون سی اینی میٹڈ فلمیں وہ پسند کرتے ہوں گے۔" سوچ سوچ کر ساری بچہ پارٹی ہلکان ہو رہی تھی۔

فلائٹ کچھ تاخیر سے پہنچی... تراویح کی ادائیگی کے بعد ابا میاں مسجد سے نکل رہے تھے' جب معظم لوگوں کی گاڑی مسجد کے سامنے سے گزری... وہ رات (گرمیوں کی رات ہی کتنی ہوتی ہے۔) تو باتوں میں ہی گزر گئی۔ عفت کو عائشہ بھابھی بہت اچھی لگیں۔ سادہ مزاج' ملنسار' پہلی سحری میں بس انہوں نے دہی کے ساتھ چپاتی لی... چائے کا کپ پی کر وہ اٹھ گئیں۔ معظم بھائی نے بھی قیمہ مٹر کے ساتھ ایک چپاتی لی اور چائے کا کپ۔

عفت بار بار "یہ سلاد لیں' یہ چکن کڑاہی میں نے آپ کے لیے ہلکی مرچ والی بنائی ہے اور یہ لزانیہ... یہ پاستا..."

"کچھ بھی نہیں لیا' میری سارے دن کی محنت کسی نے چکھی بھی نہیں۔" افسردگی سے اس نے کہا۔

"ارے میں ہوں نا..." مکرم نے خود کو پیش کیا اور ابا میاں کے ساتھ ہر چیز سے انصاف کیا۔

عفت کی عادت سحری کے بعد فجر کی نماز کے... بعد کچھ دیر سستانے کی تھی۔ دن میں وہ سو نہیں سکتی تھی اور فجر کے بعد ایک آدھ گھنٹہ کی نیند اس کے لیے بھرپور ٹانک کا کام دیتی تھی۔

فجر کی نماز کے بعد اس نے گیسٹ روم میں جھانکا۔ آداب میزبانی کو ہی سہی' رسماً' پوچھنا تو تھا کہ کسی چیز کی ضرورت تو نہیں... اندر داخل ہوتے ہی اسے جھٹکا لگا۔ عائشہ بھابھی تینوں بچیوں کے ساتھ قرآن کی تلاوت میں مصروف تھیں۔ اس کے قدم وہیں جم کے رہ گئے۔ آنکھوں کے گوشے بھیگ گئے۔ دن بھر کاموں میں جُتے رہنے کے باوجود اس کی بھی یہ ہی خواہش ہوتی تھی کہ فجر کا آغاز اسی طرح تلاوت قرآن سے ہو۔

"آیئے بھابھی جان..." عائشہ نے اسے دروازے پر کھڑا دیکھ کر قرآن بند کیا۔

"آپ اب سو جائیں' ساری رات جاگتی رہی ہیں' سفر کی بھی تھکاوٹ ہوگی۔" عفت بمشکل اتنا ہی کہہ پائی۔

"ہم بھی سوتے ہیں... ہم... اصل میں... ہم اکنا (ICCNA۔ اسلامک سینٹر) میں قرآن پڑھنے جاتے ہیں' وہاں پر پچھلے منتھ ہم کو اصول ملا کہ قرآن فجر کا گواہ ہوتا ہے... آپ کو تو پتا ہی ہوگا۔ سورۃ بنی اسرائیل میں ہے۔ ہم کو اسکالر صاحب یاسین رمضان نے بولا کہ فجر کے وقت قرآن کی تلاوت کی گواہی فرشتے لے کر جاتے ہیں۔ اس دن سے ہم ڈیلی قرآن اسی وقت پڑھتے ہیں۔" حالانکہ اب وہ روانی سے اردو بولتی تھیں' مگر لہجے میں فرق تھا۔ بڑی رسانیت سے انہوں نے ان قرآن الفجر کان مشھودا کی وضاحت کی۔

عفت کے آنسو آنکھوں کے کناروں سے نکل کر رخساروں کو بھگو رہے تھے۔ وہ گیسٹ روم جہاں دو منٹ رکنا محال ہوتا تھا' اب اسے مکینیت منزل لگ رہا تھا۔ دو ایک باتوں کے بعد عفت اپنے بیڈ روم میں چلی گئی۔ پتا نہیں دل میں کچھ کھٹک سی تھی۔ اپنی کسی کوتاہی کی یا کسی اور وجہ سے... لیٹتے ہی اسے نیند آگئی۔ ظہر کی نماز میں بہت تھوڑا وقت رہتا تھا۔ تب آنکھ کھلی۔

"ارے..." اسے یاد آیا... معظم بھائی کے بچوں کو بھوک لگی ہوگی۔" وہ جلدی سے کچن کی طرف چل

دی۔

ایک اور خلاف توقع منظر۔۔۔ اس کے دل نے اپنے بچوں کے لیے کئی دفعہ اس کی طلب کی تھی۔ وہ کچن کے دروازے میں ہی رک گئی۔ تینوں بہن بھائی ایک پلیٹ میں قیمہ مٹر ڈال کر روٹی کے ساتھ کھا رہے تھے۔ خالہ جمیلہ ان کے پاس موجود تھیں' اسے دیکھتے ہی بتانے لگیں۔

"عفت بیٹے! میں نے تو کہا تھا ڈائننگ ٹیبل پر ناشتہ لگا دیتی ہوں' لیکن مانے نہیں' بڑی کہنے لگی' ماما کہتی ہیں' نیچے بیٹھ کر کھانا اور ایک ہی پلیٹ میں کھانا ہمارے پرافٹ (رسول صلی اللہ علیہ وسلم) کا طریقہ ہے اس سے انڈر اسٹینڈنگ بھی ہوتی ہے اور برکت بھی۔"

عفت کے دل پر کچھ بوجھ اور بڑھ گیا۔ ظہر کی نماز کے بعد اس نے خالہ جمیلہ کے ذمے پکوڑے اور سموسے تلنے کا کام لگایا۔ خود اس نے اپنے لیے فروٹ چاٹ' دہی بھلے اور شوربے والے مٹن کے ساتھ چائنیز چاولوں کا مینو بنایا ہوا تھا۔ تینوں کے ہاتھ تیزی سے کاموں میں مصروف تھے۔ عفت زیر لب ذکر اذکار بھی کر رہی تھی۔ اتنا تو اسے علم ہو چکا تھا اس کے اسلام میں اور عائشہ کے اسلام میں فرق ہے' بہت بڑا فرق۔۔۔ عصر کے بعد جب کڑاہی چولہے پر رکھے دھڑا دھڑا سموسے' پکوڑے تلے جا رہے تھے۔ عفت چائنیز چاولوں کو دم پر لگانے کے بعد فروٹ چاٹ کے لیے پھل چھیل کاٹ رہی تھی۔ عائشہ آسمانی رنگ کے لان کے سوٹ میں کچن میں داخل ہوئی۔

"السلام علیکم آپ سب کو۔۔۔" اس نے پرجوش لہجے میں سلام کیا۔

"وعلیکم السلام' جیتی رہو۔" خالہ جمیلہ نے جواب دیا۔

"عفت بھابھی! آپ کا تعارف کرا دیں۔ اسکائپ پر ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔" عائشہ نے قریبی رکھی پیڑھی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

"یہ ابا میاں کی رشتہ دار ہیں' گاؤں میں رہتی ہیں۔" عفت کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کن لفظوں میں ان کا تعارف کرائے۔

"گاؤں سے آئی ہیں' ہم کو ملنے کے لیے۔" دلچسپی سے پوچھا گیا۔

"ہاں' آپ سے ملنے بھی' ویسے بھی روزوں میں کام بڑھ جاتا ہے تو ہیلپر کے طور پر بھی۔۔۔" دھیمے لہجے میں عفت نے حقیقت بیان کی۔

"ان کا بھی روزہ ہے؟" حیرانی سے اس نے پوچھا۔

"جی۔۔۔" خالہ جمیلہ نے فخریہ کہا۔

"آپ روزے میں اتنی بزرگ عورت سے کام لے رہی ہیں اور یہ کیا بنا رہی ہیں؟" اس نے شاید کبھی پکوڑوں کا ذکر نہیں سنا تھا۔ عفت نے بتایا کہ یہ یہاں کے رمضان میں افطاری کے لوازمات کا ضروری جزو سمجھے جاتے ہیں۔

"اسپائسی ہوتے ہیں؟" عائشہ نے سوال کیا۔

"جی اور آئلی بھی۔۔۔" عفت نے جواب دیا۔

"اف۔۔۔ روزے کے بعد آپ معدہ پر اتنا ظلم کرتی ہیں۔ ہم تو روزے ایسے نہیں رکھتے' بس شوربے میں روٹی بھگو کر رکھ دیتے ہیں یا دال میں روٹی بھگو کر رکھ لیتے ہیں۔"

"بس۔۔۔؟" عفت نے بے اختیار پوچھا۔

"ہاں آپ کو روزہ کا مطلب نہیں پتا۔" سادہ سے لہجے میں عفت نے سوال کیا۔

"کیا مطلب؟" عفت گڑبڑائی۔

"میرا مطلب ہے روزے کو صوم کہتے ہیں عربک میں' صوم کا مطلب ہے رک جانا۔۔۔ اسٹاپ۔۔۔ آپ نے عفت بھابھی کبھی نہیں سوچا' کس سے رکنا ہے' پورے سال میں کبھی نہیں جائزہ لیا' کون کون سے غلط طریقوں سے رکنا ہے۔" عفت پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ تاہم وہ چپ رہی' عائشہ نے سلسلۂ کلام جاری رکھا۔

"عفت بھابھی! جب تک میں کرسچن تھی مجھے نہیں پتا تھا' دنیا کی سب سے بڑی نعمت کیا ہے' سب سے پریشئس چیز کیا ہے۔ جب میں مسلمان ہوئی' مجھے گرینی نے گھر سے نکال دیا' تب میرا نکاح ان سے ہوا' انہوں نے مجھے لٹریچر دیا۔ قرآن کا ہکھتال کا

ترجمہ دیا۔ تب مجھے پتا چلا کہ دنیا کی سب سے بڑی دولت اسلام ہے‘ سادہ سادین‘ آسان سا طریقہ.... یہ تو سارے سال کی تھکاوٹ کو دور کرنے کا مہینہ ہے۔ ہاں دوسروں کو کھلاؤ‘ ان کو وہ چیزیں پہنچاؤ جو وہ خرید نہیں سکتے۔ اگر آپ یہ سب کچھ ہمارے لیے بنا رہی ہیں تو سوری ہم صرف سادہ روٹی‘ چاول لیں گے‘ بس....“

”لیکن....“ عفت کے لب پھڑپھڑائے‘ اس نے کچن میں چاروں طرف پڑی چھوٹی بڑی پتیلیوں پر نظر ڈالی۔

”یہ سب کون کھائے گا؟“ عائشہ نے عفت سے سوال کیا۔

”بھابھی پلیز.... آپ یہ سب مت بنائیں‘ اس طرح تو سارا دن روزہ رکھ کر آپ عبادت نہیں کر سکیں گی۔ گرمی میں مصروف رہیں گی۔ جب سب لوگ اتنی ہیوی چیزیں کھائیں گے تو تراویح کیسے پڑھیں گے۔ پلیز بھابھی رک جائیں.... میں بچوں کو لے کر ان کی چھٹیاں لے کر آئی تھی کہ روزہ صبر سکھاتا ہے۔ اگر سب کچھ کھلاتے پلاتے رہے تو نہ شکر ہوگا‘ نہ صبر.... وہاں ہم تو ایسے روزے نہیں رکھتے تھے۔ ہم لسٹ بناتے تھے۔ ہم نے سارا سال کیا کچھ کھایا۔ اللہ نے ہمیں کن کن حادثات سے بچایا.... ہم نے اس کی کن کن نعمتوں کو گفٹ سمجھ کر لیا۔ پھر ہم سجدہ میں جاکر شکر ادا کرتے تھے۔ یہ سب کریں گی تو آپ تو بہت مشکل میں پڑ جائیں گی بھابھی۔“

عائشہ‘ عفت کا ہاتھ پکڑے منت بھرے لہجے میں اسے سمجھا رہی تھی۔ روزہ کسے کہتے ہیں؟ عفت کو چھتیس سال مسلمان ملک اور مسلمان گھرانے میں رہ کر نہیں پتا چلا تھا وہ عائشہ کو آٹھ سالوں میں پتا چل چکا تھا۔ عائشہ کی آنسو ضبط کرنے سے عجیب حالت ہو رہی تھی۔ مگر وہ شدت جذبات سے بولے چلی جارہی تھی۔

”بھابھی.... جب میں نے پڑھا گرمیوں کا روزہ حشر کے دن کی پیاس سے بچائے گا۔ جہنم میں جانے میں ... ان کی منت

کرنا شروع کر دی تھی کہ پلیز ایک دفعہ مجھے گرمیوں کے روزے رکھوا دیں۔ میں وہاں کی گرمی برداشت کرلوں گی‘ میں صبر کرکے دکھاؤں گی۔ روزہ صبر ہی تو سکھاتا ہے نا۔ بھائی یہ تو مان گئے تھے‘ مگر بچوں کو ذہنی طور پر تیار کرنے میں کئی ماہ لگ گئے۔ پھر میں نے ان کو بتایا کہ ہر مسلمان کی ٹریننگ کے لیے روزہ رکھنا ضروری ہے۔ آپ لوگوں کو چلنا پڑے گا۔ ہر فرائی ڈے کا روزہ رکھنا پڑے گا۔ اسی طرح آپ ہمارے ساتھ جنت میں جاسکتے ہو اور قیامت کے دن کی پیاس سے بچ سکتے ہو۔ اللہ کا شکر ہے بچے بھی مان گئے۔ اللہ کا شکر ہے ان کو چھٹیاں بھی مل گئیں۔ اللہ کا بہت شکر ہے کہ ہر کام خود بخود آسان ہوتا چلا گیا۔ اب آپ میرے ساتھ ہوں گی‘ ہم سب بچوں کو نقشہ بنا کے دیں گے۔ گو ٹو جنہ کا.... صراط الجنہ کا سامان کہ کیا کیا کرنا ہے کیا نہیں کرنا۔“

عائشہ بول رہی تھی اور عفت بس اسے دیکھے جارہی تھی‘ دیکھے ہی جارہی تھی۔ قرآن تو وہ بھی کھولتی تھی اسے تو کبھی صراط الجنہ کا پتا نہیں چلا تھا۔ عبادت تو وہ بھی کرتی تھی۔ اسے تو کبھی عبادت کرکے بھی روز حشر کا دن یاد نہیں آیا تھا۔ گرمیوں کے روزے رکھ کے بھی آخرت کی پیاس کا خیال نہیں آیا تھا۔ اس کا ذہن ایک ہی بات سوچ رہا تھا۔ ہم بس پیدائشی مسلمان ہیں‘ کلمہ گو.... بھوک پیاس برداشت کرنے کو روزے اور رکوع و سجود کو نماز کا نام دینے والے.... قرآن کی تلاوت ثواب اور برکت کے لیے کرنے والے عفت کو تو بس اتنا ہی پتا تھا کہ سحری کھائی اور سو گئے۔ قرآن کا پارہ پڑھ لیا۔ افطار پر خوب اہتمام کیا.... تراویح پڑھی‘ سحری کا بندوبست کرکے پھر سو گئے۔

یہ روزہ کیسا ہوتا ہوگا جو عائشہ بتا رہی تھی۔ یہ کل سے رکھنا تھا۔ پھر پتا چلے گا کہ دونوں میں کیا فرق ہے؟ اور کیا خبر جس صراط الجنہ کا نقشہ عائشہ بنانے آئی ہے اس میں اس کی کوششیں بھی بار آور ثابت ہوں‘ کون جانے؟ ایسا مہمان قدردان انسان زندگی میں پھر آئے یا نہ آئے۔

☆

نادیہ جہانگیر

گھن چکر

"بھابھی! میرا ناشتا تیار ہے؟" ابھی وہ فجر کی نماز پڑھ کے باہر نکلی ہی تھی کہ چھوٹے دیور ریحان کی آواز سنائی دی۔ وہ نادم سی اسے دیکھنے لگی۔

"اوہ سوری.... میں ابھی کمرے سے باہر آئی

ہوں۔"

"میں نے رات آپ کو کہا بھی تھا بھابھی۔" ریحان ناراضی سے بولا تو اس کے ہاتھ پیر پھول گئے۔

"آئم سوری میں بھول گئی.... لیکن تم ایزی رہو۔ ابھی پانچ منٹ میں میں ناشتا تیار کر لیتی ہوں۔ تم بس فکر نہ کرو۔"

"مجھے انٹرویو کے لیے جانا ہے بھابھی! جب ہی رات آپ کو کہا تھا کہ جلدی جاگ جایئے گا۔" ہنوز اس کا منہ پھولا ہوا تھا۔

"آئم سوری ڈیر برادر۔ ذہن سے نکل گیا۔ لیکن میں نے کہا نا۔ ابھی فورا" ناشتا تیار ہو جاتا ہے۔" زبردستی مسکرا کر اس نے چٹکی بجائی اور فورا" کچن میں غائب ہو گئی۔

"میں لیٹ ہو گیا تو سارا قصور بھابھی بیگم کا ہو گا۔" ریحان سر جھٹک کر واپس اپنے کمرے کی طرف مڑ گیا۔ کچن میں تیز تیز آٹے کا پیڑا بناتی سعدیہ نے خود کو ملامت کی کہ وہ کیوں نہ جلدی کمرے سے باہر آئی۔ حالانکہ ریحان نے تو اسے رات کا بتایا ہوا تھا کہ اسے صبح جلدی انٹرویو کے لیے نکل جانا ہے اب خود پر افسوس کرتی وہ جلدی جلدی ایک چولہے پر چائے رکھ کر دوسرے پہ پراٹھا بنانے لگی۔

"آملیٹ رہنے دیتی ہوں' خوامخواہ لیٹ ہو جائے گا۔" ایک طرف پڑے انڈے دیکھتے ہوئے اس نے سوچا تب ہی چائے کو ابال آگیا اس نے فوراً برنر آہستہ کیا۔

"بھابھی میرا بلیو ڈریس استری کر دیا آپ نے؟" ابھی وہ پراٹھا اتار ہی رہی تھی جب پیچھے سے چھوٹی نند سونیا نے آکر پوچھا۔

"بلیو ڈریس! انہیں تم نے تو مجھے گرین ڈریس کا کہا تھا۔ میں نے تو وہ استری کیا ہے۔" اس نے گردن ترچھی کر کے جواب دیا تو سونیا ناراضی سے اسے دیکھنے لگی۔

"اوفوہ۔ بھابھی! آپ کوئی بھی بات پوری طرح سے نہیں سنتیں' میں نے بلیو ہی کہا تھا کیوں کہ آج ہم سب دوستوں نے بلیو ڈریسز میں یونیورسٹی جانا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا کہ ہر ویک اینڈ پہ ہم سب فرینڈز ایک ہی رنگ کے کپڑے پہنتے ہیں گرین تو لاسٹ ویک اینڈ پہ پہنے تھے۔"

"سوری یار۔ میں تھوڑی دیر میں کر دیتی ہوں۔ یہ ذرا ریحان کو ناشتا دے لوں.... تم آواز تو دو اسے۔" کپ میں چائے نکالتے ہوئے اس نے کہا ہی تھا ریحان اندر آگیا۔

"کچھ بنایا نہیں؟"

"تم بیٹھو۔ ناشتا تیار ہے۔" ریحان کے بیٹھتے ہی اس نے چائے اور پراٹھا اس کے سامنے رکھ دیا۔

"آملیٹ کہاں ہے؟" ریحان سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

"آملیٹ نہیں بن سکا۔ وقت کم ہے نا' جب ہی میں نے جلدی میں چائے اور پراٹھا بنا دیا۔"

"مجھے سارا دن بھوکا رہنا ہے بھابھی....! اس ایک پراٹھے اور چائے پہ کیسے گزارہ ہو گا۔"

"اچھا.... میں بنا دیتی ہوں۔" وہ تیزی سے پیچھے مڑ کر پیاز اٹھانے لگی۔

"بھابھی میرے کپڑے۔" سونیا بسوری۔

"بس پانچ منٹ.... میں ابھی آئی۔"

"اب رہنے دیں آملیٹ.... ادھر بٹھا دیا تو وقت پہ نہیں پہنچ سکوں گا۔" ریحان چائے کا آخری گھونٹ لیتے ہوئے ناراضی سے اٹھا۔

"شاید ناراض ہو گیا ہے۔"

"چھوڑیں بھابھی' اس کی تو عادت ہے خوامخواہ بگڑنے کی۔ آپ کپڑے استری کر کے یہ آملیٹ میرے لیے بنا دیجئے گا۔" سونیا کے کہنے پہ وہ سر ہلاتی اس کے کپڑے استری کرنے چل دی۔

"مجھے چائے تو دیتی جائیں۔" سونیا نے پکارا تو وہ سر ہلا کر پیچھے مڑی اور اس کے لیے چائے نکالنے لگی۔ تب ہی باہر سے اس کی جٹھانی اندر چلی آئی۔

"شکر ہے' چائے تیار ہے۔" اس کی جٹھانی رانیہ نے اسے کپ میں چائے ڈالتے دیکھا تو ہلکی پھلکی ہوگئی۔

"یہ تو صرف ایک کپ ہے بھابھی۔۔۔" اس نے مڑ کر کرسی پہ بیٹھتی ہوئی رانیہ کو دیکھا جس کا منہ سا بن گیا۔

"اور یہ میرے لیے ہے۔" سونیا نے تیزی سے کہا اور ساتھ اپنا کپ بھی اٹھالیا' رانیہ خفگی سے سعدیہ کو دیکھنے لگی کہ یہ اسے بھی تو دے سکتی تھی۔

"میں لیٹ ہوجاؤں گی یار۔۔۔ مجھے آج جلدی آفس پہنچنا تھا۔" اس نے اپنے آفس جانے کا جتایا کہ وہ کمانے ہی جارہی ہے ایسے میں یہ چائے اس کا حق بنتا ہے۔

"اوکے۔۔۔ میں ابھی بنا دیتی ہوں۔" سعدیہ نے سرہلا کر فریج سے دودھ نکالا اور دیگچی چولہے پہ چڑھا دی۔

"ہاں جلدی سے۔ اور آملیٹ بھی ساتھ ہی بنادو۔۔۔ میں ابھی ناشتا کروں گی۔" رانیہ گیلے بالوں میں انگلیاں چلاتی آرام سے تازہ اخبار دیکھنے لگی۔

"جی۔" وہ تیزی سے پیاز کاٹنے لگی تب ہی تیز چھری انگلی پہ پھر گئی۔

"بھابھی میرے کپڑے۔۔۔" چائے پی چکنے کے بعد سونیا کو پھر اپنے کپڑے یاد آئے۔ سعدیہ کی "سی" کسی کو سنائی نہ دی۔

"ٹھہرو سونیا! میں بھابھی کو ناشتا دے لوں۔ تمہارے کپڑے بھی استری ہوجائیں گے۔" خون بہاتی انگلی اس نے پانی سے صاف کی اور دوپٹے سے دبا کر چھوڑ دی۔

"پھر جلدی آئیے گا۔ لائٹ ہی نہ چلی جائے۔" سونیا کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔ وہ آملیٹ کے لیے انڈے پھینٹنے لگی کہ چھری کا درد لے کر بیٹھنے کا فائدہ۔ سعدیہ نے نفی میں سرہلایا۔

"بی اماں کو چائے دے آئیں؟" اخبار پڑھتے پڑھتے رانیہ کو یاد آیا۔

"نہیں۔ ابھی تو صرف ریحان اور سونیا نے پی ہے۔"

"تم بہت لیزی ہو قسم سے۔ بی اماں کب سے آوازیں دے رہی ہیں تمہیں۔"

رانیہ یوں گویا ہوئی جیسے بی اماں کی ذمہ داری صرف سعدیہ کی ہو۔

"اوہ۔ میں نے تو سنا ہی نہیں۔ وہ چائے مانگ رہی ہوں گی۔ اب تو غصہ آگیا ہوگا انہیں۔" سعدیہ شرمندہ ہوگئی اور ساتھ خفیف بھی۔

"دماغ حاضر رکھا کرو یار۔۔۔ اب وہ خوامخواہ شور مچائیں گی۔"

"آپ یہ ناشتا کریں۔ میں انہیں چائے دے آؤں۔" وہ رانیہ کے سامنے ناشتا رکھ کر جلدی سے ساس کے لیے چائے نکال کر باہر آگئی۔

ڈرتے ڈرتے ان کے کمرے میں آئی تو اس کی توقع کے عین مطابق وہ سرخ چہرہ لیے آنکھوں میں غضب کا غصہ سمیٹے اسے گھور رہی تھیں۔ اس کے ہاتھوں پیروں سے جان جانے لگی۔

"بہری ہوگئی ہو کیا؟ میں کب سے تمہیں آوازیں دے رہی ہوں' سنائی نہیں دیتا کیا؟" اس کے آتے ہی وہ تڑخی تھیں' وہ دبک گئی۔

"آئم سوری بی اماں۔۔۔ میں ریحان' سونیا اور رانیہ بھابھی کو ناشتا دے رہی تھی۔" اسے سمجھ نہ آیا کہ کیا کہے اسے ساس کے غصے سے بہت خوف آتا تھا۔

"تمہاری بڑی میں ہوں یا وہ؟" وہ درشتی سے پوچھنے لگی وہ گھبرا گئی۔

"بی اماں! ریحان کو انٹرویو کے لیے جانا تھا اور رانیہ بھابھی کو آفس کے لیے۔" ڈرتے ڈرتے اس کے منہ سے نکلا تو وہ دھاڑیں۔

"تو وہ خود بھی ناشتا بنا سکتی ہے اپنے لیے۔" وہ کیا کہہ سکتی تھی۔ صرف سرہلا کر باہر نکل آئی کہ اس کا شوہر آذر اسے باہر آوازیں دے رہا تھا اسے وہاں سے

نکل آنا ہی مسئلے کا حل لگا۔

"جی۔۔۔" آذر دروازے میں کھڑا اسے قہر برساتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"میں کب سے تمہیں بلا رہا ہوں آواز نہیں آتی کیا؟" ادھر آذر کا غصہ بھی سوا سیر تھا۔

"آذر! وہ میں بی اماں کو چائے۔۔۔"

"بس بس رہنے دو۔۔۔ سب کی کرو جی حضوریاں۔ میری ایک بھی نہ سننا۔" وہ ناراضی سے کہتا اس کے ہاتھ پاؤں پھلا گیا۔

"آئم سوری آذر۔۔۔" وہ روہانسی ہو گئی۔ سمجھ نہ آیا اسے کیسے سمجھائے۔

"آذر وہ پہلے ریحان۔ سونیا پھر رانیہ بھابھی ناشتا مانگنے لگیں تو میں کیا کرتی۔ سب کو اپنے اپنے کاموں پہ نکلنا تھا۔" وہ رو دینے کو تھی آذر نرم پڑ گیا۔

"میں نے تمہیں میچنگ ٹائی نکالنے کو کہا تھا۔" اب کی بار وہ ذرا سا نرم پڑا۔

"میں ابھی نکال دیتی ہوں۔" وہ اندر جانے لگی تب ہی پیچھے سے اسے سونیا نے پکار لیا۔

"بھابھی! لائٹ چلی جائے گی۔ پلیز مجھے کپڑے استری کر دیں۔"

"میں آتی ہوں۔" سرہلا کر وہ آذر کے ساتھ کمرے میں آ گئی۔ جلدی جلدی تمام ٹائیاں نکال کر آذر کے سامنے رکھیں جو استری شدہ شرٹ کو تنقیدی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

"یہ کون سی شرٹ نکال دی یار۔ کہا بھی تھا سی گرین کرنا اب یہ بلیو شرٹ پہن کر میں آفس جاؤں گا کیا؟"

اب کی بار وہ ناراضی سے شرٹ کو نہیں اسے دیکھ رہا تھا' جسے خود کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ اس نے کیا کر دیا۔ سونیا نے نیلے کپڑوں کا کہا اس نے ہرے کر دیے۔ آذر نے ہری شرٹ کا کہا اس نے نیلی کر دی یقیناً" اس کا دماغ حاضر نہیں رہتا۔ وہ خود کو ملامت کرتی آذر کی سی گرین شرٹ لے کر سونیا کے کمرے میں چلی آئی جہاں سونیا صبح صبح فون پہ کسی سے گپیں ہانک رہی تھی۔

"بھابھی! پہلے میرے کپڑے استری کرنے ہیں۔ بھائی کی شرٹ بعد میں۔۔۔" اس کے ہاتھ میں آذر کی قمیص دیکھ کر یقیناً" سونیا اس کا ارادہ بھانپ گئی تھی' جب ہی اسے حکم دیا وہ سرہلا کر پہلے اس کے کپڑے استری کرنے لگی۔ ابھی اس کے کپڑے استری کر کے سائیڈ پہ رکھ کر آذر کی قمیص استری کے نیچے رکھی ہی تھی جب آذر غصے سے ہانپتا اندر آ گیا۔

"کب دو گی شرٹ۔۔۔ پتا بھی ہے میں آفس سے لیٹ ہو رہا ہوں اور تم یہاں سلفی لگا کے بیٹھ گئی ہو۔" غصے سے بولتے ہوئے اس نے اس کے ہاتھ سے قمیص چھین لی جو ابھی ویسے کی ویسے ہی تھی۔ آذر گویا کرنٹ کھا کر سیدھا ہوا۔

"یہ کیا۔۔۔ تم نے ابھی تک اسے استری ہی نہیں کیا؟" وہ بگڑ ہی تو گیا تھا۔

"آذر میں سونیا کے۔۔۔" وہ ہکلائی' وہ اسے کھا جانے والی نظروں سے دیکھنے لگا۔

"تم بہت کام چور ہو گئی ہو۔ مجال ہے جو میرا ایک کام بھی تم سے ٹھیک طرح سے ہو جائے۔" وہ ناراضی سے بولتا اس کی بات کاٹ گیا اور شرٹ زور سے اس کے اوپر پھینک دی۔

"یہ رکھو اپنے پاس۔ مجھے نہیں پہننی یہ۔۔۔" غصے سے کہہ کر وہ باہر نکل گیا تو وہ پھولے ہوئے ہاتھوں پیروں اور سانسوں سمیت "آذر' آذر" کرتی اس کے پیچھے ہولی' مگر اس نے وہی نیلی قمیص اٹھا کر غصے سے پہنی فائل اٹھائی اور تن فن' تن فن کرتا باہر نکل گیا۔

"آذر! ناشتا تو کرتے جائیں۔" وہ رونے کو تھی' مگر آذر نے ان سنی کر دیا۔

"آج پھر اسے بھوکا نکال دیا گھر سے؟" بی اماں نے سختی سے اس سے پوچھا تو اس کا جی چاہا دھاڑیں مار مار کر رو دے' مگر کمال ضبط سے آنسو وہیں آنکھوں میں دباتی واپس اپنے کمرے کی طرف پلٹ آئی۔

"سعدیہ! کہاں غائب ہو گئی ہو یار۔۔۔ اویس کو ناشتا دو۔ یہ مجھے بھی لیٹ کر رہے ہیں۔" رانیہ نے اپنے

اپنے کمرے کی طرف مڑتے دیکھا تو پکار لیا۔ اس نے گیلی ہوتی آنکھوں کو وہیں رگڑ ڈالا۔

"اویس بھائی کو آپ کے ساتھ جانا ہے؟" گلوگیر لہجے میں پوچھا۔

"ہاں۔" رانیہ اس کی آواز میں بھیگا پن محسوس کرکے بھی انجان بن گئی۔

"پھر بچوں کو کون ڈراپ کرکے آئے گا؟" اس نے آہستہ سے پوچھا حالانکہ جواب پہلے سے پتا تھا۔

"بچے کہاں ابھی جاگے ہیں۔ اویس کو ناشتا دے کر تم انہیں جگانا تیار کرکے ناشتا کرانا اور پھر خود ہی انہیں ڈراپ بھی کر آنا۔ ہم تو لیٹ ہو جائیں گے یار۔" رانیہ نے فوراً" حل پیش کیا تھا۔ وہ زبردستی مسکرادی۔

"آپ بچوں کو جگا دیں۔ میں سب کے لیے ناشتا تیار کرتی ہوں۔"

"میں لیٹ ہو رہی ہوں، لیکن پھر بھی جگا آتی ہوں۔ تم جلدی سے پہلے اویس کو ناشتا دو۔" اس نے سرہلایا تو رانیہ باہر نکلنے لگی۔

"اور ہاں بچوں کے ٹفن تیار ہیں نا؟" وہ ایک بار پھر واپس مڑی تھی۔

"ہاں وہ میں نے رات ہی کو تیار کر دیے تھے۔" رانیہ سرہلا کر باہر نکل گئی۔ اویس کو ناشتا دے کر اس نے بچوں کو ناشتا کرایا، انہیں تیار کرکے ڈراپ کرنے چل دی کہ گھر میں ایک گاڑی ہر وقت موجود رہتی تھی سوئے قسمت اسے ڈرائیونگ آتی تھی، ہر دوسرے تیسرے دن بچوں کو پک اینڈ ڈراپ کرنا اس کا معمول تھا۔ بچے اس کے اپنے نہیں بلکہ جیٹھ اویس اور جٹھانی رانیہ کے تھے، لیکن گھر کے باقی لوگوں کی طرح یہ بچے بھی اس کی ذمہ داری بن چکے تھے۔

اسے یہاں بیاہ کر آئے ہوئے دوسرا سال تھا اور اسے نہیں یاد پڑتا تھا کہ ان دو سالوں میں کبھی رانیہ، بی اماں یا سونیا نے بچوں کو ناشتا لنچ یا ڈنر کرایا ہو۔ کبھی فرصت سے ان کے لیے کھانا بنایا ہو یا اپنے ہاتھوں سے انہیں کھلایا ہو۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی بچوں کو سلانے، جگانے، نہلانے، دھلانے کی ذمہ داری بھی اس کے سر ہو گئی تھی۔ جو اس دن سے لے کر آج تک بہت احسن طریقے سے نبھا رہی تھی۔ سعدیہ جہاں بہت صبر، برداشت والی لڑکی تھی، وہیں بے حد خوش اخلاق، ہنس مکھ اور صلح جو قسم کی لڑکی تھی۔ اسے لڑنے جھگڑنے سے شروع سے نفرت تھی۔ اپنے ماں باپ کے گھر بھی اس نے کبھی اپنی ماں کو اپنی نندوں، ساس دیورانیوں، جٹھانیوں حتیٰ کہ اپنے شوہر سے لڑتے نہیں دیکھا تھا اور یہ بات اور عادت اسے شاید گھٹی میں ملی تھی۔

وہ آذر سے بیاہ کر یہاں آئی تو آذر نے پہلی ہی رات اسے محبت سے کہہ دیا کہ وہ اس گھر کو اپنا گھر سمجھے..... آذر کے گھر والوں کو اپنا سمجھے۔ سب کی تابع اور فرماں بردار رہے۔ وہ پہلے ہی سے صلح جو اور انتہائی فرماں بردار قسم کی لڑکی تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے سارے گھر کا کام اپنے سر لے لیا۔ پہلے گھر میں ایک ملازمہ آتی تھی جس کی تنخواہ اویس دیتا تھا۔ اس کے گھر آنے کے بعد رانیہ نے بی اماں سے کہہ کر اسے فارغ کرا دیا۔ اسے اچھا تو نہ لگا کہ تھوڑی بہت مدد ملازمہ کرا دیتی اس کا کام بٹ جاتا، لیکن رانیہ اور بی اماں کے سامنے وہ کچھ بول نہ سکی۔

ایک دوبار آذر سے ہلکا سا کہا کہ وہ اس کی مدد کے لیے کوئی ملازمہ رکھ دے، آگے سے وہ ہوں، ہاں کہہ کر ٹال دیتا کہ ابھی اس کی ملازمت نئی نئی تھی، تنخواہ اس قابل نہیں تھی کہ وہ اپنے خرچے سے کوئی ملازمہ افورڈ کر سکتا۔ آذر کی ٹال مٹول سے وہ سمجھ گئی تو خاموش ہو گئی، لیکن ایک دن باتوں ہی باتوں میں رانیہ بھابھی سے کہہ دیا تو جواباً" بھابھی نے سہولت سے منع کر دیا۔

"یار! اس خاندان میں ملازم رکھنے کا رواج نہیں ہے۔ یہاں ہر کوئی اپنے ہاتھ سے کام کرنے کا عادی ہے۔ وہ ملازمہ تو میں نے زبردستی دو ہفتوں کے لیے رکھی تھی کہ آذر کی شادی کے ہنگاموں میں بہت کام ہو تا تھا۔ بی اماں مان نہ رہی تھیں جب ہی میں نے اویس سے کہہ کر صرف دو ہفتوں کے لیے وہ رکھی اور

پھر تم آگئیں۔ تمہیں تو ہر کام بخوبی آتا ہے جب ہی ہم نے اسے فارغ کردیا اور ویسے بھی یار ہم تو ہوئے دفتروں میں کام کرنے والے مصروف لوگ۔۔۔ تم ہاؤس وائف ہو۔ گھر کی عورتوں کو تو گھر کے کام کرنے ہی چاہئیں۔"

"دفتروں میں جانے والی عورتیں بھی اپنا کام خود کرتی ہیں بھابھی۔۔۔ تنخواہ لانا ہی سب کچھ نہیں ہوتا گھر کو بنانا اور سنوارنا بھی عورت کی ذمہ داری ہوتا ہے۔"

اس کا جی تو چاہا کہہ دے، لیکن خود پہ کنٹرول کرگئی۔ پھر اس دن سے لے کر آج تک وہ گھر کو کیا گھر کے تمام مکینوں کو سنبھالے ہوئے تھی۔ کبھی ماتھے پہ بل آیا نہ شکن پڑی، دن رات کام میں جتی رہتی۔ گھر کے کاموں اور گھر کے مکینوں نے اسے گھن چکر بنا دیا تھا، لیکن وہ تھی کہ خوش اخلاقی اور تابع داری سے ہر کام سر جھکائے کیے جاتی، لیکن اب کچھ دنوں سے آذر اس کی مصروفیت سے چڑنے لگا تھا۔

وہ جب بھی گھر آتا، یہ کام میں مصروف ہوتی۔ کبھی کھانا بن رہا ہوتا، کبھی گھر صاف ہو رہا ہوتا، کبھی کپڑوں کی دھلائی، کبھی بچوں کی نہلائی۔۔۔ آذر کو وہ قائداعظم کے مقولے "کام کام کام" پہ پوری طرح فٹ بیٹھی دکھتی۔

آذر گھر آتا تو اسے کام کرتے دیکھتا۔ گھر سے جاتا تو اسے کام کرتے دیکھتا۔ اٹھتے، بیٹھتے، سوتے، جاگتے وہ اسے کام ہی کرتے دیکھتا، جب ہی تو وہ اب اس کے کاموں کے ساتھ ساتھ اس سے بھی چڑنے لگا تھا۔

وہ روز سوچتی کہ اسے سمجھائے گی۔ گھر کی ذمہ داریوں کا اسے بتائے گی، لیکن وقت ہی نہ مل پاتا۔ کبھی وہ گھر آتا تو اسے کاموں میں الجھے پاتا۔ اس کا انتظار کرتے کرتے سو جاتا اور کبھی یہ اپنے کاموں سے اس قدر تھکی ہوتی کہ آذر کے آنے سے پہلے ہی سو جاتی۔ دوسرے دن احساس تو ہوتا، لیکن مجبور ہوتی کہ کاموں کا انبار اتنا ہوتا ایسے میں آذر سے تفصیل سے بات کرنے کا موقع ہی نہ مل پاتا۔ آج بھی وہ اس سے ناراض ہو کر چلا گیا تھا۔

اس کا اندر تک غمگین تھا، لیکن کیا کرتی گھر کے پھیلاوے سمیٹتے سمیٹتے دوپہر کے کھانے کا وقت ہو گیا، پھر بچے آگئے ان کو کھلانا، پلانا، ہوم ورک کروا کے سلانا سب اس کے ذمے تھا۔ بی اماں کو دوپہر کے کھانے میں میٹھا لازمی چاہیے ہوتا تھا۔ آج دن کو وہ نہ بنا سکی تو وہ بھی ناراض ہو گئیں جب ہی بچوں کو سلا کر وہ ان کے لیے کھیر بنانے میں جت گئی۔

چاول کی کھیر بنتے بنتے وقت لگ گیا۔ عصر ہوئی تو گھر کے افراد لوٹنا شروع ہو گئے۔ سونیا یونیورسٹی سے آتے ہی کھانے پہ لپکی۔ ریحان ابھی تک ناراض تھا۔ شاید انٹرویو ٹھیک طرح سے نہ دے پایا تھا۔ عذر۔۔۔ کیا کہ صبح گھر سے بھوکا نکلا تھا تو پھر کیسے کچھ ہو پاتا۔ سعدیہ بے چاری شرمندہ ہو کر رہ گئی کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے انٹرویو میں ناکام ہو گیا۔

کھانے کے بعد چائے کا دور چلا جس میں گھر کے تمام لوگوں کو لوازمات سے بھری پلیٹیں چاہیے ہوتی تھیں، سموسے اور نمک پارے بنا بنا کر وہ تھک سی گئی۔ کچن میں صبح سے کھڑی تھی۔ ٹانگیں جواب دینے لگیں۔ تمام افراد کو چائے بمع لوازمات۔۔۔ پہنچا کر وہ اپنے کمرے میں سستانے کے لیے آگئی لیکن ابھی لیٹی ہی تھی کہ رانیہ بھابھی۔۔۔ وارد ہوئیں۔

"یار سعدیہ! یہ قمیص تو فٹ کر دو۔ کافی کھلی لگ رہی ہے۔" وہ کوئی نئے کپڑے سلوا کر لائی تھیں جو اپنے ساتھ لگا لگا کر دیکھ رہی تھیں۔ اس کا دل تو نہ چاہا لیکن بادل نخواستہ اٹھ کر قمیص پکڑ لی۔ تھوڑی دیر بعد وہ قمیص سیٹ کر کے رانیہ کو قمیص کمرے میں دینے گئی تو اسے بیڈ پہ الٹا لیٹ کر فون پہ مگن پایا۔ (واہ۔ اتنا آرام۔)

"بھابھی! یہ قمیص ٹھیک ہو گئی ہے۔"

"ہاں، ٹھیک ہے رکھ دو۔" ذرا سی گردن موڑ کر رانیہ نے کہا تو سر ہلا کر وہ قمیص رکھ کر باہر نکلنے لگی لیکن تب ہی رانیہ کی بات نے اس کے قدم پکڑ لیے۔

"ہاں۔ کام والی تھی۔ کل وقتی ملازمہ ہے یار۔"

رانیہ فون پہ کسی کو بتا رہی تھیں۔ اس کا سر چکرا کر رہ گیا اسے لگا اس کے سر پہ آسمان آن گرا ہو۔ چکراتے سر کے ساتھ وہ رانیہ کے کمرے سے باہر نکلی جب سامنے سے اسے اویس بھائی آتے دکھائی دیے۔

"سعدیہ ایک گلاس پانی تو پلا دو۔" چکراتے سر کے ساتھ پتا نہیں کیسے اس نے فریج سے پانی نکالا۔ گلاس میں انڈیلا اور اویس کو ان کے کمرے میں دینے آگئی۔ دروازہ کھلا ہوا تھا وہ بنا دستک کے اندر آگئی مگر اگلے ہی پل شرمندہ بھی ہوگئی کہ رانیہ کا سر اویس کے سینے پہ تھا اور اویس اس کے بالوں پہ بوسہ دے رہا تھا۔

"میں نے سارا دن تمہیں بہت مس کیا میری جان۔"

"جھوٹ نہ بولیں جناب مجھے سب خبر ہے۔"

"یقین نہ آئے تو میرے دل سے پوچھ لو۔" وہ اک ادا سے رانیہ پہ جھکا بے ساختہ سعدیہ کھنکاری۔

"اویس بھائی پانی۔"

"او۔ ہاں۔" دونوں فوراً سیدھے ہوئے۔ وہ فوراً پانی سائیڈ ٹیبل پر رکھ کر باہر بھاگی' یہ اور بات پیچھے اویس اور رانیہ کی ہنسی اسے صاف سنائی دی تھی۔ لاؤنج سے گزرتے ہوئے اسے بی اماں ٹی وی کے سامنے بڑی محویت سے شو دیکھتی نظر آئیں۔

"اے سعدیہ! فریج سے کوئی جوس لا دو یا پھر فریش **مینگو** جوس بنا دو۔ دل کو وحشت سی ہو رہی ہے۔" ڈانس شو سے ذرا کی ذرا نظریں گھما کے انہوں نے اس سے کہا اور خود دوبارہ سے ٹی وی میں گم ہو گئیں۔ اسے اپنی ٹانگیں بے جان ہوتی محسوس ہو رہی تھیں۔ پاس سے گزرتی سونیا جس نے کان سے فون لگا رکھا تھا کو پکارا تو وہ بولے بغیر آنکھوں سے کیا ہے۔ کا اشارہ کر کے پوچھنے لگی۔

"بی اماں کے لیے۔ فریش **مینگو** جوس بنا دو گی؟" اس نے بے چارگی سے پوچھا' جواباً سونیا نے فوراً نفی میں سر ہلایا۔

"میں ذرا بزی ہوں۔" سونیا کہہ کر چھپاک سے غائب ہوگئی' بادل ناخواستہ اسے ہی جوس بنانا پڑ گیا ابھی جوس گلاس ہی میں انڈیلا تھا جب بیٹ اور بال اٹھائے ریحان اندر آگیا۔

"ایک گلاس جوس میرے لیے بھی بھابھی۔ سخت پیاس لگی ہے۔" اس نے فرماں بردار "کام والیوں" کی طرح سر ہلا کر بی اماں والا گلاس اسے تھمایا اور ان کے لیے دوسرا بنانے لگی۔

بی اماں کو جوس پلا کر وہ اپنے کمرے میں آئی تو بی اماں اور رانیہ اسے باہر سے آوازیں دینے لگیں۔ وہ تھک کر اپنے بستر کو دیکھنے لگی۔ دکھتی کنپٹی کو ایک انگلی سے مسلتی اس نے بے جان ہوئی ٹانگوں کو بمشکل گھسیٹا۔ اور اپنے نرم ملائم بستر پر ایک نظر ڈال کر کمرے سے باہر نکل آئی۔ رانیہ اور بی اماں اس کے لیے ایک اور کام لیے بیٹھی تھیں۔

"سعدیہ! اویس کے کچھ دوست آرہے ہیں۔ کیا خیال ہے کھانے میں کیا کیا بناؤ گی؟" رانیہ یوں پوچھ رہی تھی جیسے دوست اس کے شوہر کے نہیں بلکہ سعدیہ کے شوہر کے آرہے ہوں۔

"آپ مینو بنا دیں۔ میں بنا دوں گی۔" کمزور سے لہجے میں کہتے ہوئے وہ آہستہ سے صوفے پہ بیٹھ گئی۔

"بیٹھنے کا ٹائم نہیں ہے یار۔ تم ابھی سے اسٹارٹ کر دو' کہیں دیر نہ ہو جائے۔" رانیہ کے کہنے پر وہ سر ہلا کر اسی وقت اٹھ گئی۔ مینو بہت لمبا تھا وہ جلدی جلدی ڈشز تیار کرنے لگی۔ حالانکہ اس وقت جو اس کی حالت ہو رہی تھی قطعی جی نہیں چاہ رہا تھا کہ ایک کام بھی کرے۔ رانیہ بار بار اندر جھانکتی ڈھکن اٹھا اٹھا کر کھانے دیکھتی' اچھی طرح تسلی کر کے باہر نکل جاتی۔ اسے اس وقت اپنا آپ واقعی رانیہ کی کل وقتی ملازمہ کا سا لگ رہا تھا۔ اسے خود پر ترس آنے لگا کہ جس کے پاس اپنے یا اپنے کام کے لیے ایک پل بھی نہیں تھا اور رانیہ کیسے گھر کی مالکن بنی مہارانیوں کی طرح اڑتی پھر رہی تھی۔

"چھوٹی امی۔ ہمیں نوڈلز تو بنا دیں۔" وہ بریانی کو دم پہ رکھ رہی تھی جب رانیہ کی بیٹی نے آکر اس سے فرمائش کر دی۔

"بیٹا میں اس وقت ذرا بزی ہوں۔ ابھی نہیں بنا سکتی۔" اس نے نرمی سے اسے منع کرنا چاہا تو وہ تیز تیز نفی میں گردن ہلانے لگی۔

"نہیں۔ مجھے ابھی چاہیے۔ ہمیں بھوک لگی ہے۔"

"دیکھو۔ بیٹا۔ میں کتنا کام کر رہی ہوں۔ ابھی تھوڑی دیر میں فارغ ہو کے بنا دیتی ہوں۔"

"ہمیں بھوک تو ابھی لگی ہے۔ تھوڑی دیر بعد بنانے کا کیا فائدہ ہوگا۔" تب ہی رانیہ اندر چلی آئی گویا پھر سے کچن کا وزٹ کرنے آئی تھی۔

"دیکھیں ماما۔ یہ ہمیں نوڈلز نہیں بنانے کے دے رہیں۔" بیٹی نے فوراً" شکایت لگائی۔

"میں نے ایسا تو کہا بیٹا۔"

"ڈونٹ وری۔ تم اپنے کمرے میں جاؤ۔ یہ ابھی بنا دیتی ہیں۔" اپنی پانچ سالہ بیٹی کو تھپکی دے کر رانیہ نے اپنے کمرے میں بھیج دیا۔

"بریانی تو دم پہ ہے یار۔ تم ابھی نوڈلز بنا دو۔ بچے ہیں بھوک لگ رہی ہوگی۔" رانیہ نے یوں کہا جیسے وہ بچے سعدیہ ہی کے ہوں۔ وہ گہری سانس لے کر نوڈلز کی تیاری کرنے لگی۔ رانیہ وہیں کرسی پر ٹک کر اپنے ٹچ اسکرین فون سے کھیلنے لگی۔

"تیاری کہاں تک پہنچی۔؟" اویس اندر آیا تھا۔

"آخری مراحل میں ہے۔"

"تم یہ فون چھوڑو۔ ان آخری مراحل کو جلدی سے نبٹاؤ وہ لوگ آنے ہی والے ہوں گے۔ سعدیہ فری نہیں لگ رہی۔"

"اب صرف سلاد رہتا ہے۔ سعدیہ فوراً" بنا لے گی یہ ایسے کام فوراً" کرنے کی عادی ہے۔"

"تم بھی تو کر سکتی ہو۔"

"میں بہت تھکی ہوئی ہوں یار۔ مجھ سے کچھ بھی نہیں ہوگا۔ تم جانتے تو ہو آفس کے کام بندے کو کتنا تھکا دیتے ہیں۔"

"ہاں یہ تو ہے' پھر یہاں کیوں گرمی میں بیٹھی ہو۔ جاؤ کمرے میں اے سی میں کچھ آرام کر لو۔" اویس نے بہت فکر مندی سے کہا تھا۔

"ہاں۔ ٹھیک کہہ رہے ہو' میں بھی یہی سوچ رہی تھی۔ یہاں تو بہت گرمی ہو رہی ہے۔" وہ کہنے کے ساتھ ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

"بھابھی یہ بچوں کے لیے لے جائیں۔" پیچھے سے اس نے پکارا تھا۔

"تم خود ہی دے آؤ یار' مجھے تو یہاں بیٹھ کے پسینہ آگیا۔"

رانیہ باہر نکل گئی وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئی۔

مہمان آئے کھانے کا دور چلا۔ آخر میں کسی کو چائے اور کسی کو کافی چاہیے تھی۔ وہ سب کو سرو کرتی کرتی تھکن سے ادھ موئی ہو گئی تھی۔ کھانے کے ڈھیروں خالی برتن تھے۔ جنہیں وہ اس وقت دھونا تو چاہتی تھی مگر ایک تو تھکن اور اوپر سے کچن کی گرمی سے اس کی جان جا رہی تھی۔ وہ خالی برتن وہیں چھوڑ کر اپنے کمرے کی طرف چلی آئی۔ اویس اپنے دوستوں کو الوداع کر کے واپس آرہا تھا۔

"اویس! آ بھی جاؤ۔ قسم سے میں تو آج بہت تھک گئی ہوں۔" اپنے کمرے کے دروازے میں کھڑی رانیہ بہت بوجھل اور تھکے ہوئے انداز سے کہہ رہی تھی۔

"بس آیا سرکار۔" اویس مسکرا کر کہتے ہوئے آگے بڑھا اور رانیہ کو کندھے سے لگا کر اندر لے گیا۔ اس نے گردن موڑ کر یہ سین دیکھا تھا اور پھر اندر چلی آئی۔

آذر سونے کی تیاریاں کر رہا تھا اسے دیکھ کر منہ دوسری طرف پھیر لیا۔ اس کا دل کسی نے مٹھی میں لے لیا۔ وہ آہستہ سے پاس لیٹ گئی۔ کچھ دیر آذر کی پشت دیکھی۔ اور پھر اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ دیا۔

"مجھے نیند آرہی ہے پلیز۔ ڈسٹرب نہ کرو۔" وہ گہری سانس لے کر کروٹ بدل کر سامنے دیکھنے لگی۔ آنکھیں پانی سے بھر گئی تھیں اب ان کا وہیں رکے رہنا محال تھا۔

"میں بہت تھک گئی ہوں آذر۔" اس نے کروٹ بدلے بدلے ہی کہا تھا۔

آذر کچھ نہ بولا اس کی سسکی نکل گئی۔ اگلے ہی پل آذر نے کروٹ بدلی اور اسے اپنی نرم و گرم بانہوں میں بھر لیا۔ وہ جو تھوڑی دیر پہلے سسکیوں پہ اکتفا کر رہی تھی۔ ہچکیوں سے رو پڑی۔
"میں بہت تھک گئی ہوں۔ پلیز مجھے معاف کردو۔" آذر اس کے سر کو ہولے ہولے تھپتھپا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"بھابی! باہر آئیں بھئی۔ مجھے کالج کے لیے جانا ہے۔" وہ لیٹی ہوئی تھی جب باہر سے سونیا نے دروازہ کھٹکھٹانے کے ساتھ ہی اسے آواز بھی دی تھی۔
"اے ہے یہ سعدیہ کہاں رہ گئی۔ مجھے چائے کب دے گی۔ سعدیہ۔ اے سعدیہ۔" بی اماں بھی تواتر سے اسے آوازیں دے رہی تھیں۔
"سعدیہ پلیز' میرا ناشتا لے آؤ۔ میں لیٹ ہو رہی ہوں یار۔" رانیہ یقیناً" آفس کے لیے تیار کھڑی تھی جب ہی عجلت میں لگ رہی تھی۔
"میرا ناشتا تیار ہے بھابی۔ پلیز فورا" لے آئیں' کہیں آج پھر نہ لیٹ ہو جاؤں۔" ریحان تو سب سے زیادہ عجلت میں لگ رہا تھا۔
"رانیہ! بچوں کو جگا دیا۔ سعدیہ سے کہو' وہی آج بھی انہیں ڈراپ کر آئے گی۔ ہم آفس سے لیٹ نہ ہو جائیں۔" اویس بھی یقیناً" ڈائننگ ٹیبل پہ آن بیٹھا تھا۔
"یار سعدیہ! لے بھی آؤ ناشتا۔" رانیہ بے حد ملائمت سے اسے بلا رہی تھی۔
"بھابی! میں لیٹ ہو گیا تو سارا قصور آپ کا ہو گا۔" خفگی سے بھرا لہجہ ریحان کا تھا۔ وہ انگلیوں سے ڈائننگ ٹیبل بجا بجا کر اپنی عجلت کا پتا دے رہا تھا۔
"بھابی! میں کالج سے لیٹ ہو رہی ہوں۔" سونیا اپنا گلا پھاڑ رہی تھی۔
"کم بخت لے بھی آ میری چائے۔ کیا مارنے کے ارادے ہیں۔" بی اماں نے غصے سے کہا ہی تھا کہ سعدیہ کے کمرے کا دروازہ کھل گیا۔ تک سک سے تیار سعدیہ آذر کی معیت میں باہر آئی تو سب نے ٹھٹک کر انہیں دیکھا۔
"بھابی! میرا ناشتا؟" ریحان ناراض ہوا۔
"یار سعدیہ! ہم لیٹ ہو رہے ہیں؟" رانیہ کو اپنی فکر تھی۔
"آئم سوری ٹو آل۔ آج سے میں نے آذر کا آفس جوائن کر لیا ہے شام کی چائے پہ ملاقات ہو گی۔" وہ اک ادا سے کہتی نہایت پر اعتماد انداز سے آذر کا ہاتھ پکڑ کر اس کے قدم سے قدم ملا کر چلتی ہوئی باہر نکل گئی۔ پیچھے سب کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ یہ اس گھن چکر کو کیا ہو گیا تھا؟ یہ کیسے چل پڑا تھا۔؟
"میرا ناشتا۔"
"میرا کالج۔"
"میرے بچے۔" بہت دیر بعد گھر میں آوازیں گونجی تھیں۔ گھن چکر کا چکر الٹا چلنے لگا تھا اور سب کو ہی چکر آ گئے تھے۔

○ صباح زرنشین

محبت کاروان ہے

ممانی نے چنے کی دال والی پلیٹ اٹھا کر پورے زور سے دیوار پر ماری تھی۔ انشراح کی آنکھیں پھٹ گئیں۔ ماربل لگی دیواروں اور فرش کو تین گھنٹے لگا کر صاف کیا تھا۔ اور ممانی نے اس کی محنت کو پل بھر کے اندر ہی اکارت کر دیا تھا۔ وہ شعلہ بار نگاہوں سے اسے گھورتی ایسے دیکھ رہی تھیں گویا کچا چبا جانے والی ہوں۔

"یہ دال بنائی ہے تم نے؟ اسے دال کہتے ہیں یا صابن خود ہی بتا دو؟" انشراح لب کچلتے کھڑی رہی۔

"اب کھڑی کھڑی میرا منہ کیا تک رہی ہو۔ جاؤ اور کال کر کے میرے لیے پیزا ڈیل آرڈر کرو۔ جاؤ۔"

تحکم سے پکارتے انہوں نے اس کو وہاں سے دوڑ لگانے پر مجبور کر دیا تھا۔

"توبہ ہے' زندگی عذاب بنا دی ہے اس لڑکی نے۔ جانے وہ کون سی منحوس گھڑی تھی جس وقت تم مجھ پر کسی عذاب کی طرح مسلط کی گئیں۔ منحوس ماری۔" ممانی کڑھتے ہوئے اسے نادیر کوستی رہیں اور اندر وہ آنسو پیتی پزا فرنچائز کو نمبر اور ایڈریس نوٹ کرواتی رہی۔

"کیا بات ہے بیگم صاحبہ! کیوں اس بے چاری پر چلا رہی ہو۔ تمہیں پزا ہی کھانا تھا تو ڈائریکٹ ہی آرڈر کر دیتیں۔ پھر دال کیوں بنوائی؟" ماموں کمرے سے باہر آئے تھے انشراح پر یکدم شفقت کی پھوار برسی۔ واحد وہی تھے جو اس گھر میں اس کی حمایت کر دیا کرتے تھے۔ بہت زیادہ تو نہیں کیونکہ گھر کا ماحول وہ قطعی اپنی یتیم و بے آسرا بھانجی کے لیے خراب نہیں کر سکتے تھے مگر وہ اس کا خیال ضرور رکھا کرتے تھے حتی المقدور۔

"آپ نے کس گناہ کی سزا میں مجھے اس لڑکی کا تحفہ بخشا انوار صاحب۔" ممانی ہمیشہ کی طرح خائف لہجے میں چلا کر بولیں۔

"میرا بیٹا مجھ سے دور ہو گیا۔ میری ممتا تڑپ تڑپ جاتی ہے جب اس منحوس ماری کی شکل دیکھتی ہوں تو۔ آخر کیا دیکھا تھا آپ نے اس میں۔" انشراح جب فائل میں بھیگا کپڑا اور پانی کی بالٹی دیوار صاف کرنے کے لیے لائی تو انہوں نے با آواز بلند اسے دیکھ کر کہا تھا۔ انشراح کا چہرہ تاریک ہو گیا۔ حالانکہ الفاظ نئے تھے

ناولٹ

نہ ہی لہجہ' نہ ہی کہنے والا۔ مگر تکلیف تو ہر دفعہ ہی جانے کیوں ہونے لگتی تھی۔ اور اتنی ہوتی تھی کہ درد آنکھوں کا سیل رواں بن کر بہتا۔ کہ چھپانا محال ہو جاتا اور اگر کبھی ممانی کی نظر پڑ جاتی تو وہ تو دو ہاتھ جڑنے سے بھی باز نہیں آتیں کہ "منحوس ماری تم نحوست پھیلا رہی ہو۔ میرا بچہ تو پہلے ہی پردیس میں ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

"ہوش کرو نیک بخت۔ مظالم کی چکی میں نہیں پس رہا تمہارا بیٹا۔ جو تم ہر وقت اس گھر کو میدان جنگ بنائے رکھتی ہو۔ کیا غلط کیا ہے میں نے اس کے ساتھ۔ بولو۔" انوار ماموں کو کبھی کبھار ہی غصہ آیا کرتا تھا مگر جب آتا تھا ممانی کے سارے کس بل نکال کر جاتا تھا۔

"جب میرا بچہ راضی نہیں تھا تو آپ نے اس منحوس ماری کے ساتھ کیوں پڑھوایا زبردستی اس کا نکاح۔ میرا بچہ اس دکھ سے یہ گھر چھوڑ کر چلا گیا۔ دو سال ہوگئے وہ واپس نہیں آیا۔ یہ کیا کم ظلم ہے۔"

"تو کیا کروں نکال دوں اس بے چاری کو گھر سے۔ چار معزز لوگوں کے درمیان اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر لایا تھا میں اسے۔ تحفظ اور عزت کا وعدہ کر کے۔ مگر تم نے تو اس بے چاری کو نوکرانی سے بھی بدتر درجہ دیا ہے۔ ابھی جی نہیں بھرا کیا تمہارا۔"

"نہیں بھرا میرا جی۔ اور بھرے گا بھی نہیں۔ تب تک جب تک میرا بیٹا واپس اس گھر میں نہیں آجاتا۔ اور آپ اس کی بات مان نہیں لیتے۔" وہ بھی ضد پر اڑی ہوئی تھیں۔

انشراح کے لیے یہ باتیں نئی نہیں تھیں معمول کی تھیں۔ وہ واقعی میں سب پر بھاری تھی۔ ایک بوجھ مسلسل کی طرح۔ ممانی کا صبر آزماتی تھی۔ انوار ماموں کا دم غنیمت نہ ہوتا تو جانے وہ کب کی اس گھر سے بے دخل کر کے نکال دی جاتی اور اب تک شاید کسی دارالامان میں پناہ گزین بن چکی ہوتی کہانی تو عام سی ہی تھی جو ہر دوسرے گھر کی ہوتی ہے یا ہر دوسری یا تیسری یتیم لڑکی کی ہوتی ہے۔ مگر سہنے کا انداز ہر ایک کا الگ اور جدا ہوا کرتا ہے۔ انشراح کی ماں کا جس وقت انتقال ہوا تو انوار ماموں کی منت سماجت کر کے انشراح کا نکاح انہوں نے راحیل سے کروایا تھا۔ اس کا باپ اگر نشئی اور جواری نہ ہوتا تو شاید ایسی نوبت ہی نہ آتی۔ ممانی تو جو غصہ ہوئیں سو ہوئیں' راحیل نے بھی کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ نکاح کے دوسرے ہی دن وہ گھر چھوڑ کر چلا گیا اور پھر چند روز بعد خبر ملی کہ وہ یہ ملک چھوڑ کر کوریا شفٹ ہو گیا ہے۔ انشراح کے آتے ہی ممانی کا اکلوتا بیٹا باہر چلا گیا۔ وہ جو کئی سالوں سے اندر ہی اندر کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو پایا تھا۔ مگر وہ ممانی کے کاغذوں میں سبز قدم ثابت ہوئی۔ کہ اس کی وجہ سے وہ اپنے بیٹے سے دور ہو گئیں۔

نوکرانی ہٹا دی گئی خود وہ جوڑوں کی مریضہ تھیں گھر کا سارا کام انشراح نے سنبھال لیا۔ نفرت' غصہ' بے زاری اور طعنے اسے شاباشی اور تنخواہ کے طور پر دیے جانے لگے۔ مگر وہ صبر کا گھونٹ پیے چپ کی بکل مارے وقت بتا رہی تھی اسے کسی سے بھی کوئی شکوہ نہیں تھا۔ اسے لگتا تھا کہ شاید وہ اسی قابل ہے۔ یہ بے حسی کی انتہا تھی' جو اس نے اپنے ساتھ ایسی ظالم سوچ کو وابستہ کر دیا تھا۔ مگر ایک طرح سے اچھا ہوا وہ خود ترسی کا شکار نہیں ہوئی بلکہ مضبوط ہو گئی۔ راحیل کی ماموں سے بات نہیں ہوتی تھی صرف ممانی سے ہوا کرتی تھی اور ممانی کی زبانی ہی اسے معلوم ہوتا رہتا کہ راحیل اس رشتے سے کس قدر ناخوش اور باپ سے کس قدر متنفر ہے۔ اور وہ انشراح سے تو اتنی نفرت کرتا ہے کہ اس نے قسم کھا رکھی ہے کہ جب تک وہ اس گھر میں ہے' وہ اس گھر میں نہیں رکھے گا۔ اتنا کہتے ممانی پھپک پھپک کر رونے لگتیں' اور تب انشراح کو ممانی کا درد دکھی کر دیتا۔ ان کی بے بسی کہ وہ بیٹے سے دور ہیں صرف اس کی وجہ سے' اور افسوس کی انتہا کہ انشراح کو وہ گھر سے نکال نہیں سکتیں۔ جب تک وہ اس گھر میں رہے گی راحیل واپس نہیں آئے گا۔ اور ایک ماں اپنے

بیٹے کے لیے ہمیشہ ہی ترستی رہے گی۔ انشراح نادانستہ ظلم کررہی تھی ایک ماں کی مامتا پر۔ اور بہت غلط کررہی تھی۔

انشراح نے خاموشی سے دیوار اور فرش صاف کیا اور اٹھ کر جانے لگی تب ہی ماموں نے پکارا تھا۔

"انشراح بیٹی۔ تم نے کھانا کھالیا؟" انشراح سے کچھ نہیں بولا گیا پتا نہیں جب بھی ماموں اس سے نرم لہجے میں بات کرتے تھے تو اس کی آنکھیں کیوں بھر آتی تھیں، وہ سمجھ نہیں پاتی تھی اس نے نفی میں سرہلادیا۔

"اچھا کیا۔ میں بازار سے شامی کباب لے آتا ہوں، ساتھ میں تمہارے لیے مرغ پلاؤ کی پلیٹ بھی لے آؤں گا۔ تم وہی کھالینا۔"

"ارے۔ واہ۔ میرے بیٹے کی کمائی ایسے اڑانے کے لیے تھوڑی ہے، جو اس کے لیے باہر سے کھانا آرہا ہے۔ گھر میں دال بنی ہے وہی کھائے یہ بھی۔" بیٹے کی کمائی کا احساس ممانی صرف انشراح کے حوالے سے کررہی تھیں جبکہ خود تو انہوں نے ڈیل منگوائی تھی۔

"یہ تمہارے بیٹے کی کمائی نہیں ہے نیک بخت۔ یہ میری ساری زندگی کی محنت کا صلہ ہے جواب میں گھر بیٹھے وصول کررہا ہوں۔ اور تمہارا اگر پزا کھانے کو دل چاہتا ہے تو میں اپنی بیٹی کو اس کی پسند کا کچھ بھی نہیں کھلا سکتا کیا؟"

"ماموں مجھے دال اچھی لگتی ہے۔ میں وہی کھاؤں گی۔" انشراح نے جھگڑے کو ختم کرنے کے لیے بات ختم کی جو کہ جھگڑا تو نہیں اصل میں وہ ہتک تھی۔ جو اسے کھانے کے معاملے میں ہمیشہ محسوس ہوا کرتی تھی۔ اسے سب کچھ کہہ لیا جائے وہ برداشت کرلیا کرتی، مگر کھانے کا طعنہ اس پر تیزاب کی مانند گرتا اور اس کی ہڈیوں کے گودے تک کو جلا دیتا۔ اسے سب کچھ کہہ لیا جائے مگر یہ نہیں کہ یہ سب کچھ کھا گئی۔ بھوک، ننگی، ندیدی سب کچھ۔ سب کچھ کھا جاتی ہے۔ اف اف۔ توبہ چہ چہ۔

"میں جانتا ہوں تم کھالیتی ہو۔ مگر میرا دل کررہا ہے کہ آج تم اپنی پسند کا کھاؤ کیوں میرا کہنا نہیں مانو گی؟"

ماموں آج کچھ زیادہ ہی موڈ میں تھے شاید۔ انشراح نے بے ساختہ نفی میں سرہلایا، آنکھ پھر بھی نم ہوگئی۔ ماموں نے دست شفقت رکھتے ہلکا سا سر تھپکا انشراح کو لگا جیسے اس کی ماں نے اسے آغوش میں بھرلیا ہو۔

☼ ☼ ☼

"عید آرہی ہے انوار صاحب۔ اور اس بار بھی میرا بچہ گھر نہیں آئے گا۔" دوسرے دن ممانی کی صبح کا آغاز ہی اسی ایک جملے سے ہوا تھا۔

"عید سے پہلے رمضان آئے گا اس کے سارے روزے رکھو، عبادت کرو اور خضوع و خشوع سے دعائیں مانگو۔ تمہارا بیٹا لوٹ آئے گا۔" ماموں نے اخبار تہہ کرکے سامنے ٹیبل پر رکھا اور بہترین مشورہ دیا۔

"روزے اور میں۔" ممانی نے کچھ ایسی حیرت سے دہرایا کہ انشراح کچن میں ناشتا بناتی سوچ میں پڑگئی۔

"کیوں۔ روزے کیوں نہیں رکھ سکتیں آپ؟" انوار ماموں نے تحمل سے پوچھا۔

"میرے جوڑوں میں درد ہوتا ہے میں چل پھر نہیں سکتی روزے کیسے رکھوں گی۔"

"روزہ رکھ کر آپ کو میراتھن ریس میں تو نہیں دوڑنا بھاگنا کہ آپ اتنی پریشان ہورہی ہیں۔" ان کا لہجہ ابھی بھی ٹھنڈا ٹھار اور ہموار تھا۔

"روزہ کمزور کردیتا ہے بہت اور پھر اتنی گرمی کے روزے۔ بس اللہ بخش دے ہمیں۔ ہماری ہمت سے بڑھ کر ہیں۔" ممانی کانوں کو ہاتھ لگاتے فوراً ہی توبہ تائب ہوگئیں۔

"سارا دن آپ ایئرکنڈیشن روم میں سوئی رہتی ہیں اٹھتی ہیں تو کھانا کھا کر پھر سوجاتی ہیں یا ٹی وی دیکھتی ہیں تو کیا کبھی آپ کو گرمی کا احساس ہوا۔ جو روزے کی حالت میں ہوگا۔"

"آپ صبح ہی صبح کس بحث میں پڑگئے انوار صاحب۔ میرا اور میرے اللہ کا معاملہ ہے۔ وہ بخشنے والا ہے بڑا رحیم اور کریم۔ آپ میری ٹینشن نہ لیں۔"

انوار ماموں ہلکا سا مسکرائے۔

"وہ کیوں بخشے گا آپ کو۔ آپ نے کبھی کسی کو بخشا ہے۔ ایک معمولی سی غلطی پر آپ طوفان اٹھا دیتی ہیں۔ مزاج کے خلاف کوئی بات نہیں سنتیں تو اللہ سے کیوں امید رکھتی ہیں کہ وہ آپ کو بخش دے گا۔ بہرحال یہ واقعی میں میرا مسئلہ نہیں ہے کہ آپ روزہ رکھتی ہیں یا نہیں۔ مگر میں صرف اتنا کہنا چاہتا ہوں کہ انشراح روزے کی حالت میں گھر کا سارا کام کرتی ہے۔ اور اس کے کمرے میں اے سی بھی نہیں ہے بہتر ہوگا کہ کچھ کام اپنے ذمے لے لیں یا جز وقتی ملازمہ رکھ لیں۔" اور اس بات پر تو ممانی یوں تلملائیں کہ ان کی آنکھیں ابل کر باہر آنے کو بے تاب ہوگئیں۔ مگر انوار ماموں کی خوفناک اسلامی باتوں سے ڈر کر بس پہلو بدل کر رہ گئیں۔

☆ ☆ ☆

رمضان المبارک کا بابرکت مہینہ شروع ہوا تو ممانی کا رونا اور واویلا اپنے عروج پر پہنچ گیا جو ایسے بھی ہر سال اپنے عروج پر ہی ہوتا، جب بھی عید بقرعید کا موقع ہوا کرتا ان کی عید، بقرعید عبادت سے مزین نہیں ہوتی تھیں، رونے دھونے اور انشراح کے بے ضرر وجود کو کوسنے میں ہی گزر جاتی۔ اصل حقیقت یہ تھی کہ ممانی کو وہ پسند نہیں تھی اس لیے وہ جتنا بھی اچھا کرتی انہیں کبھی نہ اس کی اچھائی نظر آتی نہ ہی کبھی وہ۔ لہٰذا انہوں نے ہمیشہ کی طرح صرف شکوہ، طعنہ اور بے زاری جیسے تمغے ہی اپنے ہاتھ سے اس کے گلے میں پہنائے تھے۔

اس بار جب راحیل کو یہاں سے گئے دو برس ہوگئے اور ان برسوں میں اس کے بغیر چار عیدیں ممانی نے اکیلے گزاریں تو ممانی کی صبر اور برداشت کی تو مانو حد ہی ہوگئی تاں اور ظالم انشراح نے ان کے بیٹے کو دربدر اور ماں کو روگی بنا کر بھی جان خلاصی نہیں کی تھی۔ انشراح کی گزشتہ دو برسوں میں راحیل سے ایک بار ہی بات ہوئی تھی، وہ بھی تب جب ممانی بازار گئی تھیں اور اپنا سیل لے جانا بھول گئی تھیں، تب راحیل انہیں کال کر رہا تھا اور بار بار کر رہا تھا۔ ماموں سے اس کی بات چیت بند تھی بالکل۔ تب اس نے ڈرتے ڈرتے فون اٹھایا تھا مبادا وہ اس کی آواز سن کر فون ہی نہ بند کردے۔ مگر انشراح کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب اس نے اس سے نہ صرف بہت اچھے انداز میں بات کی اور اس کا حال احوال بھی پوچھا تھا۔ تبھی تو وہ اس کا پھوپھی زاد مگر ان لوگوں کا آپس میں ملنا جلنا نہیں تھا۔ انشراح کے ابا میں گنتی کی ایک بھی اچھی عادت نہیں تھی۔ اس لیے انشراح کی پیدائش کے بعد ان کے لیے میکے کی دہلیز پر قدم رکھنا محال ہوگیا تھا اور وہ بھی صرف انوار ماموں کی اہلیہ کی وجہ سے۔ ان کا شمار کبھی بھی ایسی خواتین میں نہیں ہوتا تھا جو کھلے دل اور کھلے ہاتھ سے سسرالی عزیزوں کو عزت اہمیت کے ساتھ دو وقت کی روٹی دے سکیں، چاہے وہ روز آئیں یا کبھی کبھار ان کے ماتھے پر پڑنے والے بل باآسانی پڑھے اور گنے جاسکتے تھے اور انہیں ویسے بھی اس تردد کی بھی ضرورت نہیں رہا کرتی تھی کیونکہ اپنی ناگواری کا اظہار وہ برملا اپنی زبان کے جوہر دکھاتے اکثر و بیشتر کرتی ہی رہتیں۔ ایسے میں بھائی جتنا بھی اچھا ہو اگر بہن کی آمد پر بھابھی گھر میں فساد ڈال دے۔ منہ پھلا کر سر پر پٹی باندھ کر کمرہ بند کرکے سوجائے تو بہن بھائی کے گھر آنے جانے پر ہزار دفعہ نہ سہی مگر سو دفعہ تو سوچے گی ہی۔ لہٰذا انشراح کو ننھیالی پیار کبھی کبھار آنے والے ماموں کی محبت سے دیے گئے کھلونوں، اور کھانے پینے کی ان چیزوں سے ملنے لگا۔ پھر وہ اس کی فرمائش کے طور پر چیزیں لے کر آیا کرتے تھے۔ بچپن میں کبھی کبھار راحیل بھی آجایا کرتا۔ مگر اس کے بعد جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے اس نے آنا جانا کم کرتے کرتے بالکل ہی ختم کردیا۔ اور آخری بار جب وہ پھپھی کو دیکھنے آیا تو اس کے دل میں لحہ بھر کو بھی اگر یہ خیال آیا ہوتا کہ پھپھی اپنی بیٹی کی خوب صورت جوانی کے ڈر سے مر بھی نہیں پارہیں کہ اس کانشئی جواری باپ کہیں بیٹی کا سودا ہی نہ کر آئے، وہ کبھی بھی وہاں نہ جاتا۔ اس کا

بس چلتا تو وہ پھپھی کے ساتھ اپنے اس خونی رشتے کو سرنجوں سے نچوڑ نچوڑ کر اپنے بدن سے نکال دیتا آخری قطرہ بھی نہ رہنے دیتا۔ہاں البتہ جس کے نان نفقے کا ذمہ وہ اللہ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو گواہ بنا کر اٹھا کر لایا تھا اسی کی یاد اسے کبھی نہیں آئی۔

"سنو لڑکی۔! بازار سے افطاری کا سامان منگوانے کی قطعی ضرورت نہیں ہے تم سے افطاری نہیں بنتی تو بھلے روزے نہ رکھو۔ مگر میرے بیٹے کی خون پسینے کی کمائی اللے تللے میں اڑانے کی قطعاً" ضرورت نہیں ہے۔ سمجھیں تم۔" وہ تحکم سے کہہ کر چلی گئیں۔ انشراح اب انہیں کیا کہتی کہ ساری بات ہی تو ان کے سامنے ہوئی تھی ماموں بھانجی کے درمیان۔ پھر بھی ممانی نہ سمجھیں تو بھلا وہ کیا کر سکتی تھی۔ صبر کے گھونٹ پینے کے علاوہ۔

چند دن مزید سکون سے گزرے آٹھویں روزے کو ابھی انشراح فجر کی نماز ادا کر کے ذرا دیر لیٹی ہی تھی کہ ممانی کے کمرے سے رونے کی آوازیں آنے لگیں۔ انوار ماموں تو ویسے ہی صبح صبح مفتی صاحب کے گھر جایا کرتے تھے۔ مفتی صاحب ریٹائر فوجی تھے شطرنج کے رسیا۔ دونوں کی خوب بنتی تھی شطرنج کی بساط اور اس کے پیادوں کی چال پر۔ لہٰذا وہ تو بارہ بجے سے پہلے گھر آنے والے نہیں تھے۔ انشراح ننگے پیر بھاگی۔ ممانی کے کمرے کی طرف اندر سے ممانی کی آوازیں آرہی تھیں۔ ممانی راحیل سے بات کرتے ہوئے رو رہی تھیں۔

"دو سال ہونے کو آئے راحیل! تم نے ایک دفعہ بھی مجھے اپنی شکل نہیں دکھائی میری تڑپتی ممتا کا کیا قصور ہے۔ باپ بیٹے کی لڑائی میں میں کیوں پس رہی ہوں میں جانتی ہوں تم صرف اس منحوس ماری کی وجہ سے واپس نہیں آتے۔ دیکھو راحیل۔ مجھے اگر اب تو یہ کہے ناں کہ اسے گھر سے نکال دوں تو میں ' اسے نکالنے کو تیار ہوں' بس تم آجاؤ کسی بھی طریقے سے۔ اس کے بعد وہ پھپھک کر رونے لگیں۔ ان کا ایک ایک آنسو انشراح کو پاتال میں گراتا چلا گیا۔ صرف اس کی وجہ سے ایک ماں دن رات تڑپتی تھی۔ بے چین رہتی تھی' اس نے غیر جانب داری سے ممانی کی زندگی کا تجزیہ کیا' سارا دن وہ بے مصرف وقت پاس کرنے کے بہانے تلاش کیا کرتیں۔ ماموں تو صبح کے گئے دوپہر کو گھر آیا کرتے۔ انشراح تو پھر بھی کام کاج میں مصروف رہ کر فضول سوچوں کو اپنے ذہن میں جگہ نہیں دیا کرتی تھی۔ مگر ان کا کیا قصور تھا اب انشراح کو ان پر بہت ترس آیا۔ وہ اپنی جگہ کس قدر دکھی تھیں۔ انشراح کو پہلی بار مری ہوئی ماں سے شکوہ اور اپنا وجود قابل نفرت لگا۔ انشراح کی ذات میں جتنی بھی خوبیاں ہوتیں اس کے نصیب کی سب سے بڑی خامی یہ ہی تھی کہ وہ ایک غریب مجبور ماں اور نشئی' جواری اور شرابی باپ کی بیٹی تھی۔

اس کا دل چاہا وہ اندر جائے اور ممانی کو گلے لگا کر ان کے آنسو صاف کرے انہیں چپ کروا کر یہ یقین دلائے کہ ان کا بیٹا ضرور واپس آئے گا۔ وہ اس کے ساتھ وقت بھی گزاریں گی اور اس کی شادی اپنی پسند سے کر کے اس کے بچوں کو بھی کھلائیں گی' مگر انشراح سے قدم اٹھانا مشکل ہو گیا وہ اندر جاتی تو اور بھی معتوب ٹھہرتی۔ ممانی نے تو ویسے بھی چھپ کر باتیں سننے کا گناہ کسی فتوے کی طرح صادر کر دیا تھا لہٰذا بس تب کچھ سوچتے اور فیصلے کی ہمت پیدا کرتے وہ کمرے میں چلی گئی مگر نیند آسکی اور نہ ہی سکون۔

شام کو ماموں آئے تو ممانی نے سارا دن رو رو کر آنکھیں سجالی تھیں' ماموں کو جب ساری بات پتا چلی تو وہ خوب چلائے۔ روزے کی حالت میں ان کا بوڑھا وجود ہلکان ہو گیا۔ انشراح کو بہت زیادہ دکھ ہوا مگر اپنے لیے پھر بھی نہیں' صرف ماموں کے لیے جو بہن سے کیا عہد نبھانے کے چکر میں خوار ہو رہے تھے اور ممانی کے لیے بھی جن کی ممتا پیاسی اور بے چین تھی اور انشراح کو اپنا وجود تو ویسے بھی درد اور دکھ سے عاری محسوس ہوا کرتا تھا اپنے معاملے میں وہ بے حس تھی۔

"کچھ ہوش کے ناخن لو تم ماں بیٹا نیک بخت..... جوان جہان بچی کو میں کہاں چھوڑ آؤں اس معاشرے

کے گدھ تو اسے کیا نوچیں گے اس کا تو باپ ہی اس کی بولی لگانے میں پیش پیش ہوگا۔ مجھے دنیا میں منہ دکھانے لائق چھوڑ دو۔ خدا کے لیے۔" ماموں اس مرتبہ اتنے مجبور ہوگئے کہ ہاتھ جوڑ دیے۔ ممانی اور بھی شدت سے رونے لگیں۔

"کیا حرج ہے اگر آپ اسے اس کے باپ کے پاس چھوڑ آئیں گے تو... آخر وہ باپ ہے اس کا..."

"وہ بیچ کھائے گا اسے... دو سال اس نے رابطہ نہیں کیا اب کیسے جا کر اسے اس کی دہلیز پر چھوڑ آؤں ... کہ جاؤ اور پیسے کھرے کر آؤ اس کے بیچ دو اسے اپنے جیسے کسی نکمے اور جواری کے پاس..." وہ ہانپ سے گئے۔

"اب ایسا بھی ظالم نہیں ہے وہ... اگر پہلے سودا نہیں کیا تو اب بھی نہیں کرے گا۔ بیٹی ہے اس کی... آخر ایسی بھی کیا مجبوری کہ اپنے خون کا سودا کر دیا جائے۔"

"تم اپنے بیٹے کو سمجھا دو... انشراح کہیں نہیں جائے گی۔ اسے آنا ہے تو آئے ورنہ تمہیں بلا لے... میری بلا سے..." وہ اٹھ کر چلے گئے اور افطاری کے وقت ہی کمرے سے نکلے۔ بمشکل تمام انشراح نے انہیں افطاری کروائی۔ رات وہ ان کے کمرے میں آئی تو انوار ماموں جیسے جان گئے کہ وہ کیا کہنے آئی ہے تب ہی دو ٹوک الفاظ میں اسے کچھ بھی کہنے سے روک دیا' مگر انشراح ــــ ڈھٹائی سے وہ سب کہتی رہی جو وہ کہنے آئی تھی۔

"ماموں... پلیز... مان جائیں نا... مجھے آپ کا سہارا بہت ہے آپ مجھے کسی ہوسٹل میں ٹھہرا دیں... میں رہ لوں گی بلکہ جلدی میں کوئی اپنا بندوبست بھی کر لوں گی... مگر راحیل کو گھر واپس آنے دیں... ایک ماں سے اس کا بیٹا مت چھینیں۔" انوار ماموں نے اس کی جذباتی تقریر کے جواب میں بس اتنا کہا کہ انشراح شرمندہ ہوگئی۔

"مجھے طمانچہ مارنے کے لیے تمہیں یہی ایک بات ملی تھی کیا۔"

"نہیں ماموں جان..." انشراح نے بے ساختہ ان کے ہاتھ تھام لیے۔ "میں ایسا سوچ بھی نہیں سکتی۔"

"تو پھر ایسا کیوں کہہ رہی ہو... مجھ پر تم بوجھ ہو نہ ہی یہ لوگ مجھ پر اتنے حاوی کہ ان کی ہر ناجائز مانتا پھروں... میں اتنا کمزور نہیں کہ ان کی گیدڑ بھبکیوں سے ڈروں۔"

"بات ڈرنے کی نہیں ہے ماموں جان... میں جانتی ہوں اگر آپ ڈٹ جائیں گے تو کوئی کچھ نہیں کر سکے گا۔ مگر بات تو ممانی جان کی اس بلکتی ممتا کی ہے۔ جس نے دو سال سے بیٹے کی شکل نہیں دیکھی... آپ نہیں جانتے ماموں جان... وہ سارا سارا دن روتی رہتی ہیں... میں خود کو ان کا مجرم سمجھتی ہوں' مجھے شرمندگی اور دکھ ہوتا ہے انہیں اس حالت میں دیکھ اور سوچ کر کہ ان کی اس حالت کی ذمہ دار میں ہوں... پلیز ماموں جان..." ماموں جان بغور اس کا بے ریا' مخلص چہرہ دیکھتے رہے۔

"کس مٹی کی بنی ہو انشراح بیٹا... اتنی نفرت سہنے کے باوجود بھی تمہارے اندر کا خیر دوسروں کی فلاح چاہ رہا ہے... تم کتنی عظیم ہو انشراح..." وہ اس سے یوں بولے کہ انشراح شرمندہ ہوگئی۔

"ایسا مت کہیں ماموں جان... میں بہت عام سی لڑکی ہوں... عظیم تو آپ اور ممانی جان ہیں جنہوں نے مجھے اس وقت سہارا دیا جب میرا باپ بھی میری ذمہ داری لینے سے انکاری تھا۔"

"اس گھر پر تمہارا پورا پورا حق ہے اور مجھے امید ہے ایک وقت آئے گا جب سب کچھ ٹھیک ہو جائے گا... بس میرا بچہ تم نے ہمت نہیں ہارنی۔" وہ اسے گلے سے لگا کر اس کا سر تھپکتے رہے' انشراح تادیر ان کے کندھے سے لگی' آنسو ان کے قمیص پر گراتی رہی جسے وہ بغیر جتلائے جذب کرتے رہے۔

☼ ☼ ☼

اگلی صبح ماموں نے اعلان کر دیا۔ کہ انہیں راحیل

کی شرط منظور ہے۔ وہ واپس آسکتا ہے۔ ممانی ناشتا کر رہی تھیں نوالہ کھانا بھول گئیں۔ تادیر یک ٹک ماموں کی طرف دیکھتی رہیں۔

"کیا کہہ رہے ہیں انوار صاحب۔۔۔"

"وہی جو تم اور تمہارا بیٹا چاہتے تھے۔۔۔ اسے واپس بلالو۔۔۔ انشراح اس کے آتے ہی یہاں سے چلی جائے گی۔" ماموں نے نگاہ چراتے بمشکل ضبط سے کہا تھا۔

"ٹھیک ہے۔۔۔ تو پھر میں آج ہی راحیل سے کہتی ہوں کہ طلاق کے پیپرز تیار کروائے۔" وہ تو روئی کے گالے کی مانند ہلکی ہو کر خوشی سے چلائیں۔۔۔ ماموں تو ماموں۔۔۔ انشراح کا سانس بھی حلق میں اٹک گیا۔ پھر خود ہی مطمئن ہو گئی کہ ایسا تو ہونا ہی تھا۔ جب وہ اس کی اس گھر میں موجودگی برداشت نہیں کر سکتا تو پھر اپنی زندگی میں کیسے کرتا لہٰذا یہ کوئی انہونی بات نہیں تھی۔ انشراح نے سر جھٹک کر دوبارہ برتن دھونا شروع کر دیے۔

"اب یہ کیا نیا ڈرامہ ہے نیک بخت۔۔۔" ماموں حسب عادت دھاڑے تھے۔

"لو۔۔۔ ڈرامہ کیسا اتنے دن میں آپ کو یہی تو بتا رہی تھی کہ راحیل نے شرط رکھی ہے کہ وہ اس گھر میں تب ہی قدم رکھے گا جب انشراح یہاں سے ہمیشہ کے لیے جائے گی۔" انہوں نے اتنی آسانی سے اور اتنے ہلکے پھلکے انداز میں کہا گویا کسی سبزی کی بات کر رہی ہوں کہ راحیل کو یہ سبزی پسند نہیں۔۔۔ لہٰذا یہ سبزی آج کے بعد اس گھر میں نہیں بنے گی۔

"خدا کا خوف کرو۔۔۔ ایک یتیم بے سہارا بچی کے ساتھ اتنا ظلم۔۔۔ تمہاری اپنی بیٹی ہوتی تو کیا اس کے ساتھ بھی یہی کرتیں تم۔۔۔؟؟"

"میری اپنی بیٹی بھی ہوتی تو میں اسے یوں زبردستی کسی کے سر منڈھنے کی کوشش کبھی نہیں کرتی انوار صاحب۔۔۔" ممانی کا تحمل اپنے عروج پر قائم تھا۔

"میں ایسا کبھی نہیں ہونے دوں گا۔" انہوں نے ٹھنڈے لہجے میں اپنا فیصلہ سنایا۔

"اور میں بھی اپنے بیٹے کی زندگی داؤ پر نہیں لگنے دوں گی۔۔۔ زہر دے کر ماردوں گی اس نحوست کی پڑیا کو۔۔۔ جب سے آئی ہے ایک دن بھی سکون سے نہیں جینے دیا اس نے مجھے۔۔۔"

"اس سے پہلے تھوڑا زہر مجھے بھی دے دینا تم۔۔۔ تاکہ مجھ بوڑھے سے بھی جان چھوٹ جائے اور تم ماں بیٹا کھل کر عیش اور من پسند زندگی گزار سکو۔" وہ وہاں سے اٹھ کر چلے گئے۔ انشراح کا برتن دھوتا ہاتھ وہیں رک گیا۔ معاملہ اس کی سوچ سے زیادہ نازک اور گمبھیر تھا۔

"بس ہو گئیں خوش۔۔۔ پڑ گئی تمہارے کلیجے میں ٹھنڈ۔۔۔ ہو گیا ہمارا گھر کا سکون تتر بتر۔۔۔ لو۔۔۔ جشن مناؤ۔۔۔ تمہاری نحوست نے آج ہم میاں بیوی کو بھی لڑوا دیا۔۔۔ باپ بیٹا تو پہلے ہی بات نہیں کرتے تھے اب انوار صاحب مجھ سے بھی لاتعلق ہی ہو گئے اور یہ سب تمہاری مہربانی ہی سمجھو بی بی! مجھ ناتواں اور غریب پر۔۔۔"

انشراح کو معلوم ہی نہیں ہو سکا کہ وہ کس وقت اس کے سر پر آن کھڑی ہوئیں اور اتنا چلائیں کہ انشراح سہم کر دیوار سے جا لگی۔

"جان چھوڑ دو خدا کے لیے ہماری تم۔۔۔ لو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں تمہیں اللہ رسول کا واسطہ۔۔۔ کہیں چلی جاؤ۔۔۔" انہوں نے انتہائی لجاجت سے کہا اس کے بعد ممانی تو اپنے کمرے میں چلی گئیں خود وہ بھی اپنے کمرے میں آکر اپنی جمع پونجی سمیٹنے لگی۔ اس گھر سے کچھ اچھی یادیں تو اس کی پہلے ہی وابستہ نہ تھیں جو یادوں کا زاد راہ آنچل میں بھر کر لے جاتی۔ اس کے پاس چند ہزار کے نوٹ تھے جو کبھی کبھار ذاتی خرچے کی مد میں ماموں اسے پکڑا دیا کرتے تھے اور دو چار جوڑے ایک بیگ میں ٹھونسے اور ایک چھوٹی سی پرچی پر ماموں کے نام پیغام لکھ کر ان کے اسٹڈی ٹیبل کی دراز میں رکھ کر خاموشی سے باہر نکل آئی۔ جتنے طوفان اٹھا کر وہ ان سب کی زندگیوں میں آئی تھی اتنی ہی خاموشی سے وہ ان سب کی زندگی سے نکل رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

شام کو جب ماموں گھر آئے تو گھر میں خاموشی معمول سے بڑھ کر تھی۔۔۔ انہوں نے افطاری کے سامان والے شاپر میز پر رکھے۔ آج تو انہوں نے سارا دن ہی مفتی صاحب کے گھر گزارا تھا۔ آج صبح ان کا دل ہی اتنا خراب ہو گیا تھا کہ دل نہیں چاہا کہ ممانی سے سامنا ہو اور انشراح سے بات کرنے کی توان میں ہمت ہی نہیں تھی۔ انہیں اس پر ترس آیا اور اس کے نصیب سے گلہ بھی۔۔۔ کیا ضروری تھا کہ وہ بھی ان ہی مصائب سے نبرد آزما ہوتی جس سے ساری زندگی ان کی بہن دوچار رہی تھی۔ ماموں گھر میں آئے تو آتے ہی انشراح کے کمرے میں گئے۔۔۔ جو بھی تھا انہیں اس طرح صبح سویرے نہیں جانا چاہیے تھا۔ انہیں انشراح کو ہمت اور حوصلے کی تلقین اور اپنے ساتھ کا یقین دلا کر جانا چاہیے تھا۔ انہوں نے خود کو ملامت کی مگر انہیں یہ خبر نہیں تھی کہ یہ ملامت بہت جلد ہی ملال میں بدلنے والی ہے۔ انشراح اپنے کمرے میں نہیں تھی، نہ ہی وہ ان کی اسٹڈی میں تھی نہ چھت پر نہ ہی لان میں۔۔۔ نہ ہی کچن میں 'باری باری انہوں نے پورا گھر چھان مارا' وہ کہیں بھی نہیں تھی۔۔۔ ان کا دل بے اختیار کسی انہونی کے خیال سے دھڑکا۔۔۔ انہوں نے بے ساختہ اسے آوازیں دینا شروع کر دیں۔۔۔ مگر وہ کہیں ہوتی تو ملتی نا۔۔۔ ان کی پریشانی تھی یا کوئی اور احساس۔۔۔ ممانی بھی جھٹ چپل پاؤں میں اڑستی کمرے سے باہر آگئیں۔ ماموں نے ان کی نیند سے بے دار ہوئی شکل دیکھ کر قدرے کرخت لہجے میں استفسار کیا تھا۔

"انشراح کدھر ہے؟" ممانی کے ماتھے پر بل پڑے۔

"اپنے کمرے میں ہو گی۔۔۔ اتنا شور کیوں مچا رہے ہیں آپ؟"

"کیوں کہ وہ اپنے کمرے میں نہیں ہے۔ بلکہ اس گھر میں کہیں بھی نہیں ہے۔" وہ دھاڑے ممانی بھی مارے دہشت کے دہل سی گئیں۔ ماموں کی آنکھوں میں خون اتر رہا تھا غصہ شرارے کی مانند ابل رہا تھا' جبکہ ممانی کے اندر کہیں سکون کے جھرنے بہنے لگے تھے۔

"خس کم جہاں پاک۔۔۔" مصیبت خود ہی ٹل گئی تھی کاش وہ یہ سب اسے چند روز پہلے کہہ دیتیں۔۔۔ کم از کم اتنے دن بے سکونی میں تو نہ کٹتے' مگر ان کی بھول تھی آنے والے دن ان کے لیے مزید اذیت کا سامان لے کر آنے والے تھے۔

"کیا کہا تھا تم نے اسے میرے جانے کے بعد۔۔۔ بولو؟" وہ عین ان کے سر پر آکر چلائے ممانی کو اپنے کانوں کے پردے پھٹتے محسوس ہوئے۔

"کک۔۔۔ کچھ نہیں وہ۔۔۔" ان کی دہشت کے مارے ہکلاتی زبان سچ اگل گئی۔ ماموں نے اپنا سر پیٹ لیا۔

"تم نے جوان جہان بچی کو گھر سے نکال کر اچھا نہیں کیا نیک بخت۔۔۔ وہ بے آسرا اور بے سہارا تھی تم نے اپنی نفرت میں ایک لمحے کو بھی سوچا کہ وہ کہاں جائے گی اس گھر سے نکل کر۔۔۔ اس باپ کے پاس جو سارا دن گلی کے نکڑ پہ نشہ کر کے سویا رہتا ہے اور جس کے پاس کھانے کو ایک پھوٹی کوڑی نہیں ہوتی۔" دکھ کے مارے ان کے آنسو چھلک پڑے اتنے اونچے لمبے انوار صاحب اس روز بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر روئے۔

"میں نے اسے کچھ بھی نہیں کہا انوار صاحب۔۔۔ وہ شاید ہماری باتیں سن کر خود ہی چلی گئی ہے۔" ممانی کو بہت دیر بعد احساس ہوا تو پاس آکر بیٹھتے تسلی دینے لگیں' مگر انوار صاحب نے جواب نہیں دیا۔

"روزہ تو افطار کر لیں۔۔۔ مکروہ ہو جائے گا آپ نے سارا دن صبر کیا ہے۔" انہوں نے خاموشی سے ایک کھجور اٹھا کر منہ میں رکھ لی۔ ممانی نے شربت کا گلاس آگے کیا مگر ان سے پیا نہیں گیا۔ کیا خبر انشراح کو افطاری نصیب ہوئی بھی ہو یا نہیں۔۔۔ اس سوچ اور دکھ بھرے احساس نے ان کی ساری بھوک پیاس ختم کر دی تھی۔ صرف ایک احساس باقی سب پر بھاری تھا کہ وہ انشراح کی حفاظت نہیں کر سکے کسے تحفظ دیتا تو

دور کی بات وہ اپنائیت کا احساس بھی نہیں دے پائے
جس کا وعدہ کر کے اس گھر میں لائے تھے.... روز
قیامت تو کیا وہ تو ابھی اس دنیا میں کسی کو منہ دکھانے
قابل نہیں رہے تھے۔

"بلا لو اپنے بیٹے کو اب یہاں.... اور مناؤ تم دونوں
جشن.... چلی گئی وہ بے چاری یہاں سے.... جس کا وجود
ہمیشہ تمہیں کھلتا رہا' جس کے ہاتھ کا پکا تم کھایا کرتی
تھیں.... مگر اس کے وجود سے تمہیں بہت نفرت تھی
کہ اس گھر کے کسی کونے میں اسے بے کار چیزوں
جتنی جگہ دے دو.... تم کتنی خود غرض عورت ہو...."
بے ربط انداز میں کہتے وہ تھکے تھکے قدموں سے اندر
بڑھ گئے۔ اب بھلا وہ اسے کہاں جا کر ڈھونڈیں۔ اس
کے پاس تو پیسے بھی نہیں تھے۔ ابھی تو وہ اس کی ہوسٹل
میں رہائش کا انتظام کروانے کی کوشش میں تھے' مگر
وومن ہوسٹلز کی آزادی اور ماحول انہیں انشراح کے
لیے کسی بھی طور پر مناسب نہیں لگ رہا تھا اور ویسے
بھی انہیں لگتا تھا کہ راحیل کی بس ایک بار وہ ضد
پوری کر دیں گے اگر وہ یہاں آ جائے گا تو انشراح کو
واپس۔ اس گھر میں لے جائیں گے۔ راحیل کو واپس
پاکستان بلانا مشکل تھا۔ انہوں نے انشراح کے ساتھ
مل کر ہی پلان بنایا تھا' مگر انہیں کیا خبر تھی کہ راحیل
اس کی اس گھر سے جانے کی بات کس انداز میں کر رہا
ہے۔ انہوں نے سوچا تھا وہ راحیل سے کہہ دیں گے
اگر تمہیں انشراح کے ساتھ نہیں رہنا تو مت رہو....
اسے بے شک طلاق دے دو.... وہ اس کی اپنی پسند سے
کسی اور جگہ پر شادی کر دیں گے مگر.... ممانی کی جلد
بازی نے سارا کام چوپٹ کر دیا تھا اور جانے انہوں نے
انشراح جیسی لڑکی جو بڑی سے بڑی بات با آسانی پی جایا
کرتی تھی سے ایسا کیا کہا تھا کہ وہ بنا کسی کو بتائے یہ گھر
ہی چھوڑ کر چلی گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

اس نے سارے کاٹھ کباڑ کو ہٹا کر صاف کیا....
جالے اتارے' فرش سرف پانی میں ڈال ڈال کر دھویا
اور کمرے کو کسی طرف سے رہنے کے قابل بنایا۔ اس کے
باپ نے وہ گھر بیچ دیا تھا جو اس کی ماں نے اپنا زیور بیچ کر
اور سلائی کی آمدن سے بنوایا تھا' مگر اب ایک چھوٹی سی
کال کوٹھری میں کبھی کبھار آ کر رہنے لگتا تھا۔ انشراح کو
اس جگہ کی خبر تھی ایک بار وہ یہاں سے گزری تو ابا کو
یہاں بیٹھے دیکھ کر اسے دکھ ہوا تھا۔ کئی دن اس کے
ذہن سے یہ گندی' سیلن زدہ پلستر ادھڑی دیواروں والی
کال کوٹھری نکل نہیں سکی.... اس کے باپ کے نشے
اور جوئے کی لت نے اسے عرش سے فرش اور پھر فرش
سے قدموں کی دھول بنانے میں کوئی زیادہ وقت نہیں
لیا تھا۔ کل دوپہر کو انشراح سیدھی ادھر ہی آئی تھی۔ ابا
نے دروازہ کھولا بہت دیر تک دیکھ کر جیسے پہچاننے کی
کوشش کی اور پھر ہنسنے لگے۔ انشراح جو ان کے نحیف
و نزار وجود کو دیکھ کر دکھی ہو رہی تھی ان کے ہنسنے سے
ڈر گئی۔ بہت دیر بعد ان کی ہنسی تھمی۔

"آ گئی اپنی اوقات پہ....؟" انہوں نے اس کے
ہاتھ میں بیگ دیکھ کر مذاق اڑاتے کہا تھا۔

"کہا تھا نا.... وہاں تیرا کوئی سہارا نہیں بنے گا' مگر تو
نے میری ایک نہیں مانی۔ اب دیکھ لو.... نکال دیا نا تجھے
ان لوگوں نے...." انشراح کی آنکھ سے آنسو گرا اور پھر
تواتر سے گرنے لگے۔ اس کے چہرے پر کیا وہ ذلت رقم
تھی' جو ابا نے اسے دیکھتے ہی من و عن دہرانی شروع
کر دی تھی۔

"تو نے ٹھیک کہا تھا ابا.... کاش میں تیری بات مان
ہی لیتی۔" وہ اندر بڑھ آئی اور جھلنگا چارپائی پر گر سی
گئی۔ سفر بھی تو طویل تھا تھکن تو سوا ہونی ہی تھی۔

"چل کوئی بات نہیں.... ابھی بھی کچھ نہیں بگڑا....
تیرا باپ ابھی زندہ ہے تو کسی سوچ کو دل میں جگہ نہ
دے۔" انشراح کی آنکھیں نمکین پانیوں سے بھر
گئیں۔ کاغذی رشتے تو برت آئی تھی اب باپ کی
محبت اور شفقت دیکھ رہی تھی۔ انہوں نے گویا ایسے
کہہ کر اس کے زخموں پر پھائے رکھ دیے۔ پوچھا کچھ
بھی نہیں۔ انشراح کو لگا جیسے وہ سب کچھ پہلے سے
جانتے ہیں یا جان گئے ہوں.... تھوڑی دیر بعد وہ آئے تو

ان کے ہاتھ میں افطاری کا سامان تھا۔ دو سموسے ایک پلیٹ چنا چاٹ اور ایک دودھ کا پیکٹ ساتھ میں پانی کی ٹھنڈی بوتل۔

"لے... افطاری کر لے... ابھی اتنے ہی پیسے تھے کل اور لے آؤں گا تیرے لیے چیزیں۔" وہ لڑکھڑاتے ڈولتے قدم اٹھاتے واپس چلے گئے۔ انشراح کو اچھا لگا اس کے باپ کو اس کا احساس تھا وہ کم از کم اتنے بے حس تو نہیں تھے جتنا اس نے ان کے متعلق سوچ رکھا تھا اسے یہ سوچ کر بھی خوشی ہوئی کہ کم از کم اس کے باپ کو اس کے متعلق یہ بات یاد تھی کہ اس کا روزہ ہے جب ہی وہ افطاری کا سامان لائے جب کہ وہ سوچ رہی تھی کہ گھر میں تو نمک تک نہیں ہے وہ روزہ افطار کیسے کر پائے گی' مگر ابا بھولے نہیں تھے کہ انشراح روزے قضا نہیں کیا کرتی... جب وہ افطاری کر چکی تو ابا اس کے پاس آکر بیٹھے تھے۔ محبت' پیار اور شفقت کے سارے رنگ ان کے لہجے سے ٹپک کر رہے تھے۔ انشراح نے انہیں ساری کہانی سنادی تھی۔ ویسے بھی اب چھپانے کا کیا فائدہ تھا ایسا تو ہونا ہی تھا کسی نہ کسی دن... انہوں نے خلاف توقع اس کے سر پر ہاتھ رکھا اور اسے تسلی دے کر باہر چلے گئے۔ انشراح ماموں کے متعلق سوچتی ہی رہی کہ آیا انہوں نے وہ خط نکال کر پڑھ لیا ہوگا یا نہیں...

☆ ☆ ☆

انشراح کو انوار صاحب نے ہر اس جگہ ڈھونڈا جہاں وہ اسے ڈھونڈ سکتے تھے۔ ہاں دانستہ طور پر وہ اس کے نشئی باپ کی طرف نہیں گئے' کیوں کہ وہ جانتے تھے انشراح وہاں نہیں جا سکتی اور اگر وہاں جا کر اس کا پتا کرتے تو دو سال اس کی خبر گیری نہ کرنے والا اس کا باپ لازما" اپنی بیٹی کے اغواء کا مقدمہ ان پر چلانے کی دھمکی دینے کے ساتھ واویلا تو ضرور ہی مچاتا۔ بھلے وہ یہ اوچھا ہتھکنڈا پیسوں کے لیے ہی کرتا' مگر انوار صاحب کو یہ بھی گوارا نہیں تھا کہ ان کی بھانجی ان کے بیٹے کی بیوی ان کی بہو... ان کے خاندان کی عزت کے بارے میں بھلے اس کا باپ ہی یوں استفسار کرے۔

راحیل واپس آچکا تھا۔ ممانی اسے دیکھ کر وارے صدقے ہوتیں۔ انوار صاحب نے اس سے کوئی بات نہیں کی تھی' حالانکہ اس نے کئی بار خود انشراح کے متعلق سوال کیا تھا۔ پہلی بار اس نے اپنی آمد کے آدھے گھنٹے بعد ہی استفسار کیا تھا' مگر ممانی بات کو کسی اور رخ پر لے گئی تھیں۔ وہ لوگ اس وقت کھانا کھا رہے تھے۔

"ہاں... ہاں بیٹا... وہ تو چلی گئی کب کی... تم یہ بریانی تو کھاؤ... بہت مزے کی بنی ہے۔" راحیل خاموش ہو گیا تھا اور اپنی پلیٹ میں بریانی نکال کر کھاتے انوار صاحب کے حلق میں نوالہ پھنس گیا انہیں کبھی کبھار اپنی بیوی پر حیرت ہوا کرتی وہ کس مٹی کی بنی تھیں آخر... دو سال دن رات انشراح نے اس گھر کو سنبھالا تھا۔ ان کی خدمت کی تھی' نیک بخت کی ہڈیوں میں تو پانی بھر گیا تھا' مگر مجال تھا کہ ایک دن بھی انہوں نے منہ سے بھاپ نکالی ہو کہ انشراح کے بغیر وہ گھر نہیں سنبھال پا رہیں یا وہ تھی تو انہیں بہت بے فکری تھی۔ ہوتے ہیں کچھ لوگ ایسے جو کسی اچھائی کا صلہ تو دور کی بات اسے مانتے ہی نہیں۔ ممانی کا شمار بھی شاید انہی لوگوں میں ہوا کرتا تھا۔

راحیل دو سال کوریا میں رہ کر آیا تھا جس کمپنی کی طرف سے گیا تھا وہ کمپنی بہت بڑی تھی لہٰذا اس کا رہن سہن' بہترین تنخواہ اور کھانا سب بہت پرکشش تھا۔ رزق کی فراوانی' جوانی کی طاقت اور سب کچھ اپنے بس میں کر لینے کا عزم اسے دیکھنے میں ہی مضبوط اور توانا مرد ظاہر کرتے تھے۔ انوار صاحب کو بیٹے کو دیکھ کر فخر ہوتا تو اگلے ہی لمحے دکھ بھی... کاش ان کا بیٹا کم خوب صورت ہوتا' مگر دل کا صاف کھرا اور نرم ہوتا وہ اتنا سنگ دل نہ ہوتا۔

راحیل ایک دن ان کے کمرے میں چلا آیا۔ افطاری کے بعد عموماً" وہ واک پر جایا کرتے تھے' مگر اس روز نہیں گئے... پہلے ان کے ساتھ انشراح جایا کرتی تھی' مگر اب وہ جانے سے پہلے ہی اپنی بوڑھی

ہڈیوں میں تھکن ہوتی محسوس کرتے لہٰذا ابھی جاتے اور کبھی نہیں۔ انہوں نے اسے آتے ہوئے دیکھا مگر انجان بن گئے' راحیل خاموشی سے آکر ان کے قدموں میں بیٹھ گیا تھا۔

''بابا... آپ مجھ سے ناراض ہیں نا؟'' انوار صاحب کی آنکھوں میں درد بھرنے لگا' مگر وہ ضبط کیے درد کے سیل رواں کو روکنے کی کوشش میں بے حال ہو گئے۔

''میری طرف دیکھیں بابا۔'' راحیل نے ان کا چہرہ اپنی سمت کرنے کے لیے ان کا ہاتھ دبایا۔ انوار صاحب نے بے ساختہ اس کی طرف دیکھا جس کے چہرے پر زمانے بھر کا دکھ جمع تھا۔

''نہیں۔''

''کچھ تو ہے بابا... مجھے لگتا ہے جیسے آپ نے مجھے معاف نہیں کیا۔''

''جب اولاد خود کو والدین سے بڑا اور معتبر سمجھنے لگے تو والدین کو چاہیے کہ اپنی عزت بچانے کو خاموش ہو جائیں۔ میں تم سے ناراض نہیں ہوں بس یہ سمجھو کہ اپنی عزت کا مارا خاموش ہو گیا ہوں۔''

''بابا...'' راحیل تو جیسے تڑپ ہی گیا۔ ''ایسا کیوں سوچ رہے ہیں۔''

''میں بہت بوڑھا اور کم ہمت سہی راحیل... مگر زمانے کا چلن اور تجربہ میرے پاس تم سے کہیں زیادہ ہے۔ تم نے ابھی زندگی کو صرف دیکھا ہے جبکہ میں اسے برت عمر کے اس حصے میں پہنچ گیا ہوں۔ لہٰذا کوئی سوال جواب مت کرو میں اپنی ہمت کے مطابق یہ مشکل وقت بھی نبھا جاؤں گا اور اسے ڈھونڈ لوں گا... تم صرف اپنی من مانی کرو اور خوش رہو۔ تمہیں فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔'' مگر راحیل کا منہ تو یہ سب سن کر ایسے کھلا جیسے جانے کیا خبر سن لی ہو۔

''بابا... میں بالکل بھی نہیں سمجھا آپ کی کسی بھی بات کا مطلب... آپ کس کی بات کر رہے ہیں کون گم ہوا ہے؟؟''

''میرا وہ مان اور غرور' جو ایک باپ ہونے کے ناتے میں نے تم پر کیا تھا۔'' راحیل نے تڑپ کر ان کے ہاتھ تھام لیے۔

''بابا... میرے بغیر بتائے کوریا جانے پر آپ اس قدر ناراض ہیں مجھ سے کہ میری معافی بھی آپ کا دل نرم نہیں کر رہی... دو سال سے میں آپ کو منانے کی کوشش کر رہا ہوں اور...'' راحیل اس سے زیادہ کچھ بول ہی نہ سکا۔ انوار صاحب کو اور بھی تکلیف ہوئی وہ انشراح کا ذکر تک نہیں کرتا تھا۔ وہ اگر ایک دفعہ بات کرتا تو وہ کم از کم اسے بہت کچھ جتلا تو سکتے تھے۔

''میں مانتا ہوں' میں نے غلط کیا مگر... وہ سب تو وقتی تھا آپ نے بغیر بتائے اتنی اچانک میرا نکاح کروا دیا... اور اسے گھر لے آئے... میں کسی رشتے کو نبھانے کی پوزیشن میں نہیں تھا۔ اور بس اتنا سا احتجاج تو میرا حق بنتا تھا نا بابا...''

''اتنا سا احتجاج... یہ اتنا سا احتجاج ہے راحیل...'' انوار صاحب نے دکھ سے دہرایا۔ کسی کی زندگی داؤ پر لگ گئی تھی اور ان کے بیٹے کو اپنا احتجاج اتنا سا محسوس ہو رہا تھا۔

''تمہاری ماں نے تمہاری خواہش پوری کرنے کی خاطر اسے گھر سے نکال دیا... وہ دربدر ہو گئی۔ اس کے پاس پیسے نہیں تھے راحیل' نہ ہی کوئی ٹھکانہ... تم اسے چاہے طلاق دے دیتے' مگر یوں ذلیل تو نہ کرتے۔ تم نے اسے اتنا ارزاں اور حقیر جان لیا تھا کہ میں اسے تمہارے سر منڈھ دیتا... تم ایک بار مجھ سے تو بات کرتے... یہ سب کچھ کرنے کی کیا ضرورت تھی آخر؟''

راحیل نے بے ساختہ ان کے ہاتھ پکڑ لیے تھے اس کے چہرے کا رنگ بدلتا جا رہا تھا۔

''بابا... مجھے بالکل بھی سمجھ نہیں آرہی کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ مجھے آپ کی قسم بابا... میں نے کوئی شرط نہیں رکھی... آپ جو بھی کہہ رہے ہیں آپ کو غلط گائیڈ کیا گیا ہے' میں تو اس بار انشراح کو لینے آیا ہوں۔'' کچھ دیر بعد راحیل نے جیسے دھماکہ کر دیا تھا۔

انوار صاحب کا منہ مارے حیرت کے کھل گیا' مگر اس سے پہلے کہ وہ اسے تفصیل بتاتے ایک دھماکہ اور

ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

انشراح نے اس چھوٹے سے کمرے کو چمکتا دمکتا پایا اور مسکرا دی۔ وہ جب سے آئی تھی اس کمرے کی تو کیا اس کے ابا کی صحت اور حالت بھی بہتر ہو گئی تھی نشہ تو وہ اب بھی کرتے تھے مگر اب وہ انشراح کی وجہ سے اس سے ذرا چھپ کر اور کم کم پیا کرتے تھے۔ انشراح ان کا بہت خیال رکھ رہی تھی۔ روزانہ صبح انہیں صاف ستھرے کپڑے بدلوایا کرتی۔ بازار جا کر وہ سودا سلف بھی خرید لائی تھی جو چند ہزار تھے اس میں سے تو آدھے سے زیادہ راشن پانی اور دوا میں ہی ختم ہو گئے وہ سنجیدگی سے جاب کے متعلق سوچ رہی تھی مگر اتنی کم کوالی فکیشن میں بہتر جاب ملنا بھی ناممکن ہوتا۔ للذا وہ خاموش ہو گئی۔ اسے آئے دس دن ہوئے تھے مگر ایسا لگتا تھا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ انوار ماموں نے بھی شاید بیٹے کی ضد کے آگے ہار مان لی تھی اس لیے ایک بار بھی اس سے ملنے نہیں آئے تھے۔ کبھی سوچتی جانے انہیں وہ خط ملا بھی ہو گا یا نہیں۔ وہ ایک چھوٹے سے کاغذ پر لکھے چند الفاظ تھے.... جو وہ ان کی کتاب میں رکھ آئی تھی۔ اور اسے اچھی طرح سے معلوم تھا کہ جیسے ہی انوار ماموں اس خط کو پڑھیں گے ان کی ناراضگی ختم ہو جائے گی۔ اس نے طے کر لیا تھا کہ اب ادھر ہی اپنے باپ کے پاس رہے گی۔ راحیل کی زندگی میں نہ وہ پہلے تھی نہ ہی اب۔ اسے کبھی دوبارہ وہاں جانے کی ضرورت یا حسرت نہیں رہی تھی بہت بار اس کا دل چاہا وہ انوار ماموں کو کم از کم ایک فون تو کر ہی لے مگر پھر سوچ کر رک جاتی کہ کیا فائدہ اب اگر وہ ان کی زندگی سے نکل ہی آئی ہے تو کیا ضرورت ہے دوبارہ مخل ہونے کی.... انوار ماموں کو بے چین کرنے کی....

"انشراح بیٹی.... کہاں ہو....؟" وہ اپنی سوچوں میں گم تھی کہ ابا چلے آئے ان کے ساتھ ایک ادھیڑ عمر شخص بھی تھا۔ انشراح نے انہیں دیکھ کر فوراً سر پر دوپٹا ڈالا۔

"ان سے ملو بیٹا.... یہ کریم صاحب ہیں.... بہت اچھے انسان ہیں میری بہت مدد کیا کرتے ہیں۔"

انشراح نے دھیرے سے انہیں سلام کیا اور پھر فوراً نگاہ جھکا لی۔ ان کی مسکراتی معنی خیز آنکھوں میں بلا کا سحر تھا آنکھوں میں عجیب سی چبھن ہونے لگی۔

"کیسی ہیں آپ انشراح ....." کریم صاحب نے اس کے چہرے پر نگاہ گاڑتے سوال کیا تو انشراح کو جواب دینا ہی پڑا۔

"ٹھیک ہوں۔"

"آپ کھڑے کیوں ہیں بیٹھیں نا کریم صاحب...." ابا کو جیسے مہمان نوازی کا خیال ابھی آیا تھا.... انشراح جزبز ہو گئی بھلا ابا اسے یہاں اپنے گھر کیوں لائے تھے۔ کیا ضرورت تھی پھر اس شخص کی آنکھیں اف ف.... عجیب کریہہ انداز تھا ان کے دیکھنے کا....

"میں آپ کے لیے پپو کی دکان سے ٹھنڈی ٹھار بوتل پکڑ کر لاتا ہوں۔" انہیں کرسی پر بٹھانے کے بعد ابا نے فوراً ہی کہا تھا۔ انشراح کو اچھا نہیں لگا ابا اسے ایک اجنبی آدمی کے ساتھ یہاں اکیلا بٹھا کر باہر جا رہے تھے "اصولاً" تو انہیں اسے اندر لانا ہی نہیں چاہیے تھا پھر خود بھی پاس ہی بیٹھے رہتے۔

"ہاں ضرور لے آؤ.... اور ایسا کرو یہ کچھ اور پیسے بھی رکھ لو واپسی پر کچھ فروٹ لے آنا.... لگتا ہے تم اپنی بیٹی کا بالکل بھی خیال نہیں رکھتے۔ رنگت دیکھو کیسی کملا سی گئی ہے۔"

"ارے میں غریب جتنا کر سکتا ہوں کرتا ہوں صاحب.... اب کیا کروں ویسے بھی یہ روزے رکھ رہی ہے تب ہی شاید تھوڑی کمزور لگ رہی ہے۔"

"اچھا.... تو تم طلاق لینا چاہتی ہو.... پہلے یہ بتاؤ تم صرف اس کی منکوحہ تھیں یا بیوی۔" کریم صاحب نے ابا کے جانے کے بعد اس سے پہلا سوال ہی ایسا بے باکانہ کر دیا تھا کہ انشراح کی کان کی لویں تک سرخ ہو گئیں۔

"یہ کیسا سوال ہے؟" اس نے قدرے درشتی سے کہا تھا۔
"یہ بہت اہم سوال ہے۔" کریم صاحب ہلکا سا مسکرائے۔
"میں سمجھی نہیں۔"
"ظاہر سی بات ہے اب میں اتنی رقم تمہارے باپ کے حوالے ایسے ہی تو نہیں کروں گا نا۔ اس نے مجھے تمہارے صرف نکاح کی خبر دی۔ رخصتی کی نہیں، مگر دو برس تم اس گھر میں رہیں ہو سکتا ہے ایک ہی گھر میں رہتے... " وہ قہقہہ لگا کر معنی خیزی سے ہنس دیے۔ انشراح کو اس شخص سے متلی محسوس ہوئی۔ یہ کس قسم کی باتیں کرنے لگا تھا وہ... نازیبا۔
"آپ کو سوچنا چاہیے کہ آپ مجھ سے اس قسم کی باتیں کرتے ذرا بھی اچھے نہیں لگ رہے۔"
"اس قسم کی باتیں کرنے کے لیے ہی میں نے تمہارے باپ کو ابھی پانچ ہزار روپے پکڑائے ہیں بی بی... دو سال سے زائد کا عرصہ گزر گیا اسے پیسہ کھلاتے تمہاری آس میں... کہ تم اب آتی ہو کہ تب... بس اب بہت ہو گیا... میں تمہیں لینے آیا ہوں... تمہاری طلاق میرا وکیل خود ہی لے لے گا... وہ ہمارا کام ہے۔" انشراح کے ذہن میں آندھیاں چلنے لگیں اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔
"ویسے تم ہو تو خوب صورت، اچھا کھانا پینا ملے گا تو اور بھی نکھر جاؤ گی۔" انہوں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا تھا۔ انشراح کی آنکھوں میں بے بسی سے آنسو آگئے۔
"خدا کے لیے مجھے چھوڑ دیں... خدا کے لیے...." وہ گڑگڑائی تھی۔ خطرے کی گھنٹیاں ایک تواتر سے اس کے اندر بجنے لگیں تھیں۔ اسے یاد آیا ماموں نے اسے کتنا منع کیا تھا کہ حالات چاہے جو بھی ہوں، مگر خدا کے لیے کبھی بھول کر بھی اپنے باپ کے پاس مت جانا... وہ تمہارے پیسے کھرے کرنے میں ایک منٹ نہیں لگائے گا۔ انشراح کو اس رات انہوں نے تادیر سمجھایا تھا، مگر جذبات میں آکر اس نے بہت بڑی غلطی کر دی تھی۔
"کیسے کیسے چھوڑ دوں تمہیں اب... پندرہ لاکھ ادا کیے ہیں وصولی تو بنتی ہے نا۔" کریم صاحب خباثت سے مسکرائے۔
"میں شور مچا دوں گی ابھی میرا باپ آجائے گا۔"
کریم صاحب اس کی بات پر ایسا ہنسے کہ انشراح کو لگا وہ پاگل ہو گئے ہیں۔
"وہ نہیں آئے گا... وہ خود ہی مجھے یہاں لایا تھا۔ دس سال ہو گئے اسے ہمارے لیے کام کرتے... تم بے فکر رہو وہ نہیں آئے گا۔" انشراح کی آنکھوں کے سامنے زمین و آسمان گھوم گئے، کوئی باپ اتنا ظالم بھی ہو سکتا ہے۔ "ہاں ہر وہ مرد ظالم ہے جو نشے کی لت میں ہوش کھو بیٹھتا ہے ان سے ہر ایک بات کی توقع کی جا سکتی ہے۔" انشراح کو یاد آیا ماموں نے اسے یہی جواب دیا تھا اور اب ماموں کی بات من و عن اس کے سامنے سچ ثابت ہو گئی تھی۔ وہ آج سچ مچ بے آسرا و بے سائبان ہو گئی تھی۔
"بس تمہارے آگے ہاتھ جوڑتی ہوں۔ میں روزے کی حالت میں ہوں، میں ایک شریف ماں کی بیٹی ہوں خدا کے لیے۔" یکلخت اس کے منہ سے یہ جملے نکلے اور کریم صاحب وہیں پر رک سے گئے وہ جو اسے گھسیٹ کر اپنے ساتھ گاڑی میں بٹھانا چاہتے تھے رک گئے۔ انہیں یاد آیا آج سے دس برس پہلے بھی وہ یہاں اس گھر میں آئے تھے وہ عورت غالباً انشراح کی ماں تھی اس نے بھی اسے یہ ہی واسطہ دیا تھا اور اب اس عورت کی بیٹی نے بھی اسے یہ ہی واسطہ دیا تھا اور وہ اتنے ظالم تو نہیں ہو سکتے تھے کہ اللہ کے واسطے رحم کی بھیک مانگنے والے کو خالی ہاتھ لوٹا دیں۔
انشراح ہاتھ جوڑے روتے ہوئے ان کے سامنے کھڑی تھی وہ یک ٹک اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔ تب ہی دروازہ دھڑام کی آواز سے کھلا تھا اور کوئی اندر آیا تھا۔ انشراح نے آنے والے کو ایک نظر دیکھا اور بھاگ کر ان سے لپٹ گئی۔
"ماموں۔" بالآخر ماموں آگئے تھے وہ ان کے سینے

سے لگ کر بلک بلک کر روتی رہی۔ اور ماموں اس کا سر تھپکتے رہے۔ انوار ماموں خود بھی رو رہے تھے۔ یہاں تک کہ وہ بے ہوش ہو گئی۔ باقی کریم صاحب کے ساتھ کے سارے معاملات راحیل نے ہی طے کیے۔

☆ ☆ ☆

اسے ہوش آیا تو وہ ماموں کے گھر میں تھی اور ماموں اور راحیل اس کے قریب بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ابھی تک بے خبر تھی کہ ماموں کو اس کے وہاں ہونے کی اطلاع کس نے دی تھی اور ماموں سے بھی زیادہ حیرت اسے راحیل کو اپنے کمرے میں دیکھ کر ہو رہی تھی۔

"کیسی ہو انشراح؟" راحیل نے اسے دیکھ کر مسکراتے ہوئے پوچھا تھا۔

"میں یہاں کیسے آئی ماموں جان؟" اس نے راحیل کے سوال کو نظرانداز کیا اور ماموں سے پوچھا۔

"میں لایا ہوں تمہیں یہاں۔" راحیل نے ذرا رعب سے کہا تھا اس نے ذرا بھی برا نہیں منایا تھا کہ انشراح نے اس کی بات کا جواب کیوں نہیں دیا تھا۔ ماموں تو اب بھی خاموش تھے ہاں اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لیے بس ہولے ہولے تھپک رہے تھے۔

"ماموں۔ آپ مجھ سے بات کیوں نہیں کر رہے؟" انشراح اٹھ کر بیٹھ گئی اور رونے لگی۔ راحیل نے اپنی مسکراہٹ دبائی وہ اس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہی تھی۔

"کیوں کہ ماموں کا بیٹا تم سے مخاطب ہے اور تم سے بات کرنا چاہتا ہے۔ ہے ناں بابا۔ راحیل نے باپ کی تائید چاہی جو بہت خاموش تھے۔

"ماموں جان۔ آپ کو مجھے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا۔" وہ روتے ہوئے ان کے سامنے آ بیٹھی۔

"انشراح۔ پہلی غلطی پر اگر اللہ نے تمہاری حفاظت کی تو تم کیا چاہتی ہو کہ بار بار اس غلطی کو دہراؤ۔" ماموں نے زبان کھولی اور انشراح کو پاتال میں گرا دیا اس کا سر جھک گیا۔

"اچھی بیٹیاں باپ کا کہنا مانتی ہیں۔ حالات چاہے جیسے بھی ہوں انہیں والدین کا اعتبار کرنا چاہیے۔ اور تم نے میرا اعتبار نہیں کیا انشراح۔ مجھے دکھ ہوا تم نے بھی میرا ساتھ چھوڑ دیا۔"

"نہیں ماموں جان۔ میں نے وہ سب آپ کے لیے ہی کیا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی آپ کو دکھ دینا۔"

"اور میری خوشی تمہاری اس گھر میں موجودگی تھی انشراح۔ تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے تھی۔ میں نے صرف مری ہوئی بہن کا وعدہ نبھانے کے لیے ہی تمہیں اس گھر میں جگہ نہیں دی تھی بلکہ مجھے تم شروع سے ہی ایک بیٹی کی طرح سے عزیز ہو۔ اور بخدا میں نے کبھی بھی تمہیں اپنی ذمہ داری نہیں سمجھا بلکہ خوشی سمجھا ہے۔ اور تم یہ بات خود بھی جانتی تھیں۔" انشراح کا سر جھک گیا۔ غلط تو نہیں کہہ رہے تھے وہ۔

"میں جانتا تھا تمہارے باپ کے کارنامے.... ساری زندگی تمہاری ماں نے جس مصیبت میں گزاری اگر میں نہ ہوتا تو شاید وہ تمہاری ماں کا بھی کہیں سودا کر چکا ہوتا اس سے باپ سمجھ کر بھی گلہ کرنا فضول ہے۔ اسے تو رشتوں کی نزاکت اور ان کا احساس بھی نہیں ہوگا۔ تم اپنے باپ کے لیے صرف ایک لڑکی تھیں جس کے ساتھ اس کا کوئی رشتہ نہیں تھا اور جس کی ذات سے وہ چند روپے کما کر نشہ کر سکتا تھا۔ اور مجھے بس اتنا دکھ ہے کہ مجھے تم پر اعتماد تھا کہ تم ہر جگہ جا سکتی ہو مگر اپنے باپ کے گھر نہیں۔ اور اس یقین و اعتماد کی بدولت میں تمہارے باپ کے پاس نہیں گیا۔ مگر میں غلط تھا۔ اور اپنی اس غلطی کا احساس مجھے راحیل نے دلایا۔ جس نے آتے ہی تمہیں وہاں جا کر ڈھونڈ لیا تھا۔ بہرحال اچھا ہوا کہ کچھ بھی غلط ہونے سے پہلے اللہ نے میری لاج رکھ لی۔ ورنہ میں گناہ گار تو منہ چھپاتا پھر رہا تھا۔"

"ماموں جان۔ مجھے معاف کر دیں میں نے بہت دفعہ سوچا کہ آپ کو فون کر کے بتا دوں مگر پھر سوچ کر مطمئن ہو جاتی کہ۔ اتنی مشکل سے آپ کے گھر کے حالات بہتر ہوئے تھے مجھے واپس جا کر آپ سب کی زندگی میں کوئی پرابلم پیدا نہیں کرنا چاہیے ویسے بھی

ممانی جان ہیں۔"

"تمہیں دنیا زمانے کی فکر ہے مگر اپنی کیوں نہیں۔ انشراح۔ جو بھی ہوا اسے بھول جاؤ کیوں کہ میں نہیں چاہتا کہ ماضی دہرا کر انسان کو اپنی تکلیفوں میں اضافہ کرنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ نیک بخت نے جو بھی کیا اس پر ابھی اسے کوئی شرمندگی نہیں ہے مگر کبھی کبھی انسان کی زندگی میں ایک لمحہ ضرور آتا ہے جو اسے سرتا پیر بدل دیتا ہے۔ سو ہمیں اسے یہ وقت ضرور دینا ہے۔ اب تم محفوظ ہو کیونکہ اب میرے علاوہ راحیل بھی تمہارے ساتھ ہے اور جلد یا بدیر سب ٹھیک ہو جائے گا' تمہاری رخصتی کے حوالے سے مجھے کچھ تیاری کرنی ہے۔ کچھ کام ہے میں چلتا ہوں۔ راحیل تم ذرا اس کے پاس ہی رہنا۔ میں بس تھوڑی دیر میں لوٹ آؤں گا۔" اتنا کہہ کر وہ انشراح کو الجھتا چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ انشراح سمجھ نہیں سکی کہ کیا ماجرا ہے "آخر ایسا بھی کیا ہو گیا کہ۔ کایا پلٹ ہو گئی۔" ماموں کے جاتے ہی انشراح بھی اٹھ کر کمرے سے جانے لگی تھی مگر راحیل نے اسے روک دیا تھا۔

"ٹھہر جاؤ انشراح۔" انشراح کے قدم ڈھیر ہو گئے مگر وہ پلٹی نہیں تھی۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔"

"ہمارے درمیان ایسا کوئی تعلق نہیں ہے راحیل کہ ہم کوئی بات کر سکیں۔ ابھی ابھی ماموں نے جو بھی کہا۔ آپ پلیز پریشان مت ہوں۔ میں آپ پر بوجھ نہیں بنوں گی' آپ اپنے فیصلے پر قائم رہیں۔"

"نہیں انشراح۔ یہ بات نہیں دراصل...."

"تو اس کے علاوہ باقی کیا بچتا ہے ہمارے درمیان۔ پلیز راحیل۔ آپ ماموں کی پروا مت کریں میں انہیں منالوں گی۔ مگر میں ساری زندگی اس احساس کے ساتھ نہیں جی پاؤں گی کہ مجھے آپ پر زبردستی مسلط کیا گیا ہے۔" اس نے اس کے سامنے روتے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے۔

وہ سب جھوٹ تھا یا امی کی ناپسندیدگی میں کی جانے والی سازش۔ ان کی ہر بات میں برابر کا شریک رہا۔ یہاں تک کہ تم اس گھر سے چلی گئیں۔ امی نے جس دن مجھے فون پر بتایا یقین جانو۔ مجھے خود سے نہ جانے کیوں۔ مگر کراہت محسوس ہوئی تھی۔ مجھے اچھا نہیں لگا مگر میں اپنے اس احساس کو سمجھ نہیں سکا اور کسی فاتح کی طرح یہاں واپس چلا آیا۔ مگر یہاں آکر مجھے احساس ہوا کہ میں نے کتنا غلط کیا اور جانتی ہو مجھے یہ احساس کس نے دلایا۔"

کس نے؟" انشراح نے نظر اٹھا کر دیکھا۔"

"تم نے 'تمہاری وہ تحریر جو تم نے بابا کے لیے لکھ رکھی تھی اسے بابا نے نہیں میں نے پڑھا تھا اور یقین کرو کہ میں تمہاری وہ تحریر پڑھ کر پاتال میں ایسا گرا کہ ابھی تک اسی میں دھنسا ہوا ہوں۔ تم نے میری بابا سے حمایت کی جو اتنی دور بیٹھا تھا تمہیں بار بار دھتکار رہا تھا اور یہ شرط رکھ رہا تھا کہ تم اس گھر سے جاؤ گی تو میں اس گھر کی دہلیز پار کروں گا۔ تم نے کہا "ماموں جان۔ راحیل آپ کی عمر بھر کی کمائی اور بڑھاپے کا کیا سہارا ہے اسے آپ ایک ایسی لڑکی کی خاطر ٹھکرا رہے ہیں جس کا باپ بھی اس کا سرپرست نہیں ہے "اور جو زندگی میں کسی ایک کا بھی دل اس احساس کے ساتھ نہیں جیت پائے گی کہ اس نے ایک ماما کو تڑپا کر ایک بیٹے کو دربدری کا دکھ دیا۔ میں اس شرمندگی کے ساتھ نہیں جینا چاہتی کہ ممانی کی آنکھ میں ہمیشہ میری وجہ سے آنسو آئے اور راحیل صرف میری وجہ سے پاکستان کبھی نہ آپائے۔ اس سے آگے میں پڑھ نہیں سکا انشراح! میں اتنا ہی پڑھ پایا مگر اس دن کے بعد مجھے احساس ہوا کہ تم کتنی عظیم لڑکی ہو۔ تم سے نفرت کیسے کی جاسکتی ہے؟ تم تو ان کا بھی خیال کرتی ہو جو تم سے نفرت کا کھلم کھلا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے بعد پل بھر میں ہی میرے اندر سے سارا غبار صاف ہو گیا اور میں یہ تو نہیں کہوں گا کہ مجھے تم سے محبت ہو گئی ہے کیوں کہ اگر میں یہ بولوں گا تو میں جھوٹ کہوں گا اور نہ ہی یہ کہ مجھے تم سے ہمدردی یا تم پر ترس آیا۔ مجھے صرف تم پر رشک آیا۔ تمہاری اچھائی تمہاری نیک فطرت اور تمہارے خلوص نے پہلے مجھے قائل کیا اور پھر اپنا

گرویدہ۔ انشراح! میں تم سے معافی کا خواستگار تو ہوں مگر میں تمہیں کبھی مجبور نہیں کروں گا۔ کیونکہ تمہاری مرضی اور منشا میرے لیے زیادہ مقدم ہے۔
امی جان ابھی اس صدمے سے نہیں نکل پائیں کہ دو سال تک انہیں دھمکیاں دینے والا ان کا بیٹا اچانک کیسے بدل گیا کہ جس لڑکی سے اسے اتنی چڑ تھی اس کے لیے وہ اتنا حساس ہو گیا۔ وہ مجھ سے ناراض ہیں اور یقیناً تم سے بھی ہوں گی۔ اور۔" بلا ارادہ ہی انشراح نے اس کی بات کاٹ کر اس سے پوچھ لیا۔
"اب آپ مجھ سے کیا چاہتے ہیں؟" بات کرتے کرتے راحیل رک کر مسکرایا۔
"صرف اتنا کہ میں نے بڑی مشکلوں سے سب کچھ ٹھیک کرنے کی کوشش کی ہے۔ جس وقت بابا نے مجھے روتے ہوئے بتایا کہ راحیل وہ گھر سے چلی گئی ہے اور اس کے پاس پیسے بھی نہیں تھے تب میں نے بابا سے کہا کہ میں نہیں جانتا آپ مجھ سے کیوں بدگمان ہیں۔ مگر میری خواہش تو پاکستان آنے کے لیے بس اتنی تھی کہ اب کی بار واپس جاؤں تو انشراح میرے ساتھ ہو۔" انشراح نے بے ساختہ سر اٹھا کر حیرت سے راحیل کو دیکھا جو کہ مسکرا رہا تھا۔
"بابا نے نہیں سوچا کہ میں جھوٹ بول رہا ہوں یا سچ اور اگر سوچا بھی ہو گا تو پوچھا نہیں تھا کیوں کہ ہم اپنوں کو ہمیشہ ہر معاملے میں امپھس دینے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ان کا حق ہوتا ہے اور ہمارا فرض کہ وہ اپنے فیصلے پر نظر ثانی کر سکیں، تاکہ کسی غلط فیصلے کی گنجائش یا امکان باقی نہ رہے۔ اور اب یہ ہی میری تم سے گزارش ہے انشراح۔ کہ میرے اور اپنے رشتے کو تھوڑا وقت دو کہ اس میں کوئی گنجائش نکل سکے۔ کیونکہ وقت اور حالات ہمیشہ امکانات کے بل پر ہی بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں۔ اس نے اپنی بات ختم کی تو انشراح نے اپنا آنسوؤں سے تر چہرہ اوپر اٹھایا تھا۔
"میں نے کبھی اپنے رب سے شکوہ نہیں کیا اپنے کسی بھی حالات میں۔ اور میری خواہش ہو گی کہ میں آئندہ بھی اپنے رب یا اس کے بندے سے شکوہ نہ کروں۔ اور میں جانتی ہوں میں ایسا کبھی کروں گی بھی نہیں۔ کیوں کہ میرے اندر میری ماں نے کبھی یہ چیز ڈالی ہی نہیں۔ آپ کو مجھ سے جتنی بھی امیدیں ہیں میں ہمیشہ ان پر پورا اترنے کی کوشش کروں گی لیکن آپ کو فیصلے کا اختیار ہمیشہ حاصل رہے گا۔"
"آج ستائیسواں روزہ ہے انشراح۔ اور بابا نے کہا تھا تمہیں عید کی شاپنگ کروا دوں۔ کیونکہ عید کے دوسرے دن ہماری شادی ہو گی۔" انشراح نے اچانک ہی سر اٹھایا تھا۔
"مگر میں نے کہا تھا کہ مجھے ابھی آپ سے شادی نہیں کرنی۔"
"تم نے مجھے فیصلے کا اختیار دیا ہے انشراح۔ میں وہی استعمال کر رہا ہوں۔" وہ مبہم سا مسکرایا۔
"لیکن میں نے یہ اختیار آپ کو مجبوری یا ترحم میں استعمال کرنے کے لیے نہیں دیا۔"
"نہ تو یہ مجبوری ہے نہ ہی ترحم۔ یہ میرے دل کی خوشی اور سکون ہے جلد ہی محبت میں بدلنے والی ہے۔ انشراح میں نے اپنا آپ تمہارے سامنے کھول کر اس لیے رکھ دیا کہ تم مجھے اچھے سے جان کر فیصلہ کر سکو کہ مجھ جیسے آدمی سے محبت کی گنجائش نکل سکتی ہے یا صرف نفرت کی۔ اور تمہارا اختیار یہ احساس دلا رہا ہے کہ تمہارے دل میں گنجائش نکل سکتی ہے۔"
"اور ممانی جان۔" انشراح سمجھ ہی نہیں سکی، ٹینشن بھی تو ممانی جان کی۔
"نہیں تھوڑا وقت لگے گا اس بات کو سمجھنے میں ویسے قصور ان کا بھی نہیں، جو کچھ بھی ہوا انہوں نے میری محبت میں ہی کیا۔ اصل مجرم تو میں ہوں اگر اسے معافی مل سکتی ہے تو یقیناً تم امی جان کو بھی معاف کر دو گی۔"
"نہ تو میں آپ سے ناراض ہوں نہ ممانی جان سے نہ کسی اور سے۔ یہ میرے نصیب کی کٹھنائیاں تھیں جو اب ختم ہو گئیں ہیں اللہ کا شکر کہ میں ثابت قدم رہی۔ میں ممانی جان سے ملنے جا رہی ہوں اس امید کے ساتھ کہ شاید کبھی ان کے دل میں بھی میرے لیے

گنجائش نکل سکے۔" انشراح مسکراتے ہوئے آگے بڑھی تھی۔

"تو اس عید پر میں تم سے ایک وعدہ لوں گا۔" راحیل تھوڑا رومانٹک ہوا۔ انشرح کے اظہار نے اسے ہلکا پھلکا کردیا تھا۔

"کیسا وعدہ؟"

"کہ میں جتنی بھی غلطیاں کروں گا تم ہمیشہ جواب میں مجھے پیار دو گی اور غصہ تو بالکل بھی نہیں۔" انشراح نے سڑھیاں اترتے آنکھیں نکال لیں۔

"ہیں۔ میں نے کب اظہار کیا؟" اس کی حیرت راحیل کو مزا دے گئی۔

"اچھی لڑکیاں اپنی محبت کا اظہار سر جھکا کر ایسے ہی کیا کرتی ہیں۔ جیسے ابھی تم نے کیا۔"

"مگر میں نے ابھی کیا کہا۔" انشراح کے اوپر کا خالی پورشن بجنے لگا۔

"یہ ہی کہ راحیل میں آپ سے اتنی شدید محبت کرتی ہوں اور کرتی رہوں گی کہ اگر آپ زندگی میں کسی بھی وقت دوسری شادی کا خیال اپنے دل میں لائیں گے تو میں آپ کو یہ اختیار سونپ دوں گی کہ آپ اپنی مرضی سے شادی کرلیں۔"

راحیل نے کچھ اس قدر معصومیت سے کہا کہ لحہ بھر کو انشراح سوچ میں پڑگئی کہ کیا واقعی وہ اپنی بے وقوفی میں وہ یہ سب کہہ گئی ہے۔ تب ہی حیرت سے پوچھ بھی گئی۔

"اچھا کیا واقعی میں نے یہ سب کہا؟" راحیل نے مسکراہٹ دباتے اثبات میں سرہلایا۔

"اب میں اتنی بھی بے وقوف نہیں ہوسکتی یقیناً۔" انشراح نے برا مانتے ہوئے قدرے نروٹھے پن سے کہا تھا۔

"اچھی بیویاں بے وقوف ہی ہونی چاہئیں شوہر کی کافی ساری کوتاہیاں تب ہی نظرانداز ہوسکتی ہیں۔"

"اور اچھے شوہر میں کیا اعلا صفات ہونی چاہئیں؟" انشراح نے بھی اس بار مسکراہٹ دبائی۔

"نہیں صرف ان ہی بے وقوف بھولی بیوی سے پیار کرنا چاہیے جو کہ میں ہمیشہ کروں گا۔ منظور ہے۔" اس نے اپنا ہاتھ پھیلائے شرمائی لجائی انشراح کو دیکھ کر پوچھا۔

"منظور ہے" انشراح نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ آسمان کے وسیع تھال پر کہکشاں بکھری' خوش رنگوں کی تھاپ بجی۔ بہار ــــــ نے خراماں خراماں انگڑائی لی اور محبت کی سرزمین پر قدم رکھا۔

عید کا چاند طلوع ہونے سے پہلے مسکرایا کہ ایک بار پھر اس نے دو ولوں کا ملن کروایا

☆

ندرین آرزو

ماہیرا اور عکس

اس نے کھڑکی سے باہر تیزی سے پیچھے لپکتے درختوں پر نگاہ ڈالی۔ یہ گلیاں۔ یہ سڑکیں۔ یہ فضا۔ یہ ماحول سب اس کے لیے اجنبی ہو گئے تھے۔

اس نے گھونگھٹ کی اوٹ سے ساتھ بیٹھے بے حس وجود پر نگاہ ڈالی۔ وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹیکے اونگھ رہا تھا۔ نئی نئی دلہن قریب بیٹھی ہو اور انسان غنودگی میں چلا جائے۔ خیر اس کی بلا سے۔ وہ جاگتا رہے یا سوتا رہے۔ اس کا دل تو درد سے بھرا تھا۔

ابا نے اسے کتنی آسانی سے اور کتنی جلدی اپنے گھر سے نکال باہر کیا۔ پتا نہیں ابا نے اتنی عجلت کیوں دکھائی۔ کیوں انہوں نے اس کے بوجھ کو سر سے اتار پھینکا۔ وہ اس گھر میں پڑی انہیں کیا کہتی تھی۔ وہ کبھی ان سے اپنی کسی ضرورت کا رونا نہیں روتی تھی۔ وہ کبھی ان سے اپنی کسی فرمائش کے پورا کرنے کی ضد بھی نہیں کرتی تھی۔ اماں کے گزر جانے کے بعد جب سے ابا نئی امی لے آئے تھے۔ وہ تب سے سہمی سہمی رہتی تھی۔ اسے نئی امی کی آنکھوں سے بہت خوف آتا تھا۔ ان کی گھورتی آنکھیں اس کی جان نکال دیتی تھیں۔

ابا جب دکان سے واپس آتے تو وہ ان سے لپٹ جانا چاہتی تھی، لیکن نئی امی کی غصیلی آنکھیں اسے ابا سے دور رکھتیں۔ اس میں اتنی ہمت بھی نہیں ہوتی تھی کہ ابا کے قریب بھی پھٹک جائے۔

جب اماں زندہ تھیں۔ وہ ہمیشہ ابا کے ساتھ سوتی تھی۔ وہ ان کے سینے پر سر رکھے پڑی رہتی۔ ابا دکان سے لوٹتے تو اس کے لیے مٹھائی اور جلیبیاں ضرور لاتے تھے۔ اس کے لیے کھلونے لاتے۔ اس کے نئے

کپڑے بھی لاتے تھے۔ لیکن جب سے نئی امی آئی تھیں۔ وہ ان سب چیزوں کے ساتھ ساتھ جیسے ابا کی توجہ کو بھی ترس گئی تھی۔ اماں کے گزرنے کے بعد ابا نے اسے ایک مرتبہ بھی خود سے نہیں لپٹایا تھا۔ نہ اس کی پیشانی پر بوسہ دیا تھا۔ نہ اسے رات کو کبھی اپنے ساتھ سلایا تھا۔

ان کی جگہ اب نئے بہن بھائی سوتے تھے۔ نبیہ

اور اس سے چھوٹا نند۔ نئی امی 'ابا کو ان ہی دو بچوں میں الجھائے رکھتیں۔ ان کی فرمائشیں پوری کرواتیں۔ پھر وہ اسکول جانے کے قابل ہوئے تو ان کے اسکول کا خرچا۔ ان کی فیس۔ ان کا یونیفارم۔ ان کی کتابیں۔ ابا جیسے اس کی طرف سے مکمل غافل ہو گئے کہ اسے بھی اسکول جانا ہے۔ اسے بھی تعلیم حاصل کرنی ہے۔ نئی امی کا کہنا تھا۔

'بھلا لڑکی ذات اتنا پڑھ لکھ کر کیا کرے گی۔ آخر کو اس نے چولہا چوکا سنبھالنا ہے۔ اچھا ہے ابھی سے گھر داری سیکھ لے۔''

نئی امی گھر اور اپنے بچوں کا سارا کام اس سے کراتی تھیں۔ ابا آتے تو ان کے سامنے خود جت جاتیں۔ اور کبھی سر درد اور کبھی جسم درد کی شکایت کرتیں۔

''سارا دن کام کرتے کرتے میری کمر تختہ ہو جاتی ہے۔ مجال ہے جو ایک پل بھی آرام نصیب ہو۔ ذرا دیکھیں تو برتن دھوتے دھوتے میرے ہاتھ گھس گئے ہیں۔''

حالانکہ سارے برتن وہی دھوتی تھی۔ نئی امی روٹیاں تک اس سے پکواتی تھیں' کتنی بار روٹیاں پکاتے ہوئے اس کے ہاتھ جلے تھے جو بازوؤں اور ہاتھوں پر بدنما داغ چھوڑ گئے تھے۔

ابا کو کبھی محسوس ہی نہیں ہوا کہ وہ اس کے ہاتھ تھام کر ان داغوں کو دیکھ لیتے۔ لیکن اس سے بڑھ کر

اس کی روح پر جو داغ لگے تھے، انہیں وہ بھی دیکھنے کی فرصت نہیں تھی۔

وہ آج تک سمجھ نہیں پائی تھی۔ یہ سوتیلی مائیں اپنے ساتھ ساتھ سگے باپ کو سوتیلا کیوں بنا دیتی ہیں۔

اس نے جیسے تیسے پرائیوٹ میٹرک کر لیا تھا۔ دن بھر کے کام کے بعد وہ تھک جاتی تھی، لیکن پھر بھی راتوں کو بیٹھ کر پڑھتی تھی۔ اس نے پڑوس کی قدسیہ سے اس کی پرانی کتابیں لے لی تھیں اور کچھ کتابیں اس نے ابا سے بازار سے منگوالی تھیں۔ وہ میٹرک میں پاس ہوئی تو اس نے پرائیوٹ طور پر ایف اے کی تیاری شروع کر دی۔ اس کے لیے بھی کتابیں قدسیہ سے ہی لی تھیں۔

وہ ان دنوں ایف اے کے امتحان کی تیاری کر رہی تھی، جب نئی امی کی بہن کا بیٹا ان کے گھر رہنے چلا آیا۔ وہ ایم اے کر رہا تھا۔ یہیں یونیورسٹی میں اس کا داخلہ ہوا تھا۔ لاہور میں رہنے کی جگہ نہیں تھی، اس لیے وہ ان ہی کے گھر رہنے آ گیا تھا۔ اس کے آنے پر ہانیہ پر کام کا بوجھ بڑھ گیا۔ نئی امی نے تو بڑی آسانی سے طاہا کو گھر پر رکھ لیا تھا۔ ابا کو کوئی اعتراض نہیں تھا۔ ابا نئی امی کی کسی بات پر کوئی اعتراض کرتے بھی نہیں تھے۔ انہیں گھر کا ماحول پر سکون رکھنا تھا۔

لیکن ہانیہ کا سکون مزید برباد ہو گیا۔

طاہا کی نت نئی فرمائشیں اور اس کے کام کرتے کرتے وہ تھکنے لگی تھی۔

"ہانیہ! مجھے یونیورسٹی جانا ہے۔ مجھے جلدی سے پراٹھا ڈال دو۔"

"ہانیہ! مجھے دیر ہو رہی ہے اور تم نے ابھی تک میرے کپڑے استری نہیں کیے۔"

"ہانیہ! آج تمہارے ہاتھوں کے پکوڑے کھانے کو دل چاہ رہا ہے اور دیکھو، ساتھ میں ہرے دھنیے کی چٹنی بھی بنا لینا۔"

وہ براہ راست اسے مخاطب کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو نئی امی سے کہہ ڈالتا۔

"خالہ! یہ آپ کی بڑی بیٹی کتنی کام چور ہے۔ پچھلے دو دنوں سے میں اسے بریانی کا کہہ رہا ہوں، مگر اس کے کان پر جوں تک نہیں رینگتی۔ لگتا ہے اسے میرا یہاں رہنا پسند نہیں۔"

"اے کیسے پسند نہیں۔ اس کی پسند و ناپسند کو بھلا کون پوچھتا ہے۔ اس کام چور نے تجھے کچھ کہا تو نہیں؟"

نئی امی تیوریاں چڑھا لیتیں۔

"منہ سے کہنا ضروری نہیں ہوتا۔ انسان کی نظریں بھی بہت کچھ سمجھا دیتی ہیں اور مجھے اس کی نظروں میں اپنے لیے بیزاری اور غصہ دکھائی دیتا ہے۔"

"اے یہ تجھے غصہ دکھا کر تو دیکھے۔ اس کی آنکھیں نہ پھوڑ ڈالوں گی۔" وہ غصے سے کہتیں۔

کئی مرتبہ ہانیہ کا دل چاہتا تھا۔ وہ صاف طور پر کہہ دے۔

ان کا بھانجا ان کی ذمہ داری ہے۔ لہٰذا وہ اپنی اس ذمہ داری سے خود نپٹیں۔ بھلا اس کے لیے یہ دردِ سر کیوں؟

لیکن وہ کچھ نہ کہہ پاتی۔ وہ جانتی تھی اگر کچھ کہہ دیا تو اس کے لیے زندگی مزید تلخ اور دو بھر ہو جائے گی۔

وہ دل ہی دل میں اس شخص کو بد دعائیں دیتی تھی۔

"اے میں پڑھ رہا ہوں۔ مجھے ایک کپ چائے بنا دو۔"

"تو کیا میں گھاس کھود رہی ہوں۔ نظر نہیں آتا۔ میں بھی پڑھ رہی ہوں۔" دل میں کہتی، لیکن لبوں سے ادا نہ ہو پاتا۔

"ویسے تم کیا پڑھتی رہتی ہو؟" وہ اس کی کتابیں الٹ پلٹ کر دیکھتا۔

"اوہو تو ایف اے کی تیاری ہو رہی ہے۔ ویسے صورت سے تو تم میٹرک بھی نہیں لگتیں۔ حلیہ دیکھا ہے اپنا۔ بالکل کام والی مائیوں جیسا ہے۔ یقین مانو۔ پہلے دن تمہیں دیکھ کر میں کام والی ماسی ہی سمجھا تھا، لیکن بعد میں پتا چلا کہ تم خالو کی لڑکی ہو۔"

"میں چائے لاتی ہوں۔" اسے اس کے کسی تبصرے سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔
"یہ تم ہر وقت منہ پھلائے کیوں رہتی ہو۔ میں جانتا ہوں۔ خالہ کا تم سے سلوک اچھا نہیں ہے۔ وہ دن بھر تم سے کام کرواتی ہیں، تمہیں جھاڑ الگ پلاتی ہیں اور۔"
"آپ پلیز اوپر اپنے کمرے میں جایئے۔ میں آپ کے لیے چائے وہیں لاتی ہوں۔"
طاہا کو سیڑھیوں سے اوپر والا کمرہ دیا گیا تھا۔ اس کمرے کی صفائی ستھرائی کا ذمہ بھی ہانیہ کا تھا۔ وہ اپنے میلے کپڑے وہیں کرسی پر ڈال دیتا تھا۔ اس کی کتابیں پلنگ پر بکھری رہتی تھیں۔ اس کے جوتے اور موزے فرش پر پڑے رہتے۔ اس کی الماری سے تمام کپڑے بھی باہر لٹک رہے ہوتے تھے۔ اس کا کمرہ صاف کرتے اسے پورا گھنٹہ لگتا تھا۔ وہ صبح صاف کرتی تھی۔ اگلے دن تک پھر اسی طرح کمرہ بکھرا ملتا۔ اسے لگتا تھا وہ یہ سب جان بوجھ کر کرتا ہے۔ وہ اسے تنگ کرنے کو اپنے کمرے کو منتشر کر دیتا ہے۔
نبیہ اور فہد کو پڑھانے کی ذمہ داری بھی نئی امی نے اس کے سر ڈال دی تھی۔ ان کا ہوم ورک کرانا۔ ان کا یونیفارم تیار رکھنا، وہ یہ سارے کام کرتے کرتے تنگ آ گئی تھی۔ اس کا دل چاہتا تھا۔ وہ کہیں روپوش ہو جائے۔ تب امی کو اس کی وقعت اور قدر کا احساس ہو۔
اس عید پر بھی ابا نے اس کے لیے کچھ نہیں خریدا تھا۔ امی کے ساتھ نبیہ اور فہد کی ہر چیز لائے تھے، لیکن انہیں ایک بار بھی ہانیہ کا خیال نہیں آیا کہ اسے بھی نئے کپڑوں اور چوڑیوں، مہندی کی ضرورت ہوگی۔
نبیہ اور فہد خوش خوش اسے اپنی ہر چیز دکھاتے رہے اور وہ آنکھوں میں آنسو لیے اندر ہی اندر اپنی محرومی پر کڑھتی رہی۔
اگر اماں زندہ ہوتیں تو وہ تب دیکھتی۔ ابا اس سے اس طرح لاپروا اور غافل کیسے رہتے۔
کل عید تھی، وہ رات تک گھر کی صفائی میں مصروف رہی۔ صبح طاہا کی امی اور اس کی دو بہنیں بھی پہنچنے والی تھیں۔ طاہا بہت خوش تھا۔ اس کے گھر والے اس کے ساتھ عید منائیں گے۔ نئی امی کی اسے خصوصی ہدایات تھیں۔ گھر کا کونہ کونہ چمکتا ملنا چاہیے۔ صبح کے لیے شیر خورمہ وہ اذانوں کے وقت اٹھ کر پکائے گی۔ ناشتے کے ساتھ ساتھ انہوں نے دوپہر کے کھانے کے لیے بھی اسے سب بتا دیا تھا۔
یعنی کل عید کا سارا دن بھی کچن میں گزرے گا۔ ملازمہ ہمہ وقت خدمت کو تیار رہے گی۔
وہ نبیہ، ہانیہ اور امی ابا کے کپڑے صبح کے لیے استری کر کے اٹھی ہی تھی کہ طاہا سر پر آسوار ہوا۔
"یہ میرے کپڑے بھی استری کر دو۔"
"اس وقت۔" وہ تھکی تھکی آواز میں بولی۔
"کیوں اس وقت کیا ہوا؟" وہ انجان بن گیا۔

حالانکہ صاف جانتا تھا' رات کا ڈیڑھ بج رہا ہے اور کام کرتے کرتے وہ تھک کر نڈھال ہو چکی ہے۔

"لو پکڑو کپڑے۔ یوں ہونق کیوں بنی ہو۔" اس نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کپڑے خود ہی اس کے ہاتھ میں تھمادیے۔

اس کی آنکھیں لبالب بھر گئیں۔

"اچھا سنو۔ تم نے صبح کے لیے اپنے کون سے کپڑے استری کیے ہیں؟" بھلا وہ کیوں پوچھ رہا تھا۔

"مجھے کپڑوں کا شوق نہیں۔" اپنے غموں اور محرومیوں کی تشہیر اسے بالکل پسند نہیں تھی۔

"کیوں.... جبکہ کپڑوں کا تو ہر لڑکی کو شوق ہوتا ہے' اوہ اب سمجھا۔ غالباً" تمہارے لیے نہ خالو نے کپڑے خریدے ہیں اور نہ خالہ نے۔ کل بچے اپنی شاپنگ دکھا رہے تھے۔ مجھے تمہارے کپڑے نظر نہیں آئے۔" وہ کہہ رہا تھا۔

ہانیہ نے لب کچل ڈالے۔ وہ اس کے سامنے رونا نہیں چاہتی تھی۔ پھر بھی آنسو ابل ہی پڑے۔

"میرا مقصد تمہیں رلانا نہیں تھا ہانیہ۔ اچھا ایک منٹ ٹھہرو۔" وہ اس کی بات سنے بغیر تیزی سے پلٹا اور سیڑھیاں چڑھ گیا۔ لمحوں بعد ہی اس کے سیڑھیاں اترنے کی آواز آئی۔

"یہ دیکھو۔" وہ ایک پیکٹ لیے اس کے سامنے آ گیا۔

"یہ۔ یہ کیا؟" وہ سمجھ نہ سکی۔

"یہ تمہارے عید کے کپڑے ہیں۔ ریڈی میڈ۔ سلے سلائے۔ میں جانتا تھا اگر ان سلے کپڑے لے لیے تو سلوانے کا وقت نہیں ہو گا۔ اس لیے بازار سے گزرتے تمہارے لیے یہ کپڑے لے لیے۔ ایسے ہی تمہارا خیال آ گیا تھا۔ لو انہیں صبح پہن لینا۔"

"نن نہیں میں آپ سے یہ کپڑے نہیں لے سکتی۔" وہ گڑبڑائی تھی۔

ایک غیر کو اس کا احساس ہے' لیکن اس کے سگے ابا کو اس کا ذرا بھی خیال نہیں۔ کاش وہ پیدا نہ ہوتی یا پھر اماں اس دنیا سے جاتے ہوئے اسے بھی اپنے ساتھ لے جاتیں۔

"کیوں نہیں لے سکتیں۔"

"میں صبح نئی امی کو کیا بتاؤں گی کہ یہ کپڑے کہاں سے آئے۔" الفاظ اس کے حلق میں اٹک سے گئے۔

"تم کچھ مت کہنا۔ میں انہیں سنبھال لوں گا۔"

"نہیں۔ وہ میری جان نکال دیں گی۔" وہ ڈری۔

تب پہلی بار طاہا کو اس لڑکی کے لیے اپنے اندر عجیب سے خیالات و احساسات سر اٹھاتے محسوس ہوئے۔ اس نے اپنے قیام کے سارے عرصے میں ایک بار بھی اسے مسکراتے نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ ہنسنے سے ڈرتی تھی۔ وہ اس پیاری سی لڑکی کے اندر جھانکنا چاہتا تھا۔ اس کی سادگی اور اس کی معصومیت نے غالباً" اسے بہت متاثر کیا تھا۔

"لو۔ یہ کپڑے رکھ لو۔ اگر تم نے صبح یہ کپڑے نہ پہنے تو میں خفا ہو جاؤں گا۔"

"وہ اس کا کیا لگتا ہے؟"

بسا اوقات کسی سے اپنے رشتے کی وضاحت کتنی دقت طلب ہوتی ہے۔ پہلی بار اسے اس شخص کی ہمدردی اچھی لگی۔

"مگر....؟" گھنیری پلکیں بے قراری سے اٹھیں۔

"میں نے کہا ناں۔ میں صبح انہیں سنبھال لوں گا۔"

وہ شگفتگی سے مسکرایا تو وہ بھی ہولے سے مسکرا دی۔

اس لڑکی کے چہرے پر صرف اس کی وجہ سے مسکراہٹ آئی ہے۔ یہ احساس جیسے اس کے لیے بہت خوش کن تھا۔ اس نے اس کی سیاہ آنکھوں میں دیکھا۔ یوں مسکرانے سے اس کی آنکھوں کی روشنیوں میں اضافہ ہو جاتا تھا اور اس کی آنکھوں کی روشنیاں کتنی دل فریب اور ڈسٹرب کر دینے والی تھیں۔ وہ بھی ڈسٹرب ہو گیا۔

صبح سب اجلا اجلا تھا۔

پہلی بار ہانیہ کو یوں صبح اٹھنا اور گھر کے کام کرنا اچھا لگ رہا تھا۔ شیر خورما بنا کر اور ناشتے سے فارغ ہو کر وہ

تیار ہونے چلی گئی۔ جب تیار ہو کر باہر آئی تو طاہا کے گھر والے آچکے تھے۔ طاہا ان سب میں بیٹھا بہت چونچال اور خوش باش لگ رہا تھا۔

"یہ لڑکی کون؟" طاہا کی امی نے اس پیاری سی لڑکی کو دیکھ کر نئی امی سے پوچھا۔ تو وہ اس کا حلیہ دیکھ کر دنگ رہ گئیں۔

"ایں۔ یہ نئے کپڑے۔؟"

گلابی رنگ کے خوب صورت جوڑے میں نہائی دھوئی، لمبے بال کھولے وہ کس قدر دلفریب اور حسین لگ رہی تھی۔

یہ جوڑا اس نے کہاں سے لیا.... ؟ کیا نبیہہ کے ابا نے ان سے چھپ کر ان سے چوری چوری بیٹی کو جوڑا خرید دیا، وہ اگر انہیں بتا دیتے تو وہ کون سا انہیں روک دیتیں۔ نئی امی کا منہ بن گیا۔

بیٹی کے جوڑے پر پیسے خرچ کر ڈالے۔ ان ہی پیسوں سے دو دن کا خرچ چل جاتا۔

"تم نے بتایا نہیں۔ یہ لڑکی کون ہے۔"

"اسلم کی پہلی بیوی کی لڑکی۔ کم بخت خود مر گئی اور اسے میرے سر ڈال گئی۔ یہاں اس مہنگائی میں اپنے بچوں کا خرچ اٹھانا مشکل ہے اور اوپر سے یہ جوان جہان لڑکی، کم بخت کی شادی بھی میرے سر پر ہے۔ کہاں سے پیسے آئیں گے۔ کئی دفعہ تو دل کرتا ہے اسے کسی سے نکاح کے دو بول پڑھوا کر رخصت کر دوں۔ سر سے بلا تو ٹلے۔ اس کا شوہر خود ہی اس کا خرچا اٹھائے۔ ہماری خلاصی ہو۔" وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھیں۔

"ویسے لڑکی ہے پیاری۔" خالہ نے تعریف کی۔

"تو پھر تم اسے اپنے لڑکے سے بیاہ لو۔" نئی امی جل کر بولیں۔

"اے خدا نہ کرے۔ میں اپنے بیٹے کو اتنی محنت سے پڑھا رہی ہوں۔ کسی اونچے خاندان سے بہو لاؤں گی۔ خوب سارا جہیز لوں گی۔ لڑکی کا گھرانہ امیر ہو تو لڑکے کی عزت ہوتی ہے۔ وہ شان سے سر اٹھا کر رشتہ داروں میں اٹھتا بیٹھتا ہے۔"

طاہا کے کانوں میں امی کا تبصرہ بخوبی پہنچ رہا تھا۔ وہ اپنی جگہ پہلو بدل کر رہ گیا۔ یہ لڑکی ہانیہ اسے اچھی لگنے لگی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا۔ تعلیم سے فارغ ہو کر وہ اس کے متعلق امی سے بات کرے گا، لیکن امی نے تو اس کے کچھ کہنے سے پہلے ہی اپنے خیالات کا اظہار کر دیا تھا۔ خیر، وہ وقت تو آئے۔ وہ خود ہی انہیں قائل کر لے گا۔

"تم جا کر باورچی خانے میں کھانا پکاؤ۔ دوپہر سر پر ہے اور سنو یہ نئے کپڑے اتار کر جانا ورنہ خراب ہو جائیں گے۔" نئی امی نے اسے غصیلی نظروں سے گھورتے کہا۔

"رہنے دیں ناں خالہ! آج عید کا دن ہے۔" طاہا نے طرفداری کی۔

"کیوں بھئی، نئے کپڑوں کا ناس مارنا ہے کیا؟ ویسے بھی اتنی مہنگائی ہے۔ ایک وقت کی دال روٹی مشکل سے چلتی ہے۔ کہاں یہ نقصان برداشت کیا جائے گا۔ ذرا یہ بتایہ جوڑا تجھے کس نے دیا.... ؟" اس سوال کے خوف سے وہ کانپ رہی تھی۔

"یہ جوڑا میں اس کے لیے لایا تھا خالہ۔"

"تم" اس انکشاف پر نئی امی کا سر گھوم گیا۔ وہ کیا سن رہی تھیں اور کیسے سن رہی تھیں "تم بھلا اس کے لیے یہ جوڑا کیوں لائے....؟"

اس سے تختی سے کہہ کر انہوں نے بت بنی لڑکی کی جانب دیکھا۔

"تو اتنی گھنی ہے کہ تو نے بھی مجھے اس بارے میں کچھ نہیں بتایا... تجھ سی بدذات لڑکی میں نے اپنی ساری زندگی میں کہیں نہیں دیکھی۔ دوسروں سے کپڑے لے کر تو کیا ظاہر کرنا چاہتی ہے کہ ہم ظالم ہیں۔ ہم نے تیری کسی ضرورت کا کبھی کوئی خیال نہیں رکھا۔ تجھے کبھی نئے کپڑے نہیں لے کر دیے۔ ارے اب تک جو لوٹھا ہوئی ہو تو ہمارے دیے ہوئے کپڑوں کو پہن کر ہوئی ہو اور۔"

وہ خوب برہ برہ کر بول رہی تھیں۔

طاہا نے دیکھا۔ وہ پلکیں جھپکتے ہوئے آنسو روک

رہی تھی۔

"خالہ! آپ ناحق اس پر برس رہی ہیں۔ میں خود ہی اس کے لیے کپڑے لے آیا تھا۔ صرف یہ سوچ کر کہ عید کا دن ہے۔ اگر یہ نئے کپڑے نہیں پہنے گی تو آنے جانے والوں میں آپ کی سبکی ہوگی۔ سب ہی آپ کو ظالم سمجھیں گے کہ سوتیلی بیٹی کا خیال عید کے دن بھی نہیں رکھ سکیں۔ میں نے تو صرف آپ کی عزت بڑھانے کی خاطر اسے یہ کپڑے لا کر دیے تھے۔ ابھی محلے کی خالہ شیر خورمہ دے کر گئی ہیں۔ انہوں نے ہانیہ کے کپڑے دیکھ کر آپ کے لیے تعریفی کلمات ادا کیے ہیں کہ آپ کتنی خدا ترس اور ہمدرد ہیں۔ سوتیلی بیٹی کا اپنی سگی بیٹی سے زیادہ خیال رکھتی ہیں۔"

"کیا سچ؟" نئی امی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔

"بالکل سچ۔ اب جتنے بھی لوگ ہانیہ کو دیکھیں گے سب آپ کی رحم دلی اور خدا ترسی کے گن گائیں گے۔"

"دبھئی ہاجرہ! میرا بیٹا بہت عقل مند ہے۔ اسے اپنی خالہ کی عزت کا بہت خیال ہے۔" سلطانہ خالہ بولیں تو طاہا کی بہنیں بھی خوش ہو گئیں۔

"واقعی امی! طاہا بھائی بہت خیال رکھنے والے ہیں۔ یہاں خالہ کے گھر رہ رہے ہیں تو ان کا بھی اس گھر پر حق بنتا ہے۔" عائشہ مسکرائی۔

"ویسے یہ جوڑا ہانیہ پر کتنا خوبصورت لگ رہا ہے۔" ثمینہ کے توصیفی کلمات نے نئی امی کو غصہ دلا دیا۔

"اے شکل و صورت میں کیا دھرا ہے۔ انسان میں سلیقہ شعاری اور ہنر ہونا چاہیے اور یہ لڑکی اول درجے کی سست اور کاہل ہے۔ جوان لڑکی کے گھر میں موجود ہوتے سارا کام مجھے خود کرنا پڑتا ہے۔"

"واقعی یہ تو بہت بری بات ہے۔" سلطانہ خالہ بولیں۔

"بچی تم اپنی خالہ کا ہاتھ بٹایا کرو۔ پیدا کرنے والے سے پالنے والے کا حق زیادہ ہوتا ہے۔ یہ تمہیں جس محبت اور توجہ سے پال رہی ہے۔ تمہیں تو اس کا احسان مند ہونا چاہیے۔ ورنہ آج کل کے مطلبی زمانے میں کون کسی کو پوچھتا ہے۔ خصوصاً" سوتیلے رشتوں کو۔"

ہانیہ خاموشی سے باورچی خانے میں چلی آئی۔

"رشتے تو رشتے ہوتے ہیں۔ پھر ان میں سگے اور سوتیلے کا چکر کیوں؟ اور۔" گاڑی کو جھٹکا لگا تھا۔

وہ اپنے خیالات کے تسلسل کے ٹوٹنے پر چونک گئی۔ کھڑکی کے راستے اندر آتی ہوا جیسے اس کے گھونگھٹ کو اڑائے دے رہی تھی۔ دفعتاً" اس کے اندر گھٹن بڑھ گئی۔

بسا اوقات خونی رشتے کتنی بڑی قربانی مانگتے ہیں۔ اپنی محبتوں کا خراج وصول کرتے ہیں۔ ساری زندگی کی بربادی کی صورت میں۔

وہ ابا سے سخت خفا تھی۔

ابا نے زندگی میں کبھی اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا تھا۔ نہ اس کی پرورش میں۔ نہ محبتوں میں اور اب شادی کے سلسلے میں بھی انہوں نے اسے اس طرح گھیرا تھا کہ کہیں جائے فرار نہ تھی۔ اماں کے گزر جانے کے بعد اس نے ابا کے ہاتھوں میں کبھی محبت کا لمس نہیں پایا تھا۔

انہوں نے اسے اس گھر سے نکالنے سے پہلے کچھ سوچا بھی نہیں۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے بیٹھی تھی۔

یہ عجیب بات ہے۔ اسے رخصت کرانے صرف دولہا آیا تھا۔ نہ اس کے عزیز و اقارب اور نہ اس کے دوست ہمراہ تھے۔ نہ ہی اس کے گھر کی خواتین ساتھ تھیں۔ یہ رخصتی ایسے تھی جیسے کسی کو سرخ جوڑا پہنا کر اس کا جنازہ اٹھایا جاتا ہے، لیکن جنازے میں بھی لوگ موجود ہوتے ہیں۔ لیکن یہ اس کی کیسی شادی تھی۔ نہ مایوں ہوئی.... نہ مہندی ہوئی اور نہ ہی اس کی شادی کے گیت گائے گئے۔

اس کے گھر کے دروازے کے باہر بارات کے نام پر

صرف ایک گاڑی موجود تھی جس کا دروازہ کھولے وہ شخص کھڑا تھا، جسے بدقسمتی نے اس کا دولہا بنا دیا تھا۔

"پلیز اندر بیٹھ جائیے۔" وہ خود سے اس سے مخاطب تھا۔ ہانیہ کو بڑا عجیب لگا۔

وہ بنا کچھ کہے کھلے دروازے سے اندر سیٹ پر بیٹھ گئی۔ لمبے سے گھونگھٹ سے اس نے ابا کو قریب آتے دیکھا۔ امی بھی ہمراہ تھیں۔

"خوش رہنا بچی۔"

جیسے یہ اپنے بس کی بات ہے۔ اگر خوش رہنا اس کے اپنے ہاتھ میں ہوتا تو وہ اپنی زندگی سے دکھوں کے سارے کانٹے ایک ایک کرکے نکال پھینکتی' اور اپنی راہوں میں دور دور تک پھول بکھیر دیتی۔ خوشی کس چڑیا کا نام ہے' آسودگی کس احساس کا نام ہے۔ وہ کبھی جان بھی نہیں پائی۔

ابا کا بوڑھا ہاتھ کتنی دیر اس کے سر پر جمے دوپٹے پر ٹکا لرزتا کانپتا رہا تھا۔

"دیکھنا' سسرال میں میکے کے نام کو مٹی میں نہ ملا دینا۔ یہاں تو گھر میں سارا وقت بستر توڑتی رہتی تھیں۔ لیکن وہاں سسرال میں دوڑ دوڑ کر سب کے کام کرنا۔ ماں کی تربیت پر کسی کو انگلی اٹھانے کا موقع نہ دینا۔ بھلے تمہاری سوتیلی ماں ہوں' لیکن میں نے تمہیں ہمیشہ اپنی نبیہہ سے بڑھ کر پیار دیا ہے۔ اور ہمیشہ تمہاری خوشیوں کے لیے دعاگو رہی ہوں۔"

وہ اس سے زیادہ اس کے قریب کھڑے دولہا کو سنا رہی تھیں۔

ہانیہ کے دل میں ان کے لیے بڑی شدت سے نفرت ابھری۔

اگر وہ اسے نبیہہ سے بڑھ کر پیار دیتیں تو آج وہ یوں دربدر نہ ہوتی۔ وہ اس شخص سے جدا نہ ہوتی جس نے اس کی زندگی کو خوشیوں سے بھر دینا چاہا تھا۔ جو اس کی تنہائیاں بانٹ لینے کا متمنی تھا۔ جو اس کا ہمدرد' اس کا دوست اور اس کا خیر خواہ تھا۔ اور شاید اس کا پیار بھی۔

دفعتاً" اس کا دل چاہا' وہ چلتی گاڑی کا دروازہ کھول کر باہر کود جائے' اور اس درد بھری زندگی اور مایوسیوں سے ہمیشہ کے لیے چھٹکارا پالے۔ وہ طاہا کو کبھی اپنی وفا کا یقین نہیں دلا پائے گی۔

وہ اس کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا۔
ساتھ نبھانے کی قسمیں اس سے کھائیں، مگر زندگی گزارنے کا فیصلہ کسی دوسرے کے ساتھ کرلیا۔
وہ اب ساری زندگی اسے یقین نہیں دلا پائے گی کہ وہ ابا کے سامنے مجبور ہوگئی تھی۔ وہ ان کی زبان کی خاطر، ان کی بوڑھی نگاہوں کی التجاؤں کی خاطر چپ ہوگئی تھی۔ وہ سوتیلی ماں کی ڈسی تھی۔ وہ ان کے عناد اور ان کی نفرت کی بھینٹ چڑھ گئی۔
کاش اس کی اماں زندہ ہوتیں۔
وہ ابا سے ساری زندگی بات نہیں کرے گی۔ وہ پلٹ کر اس گھر کی طرف نہیں دیکھے گی۔ وہ کبھی ابا کا سامنا بھی نہیں کرے گی۔ وہ اپنی سوتیلی ماں اور اس کے دونوں بچوں سے کوئی واسطہ نہیں رکھے گی۔ حالانکہ نبیہ اور فہد اس سے بہت پیار کرتے تھے۔ ان دونوں کی محبت میں کوئی سوتیلا پن نہیں تھا۔
اور وہ طاہا۔
وہ اس کا سب کچھ تھا۔
اس نے طاہا کو اپنا سب کچھ مان لیا تھا۔ اپنی زندگی۔ اپنی حیات اپنی خوشی۔ اپنی آسودگی اور اپنا نجات دہندہ بھی۔
لیکن جب اس سے تعلق ٹوٹا تو سب کچھ دھجی دھجی ہوگیا۔ اس کے سارے خواب بکھر گئے اور ان خوابوں کی کرچیاں اس کی آنکھوں میں چبھ گئیں۔ ان کرچیوں کے چبھنے پر جیسے اس کی آنکھیں لہولہان ہوگئی تھیں۔
اس کے ذہن میں طاہا کا سوال شور مچا رہا تھا۔
"تم مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتیں۔ تم مجھ سے دغا نہیں کرسکتیں۔ تمہیں مجھ سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ میں تم سے محبت کرتا ہوں۔ میں نے اپنی خوشیوں کو تم سے وابستہ کرلیا ہے اور تم مجھ سے یوں منہ موڑے جا رہی ہو۔ جیسے میرا تم سے کوئی تعلق نہ ہو۔"
"تم ہی بتاؤ۔ کیا تعلق ہے؟" اس کی آواز بوجھل تھی۔
"تم میری محبت ہو اور محبت کا تعلق، دلوں کا تعلق اس دنیا کا سب سے مضبوط تعلق ہے۔ کہو تم اس سے انکاری ہو۔"
اس کی بات پر وہ خوامخواہ دوپٹہ اپنی انگلیوں پر لپیٹتی کھولتی رہی۔
"اس بے وفائی کے لیے میں تمہیں تاحیات معاف نہیں کروں گا۔ ہانیہ۔"
"تم تو کیا۔ مجھے تو اس زندگی نے بھی معاف نہیں کیا۔" وہ اندر تک چھلنی چھلنی تھی۔
"پلیز ہانیہ! اب بھی میری طرف پلٹ آؤ۔ اب بھی وقت ہے۔ میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔"
طاہا التجا کرنے لگا۔
"اگر تم میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتے، تو تم نے مجھے اس ظالم دنیا سے چھین کیوں نہیں لیا۔ کیوں میری ڈھال نہیں بنے۔ کیوں اپنی والدہ اور میری امی کے سامنے نہیں ڈٹے۔ یاد رکھو طاہا محبت کرنے والے اتنے کمزور نہیں ہوتے، لیکن تم بہت کمزور نکلے۔"
"تم مجھے وقت دو ہانیہ۔ میں سب ٹھیک کرلوں گا۔" اس کی آنکھیں ضبط گریہ کے سبب جیسے سرخ ہو رہی تھیں۔
"اب کچھ ٹھیک نہیں ہوگا۔ سب ختم ہوگیا۔" ہانیہ کی اپنی آنکھیں بھی لہو رنگ ہو رہی تھیں۔
"کچھ ختم نہیں ہوا۔ میں تمہارا پیچھا کبھی نہیں چھوڑوں گا ہانیہ۔ میں تمہیں اس شخص سے چھین لوں گا۔ وہ اگر تمہارا شوہر بن گیا تو کیا ہوا۔ میں تمہاری محبت ہوں اور محبت نے ہارنا نہیں سیکھا۔"
اس کی آنکھوں میں کھو دینے کی کیفیت تھی۔
وہ اس لڑکی کو اپنے اندر سمو لینا چاہتا تھا۔ وہ اتنے دنوں سے اس کے متعلق سوچ سوچ کر ہلکان ہوا جا رہا تھا۔ اس نے اس لڑکی کے لیے امر پریم مانگا تھا۔ دنیا بھر کی خوشیاں مانگی تھیں۔ لیکن حرماں نصیبی سے وہ اس سے چھین لی گئی تھی۔ کسی اور کی بنادی گئی تھی۔ وہ بدنصیبی کا یہ وار قبول کرنے کو ہرگز ہرگز تیار نہیں تھا۔

اس رات چھت کی منڈیر سے لگے اس نے قدسیہ سے اپنے دل کی ہر بات کہہ ڈالی۔ اپنی اندر کے زخم دکھا

ڈالے۔

"وہ کہتا ہے۔ وہ میرے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ وہ کہتا ہے۔ وہ مجھے اس شخص سے چھین لے گا' جسے میرا شوہر بنا دیا گیا ہے۔"

قدسیہ کے گھر کی چھت اس کی چھت سے ملی تھی۔ وہ اکثر قدسیہ سے وہیں ملتی تھی۔ وہیں باتیں کرتی تھی۔

"اب یہ سب فضول باتیں ہیں ہانیہ۔ جو شخص وقت پڑے کچھ نہ کر سکا' تم اس کا خیال ذہن سے جھٹک ڈالو۔ تمہارے پیش نظر تمہارے ابا کی عزت ہے اور پھر تم اپنی سوتیلی ماں کو بخوبی جانتی ہو۔ وہ یہ طعنے دے دے کر تمہیں مار ڈالیں گی۔ وہ تمہیں سارے محلے میں بدنام کر دیں گی۔ تم سب بھول جاؤ۔ اور اپنی آنے والی زندگی کے متعلق سوچو۔"

قدسیہ اسے سمجھانے لگی۔

"لیکن قدسیہ۔۔۔ وہ میری محبت ہے۔ اس شخص نے مجھے جینے کا حوصلہ دیا ہے۔ اس شخص کی ذات مایوسیوں کے جنگل میں جگنو جیسی ہے۔"

"تمہاری زندگی کا اصل جگنو تمہارا شوہر ہے' جس سے تمہارا نکاح ہو چکا ہے اور جو کل تمہیں رخصت کرانے آ رہا ہے۔ دیکھو ہمت مت ہارنا۔ تم پہلے بھی آزمائشوں سے گزری ہو۔ اب بھی نئی آزمائشیں تمہاری منتظر ہیں۔ شادی کے بعد عورت کا سب کچھ اس کا شوہر ہوتا ہے۔ تمہیں اب اسی کے لیے سوچنا اور خود کو اس کی پسند کے مطابق ڈھالنا ہے۔ طاہا محض چند دنوں کا ساتھی ہے۔ تمہارا ماضی ہے۔ جبکہ وہ شخص تمہارا جیون ساتھی ہے۔ تمہارا مستقبل ہے۔"

اس نے لب کاٹ کر آنکھیں بند کر لیں۔ شاید اس طرح اس کے اعصاب سکون پا جائیں۔

قدسیہ کی ساری باتیں درست تھیں۔

لیکن شاید وہ ساری زندگی سمجھوتا نہ کر پائے۔

وہ شاید خود کو حالات کے رحم و کرم پر کبھی نہ چھوڑ پائے۔

"قدسیہ! کیا ایسا نہیں ہو سکتا۔ میں اس کے ساتھ کہیں بھاگ جاؤں۔" اس نے یہ بات کہی تو قدسیہ کانپ سی گئی۔

"ایسا سوچنا بھی مت پاگل لڑکی۔۔۔ تمہارے ابا خودکشی کر لیں گے۔ اور تمہاری چھوٹی بہن تاحیات تمہارے اس اقدام کی سزا بھگتتی رہے گی۔ تم خود غرض بن کر صرف اپنے متعلق کیوں سوچ رہی ہو۔ تم یہ کیوں نہیں سمجھتیں کہ تم سے اور بھی لوگوں کی زندگی وابستہ ہے۔ بھلے ان لوگوں نے تمہارے ساتھ کوئی اچھا سلوک نہیں کیا۔ لیکن اگر بدلے میں تم انہیں وہی کچھ لوٹاؤ گی تو تم میں اور ان میں کیا فرق باقی رہ جائے گا۔ برائی کا بدلہ برائی سے دینا جہالت ہے ہانیہ! اور تم جاہل ہو نہ ہی خود غرض۔"

قدسیہ ایک تواتر سے جو کچھ بولتی رہی تھی' وہ اس کے اندر تک اتر گیا۔

"کاش یہ زندگی مجھ پر اتنی نامہربان نہ ہوتی۔" وہ بہت بے سکون تھی۔

"خاطر جمع رکھو۔۔۔ اور حالات کا مقابلہ کرو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" قدسیہ نے ڈھارس دی تھی۔

گاڑی کسی پتھر کے اوپر سے گزرتی زور سے اچھلی تھی۔ وہ ساتھ بیٹھے شخص کے کندھے سے جا ٹکرائی۔

"سنبھل کر بیٹھیں۔" قریب ہی سرگوشی ابھری۔

وہ خفت اور شرمندگی سے سرخ پڑ گئی۔ اسے لگا جیسے سارے جسم کی آگ اس کے منہ پر آ گئی ہے۔ اس نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا تھا۔ وہ لاعلمی اور بے ساختگی میں سنبھل نہ سکی تھی۔ اس کے ماتھے پر ناگواری کی لکیریں نمودار ہو گئیں۔ اس نے آنکھیں سکیڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ جیسے اسے ان لفظوں کو سمجھنے کے لیے محنت کرنا پڑی ہو۔

پتا نہیں وہ یہ زندگی کیسے گزار پائے گی؟

ایک مستقل مایوسی اور دل شکنی والی کیفیت اس پر طاری تھی۔ اس کی آنکھیں تب سے مسلسل جل رہی تھیں اور سینے میں دل کی جگہ جیسے آگ کا جلتا سلگتا گولا دھرا تھا۔

گاڑی کو زوردار بریک لگے۔

وہ چونک گئی۔

گاڑی بڑے سے مکان کے دروازے کے عین سامنے رکی تھی۔

لکڑی کا بڑا سا دروازہ کھلا تھا۔ اور دروازے کے اس پار مکمل سناٹا طاری تھا۔ شادی والے گھر میں ایسی خاموشی۔

وہ اپنی ذات کے بے مایہ ہونے کے احساس کے تحت اندر ہی اندر کڑھتی رہی۔

پہلے نئی امی نے اس کی ذات کو ارزاں بنائے رکھا۔ اور اب اس نئے گھر میں بھی اسے اپنی وقعت کا اندازہ بخوبی ہو رہا تھا۔ وہ خود ہی نیچے اتر آئی۔

دولہا کب کا کھلے دروازے سے اندر غائب ہو چکا تھا۔ اس نے دلہن پر قطعی کوئی دھیان نہیں دیا تھا۔ وہ جزبز ہو گئی۔ عجیب بدتمیز قسم کا شخص ہے۔ دلہن کو چھوڑ چھاڑ خود غائب ہو گیا۔ نہ پذیرائی کو کوئی موجود۔ نہ راہنمائی کو۔

وہ ہونق بنی کھڑی رہی۔

اس نے ایک اچٹتی سی نظر کھلے صحن پر ڈالی۔ کوئی اہتمام کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ کوئی شور شرابا بھی نہیں۔ کہیں دولہا میاں اپنی دلہن کو گھر والوں کی مرضی کے بغیر تو نہیں بیاہ لائے؟ ایک عجیب سے خیال نے ہانیہ کے اندر جیسے ہلچل سی مچادی۔

"ارے نئی دلہن آگئی۔" ساتھ والے گھر کے دروازے سے دو لڑکیاں ایک ساتھ باہر جھانک رہی تھیں۔

"دلہن کب سے باہر کھڑی ہے۔ برکت خالہ اور چھوٹی بھابھی وغیرہ دلہن کے استقبال کو دروازے پر بھی نہیں آئیں۔"

وہ دونوں لڑکیاں اتنی اونچی آواز میں تبصرہ کر رہی تھیں کہ آواز ہانیہ کے کانوں تک بخوبی آن پہنچے۔

وہ خود ہی دروازہ عبور کر آئی۔ باہر تماشا بننے سے فائدہ۔ محلے کے گھروں سے کئی ایک شکلیں مزید جھانکنے لگی تھیں۔ وہ آدھا صحن عبور کر آئی جب ہی سامنے برآمدے کے اس پار سے ایک خاتون نمودار ہوئیں۔

"اوہ تو تم آگئیں۔ باہر رک کر ذرا انتظار کر لیتیں۔ کچھ رسمیں ہونا تھیں۔ میں شفو سے کہہ رہی تھی کہ دروازے کی دہلیز پر تیل ڈالنے کو شیشی ڈھونڈ دے۔ مگر وہ کام چور اور نکمی لڑکی کبھی کوئی چیز ٹھکانے پر رکھے تو وقت پر وہ چیز برآمد ہو ناں۔"

تو گویا دلہن کے گھر آنے پر یہ تیاری تھی کہ ایک تیل کی شیشی بھی تیار نہیں رکھی گئی تھی۔ ہانیہ جل سی گئی۔

"تم باہر چلو بہو! شفو تیل کی شیشی لاتی ہو گی۔"

"اب وہ تیل اپنے سر میں ڈال لیں۔"

ہانیہ کے لبوں پر جملہ آتے آتے رہ گیا۔

برآمدے کے دوسری طرف ایک قطار میں بنے کمروں سے اب شور کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ بلکہ برآمدے میں مجمع بھی لگنا شروع ہو گیا تھا۔ مگر اس مجمع میں سے کسی نے اس کے قریب آنے کی ہمت نہیں کی۔

"اوہ تو یہ نئی دلہن ہے۔"

ایک آواز اس کے قریب سے ابھری۔

"چھوٹی بہو۔ دلہن کو اس کے کمرے میں لے جائیو۔ میں چولہا چوکا دیکھتی ہوں۔"

خاتون کی بات پر چھوٹی بہو دانت نکوستی اس کا بازو پکڑنے کو آگے بڑھی۔

"تم تو خاصی خوب صورت ہو۔" چھوٹی بہو نے صاف گوئی سے کام لیا۔

"بھئی میں تو اپنی بھابھی سے خوب دوستی رکھوں گی۔"

شفو نے آکر دوسرا بازو تھام لیا۔ وہ دونوں اس کے دونوں اطراف میں منکر نکیر کی طرح موجود تھیں۔

وہ چپ چاپ ان دونوں کے ساتھ گھسٹتی اپنے کمرے تک آگئی۔ کمرے میں گھستے ہی اسے اندازہ ہو گیا کہ اس کمرے کی طرف کوئی آنے کا تکلف تک نہیں کرتا۔ بے انتہا بے ترتیب کمرہ تھا۔ دولہا میاں کے میلے کپڑے جگہ جگہ پڑے تھے۔ ڈریسنگ ٹیبل اور میز کرسی پر گرد کی دبیز تہیں۔ بیڈ کے نیچے سے جھانکتے

جوتے۔ پالش کی ڈبیا اور برش اس گھر کے لوگوں کو اتنی بھی توفیق نہیں ہوئی کہ نئی دلہن کے آنے سے پہلے اسے صاف ہی کر دیا جاتا۔ نہ کمرے میں کوئی سجاوٹ تھی اور نہ صفائی ستھرائی۔

شفو نے کمرے کے کونے میں لگے بٹن سے بلب جلایا اور بلب جلتے ہی وہ شرمسار ہو گئی۔

"میرے خیال میں دلہن کے استقبال کا اس سے بہتر طریقہ نہیں تھا کہ کمرے کے کاٹھ کباڑ کو سمیٹا تک نہ جاتا۔"

ہانیہ نے اپنے لہجے کی کڑواہٹ کو چھپانے کی کوشش نہیں کی۔

"اصل میں آپ کے آنے کی خوشی میں اور کچھ اہتمام کی وجہ سے اتنی مصروفیت ہو گئی کہ اس کمرے کا دھیان ہی نہیں آیا۔" شفو گندگی کی معذرت بہت واضح الفاظ میں کر رہی تھی۔

"ہاں جس قسم کا اہتمام ہے اور جتنی خوشی کا اظہار ہو رہا ہے وہ صاف نظر آ رہا ہے۔" ہانیہ نے بظاہر لاپروائی سے کہا تھا' پھر کریدنے والے انداز میں پوچھنے لگی۔

"ویسے دولہا میاں تمہارے سگے بھائی ہی ہیں ناں۔"

"جی۔ کیا مطلب۔"

"مطلب کہ بھائی کی بارات لے جانے کا شوق تو بہنوں کو ازل سے ہوتا ہے پھر تم کیسی بہن ہو کہ گھر میں بیٹھی رہیں اور بھائی تنہا دلہن لے آیا۔"

وہ جلے دل کے پھپھولے پھوڑ رہی تھی۔ اسے اس گھر کے لوگوں سے نہ مروت دکھانے کی ضرورت تھی اور نہ کسی قسم کی خوش اخلاقی۔ اسے کون سا اس گھر میں زندگی گزارنی ہے۔ یہاں کے لوگوں سے بدتمیزی اور بدسلوکی کرے گی تو فوری نجات مل جائے گی اور تب اسے اور طاہا کو ملنے سے کوئی نہیں روک سکے گا۔

اس کی کسی بات کا جواب شفو کے پاس نہیں تھا۔ اس لیے وہ موضوع بدلنے کی خاطر بولی۔

"آپ کچھ لیں گی۔ کافی یا چائے؟"

"بھلا پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔" چھوٹی بھابھی نے کہا۔ "یہ کوئی مہمان تھوڑا ہی ہے۔ اس کا اپنا گھر ہے۔ جائے چاہیے یا کافی۔ یہ خود جا کر باورچی خانے میں بنا سکتی ہے۔ کیوں ٹھیک کہہ رہی ہوں ناں۔" چھوٹی بھابھی کا انداز تیکھا تھا۔

"جی۔ مگر آج یہ ان کا اس گھر میں پہلا دن ہے۔" شفو بولی۔

"تم اس کے چونچلے اٹھانا چاہتی ہو تو شوق سے اٹھاؤ۔ میں تو چلی۔" چھوٹی بھابھی باہر چلتی بنیں۔ شفو جھینپ مٹانے کو بولی۔

"آپ مائنڈ نہ کیجئے گا۔ ہماری چھوٹی بھابھی ذرا مزاج کی تیز ہیں مگر دل کی بہت اچھی ہیں۔"

"وہ اگر مزاج کی تیز ہے تو میں بھی کون سا دبنے والی ہوں۔"

ہانیہ نے بڑے آرام سے جملہ ادا کر دیا۔ شفو حیرت سے اس نئی دلہن کو دیکھنے لگی' جو صورت سے بہت معصوم اور بھولی بھالی نظر آتی تھی' مگر اس کے لبوں سے ادا ہونے والے جملے اس تجزیے کی نفی کرتے نظر آتے تھے۔

شفو الٹے پیروں باہر چلی گئی تھی۔

کھڑکی کے اس پار صحن میں اترنے والی وہ سیڑھیوں کی طرف سے ہاون دستے کی ٹھک ٹھک آ رہی تھی۔ اس نے اٹھ کر کھڑکی بند کر دی۔ کمرے میں بہت گرمی تھی۔ چھت پر کسی پنکھے کا وجود نہیں تھا اور نہ ہی کوئی اسٹینڈ والا پنکھا تھا۔

وہ ڈریسنگ ٹیبل کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔ دھندلے شیشے کے اس پار اسے اپنا ہیولا دھندلا دھندلا سا نظر آیا۔ اس نے ہاتھ سے شیشہ صاف کیا۔ اس کے ہونٹوں' گالوں اور پپوٹوں پر شوخ رنگوں کی ساری بہار تھی لیکن آنکھوں سے ویرانی عیاں تھی۔

طاہا سے جدا ہوئے کئی گھنٹے بیت چکے تھے اس کے دل کی دھڑکنیں ہنوز چل رہی ہیں' حالانکہ اس کا خیال تھا طاہا سے جدا ہوتے ہی اس کی سانسیں بند ہو جائیں گی...۔ اور...

دفعتاً" اس کے پرس میں رکھا موبائل بج اٹھا۔

وہ بری طرح چونکی۔

وہ موبائل طاہا نے اسے دیا تھا۔ یہ کہہ کر کہ تم میری نظروں سے دور ہو جاؤ گی مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ میں تم سے غافل رہوں گا۔ اس موبائل کے طفیل ہم دونوں کانٹیکٹ میں رہیں گے۔"

"اب ان باتوں کا کیا فائدہ طاہا۔"

وہ بہت بددل ہو رہی تھی۔

"تم مایوس کیوں ہو رہی ہو۔ تم دیکھ لینا۔ ہم دونوں کا ملاپ ضرور ہو گا۔ میں تمہیں ہر قیمت پر حاصل کر کے رہوں گا۔ بس تم اپنے دل پر اس شخص کی پرچھائیاں مت پڑنے دینا۔"

وہ بہت باعزم تھا۔

اس نے پرس کھول کر موبائل پر ایک نگاہ ڈالی۔ طاہا کے دو ایس ایم ایس اس کی آنکھوں کے سامنے روشن تھے۔

"تمہارے بغیر ایک ایک پل ایک ایک صدی بن کر گزر رہا ہے۔ خدا سے دعا کرو کہ وہ ہمیں جلد ملا دے۔"

دوسرے ایس ایم ایس میں درج تھا۔

"تم اپنے نام نہاد شوہر سے اجنبیت قائم رکھنا۔ یہ بات ذہن نشین کر لو کہ تم میری امانت ہو۔ اور اس امانت میں خیانت نہیں ہونی چاہیے۔"

وہ اگر یہ میسج نہ بھی بھیجتا تو وہ اس شخص سے اجنبیت برقرار رکھنے کا تہیہ کیے ہوئے تھی۔ اس کے دل پر جس شخص کی چھاپ ہے۔ وہی اس کی زندگی اور اس کی سانسوں کا بھی مالک ہو گا۔ وہ ابا کی عزت کی خاطر ان کے بندھے ہاتھوں کی خاطر اس شخص کے ہمراہ رخصت ہو کر آ گئی تھی۔ ورنہ......

اسی دم دروازے پر کھٹکا ہوا۔

وہ دروازے کی چوکھٹ میں جما کھڑا تھا۔ جیسے لکڑی کے فریم میں تصویر۔ ایک ہاتھ سے چوکھٹ پکڑے اور دوسرا کمر پر رکھے۔ وہ لمحہ بھر کو گڑبڑا سی گئی۔ پتا نہیں وہ کب سے وہاں ایستادہ تھا۔

"وہ...... وہ مجھے منہ ہاتھ دھونا ہے۔" وہ اپنی خفت مٹانے کو جلدی سے بولی تھی۔

"مجھے ان کپڑوں اور میک اپ میں وحشت ہو رہی ہے۔ اگر منہ دھونے کو پانی مل جائے تو بہتر ہو گا۔"

"آپ صحن میں لگے نلکے کی طرف چلی جائیں۔"

وہ مدھم لہجے میں بولا۔

وہ اس کی طرف سے ہو کر صحن میں چلی آئی اور کونے میں لگے نلکے سے برآمد ہوتی پانی کی موٹی سی دھار سے چہرے پر پانی کے چھپکے مارتی رہی۔ اس نے ہتھیلیوں اور انگلیوں سے خوب رگڑ رگڑ کر ہونٹوں، پپوٹوں اور رخساروں سے سارے شوخ رنگ دھو دیے۔ اس کے کپڑے بھی گیلے ہو گئے تھے۔

وہ کھونٹی پہ لٹکے تولیے سے منہ رگڑتی اندر کمرے میں آئی تو وہ سامنے پلنگ پر ٹانگیں لٹکائے بیٹھا تھا۔

"آپ کو بھوک تو نہیں لگی۔"

وہ اس کے گیلے دامن پہ نظریں جمائے جمائے پوچھنے لگا۔

"یہ بھی بتانے کی ضرورت ہے۔ میں نے دوپہر سے کچھ نہیں کھایا۔" وہ بنا شرمائے لجائے صاف مگر کھردرے لہجے میں بولی تھی۔

"ٹھیک ہے۔ میں شفو سے کہہ کر کھانے کو کچھ منگوا لیتا ہوں۔"

اسی دم شفو نے اندر جھانکا۔ وہ کھانے کی ٹرے لائی تھی۔

"بڑے بھیا تو کھانا کھا چکے۔ مگر مجھے اندازہ تھا کہ آپ بھوکی ہوں گی۔ اس لیے کھانا حاضر ہے۔" شفو نے ٹرے سامنے کی میز پر رکھ دی۔

اس تپتے کمرے میں تھوڑی دیر گزار لینے پر ہی اس کا جسم جھلسنے لگا تھا۔ کسی تازہ ہوا کا گزر بھی نہیں تھا۔ ہانیہ نے آگے بڑھ کر خود ہی کھڑکی کے دونوں پٹ کھول دیے۔ اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ اجنبی آنکھیں موند کر لیٹ چکا تھا۔ اس کی یہ لاپروائی اس کے لیے مفید تھی۔ اچھا ہے۔ اجنبیت برقرار رہے۔ وہ خود بھی اسی بات کی شدت سے خواہاں تھی۔ اس کے لیے صرف

اور صرف طاہا کی یادیں بہت کافی تھیں۔

وہ خوب صورت لمحات اس کی زندگی میں کب آئیں گے جب وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے طاہا کی ہو جائے گی۔ کتنا خوش کن خیال ہے۔

اس نے برائے نام ہی کھانا کھایا۔ دفعتاً" اس کی بھوک ختم ہو گئی۔ ورنہ طاہا کا خیال آنے سے پہلے انتڑیاں بھوک کے مارے سکڑ رہی تھیں، مگر طاہا سے جدائی کے خیال نے جیسے اس کا دل بھر دیا۔

وہ کتنی دیر نڈھال سی کرسی پر پڑی رہی۔ دن بھر کے سفر سے اس کا جوڑ جوڑ دکھ رہا تھا۔ اور وہ اجنبی کتنے مزے سے پھیل کر سو گیا تھا۔ وہ کہاں سوئے؟ اس کمرے میں سوائے اس پلنگ کے لیٹنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ ناچار اس نے کرسی پر بیٹھے بیٹھے ہی میز پر ٹانگیں پھیلائیں اور بے آرامی سے آنکھیں موند کر سونے کی کوشش کرنے لگی۔

بند آنکھوں کے پپوٹوں میں طاہا کا ہیولا آن بسا تو باقی کی رات کٹنے کا احساس تک نہ ہوا۔ پتا نہیں صبح کب ہوئی۔ کھڑکی کے راستے دھوپ سیدھا اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ دولہا میاں پتا نہیں کب کے غائب تھے۔ کم از کم اسے ہی جگا دیتے۔ ساری رات کرسی کے ہتھے پر سر رکھنے سے اس کی گردن جیسے اکڑ گئی تھی۔ اس نے کتنی ہی مرتبہ گردن کو دائیں بائیں گھما کر اس اکڑاؤ کو ختم کرنا چاہا۔

"ناشتہ یہیں کرو گی یا باہر صحن میں؟"

چھوٹی بھابھی نے کمرے میں آ کر جھانکا تو جیسے اس کی ورزش رک سی گئی۔

"ویسے دولہا میاں تو کب کے ناشتہ کر کے کام پر جا چکے۔ اگر انہیں ابھی سے قابو میں نہیں کرو گی تو ان کی یہ لاتعلقی تاحیات برقرار رہے گی۔ دراصل انہیں کسی بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ ایک عرصے سے اسی روٹین پر قائم ہیں۔ صبح سویرے ناشتہ کر کے کام پر نکل جاتے ہیں۔ نئی دلہن کی آمد نے بھی ان کے معمول میں کوئی فرق نہیں ڈالا۔"

پتا نہیں چھوٹی بھابھی صاحبہ کیا جتانا چاہ رہی تھیں۔

"ویسے بہت دیر لگائی تم نے اٹھنے میں، لگتا ہے جیٹھ جی نے...؟" اس نے مسکراہٹوں کو بظاہر روکتے اور بے قابو کرتے ہوئے کہا۔

"تمہارے کرسی پر سونے کے انداز سے صاف لگ رہا تھا کہ جیٹھ جی کے پتھر دل پر کسی قسم کا کوئی نقب نہیں لگا۔ ویسے تمہاری موہنی صورت کسی کے دل پر بھی ڈاکا ڈالنے کو کافی ہے، مگر یہاں ہمارے جیٹھ جی بھی بہت کائیاں ہیں۔"

"مجھے منہ ہاتھ دھونا ہے۔"

وہ جیٹھ جی، جیٹھ جی کی اس گردان سے تنگ آ کر بات بدلنے کی خاطر بولی تھی۔

"ہاں تو دھو لو۔ منع کس نے کیا ہے۔"

وہ چپ چاپ باہر صحن میں لگے نلکے کی طرف آ گئی اور ٹونٹی کھول کر پاؤں پانی کی موٹی سی دھار کے نیچے دے لیے۔

"نلکا کم کھولو جٹھانی جی۔" چھوٹی بھابھی اس کے تعاقب میں پیچھے چلی آئیں۔

"میرا نام ہانیہ ہے۔ جٹھانی جی نہیں۔" ہانیہ نے منہ بنا کر جیسے کڑوی گولی ہضم کی تھی۔

"نام کوئی بھی ہو۔ میں تو رشتوں کے تعلق سے فرد کو بلاتی ہوں۔"

چھوٹی بھابھی کی آواز اتنی اونچی ضرور تھی کہ باورچی خانے میں موجود آپا جی تک جا پہنچے۔ آپا جی ان کی ساس تھیں۔ شوہر کے گزر جانے کے بعد انہوں نے بچوں کو بہت توجہ سے پالا تھا۔ مگر بڑے بیٹے سے زیادتی کر ڈالی تھی۔ اس کے پڑھنے کی عمر میں ہی اسے دکان پر بٹھا دیا تھا جبکہ چھوٹے ساجد کو ہتھیلی کا چھالا بنا کر رکھا تھا۔ اسے کسی کام کو ہاتھ تک نہ لگانے دیا تھا۔ کاروبار کی ساری ذمہ داری زوار کی تھی۔ ساجد تو ناز نخروں میں پڑ کر صرف آرام طلب ہو گیا تھا۔ اس کی شادی بھی بڑی دھوم دھام سے آپا جی نے پہلے کر دی تھی۔ حالانکہ پہلا نمبر زوار کا تھا۔

آپا جی نے زوار کی شادی اب تک اس لیے نہیں کی تھی، کیونکہ وہ جانتی تھیں۔ زوار ان کا کماؤ پوت ہے۔

اگر انہوں نے اس کی شادی کر دی تو آنے والی دلہن اس کی ساری کمائی پر قبضہ کرے گی۔ اور اس گھر میں فساد الگ کھڑا کرے گی۔ جبکہ ابھی انہیں شفو کو بیاہنا تھا۔ ساجد کو الگ سے نیا کاروبار کروا کر دینا تھا۔ اور اس مقصد کے تحت وہ زوار سے ایک ایک پائی کا حساب لیتی تھیں اور زوار بھی اچھے بچوں کی طرح سب کچھ آپا بی کی ہتھیلی پر رکھ دیتا تھا۔

ساجد کی ذات سے متعلق کوئی فرمائش ہو۔ زوار اسے پوری کرنا اپنی ذمہ داری سمجھتا تھا۔ ساجد کی دلہن کو منہ دکھائی میں بھاری سیٹ زوار نے صرف آپا بی کی فرمائش پر بنوا کر دیا تھا۔ اس کے کمرے میں دلہن کے آنے سے پہلے ہر طرح کی آسائش موجود تھی۔ اے سی، روم فریج، خوب صورت بیڈ، بہترین الماری.... صرف یہی نہیں آپا بی نے ساجد کا بھاری جیب خرچ بھی باندھ دیا تھا۔ وہ بیوی والا ہے۔ کل کو بچے بھی ہوں گے۔ بڑے بھائی کے سامنے اسے ہاتھ نہ پھیلانے پڑیں۔

"مجھے لگتا ہے تمہارا ولیمہ بھی نہیں ہو گا۔ آپا بی تو سرے سے ولیمہ کے حق میں ہی نہیں۔ اور جیٹھ جی ٹھہرے ان کے فرماں بردار.... ویسے میرا ولیمہ بڑے دھوم دھام سے ہوا تھا۔ اپنے پرائے سب نے تعریف کی۔ سارا خرچا جیٹھ جی نے اٹھایا تھا۔ وہی آپا کے بعد اس گھر کے کرتا دھرتا ہیں۔ سارا کاروبار انہی کے ہاتھ میں ہے۔ سارا خرچہ پانی انہی کے دم سے چلتا ہے۔"

پتا نہیں چھوٹی بھابھی اس سے ہمدردی کر رہی تھیں یا نمک پاشی۔ یا پھر اپنی اہمیت جتانا مقصود تھی۔ وہ بیزار ہو گئی۔ یہ آخر اس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتی۔ وہ کیوں ایسی باتیں اس کے کانوں میں انڈیل رہی ہے جن سے اسے کوئی سروکار نہیں۔ اس نے کون سا اس شادی کو دل سے قبول کیا ہے، جو ولیمہ کے نہ ہونے کا ملال کرتی۔ البتہ چھوٹی بھابھی کی باتوں نے دل میلا ضرور کر دیا۔

"ارے بہو۔ آ کر نئی دلہن کے لیے ناشتہ لے جاؤ۔" آپا بی کی آواز باورچی خانے سے آئی۔

"جاؤ تم خود ہی اپنے لیے ناشتہ لے لو۔ یہاں کوئی ملازم نہیں ہے۔"

چھوٹی بھابھی تیکھے انداز میں کہتی کمرے کی جانب مڑ گئی۔ اس نے خاموشی سے نظر صحن پر ڈالی جہاں الگنی پر بے شمار کپڑے سوکھنے کے انتظار میں لٹک رہے تھے۔ وہ چند لمحے کھڑی گھر والوں کے رویے پر غور کرتی رہ گئی۔ اپا کے گھر میں اس کی حق تلفی کرنے والی صرف نئی امی تھیں۔ اور یہاں اس گھر میں ہر ایک اس کے مدمقابل ہے۔ اس چھوٹی بھابھی سے اس کا آنکڑا خوب رہے گا.... اور۔

"بھابھی یہ ناشتہ کر لیجیے۔" شفو اس کے سامنے ناشتے کی ٹرے اٹھائے آ گئی۔

وہ چپ چاپ وہیں صحن میں چارپائی پر بیٹھ گئی۔ سر نیہوڑائے ناشتہ کرتے ہوئے اس کا ذہن مسلسل پک رہا تھا۔ پتا نہیں ان نامساعد حالات میں اسے کتنے دن رہنا ہے۔ ایک دن ایک مہینہ یا ایک سال، نجانے اس کا اور طاہا کا راستہ کب ہموار ہو گا اور....

"بھابھی۔ آپ بہت کم بولتی ہیں کیا۔" شفو اس کے سامنے ہی بیٹھ گئی تھی۔

"نہیں تو...."

"تو پھر آپ بولتی کیوں نہیں۔"

"نئے گھر میں ایڈجسٹ ہوتے وقت تو لگتا ہے۔"

آپا بی باورچی خانے سے چھوٹی بھابھی کو آواز لگا رہی تھیں۔

"ارے سکینہ۔"

"جی۔"

چھوٹی بھابھی اپنے کمرے سے باورچی خانے کی طرف لپکیں۔

"دوپہر کے پکانے کے لیے کیا سوچا ہے۔ زوار ایک گھنٹے کے لیے گھر آتا ہے۔ چل جلدی سے ساجد کو سبزی لانے کے لیے بھیج دے۔"

"ساجد کے سر میں درد ہے آپا۔"

"ائے ہے۔ پہلے کیوں نہیں بتایا۔ گرمی سر پر چڑھ گئی شاید۔ برف منگوا کر سر پر رکھنی تھی۔ چل تو اس کا

سر دبا۔ میں سر درد کی گولی لاتی ہوں۔"

آپا کی تشویش سے بھرپور آواز ہانیہ نے بخوبی سنی۔ اس نے اندازہ لگالیا' ساجد سے آپابی کی دلی وابستگی زیادہ ہے۔ جب ہی وہ سبزی و بزی سب بھول بھال گئی تھیں۔ چھوٹی بھابھی اپنے کمرے کی جانب لپکیں۔

"سب بہانا ہے۔"

شفو بتانے لگی۔ "ایک تو ساجد بھائی ہڈ حرام ہیں۔ اوپر سے یہ چھوٹی بھابھی بھی الگ مزاج کی ہیں۔ شوہر کو بالکل ہی گھٹنوں سے لگالیا ہے۔"

"یہ تمہارے ساجد بھائی کیا کرتے ہیں۔" اس نے پہلی بار اس سے سوال کیا۔

"وہ ہل کر پانی بھی نہیں پیتے۔ سارا سارا دن چارپائیاں توڑتے ہیں۔ نہ ملازمت کرتے ہیں اور نہ ہی زوار بھائی کے ساتھ دکان پر بیٹھتے ہیں۔ اتنی چلتی دکان ہے۔ زوار بھائی کو تو فرصت ہی نہیں ملتی۔ اگر ساجد بھائی ان کے ساتھ دکان پر بیٹھیں تو زوار بھائی کو ذرا آرام کا وقت مل جائے' مگر زوار بھائی سدا کے نرم مزاج ہیں۔ نہ ساجد بھائی کو کچھ کہتے ہیں' نہ کسی قسم کا احتجاج کرتے ہیں۔ آپابی بھی ساجد بھائی کو ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھتی ہیں۔"

شفو کو آوازیں پڑ رہی تھیں۔ وہ کھسک لی۔

ساجد نے نہ سبزی لائی تھی۔ نہ لایا۔ آپا نے دال ہی بگھار لی۔ زوار دوپہر کھانے پر گھر چلے آئے۔ تو ساجد کے کمرے سے اونچا اونچا بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"آپا کو پتا بھی ہے کہ مجھے دال پسند نہیں۔ پھر بھی دال پکالی۔ اگر زوار کو دال پسند ہے تو اس کے لیے الگ سے ہانڈی پکا لیا کریں۔ میں بے کار ہوں ناں' کماؤ پوت نہیں ہوں اس لیے میری پسند و ناپسند کا خیال کسے ہے۔ بڑا بیٹا گھر کا سارا خرچہ پانی چلا رہا ہے اس لیے کھانا بھی اس کی پسند کا پکے گا۔"

"ہونہہ کام کے نہ کاج کے' رعب تو یوں جمارہے ہیں جیسے گھرداری کا بوجھ خود سنبھال رکھا ہے۔ پڑے پڑے اینٹھتے رہتے ہیں۔ بازار تک سبزی کے لیے جانا بھی محال ہے اور پھر اوپر سے جھوٹ الگ کہ کھانا زوار بھائی کی پسند کا پکتا ہے۔ ساری فرمائشیں ساجد بھائی کی ہی پوری ہوتی ہیں۔ زوار بھائی کو بھلا کون پوچھتا ہے۔"

شفو' بڑبڑاتی صحن کی طرف آئی تھی' جبھی زوار بھائی کو سامنے دیکھ کر ہڑبڑا گئی۔ تو ساجد بھائی کی بکواس انہوں نے بھی سن لی۔ پتا نہیں یہ زوار بھائی منہ پر تالا کیوں لگائے رکھتے ہیں۔ کیوں اپنی ذات کے ساتھ وہ ہر طرح کی ناانصافی برداشت کرلیتے ہیں۔

"زوار بھائی! آپ کب آئے۔"

"کھانا کھانے آیا تھا۔" وہ مدھم لہجے میں بولے۔

"ٹھہریے میں آپابی سے کہتی ہوں۔"

شفو باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔ آپابی کی پسندیدہ جگہ شاید باورچی خانہ تھی۔ اس لیے وہ ہمہ وقت وہیں پائی جاتی تھیں۔ ہانیہ اپنے کمرے کی کھڑکی سے ناک چپکائے باہر کا سارا منظر دیکھ رہی تھی۔

"تو کیوں زوار کے لیے کھانا لینے آئی ہے۔ اس کی دلہن سے کہہ۔ زوار کو ناشتہ' کھانا دینا اب سے اس کی ذمہ داری ہے۔ وہ اگر سمجھتی ہے کہ یہاں نئی بہو کی حیثیت سے اس کے چونچلے اٹھائے جائیں گے تو اس کے دماغ سے یہ خناس نکال دے۔ یہاں چمڑی پیاری نہیں ہے۔ سلیقہ مندی پیاری ہے۔ بہتر ہوگا وہ ذمہ داریاں خود سے سنبھال لے ورنہ۔"

آپابی خوب چیخ چیخ کر بول رہی تھیں۔

ہانیہ غصے سے لب بھینچ کر رہ گئی۔

وہ ذمہ داریاں کس خوشی میں سنبھالے؟ اس نے اس گھر کو اپنا کب تسلیم کیا ہے۔ اس نے اس شخص کو اپنا شوہر کب مانا ہے؟ وہ یہ سب خوشی خوشی تب کرے جب اسے اس گھر میں رہنا ہو۔ اس کی حیثیت یہاں ایک مسافر جیسی ہے۔ جس کی منزل کہیں اور ہے اور...

"بھابھی۔" شفو اسے بلانے آگئی۔

"آپابی آپ کو بلا رہی ہیں۔ زوار بھائی کھانا کھانے آئے ہیں۔"

وہ الٹے پیروں واپس پلٹ گئی۔

ہانیہ انکار کرنا چاہتی تھی، مگر نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے قدم سست روی سے باورچی خانے کی جانب اٹھ گئے۔ سامنے آپا بی نے کھانے کی ٹرے تیار کر رکھی تھی۔ ایک پلیٹ میں دال اور دو روٹیاں جبکہ دوسری طرف چولہے پر مرغ کڑاہی پک رہی تھی۔ آپا بی کے لاڈلے ساجد نے دال کھانے سے انکار جو کر دیا تھا۔ اس لیے وہ بڑی محبت سے ساجد کے لیے کڑاہی پکا رہی تھیں۔ بقول شفو۔ سارا خرچا پانی زوار بھائی کے دم سے چلتا ہے تو پھر اس کماؤ پوت کو دو وقت کا معقول کھانا بھی نہ ملے۔

"اے سر پر کیوں سوار ہے۔ یہ ٹرے اٹھا کر اپنے میاں کے لیے لے جا۔ اسے کھانا کھا کر واپس دُکان پر بھی جانا ہے۔ اور کان کھول کر سن رکھ۔ اپنے شوہر کے لیے خود ہی کھانا اور ناشتہ وقت پر ڈال کر لے جایا کر۔ یہاں کوئی نوکر نہیں جو تجھے آوازیں دیتا پھرے۔۔۔ اور یہ خناس بھی اپنے ذہن سے نکال دے کہ تو اس گھر کی نئی بہو ہے۔ اپنا رشتہ نبھانا سیکھ۔ اس گھر کی بڑی بہو ہونے کے ناطے گھر کے ہر فرد کا خیال رکھنا تیری ذمہ داری ہے۔ چاہے وہ ساجد ہو یا اس کی بیوی اور اب سے باورچی خانے کا سارا کام بھی تو ہی سنبھالے گی۔"

آپا بی سارے احکام سنا رہی تھیں۔ وہ سخت گیری میں ہانیہ کو نئی ای کی طرح سے لگیں۔

"مم۔ مگر میں یہ سب کیسے کر پاؤں گی۔" اس نے تھوک نگلتے کہا تھا۔

"کیوں کیا ماں نے گھرداری سکھا کر نہیں بھیجا۔"

آپا بی نے گھورتی نگاہوں سے دیکھا تو ہانیہ نے جلدی کھانے کی ٹرے اٹھالی۔ وہ جتنی دیر سامنے موجود رہے گی۔ آپا بی کی جلی کٹی سننے کو ملیں گی۔ وہ کھانے کی ٹرے لیے برآمدے کی طرف آگئی۔ سامنے کرسی پر بیٹھے زوار کھانے کے انتظار میں تھے۔ ہانیہ نے خاموشی سے کھانے کی ٹرے ان کے سامنے رکھ دی۔ وہ سر جھکائے آہستہ آہستہ نوالے حلق میں اتارتے رہے۔ جتنی دیر وہ کھانا کھاتے رہے، وہ خاموشی سے برتن خالی ہونے کی منتظر دوسری کرسی پر بیٹھی رہی۔

یہ عجیب بت تھا، نہ کسی بات پر اعتراض کرتا، نہ استفسار کرتا۔

اور یہ اس سے بھی زیادہ عجیب تھا کہ وہ ایک ایسے شخص کی خدمت پر لگی تھی، جس سے اسے رتی برابر بھی رغبت نہیں تھی۔

کھانا ختم کر کے وہ صحن میں لگے نلکے کی جانب چلے گئے اور پھر باورچی خانے میں آپا بی کو جانے کی اطلاع دے کر تیز تیز قدموں سے بیرونی دروازہ عبور کر گئے۔ گویا آپا کو بتا کر جانا ضروری ہے اور وہ جو پاس بیٹھی تھی۔

"آپ بھی کھانا کھا لیں بھابھی۔" شفو اسے بلانے آگئی۔

ہانیہ کی نظر ہر چیز پر تفصیل اور فرصت سے پڑ رہی تھی۔ یہاں سے وہاں تک۔ آنگن میں دو میلے کچیلے بچے ادھر سے ادھر دوڑتے پھر رہے تھے۔ شور مچاتے۔ وہ اٹھی اور اپنے کمرے میں آگئی۔

"کھانا تو کھا لیں۔" شفو کی آواز نے تعاقب کیا۔

"مجھے بھوک نہیں۔"

کہنے کو چھوٹی بھابھی اس کے کمرے میں جھاڑو لگا گئی تھی، مگر پلنگ کے نیچے مڑے تڑے کاغذ یونہی پڑے تھے اور الماری کے ساتھ والے کونے میں بھی۔ لمحہ بھر کو اس کا دل کیا کہ وہ خود جھاڑو اٹھا کر کمرہ صاف کرے۔ دیواروں پر لگے جالے اتار لے۔ اور پلنگ، سنگھار میز اور میز کرسی کی دھول رگڑ رگڑ کر صاف کر دے، مگر وہ اس گھر کی ملازمہ نہیں۔ یہاں کے لوگوں سے نہ اس کا کوئی تعلق تھا اور نہ اس کمرے میں مقیم اس شخص سے، جسے ابا نے زبردستی اس کی زندگی میں شامل کر دیا تھا۔ ہائے کیا تھا۔ اگر وہ اس کا ہاتھ طاہا کے ہاتھ میں دے دیتے تو۔

طاہا کا خیال آتے ہی دل پر جیسے گھونسا سا پڑا۔ آنکھوں میں جیسے دھند سی اتر آئی۔ اس نے اپنا بیگ کھول کر موبائل نکالا۔ طاہا کے کتنے ہی محبت بھرے ایس ایم ایس نگاہوں کے سامنے روشن تھے۔

اس نے بھی جواباً "ایک پیغام بھیج دیا۔
"میرے ساتھی! میری زندگی اور میرا وجود صرف اور صرف تمہاری امانت ہے۔"
پیغام بھیج کروہ قدرے مطمئن ہو گئی۔
اسے یہاں آئے تین دن ہو گئے تھے۔ اس کا یہاں دل نہیں لگ رہا تھا۔ اسے اپنا وجود کسی کونے میں پڑی بے جان شے کی مانند لگتا۔ جو بیاہ کر لایا تھا' اس نے بھی کبھی حال پوچھنے کی زحمت گوارا نہیں کی تھی۔ کجا آپابی اس کا احوال دریافت کرتیں۔ اس نے آپابی کو بے حد چائے پیتے دیکھا تھا اور شفو کو رسالے میں منہ گھسیڑے ہوئے۔ ساجد بھائی تو اپنے کمرے سے باہر نکلتے ہی نہیں تھے اور چھوٹی بھابھی کا زیادہ وقت بھی ان ہی کے ساتھ کمرے میں گزرتا تھا۔ باقی ان کے دونوں بچے ہر ایک کی ذمہ داری تھے۔
کمرے میں بہت گرمی اور حبس تھا۔ دن بھر دھوپ اس کمرے پر پڑتی تھی۔ اس لیے کمرہ ہر وقت گرم رہتا۔ جبکہ اسے شفو نے بتایا تھا کہ چھوٹی بھابھی کے کمرے میں اے سی ہے اور یہ اے سی بھی زوار بھائی نے لگا کر دیا تھا۔
ہونہہ چھوٹی بھابھی کو اے سی لگا دیا اور اپنی شادی کرتے وقت اس شخص کو یہ خیال نہیں آیا کہ اس کی نئی نویلی دلہن گرمی میں جھلستی رہے گی۔ ہانیہ کے اندر عجیب طرح کا ابال اٹھا۔
"تمہارا کسی سے ملنے جلنے کو دل نہیں کرتا کیا؟ آجاؤ میرے کمرے میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔"
چھوٹی بھابھی کمرے کا دروازہ کھول کر اندر آئی۔
"فکر نہ کرو۔ ساجد سو چکے ہیں اور یہ بچے۔ توبہ سارا سارا دن تھکا مارتے ہیں۔ تم خوش نصیب ہو۔ ابھی بچوں کے جنجال سے دور ہو۔ یہی موقع ہے اپنے شوہر کے ساتھ موج مستی کر لو۔ جب بچے ہو جائیں گے تب سر کھجانے کو بھی فرصت نہیں ملے گی۔"
"بچے مجھے اچھے نہیں لگتے۔" اس نے چھوٹی بھابھی کی پٹر پٹر چلتی زبان کو جیسے روک دیا تھا۔
"ایں کیا مطلب؟ تمہیں بچے پسند نہیں۔ جبکہ جیٹھ جی تو بچوں پر جان دیتے ہیں۔ اب میرے بچوں کی مثال لے لو۔ ان دونوں میں جیٹھ جی کی جان اٹکی ہے۔ ان کے پسندیدہ کھلونے' مٹھائی' کپڑے سبھی وہی لاتے ہیں۔ چھٹی والے دن انہیں پارک میں گھمانے لے جاتے ہیں اور تم کہہ رہی ہو کہ تمہیں بچے پسند نہیں۔"
چھوٹی بھابھی کی آنکھیں حیرت سے پوری کی پوری وا تھیں۔
"اب یہ ضروری تو نہیں کہ جو کچھ آپ کے جیٹھ جی کو پسند ہو' وہی کچھ مجھے بھی پسند ہو۔ مجھے بچے زہر لگتے ہیں۔ ان کے آنے سے زندگی کا سکون غارت ہو جاتا ہے اور عورت کی زندگی کو گرہن لگ جاتا ہے۔ مرد کا کیا ہے۔ وہ تو اولاد پیدا کر کے بے فکر ہو جاتا ہے۔ جبکہ عورت چکی کے دو پاٹوں میں پس کر رہ جاتی ہے۔ شوہر کے نخرے بھی اٹھائے اور بچوں کا درد سر بھی مول لے۔"
وہ صرف چھوٹی بھابھی کو سنانے کو کہہ رہی تھی۔
اسے اس گھر کے لوگوں کی ہاں میں ہاں ملا کر کوئی تمغہ نہیں جیتنا۔
اس گھر کے لوگوں سے اس کا جتنا اختلاف ہو گا' ان سے خلاصی کا موقع اتنا ہی جلدی ملے گا۔
"مگر بچے تو آپابی کو بھی بہت پسند ہیں۔" چھوٹی بھابھی بے حد برا مان گئی۔ ہانیہ تیکھی نظروں سے دیکھے گئی۔
"میری بلا سے۔" ہانیہ کے ناک بھوں چڑھانے پر چھوٹی بھابھی کی چخ چخ شروع ہو گئی۔
"بے چارے جیٹھ جی۔ میری ساری ہمدردیاں ان کے ساتھ ہیں۔"
"آپ بھلا زوار بھائی کی ہمدرد کیوں ہونے لگیں۔ دن رات تو آپ آپابی کے کان بھرتی ہیں۔ ماں کو بڑے بیٹے کے بالکل ہی برخلاف کر چھوڑا۔ جانتی ہیں ناں کہ ایسی باتیں کر کے ہی آپ اپنے لیے اور اپنے میاں کے لیے آپا سے کچھ بٹور سکتی ہیں۔ مگر یاد رکھیے۔ ساری محنت زوار بھائی کی ہے اور عیش آپ لوگ کرتے

ہیں۔" شفو پتا نہیں کب سے دروازے پر کھڑی تھی۔

"تو چپکی کھڑی رہ۔ خوامخواہ بڑوں کے درمیان بولنے کی ضرورت نہیں۔ اگر جیٹھ جی محنت کرتے ہیں تو اس گھر کے لیے کرتے ہیں۔ ہم پر کوئی احسان نہیں کرتے۔"

"آپ پر احسان ہی تو کرتے ہیں۔ ورنہ آپ ساجد بھائی کو دکان پر ان کا ہاتھ بٹانے کو نہ بھیجتیں۔" شفو بولی۔

"بہت بے لگام ہو گئی ہے تو شفو۔" چھوٹی بھابھی نے کڑوا سا منہ بنا لیا اور ہونٹ سکوڑ کر بولی۔ "میں آپا سے کہلوا کر جلد ہی تیرا انتظام کرتی ہوں۔ وہ کوئی لڑکا دیکھ کر چلتا کیوں نہیں کرتیں تجھے۔"

وہ دھپ دھپ کرتی برآمدہ عبور کر گئی۔ شفو نے ترچھی نظروں سے انہیں جاتے دیکھا۔

"ہونہہ۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔"

"کیسا سچ۔" وہ چونکی۔

"آپ بس اتنا کریں بھابھی! کہ زوار بھائی کو سنبھال لیں۔ انہیں اس بات کا احساس دلائیں کہ خونی رشتوں کی اہمیت اپنی جگہ، مگر انسان کو کچھ نہ کچھ اپنے لیے بھی سوچنا چاہیے۔ وہ گھر چلا رہے ہیں۔ اس لیے ان کی اتنی وقعت ہے۔ اگر کل کو خدانخواستہ وہ ان کی کفالت سے ہاتھ کھینچ لیں تو سبھی کے رنگ ڈھنگ نظر آجائیں گے۔ خصوصاً" چھوٹی بھابھی کے۔ وہ ساجد بھائی کو لے کر فوراً" علیحدہ ہو جائیں گی۔ وہ کب سے الگ ہونا چاہتی ہیں۔ ان کی اس خواہش سے آپا بی ڈرتی ہیں اس لیے وہ ان کی ہر جائز و ناجائز ماننے پر مجبور ہیں۔ اور اس کے لیے وہ اپنے بڑے بیٹے سے زیادتی کر رہی ہیں۔ میں پوچھتی ہوں۔ اگر آپ بھی زوار بھائی کو لے کر علیحدہ ہونا چاہیں تو کیا تب اس گھر کا بٹوارہ نہیں ہو گا۔ زوار بھائی کے بغیر تو یہ گھر ایک لمحہ کو بھی نہیں چل سکتا۔"

شفو ایک تواتر سے بولتی چلی گئی۔

"آپ ایک بار آپا بی کو زوار بھائی کو الگ لے جانے کی دھمکی تو دے کر دیکھیں۔ پھر دیکھیے گا۔ حالات کیسا رخ بدلتے ہیں۔" شفو نے مشورہ دیا۔

"کیوں میں کیوں پرائی آگ میں کودوں۔" ہانیہ نے اپنا لہجہ کڑوا کر لیا۔

"وہ آپ کے شوہر ہیں۔ اور اس گھر میں ان کی حیثیت اور ان کے مقام کو تسلیم کرانا آپ کا فرض بھی بنتا ہے اور ذمہ داری بھی۔"

"تمہارے بھائی کے لیے نہ ہی میرا کوئی فرض ہے اور نہ ذمہ داری.... میں نے اس دنیا کو سدھارنے کا ٹھیکہ نہیں لے رکھا۔ پتا نہیں میں یہاں کتنے دن ہوں۔ جس طرح کا تم لوگوں کا رویہ ہے۔ ان فضول حالات میں کوئی ذی عقل اور باشعور انسان ایک دن بھی نہیں رہ سکتا۔"

ہانیہ کی باتوں پر شفو دنگ رہ گئی۔

"یعنی کہ آپ یہاں سے جانے کا سوچ رہی ہیں۔"

"میں تو صرف اتنا کہہ رہی ہوں کہ وقت اور حالات کیا کچھ دکھا دیں۔ اس کا کسی کو پتا نہیں ہوتا۔" اس کی بات پر شفو کا منہ لٹک گیا۔

ہانیہ کو دیکھ کر اسے لگا تھا۔ وہ جیسے اس کے بڑے بھائی کی قسمت بدل دے گی۔ وہ جیسے اس گھر میں ان کے مقام کو مضبوط بنا دے گی، مگر اس لڑکی کی باتوں نے جیسے اس کے اندر کوئی گرہ سی لگا دی تھی۔ وہ اس گھر کے کسی معاملے کو اپنا معاملہ سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔ وہ زوار بھائی کے کسی مسئلہ کو اپنا مسئلہ نہیں سمجھتی تھی۔ اس کی باتوں اور اس کے سرد انداز نے جیسے شفو کو بہت کچھ سمجھا دیا تھا کہ وہ اس سے کسی قسم کی کوئی امید نہ لگائے۔ وہ یہاں محض خاموش تماشائی ہے۔

"بھابھی۔" شفو نے سوکھے لبوں پہ زبان پھیر کر ہولے سے کہا۔

"نہ جانے کیوں آپ کو دیکھ کر مجھے یہ احساس ہوا تھا جیسے آپ بھائی کو خوش رکھیں گی۔"

اس کی بات پر ہانیہ نے پہلو بدل لیا۔

پتا نہیں کون، کس کو خوش رکھے گا اور کس کو ناخوش۔ اسے خوشی کا مفہوم بھولتا جا رہا تھا۔ پتا نہیں شفو کو اس پر کیوں اعتبار آگیا تھا۔

رات دیر میں زوار کمرے میں آئے تو کھٹکے کی آواز پر ہانیہ کی آنکھ کھل گئی۔ وہ بیڈ پر ہی سو گئی تھی۔ لمحہ بھر کو وہ خفت سے سرخ پڑی۔ پھر جیسے ساکت سی پڑی رہی بھلا وہ بیڈ سے کیوں اترے۔ کیوں بے آرام ہو۔
"اگر کچھ کھانے کو مل جاتا تو بہتر تھا۔" اندر داخل ہونے کے بعد مقابل کے لبوں سے کتنی دیر بعد۔ جملہ ادا ہوا تھا۔
"آپ مجھے یہاں ملازمہ بنا کر لائے ہیں کیا؟"
سامنے بیٹھی لڑکی کے لبوں سے اتنا کڑوا جملہ ادا ہونے کی غالباً" زوار کو بالکل بھی توقع نہیں تھی۔ وہ اس کی بیوی ہے اور وہ اس کے کام کرنے کو اپنا فرض نہیں سمجھ رہی تھی۔ بلکہ خود کو ایک ملازمہ تصور کر رہی تھی۔
حالانکہ یہ بات ہانیہ نے بھی بہت اچھی طرح نوٹ کی تھی۔ کہ زوار کے آنے پر نہ باورچی خانے کی بتی جلی تھی۔ اور نہ کسی کمرے کی۔ گویا کسی کو انہیں کھانا دینے کی فکر نہیں بھلا ایک بے زبان شخص کے لیے کاہے کو اپنے آرام میں خلل ڈالا جائے۔ وہ کون سا شکوہ کرتا ہے۔ یا پھر آپابی اس کے سر زوار کی ساری ذمہ داری تھوپ کر خود بے فکر ہو گئی تھیں، مگر اس نے کسی ذمہ داری کو قبول نہیں کیا تھا۔
زوار نے اسے دوسری مرتبہ کھانا لانے کو نہیں کہا۔ وہ چپ چاپ سامنے پڑی کرسی پر بیٹھ گیا۔
ہانیہ نے سوچ لیا تھا۔ وہ اگر اسے بیڈ سے اترنے کو کہے گا تو اب کی بار بھی وہ ڈھٹائی سے صاف انکار کر دے گی، مگر اس کی نوبت ہی نہیں آئی۔ وہ کتنی دیر کرسی پر خاموش بیٹھا رہا۔ اور پھر باہر صحن میں پڑی چارپائی پر جا کر لیٹ گیا۔
لمحہ بھر کو ہانیہ کو ملال سا ہوا۔
جانے بے چارے کو کتنی بھوک لگ رہی ہو؟ اس نے خوامخواہ بدتمیزی دکھائی، مگر دوسرے ہی لمحے اس نے سر جھٹک ڈالا۔
وہ بھلا اس پر کس ناتے ترس کھائے۔ جب اس کے گھر والوں کو اس کی فکر نہیں تو وہ کس خوشی میں اس کے لیے پریشانی ہوتی پھرے۔۔۔ اور وہ بھی اس شخص کے لیے جس نے اس کی خوشیوں پر نقب لگائی تھی اور اسے طاہا سے جدا کر دیا تھا۔
صبح کا اجالا پھوٹا تو چھوٹی بھابھی چیل کی طرح منڈلاتی اس کے سر پر پہنچ گئی۔
"جیٹھ جی سے تمہاری لڑائی ہوئی ہے کیا؟" وہ کرید کرید کر سوال کر رہی تھی۔
"کیوں بھلا۔ میری کیوں لڑائی ہونے لگی۔" اس نے تیوریاں چڑھالیں۔
"بھئی وہ باہر صحن میں چارپائی پر سو رہے ہیں ناں۔" وہ پتا نہیں کیا کھوج لگانا چاہ رہی تھی۔ ہانیہ کا ہاتھ گود میں پڑے پڑے بھینچ سا گیا۔ مگر پھر بھی وہ سنبھل کر بولی۔
"وہ اصل میں رات کو کمرے میں بہت گرمی تھی ناں۔ اس لیے زوار باہر چارپائی پر سو گئے۔" اس نے بڑے ٹھہراؤ سے کہا تھا۔
"اگر گرمی تھی تو کھڑکی کھول لیتے۔" انہوں نے مشورہ دیا۔
"مشورے کا شکریہ۔ ویسے میں سوچ رہی ہوں کہ میں بھی زوار سے کہہ کر آپ کی طرح اپنے کمرے میں اے سی لگوالوں۔ دن بھر دھوپ پڑنے کے بعد کمرہ بہت تپ جاتا ہے۔ آپ کا کمرہ تو پھر بھی سائیڈ میں ہے۔ اتنی دھوپ نہیں پہنچتی، مگر ہمارا یہ کمرہ تو دن بھر سورج کی زد میں رہتا ہے۔"
"اے سی اور تمہارے کمرے میں۔" چھوٹی بھابھی کا انداز استہزائیہ تھا۔
"کیوں کیا انہونی بات ہے؟" ہانیہ کا لہجہ بھی تیکھا ہو گیا۔
"آپابی اس کی بالکل اجازت نہیں دیں گی۔"
"تو ان کی اجازت مانگ بھی کون رہا ہے۔ ماشاءاللہ سے زوار کماتے ہیں۔ اس گھر کا تمام خرچہ پانی ان ہی کے دم سے چلتا ہے۔ تو کیا ان کا اتنا بھی حق نہیں بنتا کہ وہ اپنی مرضی سے اپنے کمرے میں اے سی بھی لگالیں۔"
"یہ تو تم آپابی سے پوچھنا۔"

چھوٹی بھابھی نے جانے آپا بی کو کیا الٹی پٹی پڑھائی۔
وہ دندناتی اس کے سامنے آموجود ہوئیں۔ زوار ڈریسنگ کے سامنے کھڑے بالوں میں برش پھیر رہے تھے۔
"زوار تیری بیوی کو اس گھر میں قدم رکھے کتنے دن ہوئے ہیں کہ اس نے اتنے پر پرزے نکال لیے کہ میرے مقابلے کو چلی آئی۔"
"کیا ہوا آپا بی؟" زوار نے حیرت سے آہستگی سے پوچھا۔
"اس بالشت بھر کی چھوکری نے کمرے میں اے سی لگوانے کا سوچ لیا اور مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت بھی نہیں سمجھی اور تو اتنا زن مرید نکلا کہ مجھے اس معاملے سے دودھ سے مکھی کی طرح نکال پھینکا۔ بھئی واہ۔ خوب دودھ کا حق ادا کر رہے ہو۔ میں نے اپنی ساری زندگی تمہاری پرورش میں گزار دی۔ اس گھر کو سنبھالا، لیکن اب تم نے کل کی آئی کہ کہنے میں آکر مجھے ہر معاملے سے ایک طرف کر دیا۔"
"آپا بی۔ آپ کو کسی قسم کی غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو....." انہوں نے دانت بھینچ کر کہنا چاہا۔
"غلط فہمی کیسی؟ تیری بیوی نے خود سکینہ سے اے سی کی بات کی ہے۔ کیوں ری سکینہ۔ بولتی کیوں نہیں۔"
آپا بی نے عقب سے جھانکتی چھوٹی بھابھی کی طرف گردن ذرا سی ترچھی کر کے دیکھا تھا۔
"ہوں۔" چھوٹی بھابھی نے جواباً" صرف گردن ہلانے پر اکتفا کیا۔
"دیکھیے اس کمرے میں بہت گرمی ہوتی ہے۔ اے سی لگوانے کی خواہش ایک جائز خواہش ہے اور اس کے لیے مجھے مجرم کی طرح کٹہرے میں کھڑا کرنے کی ضرورت نہیں اور زوار سے آپ کیا استفسار کر رہی ہیں۔ اگر یہ کسی قابل ہوتے تو آج ان کی یوں حق تلفی نہ ہو رہی ہوتی۔ لیکن معاف کیجیے گا۔ میں اپنے کسی حق سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں۔ اے سی تو میں لگوا کر دم لوں گی۔" ہانیہ نے بڑی دلیری سے آپا بی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔
وہ اس گھر میں فساد کی۔ وہ ماں بیٹے کے درمیان تفرقہ پیدا کرے گی۔ وہ سارے اوچھے ہتھکنڈے استعمال کرے گی تاکہ اس گھر سے جلد اسے رخصت کر دیا جائے۔
"تم اس لڑکی کو چپ نہیں کرا سکتے کیا؟"
آپا بی نے چرب زبانی کا مظاہرہ کرتی لڑکی کو تپ کر دیکھا تھا۔
"زوار بھائی نے آپ کے سامنے زبان کھولی ہے، جو اپنی بیوی کے سامنے سر اٹھائیں گے۔" شفو اس کے دفاع کو آگئی۔
"تو نکل یہاں سے۔" آپا بی شفو کا کان پکڑ کر برآمدے کی طرف لے گئیں۔
"یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔ آپا بی کے سامنے ایسا گستاخانہ انداز مجھے قطعی پسند نہیں آیا۔ اگر آپ کو اے سی لگوانا تھا تو مجھ سے بات کرتیں۔ خوامخواہ چھوٹی بھابھی سے کہنے کی کیا ضرورت تھی۔" پہلی بار اتنے بہت سے جملے ایک ساتھ زوار کے لبوں سے ادا ہوئے۔
اس نے زوار کو سست قدموں سے برآمدہ اترتے اور صحن عبور کر کے بیرونی دروازے سے نکلتے دیکھا۔ ہانیہ کو پہلی مرتبہ عجیب سا احساس ہوا۔ بے چارہ کیسے عجیب سے حالات میں وقت گزار رہا تھا۔ کتنے اختلافات کے بیچ۔ مطلبی لوگوں کے درمیان۔ اسے یہ سب اچھا نہیں لگا۔ جائز بات پر اتنا واویلا کیوں.....؟
جتنی دیر اس نے حواس بحال کرنے میں لگائے۔ شفو اس کے پاس چلی آئی۔ "دیکھا آپ نے یہ ہے حق بات کہنے کا نتیجہ۔"
"ہوں۔"
"ویسے آپ کو اپنا کمرہ بھی تبدیل کرانا چاہیے۔ اس برآمدے کا آخری کمرہ بہت کشادہ اور خوب صورت ہے۔ آپا بی نے خوامخواہ مہمانوں کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ مہمانوں کے لیے یہ کمرہ کر دیں اور آپ وہ کمرہ لے لیں۔" شفو نے مشورہ دیا۔

"ٹھیک ہے۔ بات کروں گی۔"

"اور ایک بات اور..." شفو سرگوشیانہ انداز میں قریب آگئی۔

"آپا بی آج کل چھوٹی بھابھی کی انگلیوں پر خوب ہی ناچ رہی ہیں۔ چھوٹی بھابھی کتنے دنوں سے آپا بی سے ساجد بھائی کے لیے گاڑی مانگ رہی ہیں۔ آپا بی موٹر سائیکل کے حق میں ہیں، لیکن چھوٹی بھابھی کہہ رہی ہیں کہ سوزوکی ہی دلوادیں۔"

آپا بی کو باورچی خانے سے باہر نکلتا دیکھ کر شفو کھسک لی۔

"بڑی دلہن۔ رات کے کھانے کے لیے آلو گوبھی پکالو۔ سبزی باورچی خانے میں رکھی ہے۔ ساتھ میں چٹنی اور رائتہ بھی بنالینا۔"

وہ چپ کھڑی سنتی رہی۔ پتا نہیں چھوٹی بھابھی کیا کام کرتی تھی۔ اس نے اسے ایک بار بھی کھانا پکاتے نہیں دیکھا تھا۔ ہاں البتہ جب اپنے اور ساجد بھائی کے لیے کچھ خاص پکانا ہوتا تو چھپ چھپ کر پکاتی تھی۔ کبھی گوشت بھون کر اندر کمرے میں لے جا رہی ہے۔ تو کبھی بادام کی سردائی بنا کر۔ کبھی گڑ کے چاول تیار ہو رہے ہیں۔ لیکن محض اپنے اور ساجد بھائی کے لیے، گھر کے کسی اور فرد سے اسے کوئی سروکار نہیں تھا۔

وہ باورچی خانے میں آئی تو طاق کے اوپر والے حصے میں اسے برتن ڈھکا نظر آیا۔ اس نے برتن اتار کر اندر جھانکا۔ غالباً" چھوٹی بھابھی قیمہ بھون کر رکھ گئی تھی رات کے لیے۔

اس نے آدھے سے زیادہ قیمہ کٹوری میں زوار کے لیے انڈیل لیا۔ اور اندر کمرے میں جا کر چھپادیا۔ اس نے قیمہ زوار سے ہمدردی کے تحت رکھا تھا یا اس گھر میں کوئی نیا فساد کھڑا کرنے کو۔ بہرحال جو کچھ بھی تھا۔ وہ اس فارمولے پر کاربند تھی کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہوتا ہے۔

آلو گوبھی پکا کر اس نے خود تیز مرچیں اس میں جھونک دیں۔

آج کے بعد آپا بی اسے کچھ بھی پکانے کا کہنے سے پہلے کانوں کو ہاتھ لگائیں گی۔ اس کا اندازہ بالکل درست ثابت ہوا... آلو گوبھی کھا کر آپا بی کے کانوں سے دھواں نکلنے لگا۔ شفو بھی سی سی کرتی رہ گئی۔ رجو کی آنکھوں سے آنسو جاری ہوگئے۔

"زبان کی ساری تیزی لگتا ہے آلو گوبھی میں ڈال دی ہے۔" چھوٹی بھابھی نے چبا چبا کر کہا۔

"اسے شرم نہیں آتی۔ شوہر رات کو تھکا ہارا آئے گا اور کیا یہ سبزی کھائے گا۔ ہائے زوار کی تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کیسی بدسلیقہ اور بدزبان بیوی بیاہ لایا ہے۔ اس کی شرافت کا تو ناجائز فائدہ اٹھا رہی ہے۔ ورنہ کوئی دوسرا ہوتا تو اب تک تجھے سدھار چکا ہوتا۔"

آپا بی نے ایک غصیلی نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی تھی۔

"آج کیا ہمیں بھوکا سونا پڑے گا آپا بی۔" چھوٹی بھابھی نے معصومیت بھرے لہجے میں پوچھا۔

"تم بھوکا رہنا کہاں جانتی ہو۔ کچھ نہ کچھ چھپا کر کھانے کے لیے ضرور رکھا ہوگا اپنے لیے اور ساجد بھائی کے لیے۔" ہانیہ نے بڑے ٹھہراؤ سے کہا۔

"کیا مطلب؟" وہ چونکی۔

"مطلب آپ بخوبی سمجھتی ہیں۔" وہ اپنے کمرے میں چلی آئی۔ اسی وقت زوار بھی آگئے۔ آج ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی اس لیے دکان جلد بند کر آئے تھے۔ ان کے کچھ کہنے سے پہلے ہی وہ باورچی خانے میں جا کر روٹیاں اٹھا لائی۔ ٹرے میں روٹیاں اور چٹنی رکھی تھی اور قیمہ کی کٹوری اس نے الماری سے نکال کر ان کے سامنے رکھ دی۔

زوار نے دو نوالے ہی حلق سے اتارے تھے کہ چھوٹی بھابھی دندناتی اندر داخل ہوئیں۔

"بہت خوب تو چوری کا قیمہ شوہر کو کھلایا جا رہا ہے۔ وہ تیز مرچوں والی آلو گوبھی موصوف کو کھلاتی بھی نا۔ پکا پکایا قیمہ مل گیا اور..."

"دیکھ لیجیے زوار! میں یہی دکھانا چاہتی تھی کہ آپ کو محض دال سبزی پر ٹرخایا جاتا ہے اور یہ محترمہ اپنے لیے

اور اپنے شوہر کے لیے مرغ اور گوشت پکاتی ہیں۔"
ہانیہ نے بڑے سکون سے کہا تھا۔
"اگر قیمہ چاہیے تھا تو مجھ سے ویسے ہی مانگ لیتیں۔ یوں چوری کرنے کا فائدہ۔" چھوٹی بھابھی کو پتنگے لگے تھے۔ وہ گردن گھما کر جیٹھ جی سے کہنے لگیں "دراصل ساجد کو دو دن سے تیز بخار آرہا تھا۔ خاصے کمزور ہو گئے تھے اس لیے ڈاکٹر کی ہدایت کے مطابق ان کے لیے قیمہ بنا کر رکھا تھا، مگر آپ کی بیگم صاحبہ چیل کی طرح ہر طرف منڈلاتی رہتی ہیں۔ دیکھ لیجئے۔ مریض کا کھانا آپ کے سامنے لا کر رکھ دیا۔"
"آپ یہ قیمہ لے جائیے۔" زوار آہستگی سے بولے۔
"بالکل نہیں۔" ہانیہ آگے بڑھی۔
"آپ کو یہ قیمہ کھانا ہی ہو گا۔ ایک دن یہ اور ان کے شوہر قیمہ نہیں کھائیں گے تو کوئی قیامت نہیں آجائے گی۔ یہ تو روزانہ ایسا ہی شاندار کھانا کھاتے ہیں۔ حالانکہ آپ کو خوراک کی زیادہ ضرورت ہے۔ آپ سب کے لیے اور اس گھر کے لیے محنت کرتے ہیں۔"
ہانیہ کو یوں بدمزگی پیدا کر کے بڑی کمینی سی خوشی محسوس ہو رہی تھی۔ اگر اس کا یہی رویہ برقرار رہا تو وہ بہت جلد اپنی منزل مقصود پر پہنچ جائے گی۔ طاہا کا خیال آتے ہی دل میں جیسے پکڑ دھکڑ سی شروع ہو گئی۔ اس کے چاروں اطراف میں جیسے خوشبوئیں سی پھیل گئیں۔ اس کی نظروں میں اچانک ہی چھوٹی بھابھی کے لیے اجنبیت جھانکنے لگی تھی اور سامنے بیٹھے شخص کے لیے سرد مہری۔ وہ ہاتھ منہ دھونے کے بہانے صحن میں آگئی اور یہاں سے وہاں تک جلے پاؤں کی بلی کی طرح منڈلانے لگی۔
"کاش اس کی منزل جلد اس کے قدموں میں آن گرے۔ کاش!" بعض دعائیں بہت جلد شرف قبولیت پالیتی ہیں۔ اس روشن صبح طاہا اس کے سامنے تھا۔ ہانیہ کی آنکھیں بغیر پلکیں جھپکے اس پر جمی تھیں۔ جبکہ وہ بالکل خاموش تھا۔

"طاہا تم۔" اس نے اپنے سوکھے لبوں پہ زبان پھیرتے غیر یقینی انداز میں پوچھا تھا۔
"تمہاری صورت دیکھنے کو ترس گیا تھا' اس لیے چلا آیا۔" وہ جذبوں کی تمام تر شدتوں سے کہہ رہا تھا۔
"تمہیں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا طاہا۔ تم نہیں جانتے۔ تمہارے آنے سے میرے اندر کی بے سکونی کس قدر بڑھ جائے گی۔ میں پوری کوشش سے ایسے حالات پیدا کر رہی ہوں جو ہمیں ایک دوسرے کو ملانے کا باعث بن جائیں۔ بس چند دن اور انتظار کرنا ہو گا۔ اس گھر کے تمام افراد میرے خلاف اپنے دل میں بغض و عناد پال رہے ہیں۔ ان سب کو اپنا دشمن بنا کر ہی مجھے زندگی کی حقیقی راحت اور خوشی نصیب ہو گی اور......"
"میں انکل کے کہنے پر یہاں آیا ہوں ہانیہ۔ وہ تمہاری خیریت جاننا چاہ رہے تھے۔ تم نے تو ان سے کبھی نہ ملنے کا کہہ کر انہیں بے چین کر دیا تھا۔ مگر تم سے دوری نے مجھے بھی حد سے زیادہ مضطرب کر رکھا تھا اور......"
"ہماری ایس ایم ایس کے ذریعے بات چیت تو ہو جاتی ہے۔"
"مگر میں تمہاری صورت دیکھنا چاہتا تھا۔ اسی لیے انکل نے جب تمہاری خیریت کے لیے کسی کو بھیجنا چاہا تو میں نے اپنی خدمات پیش کر دیں۔ انہوں نے تمہارے لیے کچھ کپڑے اور مٹھائی بھجوائی ہے۔"
"اب تم چلے جاؤ طاہا۔ میں بہت جلد تمہیں خوشخبری کا ایس ایم ایس بھیجوں گی۔ پھر ہم اپنی الگ دنیا بسائیں گے۔"
"اور تم...... میں تمہیں سب سے چھپا کر تاروں کے پار لے چلوں گا۔ ہم کہیں دور چلے جائیں گے۔ اس ظالم سماج کی پہنچ سے بہت دور۔" طاہا کہہ رہا تھا۔
اس دم دروازے پر کھٹکا ہوا۔
ہانیہ یک لخت ٹھٹک گئی۔ سامنے زوار موجود تھے۔ اور ان کے برابر کھڑی چھوٹی بھابھی۔ پتا نہیں وہ دونوں کب سے وہاں موجود تھے۔ اور یہ بھی پتا نہیں ان

دونوں نے ان دونوں کی گفتگو کس حد تک سنی تھی۔
چھوٹی بھابھی نے ایک قدم آگے بڑھا کر مداخلت کی تھی۔
"لگتا ہے تمہارے میکے کا کوئی خاص فرد ہے۔" وہ خوش خلقی سے مسکراتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔
"ہوں...." ہانیہ نے بھنچی بھنچی آواز میں کہا۔
"ابا نے کچھ تحائف بھجوائے ہیں۔"
چھوٹی بھابھی نے ایک تیکھی سی نظر پہلے طاہا پر ڈالی۔ پھر بستر پر رکھے ڈبوں پر۔ کچھ کھوج نکالنے کی دھن میں مبتلا۔ ہانیہ کو ان آنکھوں میں ہویدا ڈلوں کی پراسرار حرکت سے زیادہ زوار کی خاموشی نے بوکھلا دیا۔
"مجھے طاہا کہتے ہیں۔" طاہا نے خود ہی زوار کی طرف مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھایا۔
"اور میں زوار.... آپ کھڑے کیوں ہو گئے۔ تشریف رکھیے اور ہانیہ! آپ نے طاہا کو چائے پانی کا پوچھا یا نہیں یہ ہمارے مہمان ہیں۔ ان کی اچھی خاطر داری کرنا آپ کا فرض ہے۔"
زوار نے مدھم لہجے میں ہانیہ کو مخاطب کیا تو وہ مزید ہڑبڑا گئی۔
"وہ دراصل طاہا کو جلدی ہے۔ ورنہ ان کی بس چھوٹ جائے گی۔"
ہانیہ جلد از جلد طاہا کو وہاں سے ٹالنا چاہ رہی تھی۔
"کوئی بات نہیں۔ دوسری بس مل جائے گی۔ یہاں سے ہر آدھ گھنٹے بعد بس چلتی ہے۔ آپ ایسا کریں۔ پہلے ان کے لیے کھانے کا انتظام کریں اور بعد میں چائے کا اور ویسے بھی یہ کھانے کا وقت ہے۔"
زوار نے کہا تو چھوٹی بھابھی بولیں۔
"بھئی اگر جیٹھ جی کہہ رہے ہیں تو اپنے میکے والے کی خوب خاطر داری کرو۔ ویسے بھی میکے والے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں اور پھر ان سے تو تمہاری خاص دوستی معلوم ہو رہی ہے۔"
چھوٹی بھابھی کے لہجے کی حلاوت بے سبب نہیں تھی۔ وہ ان سے ہر قسم کی کمینگی کی توقع کر سکتی تھی۔

"میرے خیال میں بھابھی آپ کو اس وقت ساجد کے پاس ہونا چاہیے۔" زوار نے غالباً چھوٹی بھابھی کے آخری جملے کا برا مان کر بہت ٹھہرے لہجے میں کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

طاہا آ کر چلا گیا، مگر اس کی بے چینیوں میں اضافہ کر گیا۔ اتنے دنوں میں اس نے اپنے مچلتے دل کو جس طرح تھپک تھپک کر سلایا تھا، اس کی تمام دھڑکنیں یکلخت پوری شدت سے جاگ اٹھی تھیں۔
وہ اس کی خوشیوں کا حاصل تھا۔ وہ اس کی منزل تھا۔ ایک مانوس سی خوشبو جیسے اس کے چاروں اطراف میں رقصاں تھی۔ وہ سارا دن اس نے بہت شادمانی میں گزارا۔ لب آپ ہی آپ گنگنا رہے تھے۔ اس رات وہ خود ہی مستعدی سے زوار کے لیے کھانے کی ٹرے سجا لائی۔ آج اس نے اپنے ہاتھوں سے ان کے لیے گوشت بھونا تھا۔ آپا بی حیران نظروں سے اسے دیکھ رہی تھیں۔ جب اس لڑکی کا موڈ ہو تو سالن کتنا زبردست پکاتی ہے۔ وہ اس کی سلیقہ مندی کے جوہر دیکھ رہی تھیں۔ ترتیب دی ہوئی ٹرے میں اس کے ہاتھ کا مزے دار سالن تھا اور گرم گرم پھلکے بھی۔
"کھانا کھا لیجیے۔ ٹھنڈا ہو جائے گا۔" زوار چپ چاپ آپا بی سے چند قدم کے فاصلے پر مودب بیٹھے رہے۔
"آپ بھی کھائیں آپا۔" انہوں نے آپا بی سے کہا تو وہ "ہونہہ" کرتیں اندر ساجد کے کمرے میں جا گھسیں۔
"میں نمک بھی لے آؤں۔ شاید آپ کو سالن پھیکا لگے۔"
"آپ کو اتنے تردد کی کیا ضرورت ہے۔" انہوں نے بڑی رسانیت سے ہولے سے کہا تھا۔ "آپ نے اتنی محنت اور وقت میرے لیے ضائع کیا۔ گھر میں جو پکا تھا، وہی کھا لیتا۔ آپا بی بتا رہی تھیں کہ آپ نے خاص یہ گوشت میرے لیے پکایا ہے اور...."

"آپابی کی بات کو آپ جانے دیجئے۔ وہ انصاف کرنے کی عادی نہیں۔"

"اچھا یہ بتایئے آپ نے کھانا کھالیا۔"

ان کا اس سے محض اتنا ہی رابطہ تھا۔

"نہیں۔"

"تو کھا لیجئے۔"

"مجھے بھوک نہیں۔"

"وجہ۔"

"وجہ اگر بتا دوں گی تو کیا آپ اسے حل کرنے کی کوشش کریں گے۔" اس کا انداز فوراً" ہی تیکھا ہو گیا۔

"اگر بس میں ہوا تو ضرور کچھ کروں گا۔"

"تو مجھے وہ بر آمدے کے کونے والا بڑا کمرہ چاہیے۔ اس تنگ سے کمرے میں میرا دم گھٹتا ہے۔ آپ اس طرح کے حالات اور کمرے میں رہنے کے عادی ہوں گے مگر میں اس کباڑ خانے میں ایک لمحہ کو بھی نہیں رہ سکتی۔"

(اس کے لہجے کے ساتھ ساتھ اس کے الفاظ بھی جھلس رہے تھے۔ یعنی اس گھر کا سکون غارت کرنے کا ایک اور اچھا ہتھکنڈا)۔

"مگر وہ کمرہ تو آپابی نے مہمانوں کے لیے مخصوص کر رکھا ہے۔" شاید ان کے سر میں درد ہو رہا تھا اس لیے انہوں نے اپنی انگلیاں بالوں میں الجھالیں۔

"تو وہ اس کمرے کو مہمانوں کے لیے مخصوص کر دیں۔ مہمان تو کبھی کبھار آتے ہوں گے، مگر ہمیں تو مستقل یہیں رہنا ہے۔ اس لیے مجھے وہی کمرہ درکار ہے۔ اگر آپ کو آپابی سے کہتے ڈر لگتا ہے تو میں خود ان سے اس سلسلے میں بات کرلوں گی۔"

"نہیں۔ میں ان سے بات کرلوں گا۔"

وہ گھر میں مزید کوئی بدمزگی نہیں چاہتے تھے۔ انہوں نے تھوڑے سے تذبذب سے اس لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ یہ لڑکی شاید نہیں جانتی۔ آپابی پر اس کے برے رویے اور بدزبانی کا کتنا برا اثر پڑ رہا ہے۔ آپابی ہزاروں مرتبہ ان سے اس کی بدزبانی اور بداطواری کا رونا رو چکی تھیں۔

"اس لڑکی کی زبان کے آگے خندق ہے۔ نہ اسے چھوٹے بڑے کی تمیز ہے۔ نہ آنکھوں میں کوئی شرم۔ نہ حیا۔ ہر بات پر ہانپو۔ بدتمیزی میں اوّل نمبر ہے۔ میں کہتی ہوں۔ اپنی بیوی کو لگام ڈال کر رکھ۔ کہیں ایسا نہ ہو ہر آئے گئے کے سامنے ہمیں شرمندہ کراتی پھرے۔"

وہ آپابی کو مزید موقع نہیں دینا چاہتے تھے کہ وہ ہانیہ کے متعلق مزید غلط رائے قائم کرلیں۔ وہ جانتے تھے۔ آپابی کو کمرہ بدلنے والی بات سخت ناگوار گزرے گی۔ انہوں نے شروع سے اس گھر پر حکمرانی کی تھی۔ وہ اپنی حکمرانی میں کسی اور کی مداخلت برداشت نہیں کر سکتی تھیں۔

زوار سمجھ نہ پائے۔ وہ آپابی سے اس نئے مسئلے پر کیسے بات کریں۔

"آپابی۔ اگر بر آمدے کے آخر والا کمرہ مل جاتا تو۔" ان کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی آپابی بھڑک اٹھیں۔

"یہ تو نہیں بول رہا۔ تیرے منہ میں کسی اور کی زبان آگئی ہے۔ پہلے بھی تو تو یہاں رہ رہا تھا۔ کبھی میری حکم عدولی نہیں کی۔ کبھی گھر کے معاملات میں دخل اندازی نہیں کی۔ پھر اب کیا ہو گیا۔ دلہن کے آنے کے بعد پر پرزے نکل آئے۔ ارے جورو کے کہنے پر دم دبائے میرے سامنے چلے آئے۔ خود سے اسے منع کیوں نہیں کر دیا کہ وہ بڑا کمرہ مہمانوں کے لیے ہے۔ جب سے یہ لڑکی آئی ہے۔ گھر میں سکون نام کو نہیں رہا۔ ہر بات پر فساد۔ ہر روز کوئی نہ کوئی نیا مسئلہ۔ میری تو مت مار کر رکھ دی ہے تیری بیوی نے۔ اور وہ جو میں نے ساجد کی گاڑی کے لیے کہا تھا تجھے۔ وہ معاملہ کہاں تک پہنچا۔"

"وہ بھی ہو جائے گا۔" انہوں نے نرم آواز میں لہجوں کی تلخی کو کم کرنا چاہا تھا۔

"کہاں سے ہو جائے گا۔ تیری بیوی کچھ کرنے بھی دے گی تجھے، اپنی لگام میں تو نے اسے سونپ دی ہیں۔

اسی سبب آج تو مجھ سے آنکھیں ملانے چلا آیا۔"
"آپا! خفا مت ہوں۔" زوار نے دانت بھینچ کر کہا۔
"اگر تو میری خوشی چاہتا ہے تو ساجد کی فرمائش پوری کر دے۔" آپابی بولیں۔
"مگر کہاں سے آپابی۔" شفو کی آواز ابھری۔ وہ ہر موقع پر بڑے بھائی کے دفاع کے لیے آن موجود ہوتی تھی۔
"درختوں پر پیسے تو نہیں لگے جو توڑ توڑ کر ڈھیر لگا دیا جائے۔ ذرا ساجد بھائی سے بھی کہیں کہ گھر سے باہر نکل کر دیکھیں کہ کمائی کیسے کی جاتی ہے۔ سارا وقت وہ بستر پر پڑے رہتے ہیں۔ انہیں خود ندامت محسوس نہیں ہوتی کہ بڑے بھائی پر سارا بوجھ ڈال رکھا ہے۔ خیر سے اپنے بیوی بچوں کا بوجھ وہ خود سے اٹھائیں۔"
"ہاں بس یہی تکلیف ہے تم سب کو کہ میرا ساجد کام کیوں نہیں کرتا۔ ارے یہ زوار کون سا زمانے سے انوکھا کام کر رہا ہے۔ وہ بھائی بھی تو ہیں جو اپنوں کو ساری عمر پلکوں پر بٹھا کر کھلاتے ہیں' لیکن اف بھی نہیں کرتے۔ شاید وہاں پھوٹ پڑوانے والی نہیں ہوتیں۔ پہلے تیری چرب زبانی کیا کم تھی جو وہ کم بخت نئی دلہن بھی تیرے جیسی آگئی۔ دو دو محاذوں پر لڑنا پڑ رہا ہے مجھے۔ کوئی ڈھنگ کا لڑکا ملے تو میں تجھ سے چھٹکارا حاصل کروں۔ بیٹھ کر میرے سینے پر مونگ دلتی رہتی ہے۔"
بات کہاں تھی۔ کہاں جا پہنچی۔
آپابی سخت بد دل ہو رہی تھیں۔ نالاں ہو رہی تھیں۔ شفو کو اپنی باتوں کی تلخی کا خود بھی اندازہ ہو گیا اس نے آپابی کے ہاتھ تھام لیے۔
"آپ میری باتوں سے غلط مطلب نہ نکالیں۔ میں تو اتنا کہہ رہی ہوں کہ ساجد بھائی کو بھی کمانے کی فکر کرنی چاہیے۔ سکینہ بھابھی اور بچے ان کی ذمہ داری ہیں' زوار بھائی کی نہیں۔" آپابی نے آنکھیں سکیڑ کر برآمدے کے اس کونے میں کھڑی ہانیہ کی طرف دیکھا۔
"وہی ہے اصل فساد کی جڑ۔ جس کی وجہ سے تم دونوں بہن بھائیوں نے میرے خلاف محاذ کھول لیا ہے۔"
ان کے لہجے کی تلخی کم نہیں ہوئی تھی۔ وہ دھپ دھپ کرتی باورچی خانے میں چلی گئیں۔ شفو چائے کے برتن اٹھا کر صحن والے نلکے کے نیچے دھونے آ گئی۔ اترتی شام کے ساتھ ساتھ کشیدگیاں بھی اتر آئی تھیں۔
"بے چارے زوار بھائی کب تک رواداری نبھاتے رہیں گے۔ مروت کی مار کھاتے رہیں گے۔ وہ سب ہمیشہ ان کی ذمہ داری رہیں گے۔ آپابی کو کبھی ان پر رحم نہیں آئے گا۔" وہ برتن دھو کر ہانیہ کے کمرے میں آ گئی۔
"آپ ہی اس گھر کے حالات ٹھیک کر سکتی ہیں بھابھی۔"
"میں نے حالات ٹھیک کرنے کا ٹھیکہ تو نہیں لے رکھا۔"
وہ شفو کا دل رکھنا چاہتی تھی۔ مگر ٹکا سا جواب دے دیا۔ وہ یہاں لوگوں کے دلوں میں گھر کرنے کی نیت سے نہیں آئی تھی۔ اسے یہاں سے اپنا بوریا بستر ہر حال میں گول کرنا تھا۔ اور اس کے لیے موجودہ روش ہی ٹھیک تھی۔
"آپ زوار بھائی کی شریک سفر ہیں۔"
شفو نے تھوڑے سے تذبذب سے اس کی طرف دیکھا تھا۔ اس لڑکی کا مزاج پل میں تولہ اور پل میں ماشہ ہوتا تھا۔ کبھی تو وہ اس گھر کی خیر خواہ نظر آتی۔ زوار بھائی کے لیے فکر مند دکھائی دیتی اور کبھی ایک دم ہی بے انتہا لاتعلق بن جاتی تھی۔
آنگن میں شام کے سائے ہمک رہے تھے۔ در و دیوار پر ملگجا سا اندھیرا پھیلا رہا تھا۔ ساجد بھائی تیار ہو کر نکل گئے تھے۔ یہ وقت ان کا دوستوں سے ملنے ملانے کا ہوتا تھا۔ زوار صبح سے دکان کے لیے نکلے تھے۔ دوپہر میں کھانے کے لیے بھی گھر نہیں آئے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس شخص کے بارے میں سوچنے لگی تھی اور شاید فکر مند بھی رہنے لگی تھی' حالانکہ

یہاں اس کا ٹھکانہ عارضی تھا۔ اسے صرف اور صرف طاہا کے سنگ زندگی گزارنی تھی اور......

طاہا کا خیال آتے ہی وہ خستہ سی چپل پاؤں میں پہن کر برآمدے کی دو سیڑھیوں میں سے ایک پر چوکڑی مار کر آ بیٹھی۔ پتا نہیں قسمت کو کب ان کا ملاپ منظور ہے؟ رات طاہا کے ایس ایم ایس نے اسے بہت بے چین رکھا تھا۔

"تم جلد کچھ کرو ہانیہ۔ ورنہ میرا مرا منہ دیکھوگی۔"

یہ میسج پڑھتے ہی اس کا دل اچھل کر حلق میں آ گیا تھا۔ دل چاہ رہا تھا کہ اسے پر لگ جائیں اور وہ اڑ کر اپنے محبوب کے قدموں میں جا بیٹھے اور......

باورچی خانے سے برتنوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کھڑکی کی سلاخوں کے اس پار اسے آپا ہانڈی میں جھانکتی نظر آئیں۔ شاید بریانی پک رہی تھی۔ خوشبو سارے گھر میں چکراتی پھر رہی تھی۔ چھوٹی بھابھی کے دونوں بچے بھوک بھوک کا شور مچائے ہوئے تھے۔ دفعتاً اسے اپنی آنتیں بھی قل ہو اللہ پڑھتی محسوس ہوئیں۔ اسے یاد آیا۔ اس نے دوپہر میں کھانا نہیں کھایا تھا۔

وہ باورچی خانے میں آ کر جھانکنے لگی۔

"کیوں بھئی۔ کیا بات ہے؟"

آپابی نے اسے تیکھی نظروں سے دیکھتے پوچھا تھا۔

"مجھے بھوک لگی ہے۔ اگر بریانی مل جاتی تو......؟"

اپنا مدعا بیان کر دینے میں کوئی قباحت نہیں۔

"یہ بریانی میں نے ساجد کی فرمائش پر پکائی ہے۔ تم سب کے لیے آلو والی روٹیاں بنیں گی اور......"

"مگر مجھے بریانی پسند ہے۔"

آپابی کی غصیلی نظروں کی پروا کیے بغیر ہانیہ نے خود سے پلیٹ اٹھائی۔ دم دی بریانی کا ڈھکن کھولا اور مزے سے اپنی پلیٹ پر بریانی کا پہاڑ سا بنا لیا۔

"ہے ہے۔ ساری بریانی انڈیل لی۔ میں نے ساجد کی فرمائش پر تھوڑی سی بریانی دم دی تھی اور تو نے پلیٹ بھر لی۔" آپابی بہت غصے میں تھیں۔

"ساجد بھائی کی فرمائش پر پکا کھانا مجھے بہت پسند ہے۔ مجھے پتا ہے آپ وہ کھانا خصوصی توجہ سے پکاتی ہیں۔ اسی لیے تو بہت لذیذ اور مزے دار ہوتا ہے۔"

اس نے بریانی کا بڑا سا چمچہ بھر کر منہ میں ڈال لیا۔

"پتا نہیں کون سی منحوس گھڑی تھی، جب میں نے زوار کو شادی کی اجازت دی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا وہ تجھ جیسی چلتر باز کو بیاہ کر لے آئے گا۔ تو نے تو میرے دن کا چین اور رات کا سکون غارت کر دیا۔ میں تنگ آ چکی ہوں۔"

"تو کیا آپ مجھ سے جان چھڑانا چاہتی ہیں؟" نہ چاہتے ہوئے بھی ہانیہ کے لبوں سے روانی میں پھسل گیا۔ دل بلیوں اچھلنے لگا تھا۔ وہ وقت قریب آتا دکھائی دے رہا ہے جس کا اسے شدت سے انتظار تھا۔

اس کی بات پر آپابی کے لہجے کی خفگی بڑھ گئی۔

"میری جان چھڑوانے کی خواہش سے کیا ہوتا ہے۔ یہی تو تیری سازش ہے کہ ایسے حالات پیدا کر دے جس کے تحت میں تم میاں بیوی کو علیحدہ کر دوں... تو زوار کو اس گھر سے علیحدہ کرنے کا سوچ رہی ہے۔ لیکن کان کھول کر سن لے۔ میں تیری چٹیا کاٹ کر تجھے اس گھر سے نکال باہر کروں گی مگر اپنے کماؤ پوت کو تیرے سنگ جانے نہیں دوں گی۔ زوار پر سب سے زیادہ حق میرا ہے۔"

"یہ حق آپ کو بہت بہت مبارک ہو۔"

ہانیہ نے بلا تامل کہہ دیا۔ وہ بریانی کی پلیٹ اٹھائے دوبارہ برآمدے کی سیڑھی پر آن بیٹھی۔ اور مزے سے بریانی معدے میں منتقل کرنے لگی۔ بلاشبہ آپابی کے ہاتھوں میں بہت لذت تھی۔

رات زوار لوٹے تو آپابی نے اس کی بریانی لینے والی بات مرچ مسالا لگا کر بتائی۔ انہوں نے زوار کو صحن میں ہی روک لیا تھا اور ہانیہ کے خلاف خوب کان بھرے تھے۔

"وہ لڑکی تجھے اس گھر سے لے کر الگ ہونا چاہتی ہے۔ آج اس نے صاف صاف اپنی اس فضول خواہش کا ذکر کیا ہے۔ وہ تجھے اس گھر سے لے کر چمپت ہونا چاہتی ہے۔ تو بتا! کیا کل کی آئی بیوی کی بات مان کر

تو اپنے سگے رشتوں کو چھوڑ دے گا۔ ذرا سوچ لے۔ بیوی دوسری مل سکتی ہے۔ مگر ماں اور بہن، بھائی نہیں۔"

آپابی نے رو رو کر اپنی آنکھیں سرخ کرلی تھیں۔

"میں کہاں آپ کو چھوڑ کر جارہا ہوں؟ میں آپ سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

"تو بھلے تصور نہ کرے۔ مگر وہ تو دل میں ٹھانے ہوئے ہے۔ یاد رکھیو۔ جس دن تو نے بیوی کی بات مانی میں زہر کھالوں گی۔"

آپا کے الفاظ زوار کے دل پر برچھی کی طرح لگے۔

"ایسی بات نہ کریں آپابی۔" انہوں نے تڑپ کر ان کے لبوں پر ہاتھ رکھ دیا۔

"آپ کیا مجھے بالکل بے عقل سمجھتی ہیں، جو میں بیوی کی باتوں میں آجاؤں گا۔ میں خوب جانتا ہوں۔ شادی کے بعد ان عورتوں کی سب سے بڑی خواہش شوہر کو اس کے ماں باپ اور بہن بھائیوں سے علیحدہ کرنا ہوتی ہے۔ مگر میں ان شوہروں میں سے نہیں جو زن مرید ہوتے ہیں۔ میں مر تو سکتا ہوں مگر میں آپ سب سے جدائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔"

زوار اور آپابی کی ساری باتیں کھڑکی سے لگی ہانیہ نے بخوبی سنیں۔

اسے پہلے بھی شبہ نہیں تھا اور اب تو گنجائش ہی نہیں رہ گئی تھی کہ وہ شخص کسی ہمدردی کا مستحق نہیں اور نہ ہی اس قابل کہ اس کے متعلق سوچ سوچ کر ہلکان ہوا جائے۔ وہ تو شفو نے مسلسل اس کے کان کھا کھا کر اس کی تھوڑی بہت برین واشنگ کردی تھی کہ اس مظلوم شخص کے ساتھ ہونے والی زیادتیوں کے خلاف آواز اٹھانا اس کا حق ہے۔ ورنہ وہ اس کے معاملے میں دخل در معقولات کیوں کرتی۔

اس شخص کے بارے میں اس کا دل بہت برا ہو رہا تھا۔ وہ صبح ہی صاف طور پر اس شخص سے کہہ دے گی کہ اسے ابا کی طرف چھوڑ آئے۔ یہاں بیٹھ کر انتظار کرنے سے بہتر ہے وہ ابا سے جا کر صاف صاف کہہ دے۔ اسے زوار سے طلاق چاہیے۔

آپابی سے فارغ ہو کر زوار کمرے میں آئے تو وہ ایک چھوٹے سے بیگ میں اپنے کپڑے رکھ رہی تھی۔ الماری کے دونوں پٹ کھلے تھے۔ زوار کے اندر داخل ہونے پر ہانیہ کا ہاتھ چند لمحوں کو اسی زاویے پر رک سا گیا۔

"سنیے۔" وہ ذرا کی ذرا رکی۔ "میں ابا کی طرف جانا چاہتی ہوں۔"

یہ وضاحت نہیں کی کہ چند دنوں کے لیے یا ہمیشہ کے لیے۔ اگر زوار کو اس کے منصوبے کی بھنک پڑ جاتی تو یقیناً" ان کے ہاتھوں کے توتے اڑ جاتے۔

"کب تک چلنا ہے؟" بہت دیر کے وقفے کے بعد زوار کی تھکی تھکی آواز ابھری تھی۔

اس لڑکی پر ان کا کیا اختیار کہ وہ اس پر اپنی مرضی ٹھونستے اور اس پر اپنی پسند و ناپسند جتاتے۔ وہ سخت گیر شوہر کی طرح اسے میکے جانے سے روک دینا چاہتے تھے مگر...

"کیا آپ کو کسی کی کوئی بات ناگوار گزری ہے۔" زوار کتنی ہی دیر اس کے جواب کے انتظار میں اس کی طرف دیکھتے رہے۔ اس کے چہرے سے کچھ بھی ظاہر نہیں ہو رہا تھا۔ وہ منتظر تھے۔ شاید وہ خود ہی اپنے جانے کا ارادہ بدل دے۔ یا پھر وہ ان کی آنکھوں میں دیکھتے ان کے اندر کی خواہش پڑھ لے۔

اس لڑکی کو شاید ساری زندگی یہ احساس نہ ہو کہ اس کا ان کے ساتھ کیسا ربط ہے۔ مگر وہ بھی شاید اسے تاحیات یہ نہ بتا سکیں کہ اس کی سیاہ آنکھوں کی پلکوں کی چھاؤں کو دیکھ کر ان کے اندر طمانیت کا احساس بڑھ جاتا ہے۔ یہ آنکھیں انہیں باحوصلہ رہنے کا درس دیتی تھیں۔

گو ان دونوں کے درمیان اجنبیت کی دیوار ہنوز بلند تھی مگر اس لڑکی کو دیکھ کر لگتا تھا۔ زندگی بہت سہل اور پربہار ہے۔

وہ پہلی بار کھل کر اپنے اندر جھانک رہے تھے۔

وہ پچھلے کئی دنوں سے اس کے متعلق سوچنے لگے تھے۔ اور انہیں اس کے متعلق سوچنا اچھا لگنے لگا تھا۔

مگر۔۔۔۔۔

"مجھے کسی کی بات ناگوار نہیں گزری۔ بس مجھے خود سے یہ لگتا ہے کہ میں یہاں مس فٹ ہوں۔ میں اس گھر میں ایڈجسٹ نہیں کرپا رہی۔ میں چند دنوں ابا کی طرف رہ لوں گی تو شاید خود کو سمجھا سکوں اور آپ کی آپا بی اور باقی گھر والوں کے معیار پر پوری اتر سکوں۔"

"ٹھیک ہے آپ تیار رہیے گا۔ میں دو ایک دن میں وقت نکال کر آپ کو چھوڑ آؤں گا۔"

وہ جیسے ان سے اسی جواب کی توقع کر رہی تھی۔ اس نے جیسے پریشان ہونے کی بجائے سکھ کا سانس لیا۔ طاہا اسے اچانک اپنے سامنے دیکھ کر حیران رہ جائے گا۔ وہ طاہا کو اپنے آنے کی اطلاع نہیں دے گی۔ وہ اسے ایک دم چونکادے رہی۔

زوار نے ایک گہری نگاہ سامنے بیٹھی لڑکی کی نذر کی۔

وہ مسکرا رہی تھی۔ شاداں و فرحاں لگ رہی تھی۔ انہوں نے اس سے پہلے اس کو اتنا خوش نہیں دیکھا تھا۔ ان کے دل میں خواہش جاگی۔ وہ اسے ہر روز اس طرح خوش ہوتا دیکھیں۔

وہ باورچی خانے کی طرف جانے لگی تو ان سے بھی از راہ اخلاق پوچھ بیٹھی۔

"میں چائے بنا رہی ہوں۔ آپ چائے پییں گے؟"

☼ ☼ ☼

اگلے دو دن بہت مصروفیت کے تھے۔ زوار اسے چھوڑنے نہ جا سکے۔ اس کا ایک ایک پل صدیوں کے برابر گزر رہا تھا۔ تیسرے دن جب وہ کوچ میں بیٹھی تو جیسے منوں بوجھ اس کے دل و دماغ سے سرک گیا تھا۔ جیسے جیسے کوچ اپنی منزل کی طرف بڑھ رہی تھی' ویسے ویسے ہانیہ کا چہرہ اندرونی مسرت سے جگمگا رہا تھا۔

وقت کے اس کینوس پر دو الگ الگ منظر تھے۔ ایک کے چہرے پر خوشی و طمانیت تھی۔ جبکہ دوسرے کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ ان کی آنکھیں دھواں دھواں ہو رہی تھیں اور جیسے شکستگیوں اور مایوسیوں نے مل کر ان کی ذات کا احاطہ کر لیا تھا۔

وہ اس سے پوچھنا چاہتے تھے۔ وہ گھر کب لوٹے گی' مگر پوچھ نہ سکے۔ اس کا پھولا پھولا بیگ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ وہ خاصے دنوں میکے میں رہنے کا پروگرام بنا کر نکلی ہے۔

کوچ اسٹینڈ کے احاطے سے نکل کر وہ رکشے میں بیٹھ گئے۔ رکشہ جانی پہچانی سڑکوں سے گزر رہا تھا۔

بس یہی آخری موقع ہے۔ اس کے بعد وہ شخص واپس لوٹ جائے گا اور وہ دوبارہ اسے کبھی دیکھ بھی نہیں سکے گی۔ ایک الوداعی نظر خاموش بیٹھے زوار پر ڈالی۔ یہ بے ضرر سا شخص۔ اس نے اس کے ساتھ رہتے ہوئے اسے کبھی برا بھلا نہیں کہا تھا۔ نہ کبھی ڈانٹا تھا۔ نہ ہی اس کے ناروا رویے کی شکایت کی تھی۔ اس شخص کی ذات اچھائیوں کی امین تھی۔

لمحہ بھر کو جانے کیوں جیسے کسی نے اس کا دل مٹھیوں سے لے کر بھینچ دیا ہو۔

کیا وہ اس بے حد سنجیدہ اور اچھے شخص کو دکھی کر کے خوش رہ لے گی؟

تیزی سے دوڑتے رکشے کے دروازے سے ہوا اندر آکر اس کا آنچل اڑائے دے رہی تھی۔ اس کے بالوں کو لہرا رہی تھی۔

جبھی باہر دیکھتے وہ زبردست طریقے سے چونکی۔ اس کے برابر' ہاں اس کے بالکل برابر سے طاہا کی بائیک گزر رہی تھی۔ طاہا کے پیچھے ایک خوب صورت لڑکی بیٹھی تھی۔ جس سے وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا اور وہ لڑکی بھی اس کی کمر میں اپنے بازو ڈالے اس سے چپکی بیٹھی تھی۔ دونوں کے انداز کی بے تکلفی نے جیسے ہانیہ کا دماغ بھک سے اڑا دیا۔

تو تو کیا طاہا اسے بھول گیا۔

ابھی کل ہی طاہا کا محبت بھرا ایس ایم ایس اسے موصول ہوا تھا۔ اس پیغام کو پڑھ کر ہانیہ کو رتی برابر بھی گمان نہیں گزرا تھا کہ وہ اسے دھوکا دے رہا ہے۔ کہ وہ اس کے ہوتے ہوئے کسی اور لڑکی سے محبت کی پینگیں

نکال سکی۔
مگر گنجائش تو اب بھی نکل سکتی ہے؟
وہ سر جھکائے بیٹھی رہی۔ آنسو تیزی سے اس کے گالوں پر دائیں بائیں لڑھکتے رہے۔
وہ کس منہ سے زوار سے تمام حقیقت بیان کرپائے گی۔ وہ اس شخص کے سامنے کس طرح اعتراف جرم کرپائے گی۔ اسے اپنے جرم کے ناقابل معافی ہونے کا یقین تھا۔ اگر زوار نے اسے قبول نہ کیا تو۔۔۔؟
اس نے ان کے جذبات کو مجروح کیا تھا۔ اس نے ان کے اعتماد کو کرچی کرچی کیا تھا۔
کاش وہ اپنا ماضی دفن کرکے زوار کی زندگی میں داخل ہوئی ہوتی۔
کیا پایا اس نے اپنی بے وفائی کے ہاتھوں۔ بدلے میں اسے بھی بے وفائی ملی۔ وہ جیسے اپنا سب کچھ ہار گئی تھی۔ زوار نے رکشہ واپس موڑنے کو کہہ دیا تھا۔
"کہاں چلیں؟"
"واپس گھر۔"
ہانیہ میں اتنی ہمت بھی نہیں تھی کہ وہ ایک نظر اٹھا کر برابر بیٹھے شخص کو دیکھ ہی لیتی۔ دفعتاً" اسے اپنے کندھے پر کسی مضبوط ہاتھ کا ہلکا سا دباؤ محسوس ہوا۔
"میں تم سے اسی فیصلے کی توقع کررہا تھا۔ گو کہ تم حماقت کرنے چلی تھیں۔ مگر بروقت سنبھل گئیں۔ وہ لڑکا طاہا تمہارے لیے کسی طور مناسب نہیں تھا۔"
"جی!" اسے غش آگیا۔
"آ۔۔۔ آپ۔۔۔" اس کے حلق میں گولا سا پھنس گیا تھا۔
"میں باخبر تھا۔ جس دن وہ لڑکا تم سے ملنے آیا تھا۔ میں نے تمہاری اور اس کی باتیں سن لی تھیں۔ میں تمہیں تب ہی روک لینا چاہتا تھا۔ مگر میں جانتا تھا۔ تم میرے روکنے سے نہیں رکو گی۔ اب بھی اگر تم طاہا کو اس لڑکی کے ساتھ نہ دیکھتیں تو شاید۔۔۔"
"میں آپ کی گناہ گار ہوں۔ میں آپ کی مجرم ہوں۔"
اس کے آنسوؤں کی رفتار میں تیزی آگئی۔
"میں نے آپ کے گھر کی فضا کو مکدر کیے رکھا' آپا بی اور سب کے ساتھ بدزبانی کی۔ آپ کا سکون غارت کردیا۔ میں ہیرے اور پتھر کے فرق سے واقف نہیں تھی۔۔۔ کیا آپ مجھے معاف کریائیں گے۔"
جھر جھر بہتے آنسو اس کے پچھتاوے اور تاسف کے گواہ تھے۔ صحیح معنوں میں جیسے اسے اب عقل آئی تھی۔ وہ اللہ کی شکر گزار تھی۔ جس نے بروقت اس کی آنکھیں کھول دیں اور کھرے کھوٹے کا فرق دکھا دیا۔
ورنہ۔۔۔
اس نے ایک جھرجھری لی۔ وہ اس سے آگے کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔ جو کچھ ماضی میں تھا۔ جو کچھ ابھی دیکھا ہے۔
وہ سر جھکائے خاموش تھی۔ گم صم۔ وہ ان سے شاید تاحیات درخواست نہ کرپائے کہ وہ اس کی ذات سے وابستہ تمام تلخیاں بھلا کر اسے اپنی زندگی میں شامل رہنے دیں۔ اسے اپنے گھر کے کسی کونے میں رہنے دیں۔
اگر انہوں نے اسے قبول نہ کیا تو۔۔۔؟
اس سوچ نے اسے بالکل ہی برف کا بنا کر جما دیا۔ وہ ان کے جواب کے انتظار میں جیسے ادھ موئی ہو چلی تھی۔
"آپ اگر چاہیں تو مجھے چھوڑ کر جاسکتے ہیں۔" ہاں اسے اس کی کم عقلی کی سزا ضرور ملنی چاہیے۔
"کیا میں تمہیں ایسا ہی لگتا ہوں۔ راہ میں چھوڑ دینے والا۔"
گمبھیر لہجہ' ٹھہرا ٹھہرا انداز ہانیہ کے اندر تک اتر گیا۔ اس نے ان بے تحاشا روشن گہری گہری آنکھوں میں دیکھا۔ وہاں اس کے لیے کسی غصہ اور نفرت کا نام ونشان نہیں تھا۔ وہ ہیرا انمول تھا۔

آمنہ خالہ، امی جی کی دور پرے کی خالہ تھیں جن کا گھر ہمارے گھر کے پچھواڑے ہی تھا۔ امی جی ان کی بڑی مداح اور ہم بہن بھائی بڑے قدح تھے.... نجانے کون سے اوصاف تھے جن سے امی جی کی طبیعت لگا کھاتی اور ہم کوفت کا شکار ہی رہتے۔ جب تک امی جی روز کا ایک چکر ان کی طرف نہ لگالیتیں، جان الگنی پر ٹنگی رہتی۔ امی جی کو ان کی طرف جانے کا لپکا تھا۔

آمنہ خالہ کثیرالاعیال تھیں مگر سات عدد بیٹے سب کام دھندے کی بدولت اپنے اہل خانہ کے ہمراہ دنیا کے سات براعظموں میں مقیم تھے، بس فون پر ہی رابطہ رہتا۔ کم از کم ہم نے اپنے ہوش و حواس میں ان میں سے کسی کو کبھی پاکستان کی سرزمین پر نہ دیکھا تھا....

میمُونہ صدف

مُسکن

چار عدد بیٹیاں تھیں جو اپنے اپنے گھروں میں آباد اور خوش تھیں۔ کبھی کبھار ماں سے ملنے چلی آتیں۔ اعظم خالو کا دو برس قبل ہی جگر کے عارضے میں مبتلا رہنے کے بعد انتقال ہو گیا تھا۔

ہم تینوں بہن بھائی خال خال ہی آمنہ خالہ کے ہاں جاتے ... میٹھی عید ' بقر عید یا چند ایک بار امی جی گھسیٹ کر لے جاتیں۔ خالہ کا گھر وسیع و عریض رقبے پر محیط تھا' مگر گھر کے پچھواڑے کا سارا حصہ کرائے پر تین مختلف خاندانوں میں 'اٹھا رکھا تھا... سامان تھا کہ بے حد مختصر' حالانکہ بیٹے ہر ماہ تگڑی بندھی رقم خرچے کے طور پر بھجواتے مگر خالہ تھیں کہ دانتوں سے پکڑ کر رکھتیں۔ سادہ سے پیوند لگے دو جوڑوں میں سردیاں ' گرمیاں گزار دیتیں... ملنے ملانے میں بڑی ہنسوڑ اور خوش اخلاق واقع ہوئی تھیں مگر جہاں روپیہ خرچنے کا سوال آیا' خالہ فوراً "شوم پن" پر اتر آتیں۔ کھانے پر بضد روکتیں تو محض سالن اور روٹیوں پر اکتفا کرواتیں ... بوٹیاں بھی پورے حساب کی...

جتنے بندے ' اتنی بوٹیاں ' اگر کبھی غلطی سے دل دوسری بوٹی کھانے کا کر جاتا تو دل ناداں کو تسلیاں دے کر چپ کی بکل مارنا پڑتی۔ مگر تعجب تھا کہ کم کھانے میں بھی برکت ایسی کہ ہم سیر شکم لوٹتے۔ ہاں بھرے پیٹ بھی لالچ نہ جاتی یہ اور بات تھی۔

خالہ کی اس کنجوسی کی بنا پر ہم نے ان کا نام "شوم خالہ" رکھ چھوڑا تھا۔ امی جی گھور کر' ڈپٹ کر' سمجھا بجھا کر تھک گئیں مگر ہم تینوں باز نہ آئے۔

ہاں ایک بات ضرور تھی' جب بھی ہمارا ان کے ہاں جانا ہوا' ملنے ملانے والی خواتین کا تانتا بندھا رہتا اور بھلے سے کم ہی مگر خالہ شوم کھانا ضرور پیش کرتیں... کھانا کھائے بغیر کوئی نہ جاتا تھا ان کے گھر سے ... یوں جیسے لنگر خانہ تھا کوئی۔

"امی جی اتنا بھی کیا شوہدہ پن... اتنا پیسہ کیا کرنا ہے جوڑ جوڑ کر؟ بندہ گھسے پٹے کپڑوں میں پھرتا رہے ' میلوں کا سفر پیدل کرے ' گرمی کی شدت پر بھی اے سی نہ چلائے ' انواع و اقسام کے ذائقوں سے محروم رہے ... بھلا ایسا بھی کیا؟ قبر میں لے کر جائیں گی اتنا پیسہ۔"

طیب اس روز خالہ شوم کے ہاں سے لوٹنے کے بعد سخت نالاں تھا اور امی جی اس کی بات پر کبیدہ خاطر سی بیٹھی تھیں۔

"ظاہر پر مرنا مٹنا چھوڑ دو میرے بچو... بصیرت اور بصارت میں فرق ہوتا ہے۔ جو ہوتا ہے وہ نہیں دکھتا' اور جو دکھتا ہے وہ نظر کا دھوکا بھی ہو سکتا ہے۔"

"امی جی گنج رواں ہے ان کے پاس یہ تو آپ مانتی ہیں نا؟" عطیہ بھی طیب کی ہم خیال تھی اور میں تاحال خاموش۔

امی جی نے سر اثبات میں ہلا دیا۔

"بے شک ... مگر وہ گنج رواں نہیں جو تم لوگوں کو لگتا ہے۔"

"رہنے دیں امی جی ... صاحب ثروت ہو کر ایسا بخل۔" اور امی جی بس ہمیں دیکھتی ہی رہ گئیں۔

جس روز خالہ شوم کا انتقال ہوا اس روز بڑے بھید تھے جو کھلے ' بڑے اسرار ' نغمے و زمزمے جو کوہ دمن میں نہاں رکھے گئے' ابل ابل کر باہر آنے لگے۔

مخلوق کا جم غفیر تھا ان کے وسیع و عریض گھر کے اندر و باہر اور یہ بڑا جنازہ... وہ سب لوگ وہ تھے جن کے گھروں کے چولہے خالہ شوم کے دم سے اللہ چلاتا تھا۔ ہزاروں کی سرپرست بنی بیٹھی تھیں وہ گدڑی پوش اور ہزاروں کے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ وہ سب زارو قطار روتے اور انہیں دعائیں دیتے نہ تھکتے۔

ہم تینوں بہن بھائی دم بخود تھے...

امی جی روتی جاتی تھیں اور ایک ہی جملہ کہتیں۔

"میری خالہ کہتی تھیں پتر! دوسروں میں بانٹنے کے لیے اپنا پیٹ کاٹنا پڑتا ہے ... ساری زندگی ایسے ہی سادگی سے گزار دی تاکہ دوسرے با آسانی گزر بسر کر سکیں۔"

اور ہم تینوں اس ممسک کے سب سے بڑے مداح بن گئے جو منوں مٹی تلے سونے چل دی تھیں ... بصیرت اور بصارت کے درمیان حائل پردہ چاک ہو چکا تھا۔

☆

شفق افتخار

کہیں سے چاند سے

''کیا ہو رہا ہے' لٹل برادر۔'' سسی نے سینٹرل ٹیبل پر پڑا ٹی وی کا ریموٹ اٹھاتے ہوئے۔ صوفے پہ نیم دراز اردل کو مخاطب کیا تھا۔ جو کانوں میں ایئر فون ٹھونسے ہوئے تھا۔ ٹی وی آن ہوتے دیکھ کر اردل نے مڑ کر دیکھا اور بہن کو دیکھ کر ایئر فون کان سے نکال دیے تھے۔ لیکن نظریں ہنوز موبائل اسکرین پہ تھیں۔

''تم ادی سوہائے کی شادی پہ چل رہے ہو گاؤں؟'' سسی نے اردل سے پوچھا تھا۔ مگر توجہ چینل سرفنگ پہ تھی۔

''نہیں....'' وہ مختصر سا جواب دے کر پھر سے گم ہو چکا تھا۔

''کیوں.... تم جانتے ہو نا' بابا کو بُرا لگے گا اور پھر اماں مٹھی نے کتنے پیار سے بلایا ہے۔'' وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔

''مجھے اس گاؤں کی بورنگ سی شادی میں جا کر اپنا ٹائم ویسٹ کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔ ویسے بھی اس

مکمل ناول

ویک اینڈ پہ میرا اپنے فرینڈز کے ساتھ پروگرام ہے۔"
اس نے موبائل رکھ کر صفائی سے جواب دیا تھا۔
"تو تم اکیلے کیسے رہو گے۔ بابا تمہیں یہاں اکیلا نہیں رہنے دیں گے۔" وہ فکرمندی سے بولی۔
"اکیلا کیوں! ماما ہوں گی نا۔" وہ بے فکری سے کندھے اچکا کر بولا۔
"کیا مطلب... ماما بھی نہیں جارہیں ہمارے ساتھ؟" اس نے حیرانگی سے پوچھا تھا۔
"یو نو... مائی سسٹر... ماما کبھی بھی گاؤں جانا پسند نہیں کرتیں۔ تم جارہی ہو؟" اس نے دوبارہ ایئر فون کانوں میں ٹھونستے ہوئے ایک پل کو رک کر اس سے پوچھا تھا۔
"ہاں۔ میں تو جارہی ہوں۔ اماں مٹھی نے اتنے پیار سے بلایا ہے اور پھر جب سے ہم لوگ امریکا سے آئے ہیں' ایک بار بھی گاؤں نہیں گئے' آئی ایم ایکسایٹڈ..."
وہ مسکرا کر خوشی سے بولی تھی۔ اردل نے منہ بنا کر اسے دیکھا۔ اور دوبارہ سے اپنے سیل فون کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم لوگوں نے گاؤں جانے کی تیاری کرلی۔" ڈنر ٹیبل پہ کھانے کے لیے بیٹھتے ہوئے بابا نے جو پہلا سوال کیا' وہ یہ ہی تھا۔
"لیس بابا..." وہاں موجود تین لوگوں میں سے جواب صرف سسی نے دیا تھا۔ تب ہی بابا نے سوالیہ نگاہوں سے اردل اور اپنی بیوی رباب کی طرف دیکھا تھا۔ اردل تو خاموشی سے پوری طرح کھانے کی طرف متوجہ تھا' جبکہ رباب کچھ گڑبڑا سی گئی تھیں۔
"نہیں... دراصل... وہ شہباز..." وہ چند لمحے رک کر بولی تھیں۔ "اس ویک اینڈ پہ مائرہ کی منگنی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔ سو میں نہیں جاسکوں گی۔ یو نو عاصمہ میرے بغیر کچھ کرتی ہی نہیں۔ آپ جانتے تو ہیں... تو میں تو نہیں جاسکوں گی۔" چند ہی لمحوں میں ان کی ازلی خوداعتمادی لوٹ آئی تھی۔
"اور اردل! تم..." اب کے انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا تھا۔
"سوری بابا... اس ویک اینڈ پہ میرا اپنے کچھ فرینڈز کے ساتھ پلان ہے' میں نے ماما کو بتادیا تھا۔" وہ لاپروائی سے کہہ کر پھر سے کھانے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔
"حالانکہ میں نے تم لوگوں کو کافی پہلے سے بتادیا تھا کہ اماں مٹھی نے کتنی تاکید کی ہے ہم سب کو سوہائے کی شادی پہ آنے کی۔ اس کے باوجود تم لوگوں نے اپنے الگ الگ پلانز بنالیے۔"
اب وہ کھانا چھوڑ کر مکمل طور پر ان دونوں کی طرف متوجہ تھے۔
"بابا! یہ ہی تو میں اردل سے کہہ رہی ہوں کہ اتنے عرصے سے ہم گاؤں نہیں گئے۔ وہاں کتنا کچھ بدل گیا ہوگا۔ چلتے ہیں۔ مزہ آئے گا' مگر یہ مان ہی نہیں رہا۔" سسی کے دل میں یہ بھی خدشہ تھا کہ وہ کہیں وہاں جاکر بور نہ ہو۔ تب ہی چاہتی تھی کہ اردل بھی اس کے ساتھ جائے۔ مگر وہ مان ہی نہیں رہا تھا۔
"او پلیز سسٹر... کیا پاکستان بدل گیا ہے اتنے عرصے میں... وہ گاؤں بھی تو پاکستان کا ہی حصہ ہے۔ میں نہیں..."
"بہت بُری بات ہے اردل! دوبارہ تمہارے منہ سے یہ بات نہ سنوں۔" الفاظ ابھی اس کے منہ میں ہی تھے کہ بابا نے اسے بری طرح ٹوک دیا تھا۔ وہ کھسیا کر چپ ہو گیا تھا۔ ماما نے بھی اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تھا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ شہباز کو غصہ آجائے اور وہ زبردستی سب کو گاؤں جانے کا حکم دے دیں۔
"سوری بابا..." اردل خود بھی خائف سا ہوا تھا۔
"چھوڑیں شہباز... بچہ ہے... آپ کھانا کھائیں۔" رباب نے چاولوں کی ڈش اٹھا کر ان کی طرف بڑھائی تھی۔ جسے انہوں نے خاموشی سے تھام لیا تھا۔ "اور بلیو می! اگر بات مائرہ کی انگیجمنٹ کی نہ ہوتی تو میں ضرور آپ کے ساتھ جاتی۔ یو نو میرا بھی

بہت دل چاہ رہا تھا گاؤں جانے کا‘ مگر آپ جانتے ہیں نا کہ مائرہ میری کتنی لاڈلی ہے اور پھر سسی جا رہی ہے نا آپ کے ساتھ۔“

رباب نے میز پر دھرے ان کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھ کر ان کا غصہ ٹھنڈا کرنے کی کوشش کی تھی‘ اور ان کا غصہ ٹھنڈا ہو بھی گیا تھا۔ کیوں کہ بہرحال یہ ہی تو وہ لمس تھا جو انہیں اپنے گاؤں۔ اپنے ماں‘ باپ اور پھر اپنے وطن سے بھی دور لے گیا تھا اور بلاشبہ یہ لمس آج بھی اتنی ہی طاقت رکھتا تھا کہ ان کا غصہ ٹھنڈا کردے‘ بلکہ ان کا ارادہ ہی بدل دے۔ مگر اس بار وہ اپنا ارادہ نہ بدلنے کا سوچ چکے تھے۔

”او کے... ٹھیک ہے‘ آپ لوگوں کی مرضی۔ بہرحال میں اور سسی کل صبح نکل رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے تھوڑے دن لگ جائیں ہمیں۔ رباب! تم اردل کا خیال رکھنا۔“

اب وہ کھانا کھاتے ہوئے انہیں تاکید کر رہے تھے اور وہ مسکرا کر ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ سر سے جیسے ایک بوجھ سا اترا تھا۔

☆ ☆ ☆

گاؤں کے راستے آج بھی ویسے ہی تھے۔ کچے پکے ٹیڑھے میڑھے‘ اونچے نیچے۔ ان کے ڈرائیور کو گاڑی چلانے میں خاصی دشواری ہو رہی تھی۔ لیکن پھر بھی وہ مہارت سے ڈرائیو کر رہا تھا۔ گاؤں کی حد شروع ہوتے ہی شہباز نظامانی جانے کہاں سے کہاں تک کا سفر طے کر آئے تھے۔ بچپن‘ لڑکپن اور پھر جوانی تک‘ ان کی آنکھیں کب نم ہو گئی تھیں۔ انہیں پتا ہی نہیں چلا تھا۔

نئے اور پرانے طرز تعمیر سے بنی حویلی نے سسی کو بہت متاثر کیا تھا۔ ایسی حویلیاں اس نے اب تک صرف فلموں اور ڈراموں میں ہی دیکھی تھیں۔ بچپن میں شاید کبھی وہ یہاں آئی ہو۔ لیکن اپنے شعور میں وہ آج پہلی بار یہاں آئی تھی۔ حویلی کے بڑے سے پھاٹک کو ان کے استقبال کے لیے پورا ہی کھول دیا گیا تھا۔ آخر کو حویلی کا وارث اتنے عرصے بعد آیا تھا۔ چھوٹے بڑے گاؤں کے سب ہی لوگ ان کے استقبال کو موجود تھے اور ہر طرف سے۔

”سائیں پلی کری آیا۔“ ”سائیں پلی کری آیا۔“ کی آوازیں آ رہی تھیں۔ حویلی کے پھاٹک کے باہر ڈھول والے ڈھول بجا بجا کر اپنی خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔

شہباز گاڑی سے اتر آئے تھے اور اب خوشی خوشی سب کے سلام کا جواب دے رہے تھے۔ ان کی آنکھیں نم ہو رہی تھیں اور ان کا دل بھر آ رہا تھا۔ کتنے عرصے بعد وہ یوں اس طرح اپنوں کے بیچ آئے تھے۔ بے شک انہوں نے اپنی زندگی کا زیادہ عرصہ یہاں سے دور رہ کر گزارا تھا‘ لیکن ان کی روح ہمیشہ یہیں کہیں بستی تھی اور پھر ایک بھی لمحے کی تاخیر کیے بنا وہ اپنی ماں کے سینے میں سما گئے تھے۔ جن کی بوڑھی آنکھیں انہیں دیکھنے کو ترس گئی تھیں۔ بیٹے کے سینے سے لگی وہ ہنس بھی رہی تھی اور رو بھی رہی تھیں۔ مگر خوش تھیں بے انتہا‘ بے حساب خوش...

”منھنجی تی سئی منھنجی رانی سسی“ (میری بیٹی‘ میری رانی سسی)

اگلے ہی لمحے ان کی نگاہ بابا کے پہلو میں کھڑی سسی

پڑی تو انہوں نے اسے بھی سینے سے لگالیا تھا۔ اس کی پیشانی چومی تھی اور ڈھیروں دعائیں دی تھیں۔ سسی کو ان کے گلے سے لگ کر بہت اچھا لگا تھا۔ ایک عجیب سی خوشبو ان کے وجود سے اٹھ رہی تھی۔ سادگی اور خلوص کی خوشبو سے مزین۔۔۔ شہباز اب اماں بی بی سے مل رہے تھے۔ جو ان کی پھوپھو تھیں۔ سوہائے کی اماں جس کی شادی میں وہ یہاں شرکت کرنے آئے تھے۔

بابا کچھ دیر وہاں بیٹھنے کے بعد باہر اوطاق میں چلے گئے تھے۔ جہاں مہمان ان کا انتظار کر رہے تھے اور وہ اماں مٹھی کے ساتھ اندر چلی آئی تھی۔ جہاں اندر ہال میں شرمائی لجائی سی سوہائے اپنی سہیلیوں اور دیگر گاؤں کی عورتوں کے ساتھ موجود تھی۔ کچھ عورتیں درمیان میں ڈھولکی رکھے بیٹھی تھیں۔ یقیناً" ان کے آنے سے پہلے یہاں گیت گائے جا رہے تھے۔ وہ سوہائے سے ملنے کے بعد اماں مٹھی کے ساتھ وہیں بیٹھ گئی تھیں۔ سسی کو یہاں آکر بہت اچھا لگ رہا تھا۔

"اری گاؤں کی لڑکیوں۔۔۔ تم لوگ چپ کیوں ہو گئیں۔۔۔ گاؤ خوشی کے گیت گاؤ۔ آج مدتوں بعد تو اس حویلی میں خوشی آئی ہے۔"

اماں مٹھی نے وہیں ایک طرف رکھے اپنے نواڑی جھولے میں بیٹھتے ہوئے کہا۔ سسی کو بھی انہوں نے ساتھ ہی بٹھالیا تھا۔ بچپن کے بعد وہ اب کہیں جاکر اس طرح کے کسی بھی جھولے میں بیٹھی تھی اور اسے بہت اچھا لگ رہا تھا اماں مٹھی کے کہنے کی دیر تھی ان عورتوں نے پھر سے ڈھولک بجانا اور گانا شروع کردیا تھا۔

"لکھ لگا تیبی لاھندم۔"
(چاہے لاکھ لگ جائے تب بھی لگاؤں گی۔)
"ان سھٹی کی سمجھانندم۔"
(مگر اسے مناؤں گی۔)

وہ لوگ کوئی سندھی گیت گا رہی تھیں۔ جسے سن کر سب ہی بہت انجوائے کر رہی تھیں اور سوہائے تو باقاعدہ شرما رہی تھی اور سسی کی سمجھ میں ایک لفظ بھی نہیں آرہا تھا۔ وہ بس حیرانگی سے انہیں دیکھ رہی تھیں۔ جہاں اب چند عورتوں نے درمیان میں کھڑے ہوئے جھومر ڈالنا شروع کردیا تھا۔ (سندھ کا روایتی رقص اسے جھومر کہا جاتا ہے۔)

"ڈاگا منہڈ اکرائی۔"
(کوئی دھاگا یا تعویذ کرواکر)
"یا تہ کاشتی پڑھائی۔"
"یا کوئی چیز پڑھوا کر۔"
"پہنجی ھتن سان پیارندم۔"
(اپنے ہاتھوں سے پہناؤں گی۔)
"ان سھٹی کی معائندم۔"
(مگر اسے مناؤں گی۔)

"اماں مٹھی ۔۔۔ یہ کیا گا رہی ہیں؟"
بالآخر اس نے پوچھ ہی لیا تھا۔

"بی بی سائیں! یہ گیت لڑکی اپنے محبوب کے لیے گا رہی ہے۔ جو اس سے ناراض ہے۔ وہ کہہ رہی ہے کہ چاہے کچھ بھی کرنا پڑے' وہ ہر حال میں اسے منائے گی۔ چاہے لاکھ لگیں' چاہے جو ہو۔ کوئی تعویذ دھاگا کرواکر یا کوئی چیز پڑھوا کر میں اپنے ہاتھوں سے اسے پہناؤں گی' مگر ہر حال میں اسے مناؤں گی۔"

پاس کھڑی ایک لڑکی جو شاید اماں مٹھی کی خدمت گار تھی' اس نے سسی کو ٹوٹی پھوٹی اردو میں بتایا تھا۔ جسے سن کر سسی کی دلچسپی کچھ اور بڑھ گئی تھی۔ اسی لمحے اس لڑکی نے اماں مٹھی کے کان میں کچھ کہا تھا۔ جسے سن کر وہ اٹھ کر مردان خانے کی طرف گئی تھیں۔ جہاں میرو ان کا منتظر تھا۔ اسے اماں مٹھی سے کچھ ضروری بات کرنا تھی اور اتنی ساری خواتین میں وہ اندر آنا نہیں چاہتا تھا۔ سسی بھی چند لمحے انتظار کے بعد ان کے پیچھے چلی آئی تھی۔ اماں مٹھی میرو کے کاندھے پہ ہاتھ رکھے اسے کچھ بتا رہی تھیں اور وہ سعادت مندی سے ان کے آگے سر جھکائے کھڑا تھا۔

"تم میرو سے ملیں سسی؟" اماں مٹھی نے اسے اپنی

طرف آتے دیکھا تو اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"یہ میرو ہے' سوہائے کا بڑا بھائی' مطلب شاہ میر نظامانی' لیکن میں پیار سے اسے میرو بلاتی ہوں۔"

"او۔۔۔ نائس نیم۔۔۔ ہائے میرو!" اس نے حسب عادت اس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا۔

"السلام علیکم! کیسی ہیں آپ؟" میرو کی آنکھوں میں پل بھر کو حیرانگی ابھری تھی۔ لیکن اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ جی میں ٹھیک ہوں۔" اس نے کھسیا کر ہاتھ واپس کھینچ لیا تھا۔ سرسری سا اس سے بات چیت کے بعد وہ اماں مٹھی سے کچھ پوچھ کر واپس چلا گیا تھا اور سیاہ جوڑے میں ملبوس وہ میرو کی پشت کو دیکھتی رہ گئی تھی۔

"کتنا عجیب ہے روڈ۔" یہ اس کی پہلی سوچ تھی میرو کے متعلق۔

"چری۔۔۔ (پاگل) بھلا مردوں سے بھی کبھی عورتیں ہاتھ ملاتی ہیں۔" واپس آکر بیٹھتے ہوئے اماں مٹھی نے اسے سرزنش کرنا ضروری سمجھا تھا۔

"سو واٹ اماں مٹھی۔۔۔" اس نے جواب میں لاپروائی سے کندھے اچکا دیے تھے۔ اماں مٹھی اب اسے میرو کے متعلق بتا رہی تھیں کہ وہ کس طرح شہباز کی غیر موجودگی میں سب کچھ سنبھالتا ہے۔۔۔ اور ایک ایک پائی کا حساب آکر انہیں دیتا ہے اور یہ ہی سب باتیں وہ کئی دفعہ بابا سے بھی سن چکی تھی۔ مگر اسے نہ ان باتوں سے کوئی دلچسپی تھی اور نہ ہی میرو سے۔ سو وہ دوبارہ سے اس ہنگامے کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"گڈ مارننگ ایوری ون۔۔۔"

وہ صبح خاصا لیٹ اٹھی تھی۔ کیونکہ وہ رات کو بہت لیٹ سوئی تھی اور صبح جس وقت وہ ناشتے کے لیے آئی تقریباً سب ہی موجود تھے مگر ناشتا ختم کر چکے تھے۔

"گڈ مارننگ بیٹا۔ ٹھیک سے سوئیں رات کو۔" بابا نے پیار سے اسے دیکھا تھا۔ جانتے تھے اپنے کمرے اور بستر کے علاوہ اسے کہیں نیند نہیں آتی۔

"جی بابا۔۔۔ خاصی دیر اماں مٹھی کا سر کھانے کے بعد نیند آ ہی گئی تھی۔" اس نے مسکرا کر ٹیبل پہ نظریں گھمائیں۔ جہاں اس کے مطلب کی کوئی بھی چیز موجود نہیں تھی۔

"کیا کھائے گی میری ڈتی رانی۔" تب ہی اماں بی بی نے اس سے پوچھا تھا۔

وہ سوہائے اور میرو کی والدہ تھیں اور بچوں کو قرآن پاک کی تعلیم دیتی تھیں۔ اسی لیے تمام گاؤں کے لوگ انہیں اماں بی بی یا بی بی استاد کے نام سے پکارتے تھے اور سوہائے ان ہی بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی تھی۔

"کچھ لو نا بیٹا۔" بابا نے اس کی طرف آملیٹ کی پلیٹ بڑھائی تھی۔

"او نو بابا۔۔۔ یہ اتنا ہیوی میں نہیں کھا سکتی۔" اس نے ٹیبل پہ موجود خالص گھی میں بنے پراٹھے آملیٹ اور لسی کے جگ' مکھن اور ایسی ہی بہت ساری چیزوں کو دیکھ کر کہا تھا۔ وہ ناشتے میں صرف ایک بوائل ایگ یا ایپل اور ایک گلاس جوس لیتی تھی۔ بابا نے ملازمہ کو کہہ کر اس کا من پسند ناشتا منگوا لیا تھا اور وہاں موجود تمام لوگوں نے حیرت سے دیکھا تھا کہ ناشتا ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ کیونکہ وہاں تو سب اتنا ہی ہیوی ناشتا کرنے کے عادی تھے۔

"اماں مٹھی! ناشتے کے بعد میں واک کے لیے جاؤں گی۔ اس طرح گاؤں کا وزٹ بھی ہو جائے گا۔ ویسے بھی آج میری مارننگ واک اور ایکسرسائز دونوں مس ہو گئے ہیں۔"

وہ اپنی دھن میں مگن ناشتا کرتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"کہاں جاؤ گی ڈی (بیٹی)" انہوں نے حیرت سے پوچھا تھا۔ وہ کچھ سمجھی تھیں اور کچھ نہیں سمجھی تھیں۔

"بیٹا! حویلی کا اتنا بڑا گارڈن ہے۔ آپ جتنے دن یہاں ہو' وہیں واک کر لیا کرو' ایکسرسائز وغیرہ ابھی

رہنے دو، واپس جا کر کوئی جم وغیرہ جوائن کر لینا۔"
بابا نے اسے اپنے طریقے سے سمجھایا تھا۔ کیونکہ وہ اپنی بیٹی کو جانتے تھے۔ اس کا کچھ پتا نہیں تھا۔ کیا پتا کل کو نقل کھڑی ہوتی پورے گاؤں کا راؤنڈ لگانے۔
"کیوں بابا... یہاں کوئی جم یا پارک وغیرہ نہیں ہے کیا تو پھر یہاں کے لوگ خود کو فٹ کیسے رکھتے ہیں۔"
اس کے معصومیت سے کیے گئے سوال پر میرو اور سوہائے کو بڑے زور کی ہنسی آئی تھی۔ مگر وہ دبا گئے تھے کہ کہیں اسے برا نہ لگ جائے اور جواب میں بابا اسے بتانے لگے تھے کہ گاؤں کے لوگ اپنے آپ کو فٹ کیسے رکھتے ہیں اور کتنی مشکل زندگی گزارتے ہیں اور کتنا کام کرتے ہیں۔ محنت کرتے ہیں۔ وہ حیرت سے ان کی باتیں سن رہی تھیں۔ وہ پورا دن اسی طرح گزرا تھا۔ مسی کو یہاں آکر ذرا بھی بوریت محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ آج کافی دیر اس کی ماما اور اردل سے بھی بات ہوئی تھی۔ رات کو اماں مٹھی نے کھانے میں خاص طور پہ اس کے لیے سرسوں کا ساگ اور چاول کے آٹے کی روٹی بنوائی تھی۔ دیسی گھی اور مکھن کے ساتھ۔ بابا نے بہت شوق سے کھائی تھی۔ لیکن اسے دیکھ کر ہی کچھ ہو رہا تھا۔
"بابا... میں یہ سب نہیں کھا سکتی۔ میری ساری ڈائٹ کا ستیاناس ہو جائے گا۔"
اس نے یہ سب بابا سے انگلش میں کہا تھا' تاکہ وہاں کسی کو برا نہ لگے۔
"اوکے... تمہیں جو کھانا ہے بتا دو۔ بنا دیں گے یہ لوگ... پریشان مت ہو۔" وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ ساری زندگی امریکا میں گزارنے والے ان کے بچے ان چیزوں کو کھانا تو دور ان سے واقف بھی نہیں ہیں۔
"بابا... آئی نیڈ فروٹ سیلڈ۔" وہ کسی روٹھے ہوئے بچے کی طرح بیٹھی تھی۔
"بیٹا! تھوڑا سا کھا تو دیکھو۔ بہت اچھا بنا ہے۔ ذرا سا میرے ہاتھ سے۔" اماں مٹھی اب اسے بہلا کر کھلانا چاہ رہی تھیں کہ شاید اسے پسند آ جائے۔
"نہیں اماں مٹھی' مجھے نہیں کھانا... پلیز..."

اس نے ذرا سا چکھ کر پرے کر دیا تھا اور وہاں موجود میرو نے قدرے ناگواری سے اسے دیکھا تھا۔ اب مسی اٹھ کر کچن کی طرف چلی آئی تھی۔ تاکہ خود ہی کچھ کر سکے۔ بابا نے بھی اماں مٹھی کو اشارے سے روک دیا تھا کہ اسے جانے دیں' وہ خود ہی کچھ کھا لے گی۔ وہ کچن میں آئی تو اس وقت وہاں صرف سکھاں کھڑی تھی۔ وہ اماں مٹھی کی خاص خدمت گزار تھی۔
وہ لپک کر اس کے پاس آئی تھی۔
"حاضر سائیں... کچھ چاہیے۔" وہ ہاتھ باندھ کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی تھی۔
"بس ایک گلاس دودھ..." اس نے سکھاں سے کہہ کر مڑ کر پیچھے رکھا فریج کھول کر ایک سیب نکالا تھا۔
"حاضر سائیں۔"
سکھاں نے کاؤنٹر پر رکھی بڑی دیگچی میں سے ایک گلاس جتنا دودھ چھوٹے سوس پین میں نکالا اور اسے گرم کرنے کے لیے چولہے پہ رکھا تھا۔ ارادہ تھا کہ نیم گرم کر کے چھوٹی الائچی اور چینی ڈال کر چھوٹی سائیں کو دے گی۔
"اسے گرم مت کرو پلیز..." مسی نے اسے چولہا جلانے سے روک دیا تھا۔
"جو حکم سائیں۔" سکھاں نے ویسے ہی دودھ گلاس میں نکال دیا تھا۔
"سائیں! اس میں چینی نہ ڈالوں۔"
"نہیں... مجھے ایسے ہی پسند ہے۔" اس کا موڈ بری طرح آف ہو چکا تھا۔
"جیکو حکم سائن۔ پر سائین کی کو سوء مٹھو نہ ہجی تہ کیرو فائدو۔"
(جو حکم سائن' پر سائن دودھ گرم اور میٹھا نہ ہو تو کیا فائدہ)
سکھاں نے بڑی حیرت سے کہا تھا۔
"اف..." وہ نا سمجھی سے سر ہلا کر باہر آ گئی تھی۔ پر سکھاں کا جملہ اس کے ذہن میں اٹک کر رہ گیا تھا کہ اس نے کہا کیا تھا۔

"میرو! مٹھو" "واٹ مین بائی کو سوانیڈ مٹھو" اس نے پاس سے گزرتے میرو سے پوچھ لیا تھا۔ میرو نے پہلے تو اسے بڑی حیرت سے دیکھا تھا' پھر بڑی مشکل سے اپنی مسکراہٹ دبائی تھی۔

"گرم اور میٹھا۔" مسکراہٹ ابھی بھی کہیں ہونٹوں کے کونوں میں دبی تھی۔

"او کے تھینکس میرو۔" وہ دونوں چیزیں تھامے اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی تھی اور پیچھے میرو نے بمشکل اپنا قہقہہ روکتے ہوئے باہر کی طرف قدم بڑھا دیے تھے۔

☆ ☆ ☆

سوہائے کی شادی خیر خیریت سے ہو گئی تھی اور اس کے اگلے ہی دن بابا اپنے کچھ پرانے دوستوں اور رشتے داروں سے ملنے قریب کے گاؤں گئے تھے اور سسی سے کہہ گئے تھے کہ وہ جیسے ہی واپس آئیں گے تو شہر کے لیے نکل جائیں گے۔ سو وہ اپنی پیکنگ مکمل رکھے۔ لیکن اس وقت وہ بوریت کا شکار ہو رہی تھی۔ اماں مٹھی اپنی عبادت میں مصروف تھیں اور باقی کوئی اور تھا نہیں کہ جس سے وہ باتیں کرتی۔ کچھ دیر ٹی وی دیکھا۔ اردل اور ماما سے بات کی۔ یہ سب کرنے کے بعد وہ حویلی کے لان میں نکل آئی تھی۔ حویلی میں دو لان تھے۔ ایک آگے اور ایک پیچھے۔ آگے کے لان میں مختلف قسم کے پھول اور پھل لگے تھے جو بہت خوب صورت لگتے تھے۔ جبکہ پچھلا گارڈن کسی کھیت کا نقشہ پیش کرتا تھا۔ اس میں مختلف سبزیاں اور پتا نہیں کیا کیا اگایا گیا تھا اور اس سے کچھ آگے جا کر مویشیوں کا ایک باڑہ بھی تھا۔ جہاں گائے' بھینسیں' بکریاں اور مرغیاں وغیرہ تھیں اور ان سے حاصل ہونے والے دودھ اور انڈوں وغیرہ کو حویلی کی ضرورت کے مطابق رکھ کر روزانہ کی بنیاد پہ گاؤں والوں میں بانٹ دیا جاتا تھا۔ یوں ہی ٹہلتے ٹہلتے وہ گیٹ کی طرف آ گئی تھی۔ جہاں چوکیدار الرٹ کھڑا تھا۔ وہاں عموماً" گارڈز بھی موجود رہتے تھے' جو اس وقت وہاں موجود نہیں تھے۔

"بی بی سائیں... کچھ چاہیے۔" چوکیدار نے اسے باہر جاتے دیکھ کر کہا تھا۔

"نہیں کچھ نہیں' بس ویسے ہی میں ذرا گھومنا چاہ رہی تھی۔" اس نے باہر جانے کو قدم بڑھائے تھے۔

"مگر بی بی! آپ کو یہاں کے راستوں کا علم نہیں ہے۔ آپ کیسے جائیں گی؟؟"

چوکیدار کچھ تذبذب کا شکار تھا' لیکن وہ چوکیدار کو ان سنی کرتی باہر نکل آئی تھی اور چوکیدار وہیں رک گیا تھا' کیوں کہ اس وقت گیٹ پہ کوئی اور موجود نہیں تھا اور اسے یہاں سے ہلنے کی اجازت نہیں تھی۔ سو وہ مجبوراً" رک گیا تھا۔ سسی بے دھیانی میں کافی آگے نکل آئی تھی۔ وہ جب سے یہاں آئی تھی' پہلی دفعہ یہاں باہر نکلی تھی۔ سو اسے یہ سب بہت اچھا لگ رہا تھا۔ چھوٹے چھوٹے ایک قطار میں لگ بھگ ایک جیسے بنے گھر... اس نے یہ بات نوٹ کی تھی کہ یہاں کوئی بھی گھر کچا اور ٹوٹا پھوٹا نہیں تھا۔

صبح کا وقت تھا' سو اطراف میں تھوڑی خاموشی تھی' کیونکہ یہ وقت سب کے کام کا تھا۔ وہ چلتے چلتے کافی آگے نکل آئی تھی۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ کوئی اس کے پیچھے پیچھے چل رہا ہے مسلسل... وہ دو نوجوان لڑکے تھے۔ حلیے سے قدرے اوباش... اس کے مڑ کر دیکھنے پر وہ عجیب سے انداز میں مسکرائے تھے۔ وہ ذرا سا گھبرائی تھی' لیکن اگلے ہی لمحے اس نے اعتماد سے قدم آگے بڑھا دیے تھے۔ اب وہ اسی راستے پہ واپس جا رہی تھی جہاں سے آئی تھی۔ وہ دونوں لڑکے اسے واپس مڑتا دیکھ کر ذرا سا ہٹ کر کھڑے ہو گئے تھے اور اس کے ذرا آگے بڑھنے پر وہ پھر سے اس کے پیچھے ہو لیے تھے۔ چند لمحوں بعد سسی نے اپنی رفتار تیز کر دی تھی۔ مگر وہ اب بھی مسلسل اس کے پیچھے آ رہے تھے۔

تب ہی سسی کو احساس ہوا تھا کہ وہ گھبراہٹ اور بے دھیانی میں راستہ بھول چکی ہے۔ مگر وہ پھر بھی رکی نہیں' مسلسل چلتی رہی تھی۔ کیونکہ وہ اب بھی اس

کے پیچھے آرہے تھے اور سسی کو انہیں دور سے دیکھ کر ہی گھن سی آرہی تھی۔ کتنی ہی دیر چلتے رہنے کے بعد بھی اسے حویلی کے کوئی آثار نظر نہیں آئے تھے۔ وہ یقیناً" راستہ بھول چکی تھی۔

"یا اللہ... کوئی مجھے ڈھونڈنے ہی آجائے۔"

اس لمحے اس نے بہت شدت سے دعا کی تھی۔

اب وہ دونوں بدمعاش اس کے خاصے قریب آگئے تھے۔ اسی لمحے سامنے سے دھول اڑاتی ایک گاڑی اس کے قریب آن رکی۔ وہ دونوں اب گاڑی کو دیکھ کر بھاگنے کے چکر میں تھے۔ مگر گاڑی سے اترتے شاہ میر کو دیکھ کر وہیں رک گئے تھے۔ کیونکہ شاہ میر انہیں دیکھ چکا تھا۔

"تمہیں شرم نہیں آئی' حویلی کی مہمان پہ نظر ڈالتے ہوئے' بلکہ حویلی کی بیٹی پہ... تم باز آجاؤ اپنی حرکتوں سے۔ ورنہ اب کی بار بہت بری طرح پیش آؤں گا میں تمہارے ساتھ۔" شاہ میر نے انتہائی غصے میں کہتے ہوئے ان دونوں میں سے قدرے لمبے قد والے لڑکے کو گریبان سے پکڑ کر جھٹکا دیا تھا۔

"سائیں معاف کردو... غلطی ہوگئی' معلوم نہیں تھا کہ یہ کون ہیں۔" جواب میں دوسرے لڑکے نے شاہ میر سے معافی مانگی تھی۔

"تم دونوں رات کو مجھ سے اوطاق میں ملنا اور ہاں اپنے باپ کو بھی ساتھ لانا۔"

شاہ میر نے سسی کا خیال کرکے انہیں چھوڑ دیا تھا۔ ورنہ یہیں بیچ سڑک ان کی ایسی درگت بناتا کہ وہ دونوں یاد رکھتے۔

"حاضر سائیں..." وہ کھسیا کر وہاں سے بھاگ گئے تھے۔ تب ہی شاہ میر گاڑی کی طرف آیا تھا۔ سسی پہلے ہی گاڑی میں بیٹھ چکی تھی۔ "تمہیں منع کیا تھا نا... گاؤں میں اس طرح نکلنے سے اور وہ بھی اس حلیے میں۔" شاہ میر نے گاڑی میں بیٹھتے ہی ایک انتہائی غصیلی نگاہ ٹراؤزر' شرٹ اور گلے میں اسکارف ڈالے سسی پہ ڈالی تھی۔ جس کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ رہا تھا۔

"آئی ایم سوری... میں تو بس..."

"وہ تو شکر ہے کہ میں ادا شہباز کو وہاں چھوڑ کر حویلی آگیا تو چوکیدار نے مجھے بتایا۔ ورنہ پتا نہیں کیا ہو جاتا۔ جانتی ہو کتنا اوباش لڑکا ہے یہ۔ یہ تمہارا امریکا نہیں ہے بی بی' جہاں جب اور جہاں دل چاہے منہ اٹھا کر چل پڑو۔ یہ گاؤں ہے اور ابھی اتنا ترقی یافتہ نہیں ہوا۔" وہ بنا اس کی شکل دیکھے بس اپنا غصہ اتار رہا تھا۔ وہ سر جھکائے خاموشی سے سن رہی تھی۔ غلطی اس کی تھی۔ مگر اسے پتا نہیں تھا کہ یہ سب ہو جائے گا۔

"اماں مٹھی بھی پریشان ہو رہی ہوں گی۔ یقیناً" تم انہیں بھی بتا کر نہیں آئی ہوگی۔"

ایک بار پھر شاہ میر نے اسے جھڑک کر اس کے چہرے کی طرف دیکھا تھا۔ سسی نے نفی میں سر ہلا کر بس ایک نظر اسے دیکھا تھا۔ اس کی آنکھیں بس چھلکنے کو تیار تھیں۔ یک دم ہی شاہ میر کو احساس ہوا تھا کہ وہ کچھ زیادہ ہی سخت ہو گیا ہے۔

"مجھے کیا پتا تھا میرو! کہ وہ لڑکے اس طرح میرے پیچھے لگ جائیں گے۔ میں گھر پہ بور ہو رہی تھی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا جو مجھ سے بات کرتا یا گھمانے لے جاتا۔ اسی لیے میں باہر نکل آئی اور پھر کنفیوژن میں راستہ بھول گئی۔" وہ معصومیت سے اپنی غلطی تسلیم کر رہی تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے' لیکن آئندہ خیال رکھنا۔" شاہ میر نے گاڑی حویلی کے سامنے لاکر روکی تھی۔

"میرو... اماں مٹھی کو مت بتانا پلیز' وہ پریشان ہوں گی اور بابا کو بھی... وہ ناراض ہوں گے مجھ سے۔" وہ اترنے سے پہلے اس سے کہہ رہی تھی۔

"ہوں... اچھا نہیں بتاؤں گا۔ پر تم یہ مجھے میرو کیوں بلاتی ہو سسی۔ اتنا بڑا ہوں میں تم سے۔" شاہ میر نے جیسے اس کا ذہن بٹانا چاہا تھا۔

"سو واٹ! لگتے تو نہیں ہو نا اور مجھے اچھا لگتا ہے۔ تمہیں میرو بلانا۔ میرو بائی دا وے تھینکس۔"

اس کا دھیان بٹ گیا تھا۔ وہ اپنی ازلی پریوں سی مسکراہٹ سے بولی تھی اور شرارت سے اسے ہاتھ

ہلا کر اندر چلی آئی تھی اور شاہ میر نے گاڑی واپس موڑ لی تھی، کیونکہ اسے کہیں جانا تھا۔ لیکن اگلے دن اس نے سسی کو گھمانے کا ارادہ کر لیا تھا۔

☼ ☼ ☼

"تم لوگ تھوڑے دن اور رک جاتے بیٹا! ابھی تو میں نے تمہیں جی بھر کر دیکھا بھی نہیں ہے۔"

ابھی تھوڑی دیر میں انہیں شہر کے لیے نکلنا تھا اور اماں مٹھی پریشان ہو رہی تھیں کہ جانے اب ان لوگوں سے دوبارہ کب ملاقات ہو۔ اس وقت سب ہی وہاں موجود تھے۔

"پھر آجائیں گے نا اماں مٹھی، آپ پریشان کیوں ہو رہی ہیں۔" سسی نے مزید ان سے لپٹتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں میری ڑی (بیٹی) ضرور کیوں نہیں۔ مگر اس بار آؤ تو اپنی ماں اور اردل کو بھی ضرور لے کر آنا۔ عرصہ گزر گیا ان سے ملے ہوئے اور اردل تو کتنا بڑا ہو گیا ہو گا۔" اس بار اردل سے نہ ملنے کا انہیں افسوس تھا، لیکن سسی نے یہاں آکر ان کا دل خوش کر دیا تھا۔

"اماں مٹھی! میں چاہتا ہوں اب آپ میرے پاس آکر رہیں۔ میرے ساتھ، میرے بچوں کے ساتھ۔"

بابا نے جاتے وقت ان کے دونوں ہاتھ محبت سے تھام لیے تھے۔ اتنے عرصے بعد ماں سے ملے تھے۔ اب ان کا دل انہیں چھوڑ کر جانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔

"نہ ابا نہ... میں بھلا... اپنے گھر کو... اپنے لوگوں کو چھوڑ کر وہاں کیسے جا سکتی ہوں۔ کبھی نہیں پت (بیٹا) اب تو بس یہیں اسی مٹی میں دفن ہونا ہے۔ تم بس جہاں رہو، سدا خوش رہو۔ آباد رہو۔ بس کبھی کبھار مجھ سے ملنے آجایا کرو۔ میرے لیے وہی کافی ہے۔" ان کی بوڑھی آنکھیں بے ساختہ نمکین پانیوں سے بھر گئی تھیں۔

"جیسے آپ کی خوشی اماں مٹھی۔"

بابا نے ان کے سر پہ بوسہ دے کر انہیں خود سے لگا لیا تھا۔ اماں مٹھی نے انہیں ڈھیروں تحفے اور سوغاتیں دے کر گاؤں سے رخصت کیا تھا۔ جاتے سمے وہ چند لمحوں کو میرو کے پاس رکی تھی۔

"بائے میرو... اپنا خیال رکھنا۔ تم سے مل کر اچھا لگا اور کل کے لیے **تھینکس**۔ کل تم نے مجھے بہت انجوائے کروایا اور اس دن کے لیے بھی **تھینکس** کہ تم نے میرے کہنے پہ وہ بات اماں مٹھی کو نہیں بتائی۔"

"کوئی بات نہیں، ایک میزبان ہونے کے ناتے یہ میرا فرض تھا۔ اور ہر بات انہیں بتانے کی نہیں ہوتی۔ اس میں شکریہ کی کوئی بات نہیں۔" وہ ذرا سا مسکرایا تھا۔

"اور ہاں..." وہ جاتے جاتے پلٹی تھی۔ میرو بے ساختہ اس کی طرف متوجہ ہوا تھا۔

"میں تمہیں ہمیشہ میرو ہی کہوں گی، کیونکہ تمہاری پرسنالٹی پہ یہ ادا سائیں اور بھائی ٹائپ چیزیں سوٹ نہیں کرتیں۔" وہ شرارت سے مسکرا کر کہتی۔ آنکھوں پہ گاگلز چڑھاتی گاڑی میں بیٹھ گئی تھی اور میرو مسکرا کر اس شرارتی سی لڑکی کو دیکھ کر رہ گیا تھا۔ جس میں زندگی کا ہر احساس موجود تھا۔

"کیا لڑکیاں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ زندگی سے بھرپور... رنگوں سے بھی زیادہ روشن۔"

وہ سر جھٹک کر اماں مٹھی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ جو قدرے آب دیدہ نظر آ رہی تھیں اور اماں مٹھی اسے خود سے بڑھ کر عزیز تھیں۔ وہ انہیں ذرا بھی پریشان نہیں دیکھ سکتا تھا۔

☼ ☼ ☼

"اف ماما! میں آپ کو کیا بتاؤں۔ وہاں کتنا مزہ آیا۔ کتنا انجوائے کیا ہم نے۔" سسی جب سے وہاں سے واپس آئی تھی۔ اس کی باتیں ہی ختم نہیں ہو رہی تھیں۔ گاؤں ایسا... وہاں کے لوگ ایسے... وہاں یہ دیکھا۔ وہاں فلاں سے ملاقات ہوئی۔ اماں مٹھی یہ... اماں مٹھی وہ... میرو نے یہ دکھایا وہ کہا اور نہ جانے کیا کیا۔

وہ لوگ جب گھر پہنچے تو تقریباً" شام ہونے والی تھی

اور گھر پہ عاصمہ آنٹی فیملی سمیت موجود تھیں۔ وہ رباب کی خالہ زاد بہن تھیں اور ایک ہی کالونی میں گھر ہونے کی وجہ سے ان کا ایک دوسرے کی طرف کافی آنا جانا تھا اور بچوں کی بھی آپس میں کافی دوستی تھی۔ ان کے چار بچے تھے۔ دو بیٹیاں اور دو بیٹے۔ بڑی بیٹی آئزہ شادی شدہ تھی اور ملک سے باہر رہتی تھی۔ پھر عمر تھا' جو سسی کی یونی ورسٹی سے ہی بزنس ایڈمنسٹریشن پڑھ رہا تھا اور مائرہ جس کی حال ہی میں منگنی ہوئی تھی اور وہ بہت اترائی اترائی پھر رہی تھی۔ وہ سسی کی ہی ہم عمر تھی۔ لیکن پڑھائی کو خیر باد کہہ چکی تھی۔ کیونکہ اسے پڑھائی کے علاوہ ہر چیز میں دلچسپی تھی اور پھر آخر میں حماد تھا' جو اردل کا ہم عمر اور بہت اچھا دوست بھی تھا۔

اسی طرح رباب اور عاصمہ کی بھی آپس میں کافی گاڑھی چھنتی تھی۔ وہ عموماً" ہر ایکٹیویٹی میں ساتھ ہی پائی جاتی تھیں اور اس وقت بھی علاوہ بابا کے وہاں موجود سب ہی لوگ سسی کی باتوں کو نہایت بوریت سے سن رہے تھے۔ جبکہ وہ لاپروائی سے بولے جا رہی تھی۔ البتہ عمر اس کی بات کو کافی دلچسپی سے سن رہا تھا۔ کیونکہ در حقیقت اُسے سسی میں دلچسپی تھی۔ سوائے سسی کی ہر بات ہی دلچسپ لگتی تھی۔ وہ سب کو اپنے وہ تحفے دکھا رہی تھی جو اماں مٹھی نے حویلی سے آتے وقت اسے دیے تھے۔ جس میں ماما اور اردل کے تحائف بھی شامل تھے۔ جسے ان دونوں نے صرف دیکھ کر ہی رکھ دیا تھا۔ جبکہ سسی انتہائی دیدہ زیب ڈیزائن میں ایملک ورک سے سجا دلکش سوٹ مائرہ کو دکھا رہی تھی۔ جو اماں مٹھی نے اسے خاص طور سے بنوا کر دیا تھا۔ اسے دیکھ کر عاصمہ اور مائرہ دونوں کی ہی آنکھوں میں ستائش ابھر آئی تھی۔ مگر انہوں نے ظاہر نہ کیا تھا۔

"او کم آن سسی بے بی۔ لیواٹ پلیز۔ یہ سب بعد میں دیکھ لینا۔ جاؤ جا کر ملازمہ سے کہو ٹیبل لگائے۔ ڈنر کا ٹائم ہو گیا ہے۔" رباب نے شہباز کے وہاں سے اٹھتے ہی اسے ٹوکا تھا۔ وہ کوئی فون سننے ڈرائنگ روم سے باہر اٹھ کر گئے تھے۔

"او کے ملا۔" وہ اپنی چیزیں سمیٹ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"رباب! آئندہ سسی کو گاؤں نہ جانے دینا۔ دیکھو تو گاؤں والوں کے سے انداز اپنا کر آگئی ہے وہاں سے۔" عاصمہ نے نخوت سے ناک سکوڑی تھی۔ حالانکہ اندر ہی اندر وہ اتنی سوغاتیں اور تحائف دیکھ کر جز بز ہو رہی تھیں۔ مگر ظاہر نہ کیا تھا۔

"ہوں۔ میں بھی یہ ہی سوچ رہی ہوں۔" رباب نے باہر جاتی سسی پہ ایک نگاہ ڈال کر کہا تھا۔

☼ ☼ ☼

"شہباز۔ مجھے آپ سے ایک بات کرنی ہے۔" رباب نے رات کو بڑی فرصت سے بیٹھ کر کتاب پڑھتے شہباز سے کہا تھا۔ جو بڑی محویت سے مطالعے میں مصروف تھے۔

"ہاں بولو۔" انہوں نے نگاہیں ہٹائے بغیر کہا تھا۔

"شہباز پلیز آپ میری بات سنیں۔" رباب نے شیشے میں نظر آتے ان کے عکس کو دیکھ کر بڑی لگاوٹ سے کہا تھا۔

"میں کانوں سے سنتا ہوں مائی ڈیر وائف۔" انہوں نے مسکراتے ہوئے کہا اور کتاب بند کر دی تھی۔ مطلب پوری طرح ان کی طرف متوجہ ہونے کا اشارہ تھا۔

"وہ دراصل شہباز۔ عاصمہ نے مجھ سے سسی کے بارے میں کچھ بات کی ہے۔"

"کیا بات؟" انہوں نے پوری توجہ سے ہاتھوں پہ لوشن ملتی رباب کو سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"دراصل۔ اس نے سسی کے لیے عمر کا پروپوزل دیا ہے۔ وہ کہہ رہی تھی کہ اگر ہم اجازت دیں تو وہ لوگ باقاعدہ پروپوزل لے کر آنا چاہتے ہیں۔" رباب نے ان کے چہرے کی طرف بہت غور سے دیکھا تھا۔ انہیں ڈر تھا کہ کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔

"عمر اچھا لڑکا ہے اور سب سے بڑھ کر عمر اور سسی کی بہت اچھی فرینڈشپ ہے اور اگر رشتے داری سے

ہٹ کر بھی دیکھا جائے تو یہ ہر لحاظ سے ایک بہترین پروپوزل ہے شہباز۔۔۔ آپ کا کیا خیال ہے۔" انہوں نے لمحہ بھر کو رک کر انہیں دیکھا تھا۔

"ہوں۔۔۔ کہہ تو تم ٹھیک رہی ہو۔ عمر اچھا لڑکا ہے۔ فیوچر بھی برائٹ ہے اس کا۔ تم ایسا کرو سسی سے پوچھ لو۔ کوئی بھی فیصلہ کرنے سے پہلے اس کی مرضی جاننا اہم ہے۔ کیونکہ زندگی تو اس نے گزارنی ہے نا' دیکھو وہ کیا کہتی ہے' پھر کچھ ڈیسائیڈ کرتے ہیں۔ پھر میں اماں مٹھی سے بھی بات کروں گا۔" انہوں نے اپنی بات کہہ کر پھر سے کتاب کھول لی تھی۔

"اماں مٹھی کیوں۔۔۔" رباب فوراً" ہی چوکنا ہو گئی تھیں۔ کیوں کہ اس سلسلے میں جلدی کرنے کی وجہ بھی یہ ہی تھی کہ رباب کو ڈر تھا کہ اماں مٹھی' شہباز کو کوئی الٹی سیدھی پٹی نہ پڑھا دیں اور وہ اپنے بچوں کو ہرگز بھی اس گاؤں کے ماحول کا حصہ نہیں بنانا چاہتی تھیں۔ اردل تو جلد ہی باہر چلا جاتا' پڑھنے کے لیے اور باقی سسی کی عمر سے شادی کرنے کا بھی یہ ہی مقصد تھا کہ عمر کا بھی مستقبل میں ملک سے باہر منتقل ہونے کا ارادہ تھا۔ اس طرح ان کے دونوں بچوں کی جان چھوٹ جاتی اور پھر رہ گئے شہباز تو وہ بے شک ساری زندگی اب گاؤں میں ہی رہ لیں' انہیں کوئی اعتراض نہیں تھا۔

"کیوں کیا میں اپنی بیٹی کی شادی کرنے سے پہلے اپنی ماں سے مشورہ بھی نہیں کر سکتا؟"

انہوں نے خاصی برہمی سے رباب کو دیکھا تھا۔

رباب لاکھ اچھی سہی' وہ بہت اچھی ماں تھیں۔ بہت محبوب بیوی تھیں۔ لیکن شہباز کو ان سے آج بھی صرف ایک ہی گلہ تھا کہ انہوں نے ان کو اپنوں سے دور کر دیا تھا اور کبھی بھی ان کی ماں کو وہ عزت اور مان نہیں دیا تھا جو رباب کا فرض اور ان کی ماں کا حق تھا اور ان سے کبھی بھی بنا کر نہیں رکھی تھی۔ حالانکہ وہ بہت بے ضرر اور پرخلوص خاتون تھی اور رباب کو ہمیشہ انہوں نے دل سے قبول کیا تھا۔

"نہیں۔۔۔ نہیں شہباز! میرا بالکل بھی وہ مطلب نہیں تھا۔ میں کل ہی سسی سے بات کروں گی۔ پھر جیسے آپ چاہیں گے ویسے ہی ہو گا۔" وہ کچھ گڑبڑا کر بولی تھیں کہ مبادا" انہیں برا لگ جائے اور بنا بنایا کام بگڑ جائے۔

☼ ☼ ☼

"السلام علیکم۔۔۔ اماں مٹھی!" میرو نے ان کے کمرے کے دروازے میں کھڑے ہو کر انہیں اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ جو تسبیح ہاتھ میں تھامے جانے کس سوچ میں گم بیٹھی تھیں۔

"وعلیکم السلام۔۔۔ آؤ آؤ میرو پت (بیٹا)" وہ چونک کر سیدھی ہو گئی تھیں۔ میرو ہاتھ میں کچھ فائلز تھامے اندر چلا آیا تھا اور ذرا دور رکھی کرسی کھینچ کر ان کے پلنگ کے پاس بیٹھ گیا تھا۔

"کیا بات ہے اماں مٹھی' کیا سوچ رہی ہیں۔ طبیعت ٹھیک ہے۔" اس نے کمرے میں داخل ہوتے ہی ان کی خاموشی کو محسوس کر لیا تھا۔

"ہاں پت ٹھیک ہوں۔ تم پریشان نہ ہو۔ بس شہباز کے بارے میں سوچ رہی تھی۔"

انہیں ہمیشہ اپنی ہر پریشانی میرو سے بانٹنے کی عادت تھی' سو اب بھی وہ اس سے چھپا نہیں پائی تھیں۔

"ہاں میں بھی آپ سے یہ ہی پوچھنا چاہ رہا تھا کہ وہ آج خیریت سے آئے تھے اور پھر جلدی چلے بھی گئے۔ مجھ سے تو ان کی ملاقات بھی نہیں ہو پائی۔" میرو نے پلنگ پہ رکھی فائل کے صفحے پلٹتے ہوئے کہا تھا۔

"ہاں بیٹا! خیریت سے آیا تھا۔ چند دن پہلے میں نے تم سے ذکر کیا تھا نا کہ وہ سسی کا رشتہ کرنا چاہ رہا ہے۔ اس نے مجھ سے بات کی تھی۔ بس اسی سلسلے میں آیا تھا۔ اس اتوار کو سسی کی منگنی ہے۔ ہم سب کو جانا ہے۔"

"اچھا۔۔۔ تو یہ تو بہت خوشی کی بات ہے۔ تو پھر آپ اتنی اداس کیوں ہیں۔" میرو نے محبت سے ان کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔ واقعی اکلوتی پوتی کی منگنی پر انہیں جتنا خوش نظر آنا چاہیے تھا۔ وہ اتنی نظر نہیں

آرہی تھیں۔

"ارے نہیں ابا! میں خوش کیوں نہیں ہوں گی بھلا۔ مگر بس میں ہمیشہ سے ہی سسی کے بارے میں کچھ اور ہی سوچتی تھی۔ مگر خیر جو اللہ کو منظور..... وہ اس کے ماں باپ ہیں۔ اس کے لیے کوئی غلط تھوڑی ہی سوچیں گے۔"

"ہاں بالکل... اب آپ اداس نہ ہوں۔ کیونکہ آپ اداس بالکل اچھی نہیں لگتی ہیں۔ اچھا آپ یہ دیکھیں، مجھے آپ کو کچھ بتانا ہے۔"

میرو نے ان کا دھیان بٹانا چاہا تھا۔ کیوں کہ وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ سسی کے بارے میں ہمیشہ سے کیا سوچتی تھیں اور کیا چاہتی ہیں۔ مگر میرو جانتا تھا کہ ایسا کبھی ہو ہی نہیں سکتا ہے۔ کہاں سسی اور کہاں شاہ میر۔ زمین آسمان کا فرق تھا دونوں میں۔ مگر اماں مٹھی یہ بات نہیں سمجھتی تھیں اور شاید اس وقت وہ ان کا دھیان بٹانے میں کامیاب ہو چکا تھا' مگر یہ صرف اس کی سوچ تھی۔ کیونکہ اماں مٹھی کی نگاہیں اس کے چہرے پہ بھٹکتی ہوئی اس وقت کچھ اور ہی سوچ رہی تھیں۔

☆ ☆ ☆

منگنی کا اہتمام "شہباز ولا" کے بڑے سے لان میں ہی کیا گیا تھا۔ شہباز خود جا کر اماں مٹھی سمیت سب کو گاؤں سے لے کر آئے تھے۔ اماں مٹھی بھی بالآخر اپنے دل کو سمجھانے میں کامیاب ہو گئی تھیں۔ مگر برسوں کی خواہش سے اتنی جلدی دست برداری ذرا مشکل تھی۔ لیکن وہ بیٹے کی خوشی میں راضی تھیں کہ آخر اس کی اکلوتی بیٹی کی منگنی تھی۔ یہاں آکر ان کا بہت اچھا استقبال ہوا تھا۔ رباب بھی بہت اچھے سے ملی تھیں اور اردل بھی کافی دیر تک ان کے پاس بیٹھا رہا تھا۔ البتہ عاصمہ نے انہیں دیکھ کر ناک بھوں ضرور چڑھائی تھی۔ لیکن خاموش رہی تھیں کہ بالآخر وہ شہباز کی والدہ تھیں اور وہ اس موقع پر کسی بھی قسم کی بدمزگی نہیں چاہتی تھیں۔ منگنی کے فنکشن میں زیادہ تر فیملی کے ہی لوگ تھے باہر کے لوگوں کو بہت کم انوائیٹ کیا گیا تھا۔ پھولوں اور روشنیوں سے سجا شہباز ولا بہت خوب صورت لگ رہا تھا۔ خوب صورت ملبوسات میں سجے سنورے لوگ بہت خوشی سے اس ماحول کا حصہ بنے ہوئے تھے۔ ڈارک اور لائٹ پنک کلر کے خوب صورت اسٹائلش سوٹ میں جہاں سسی بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ وہیں بلیک ٹو پیس میں عمر بھی کم ہینڈسم نہیں لگ رہا تھا۔

منگنی کی یہ تقریب ان دونوں کے اعزاز میں ان کی خوشی سے منعقد کی گئی تھی اور یہ ہی خوشی اس لمحے ان دونوں کے چہروں پہ ستاروں کی مانند دمک رہی تھی۔ ایک دوسرے کو انگوٹھی پہناتے ہوئے پسندیدگی کے رنگوں سے سجے ان دونوں کے چہرے بہت حسین لگ رہے تھے اور یہ ہی خوشی اور اطمینان اس لمحے رباب اور شہباز کے چہروں پہ بیٹی کو خوش دیکھ کر تھا۔

"اماں مٹھی! عمر کیسا لگا آپ کو؟" تقریب ختم ہوئی تو شہباز ماں کے پاس آکر بیٹھے تھے۔

"ہاں اچھا لڑکا ہے۔ پڑھا لکھا اور سمجھ دار۔" سامنے سے رباب کو آتے دیکھ کر وہ خاموش ہوئی تھیں۔ وگرنہ شاید کچھ اور بھی کہنے کا ارادہ رکھتی تھیں۔ مگر وہ نہیں چاہتی تھیں کہ رباب اپنے دل میں ان کی طرف سے کچھ بھی غلط خیال کرے۔ یا وہ یہ سمجھے کہ وہ اس منگنی سے خوش نہیں ہیں۔ اس لیے وہ خاموش ہی رہی تھیں۔ رباب بھی وہیں آبیٹھی تھیں اور پھر وہ دونوں ان سے تقریب کے متعلق اور پھر ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے تھے۔

☆ ☆ ☆

یہ سسی کی منگنی کا دوسرا دن تھا۔ جب رات میں کھانے کے بعد وہ چہل قدمی کرتی ہوئی انیکسی کی طرف آنکلی تھی۔ جہاں شاہ میر ٹھہرا ہوا تھا۔ جبکہ باقی سارے لوگ اندر گھر میں ہی ٹھہرے ہوئے تھے۔ انیکسی کی لائٹ جل رہی تھی اور ٹیرس بھی روشن تھا۔ وہ دھیمے دھیمے قدم اٹھاتی وہیں چلی آئی تھی۔ جہاں شاہ

میر چائے کا مگ تھامے ٹیرس میں کھڑا تھا۔

"کیسے ہو میرو؟" وہ مسکراتی ہوئی اس کے قریب چلی آئی تھی۔

"شاہ میر۔ لڑکی تمہیں کتنی دفعہ کہنا پڑے گا۔ اتنا بڑا ہوں میں تم سے۔" اس نے بھی مسکرا کر جواباً اسے ڈانٹا تھا۔

وہ کھلکھلا کر ہنسی تھی۔ کل کے بعد سے جیسے مسکراہٹ اس کے چہرے سے روشنی کی مانند پھوٹ رہی تھی۔

"سوواٹ... مجھے یہ ہی کہنا اچھا لگتا ہے۔"

شاہ میر کو اس لمحے اس کا وجود روشنیوں اور مسکراہٹوں میں گھرا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اتنی ہی خوش تھی۔ اس سے کسی کو بھی کچھ پوچھنے یا کہنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ چند لمحے تک وہ شاہ میر سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی تھی۔ اس کے بعد اس کے سیل پہ کوئی ٹیکسٹ آیا تھا۔ جسے پڑھ کر اس کی آنکھوں میں چمک سی ابھری تھی۔ ایسی بھرپور چمک جس نے چند لمحوں کے لیے شاہ میر کو پوری طرح اپنے حصار میں لے لیا تھا۔

"میں چلتی ہوں میرو! عمر میرا انتظار کر رہا ہے۔" وہ جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"مگر اس وقت..." وہ بھی ساتھ ہی اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

"اس وقت مطلب...؟ اس وقت صرف رات کے ساڑھے دس بجے ہیں۔ ہمارا لانگ ڈرائیو کا پلان ہے۔ ایک ڈیڑھ گھنٹے میں واپس آجائیں گے۔" وہ مسکرا کر سیڑھیوں کی طرف بڑھی تھی۔

"لیکن سسی! اس وقت باہر نکلنا ٹھیک نہیں ہے اور پھر آج کل کے حالات بھی خراب ہیں اور یوں ادا شہباز کی اجازت کے بغیر..."

"کچھ نہیں ہوتا مائی ڈیر میرو... پھر عمر ہے نا ساتھ اور میں نے ماما کو ٹیکسٹ کر دیا ہے' وہ بابا کو بتا دیں گی۔ چلتی ہوں اب... اللہ حافظ۔"

وہ مسکرا کر وہاں سے چلی گئی تھی اور شاہ میر تب تک وہیں کھڑا رہا تھا۔ جب تک کہ گیٹ کے باہر رکی گاڑی چلی نہیں گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

ان ہی گزرتے دنوں میں عمر نے اپنی ایجوکیشن مکمل کر لی تھی اور اپنے بابا کا بزنس سنبھال لیا تھا۔ وہ ماسٹرز کے لیے بیرون ملک جانے کی خواہش رکھتا تھا اور تیاری بھی کر رہا تھا۔

سسی کا یہ فائنل ایر تھا اور اس کے امتحانات کے بعد ان دونوں کی شادی طے تھی۔ اس دن عمر کا برتھ ڈے تھا۔ جسے سیلبریٹ کرنے وہ سب فرینڈز نکلے ہوئے تھے۔ کچھ دیر گھومنے پھرنے کے بعد وہ سب ڈنر کے لیے چلے آئے تھے۔ جہاں ایک پرتکلف ڈنر کا اہتمام عمر نے اپنے سب فرینڈز کے لیے کیا تھا۔ ہنسی مذاق ہلا گلا کے بہت اچھے ماحول میں ان سب نے ڈنر کیا تھا۔ پھر سب دوست عمر سے مل کر اسے وش کر کے اور گفٹ وغیرہ دے کر ایک ایک کر کے چلے گئے تھے۔

اب وہاں صرف عمر اور سسی رہ گئے تھے۔

وائٹ کلر کے بے انتہا خوب صورت اور اسٹائلش ڈریس میں سسی اس لمحے عمر کے دل میں اتری جا رہی تھی اور عمر کی آنکھوں کی بڑھتی چمک اور مسکراہٹ سسی کو کنفیوز کر رہی تھی۔

"کیا سوچ رہے ہو عمر..." سسی نے اس کی بولتی نگاہوں سے گھبرا کر کہا تھا۔

"سوچ رہا ہوں۔ تمہارا فائنل ایر کب پورا ہو گا۔" اس کی ذو معنی بات نے سسی کو سن کر دیا تھا۔ اس سے کوئی جواب نہیں بن پڑا تھا۔ عمر کے لبوں میں دبی مسکراہٹ بہت کھل کر سامنے آئی تھی۔

"میرا خیال ہے اب ہمیں چلنا چاہیے۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔" تب ہی سسی کی نظر گھڑی پہ پڑی تو اسے یک دم ہی دیر ہو جانے کا احساس ہوا تھا۔ گھڑی میں اس وقت تقریباً رات کے بارہ بجنے والے تھے اور اسے پورا یقین تھا کہ ماما سے تو نہیں مگر آج اسے بابا سے ضرور ڈانٹ پڑنے والی تھی۔

سسی کو بہت ناگواری سے دیکھا تھا۔
"کیا ہوا ہے سسی، تم ٹھیک ہو؟" اس نے انجان بن کر پوچھا تھا اور سسی کو بازو سے پکڑ کر اپنی طرف کیا تھا۔
شاہ میر نے ایک تیز نگاہ اس پہ ڈالی تھی۔ کیسا غیر ذمہ دار شخص تھا وہ کہ رات کے اس پہر لڑکی کو یہاں اکیلا چھوڑ کر خود اندر چلا گیا تھا۔ جانتے بوجھتے کہ کچھ بھی ہو سکتا ہے اور سسی سسکتے ہوئے اسے پوری بات بتانے لگی تھی۔
"جب آپ کوئی ذمہ داری اٹھا لیتے ہیں تو اسے ہر حالت میں نبھانا بھی آپ کا فرض بن جاتا ہے۔ امید کرتا ہوں آئندہ کیسے بھی حالات ہوں، تم کبھی سسی کو اکیلا نہیں چھوڑو گے۔ اب تم اسے لے کر فوراً گھر جاؤ اور ہاں آئندہ اتنی رات گئے تم سسی کو لے کر باہر نہیں جاؤ گے اور اسے اکیلا تو بالکل نہیں چھوڑو گے۔ سمجھ گئے ہو نا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔ ورنہ مجھے ادا شہباز سے بات کرنا پڑے گی۔"
شاہ میر کے سخت لہجے نے عمر کو ایک لفظ کہنے نہیں دیا تھا اور چونکہ غلطی بھی اس کی تھی تو وہ کچھ بھی نہیں کہہ پایا تھا۔
"اور آپ.... آپ کیسے گھر جائیں گے۔" گاڑی میں بیٹھتے ہوئے یک دم ہی سسی کو خیال آیا تھا کہ شاہ میر اپنی گاڑی تو ان لوگوں کو دے چکا ہے تو وہ رات کے اس پہر کس طرح جائے گا۔
"میری فکر مت کرو، میں چلا جاؤں گا، تم جاؤ آرام سے...."
"آپ کا بہت شکریہ.... میں آئندہ خیال رکھوں گا۔" سسی کو تسلی دیتے ہوئے شاہ میر کو عمر نے دھیمے سے کہا تھا کہ مبادا وہ انکل سے کچھ کہہ دے اور انکل کے غصے سے وہ ویسے بھی خائف رہتا تھا اور وہ یہ بھی جانتا تھا کہ شاہ میر انکل کے کتنے قریب ہے اور وہ شاہ میر پہ آنکھ بند کر کے یقین کرتے ہیں۔
"ہوں.... مجھے یہی امید ہے۔"
اور شاہ میر ان دونوں کے گاڑی میں بیٹھ کر جانے تک وہیں کھڑا رہا تھا۔

☼ ☼ ☼

اپنے کمرے میں ٹہلتے ہوئے شاہ میر کا دماغ کچھ دیر پہلے ہونے والے واقعہ کو سوچ سوچ کر پھٹ رہا تھا۔ وہ ابھی کچھ دیر پہلے ہی گھر پہنچا تھا اور اس بات کی تسلی کر کے کمرے میں آیا تھا کہ سسی گھر آ چکی ہے اور اب اس کا دماغ مسلسل ایک ہی بات سوچے جا رہا تھا کہ اگر وہ وقت پہ نہ پہنچتا اور کچھ ہو جاتا تو.... ایک تو اتنی رات گئے تک سسی کا عمر کے ساتھ رہنا.... گھومنا پھرنا.... اسے کچھ خاص اچھا نہیں لگتا تھا۔ لیکن اس معاملے میں وہ بے بس تھا۔ کچھ کہہ نہیں سکتا تھا۔ لیکن حالات کے پیش نظر وہ ایسے ہی کسی واقعے سے ڈرتا تھا اور اب بات ایسی تھی کہ وہ ادا شہباز کو بھی نہیں بتا سکتا تھا۔ جانتا تھا کہ وہ غصے کے کس قدر تیز ہیں اور پھر بچوں کے معاملے میں وہ بعض دفعہ.... بعض معاملات میں کچھ زیادہ ہی سخت ہو جاتے تھے۔ اگر وہ ان کو یہ بات بتاتا تو ان کا غصہ لازمی تھا۔ وہ عمر کو ریسٹورنٹ کے دروازے میں دیکھ چکا تھا، اگر وہ یہ بات بتاتا تو شاید شہباز انکل اس کو بنیاد بنا کر رشتہ بھی ختم کر سکتے تھے۔ لیکن سسی عمر کو چاہتی ہے۔ یہ رشتہ ختم ہوا تو اسے بہت دکھ ہو گا اور وہ اس رنگوں بھری لڑکی کو دکھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ لیکن وہ حقیقتاً بہت پریشان ہو چکا تھا۔

☼ ☼ ☼

کتنے ہی دنوں سے سسی اور عمر کی ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ اس واقعے کے بعد سسی بہت اپ سیٹ تھی۔ اس رات کے بارے میں سوچ کر وہ اب بھی بہت پریشان ہو جاتی تھی کہ اگر شاہ میر وہاں نہ آتا تو.... یہ سوچ ہی اسے لرزا دیتی تھی۔ وہ سستی سے لاؤنج میں بیٹھی تھی۔ بابا آفس جا چکے تھے۔ ارول شاید اپنے کمرے میں سو رہا تھا۔ اس کے سامنے رکھا کافی کا مگ کب کا ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ اس پہ جمی تہہ اس بات کا پتا دے رہی تھی۔ ٹی وی بنا آواز کے چل رہا تھا اور وہ جانے کن سوچوں میں گم تھی۔ تب ہی ملاا اپنے کمرے سے

تیار ہو کے نکلی تھیں۔ شاید وہ کہیں جارہی تھیں۔ نک سک سے تیار رباب آج بھی بے پناہ خوب صورت تھیں۔ ہوتے ہیں نا کچھ لوگ ایسے کہ جن پہ گزرتا وقت ذرا بھی اثر نہیں ڈالتا۔ وہ سدا بہار سے لگتے ہیں اور رباب بھی ان ہی لوگوں میں سے تھیں۔

"کیا بات ہے۔ ڈارلنگ یہاں کیوں بیٹھی ہو۔" سسی کو وہاں خاموش بیٹھا دیکھا تو اس کے پاس چلی آئی تھیں۔

"طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟" رباب نے محبت سے اس کا چہرہ چھوا تھا۔ باپ کے نین نقش چرائے اور ماں کا ملیح روپ خود میں سموئے سسی انہیں اور شہباز دونوں کو ہی بے پناہ عزیز تھی۔

"ٹھیک ہوں ماما... آپ کہیں جارہی ہیں۔" سسی نے مسکرا کر ایک نظر ماں کو دیکھا تھا۔

"ہاں... عاصمہ کے ساتھ جیولر کے پاس جارہی ہوں۔ تم بھی ساتھ چلو۔" رباب نے ایک نگاہ اس کے تھکے سے چہرے پہ ڈالی تھی۔

"نہیں ماما... آپ جائیں۔" سسی ان سے کہہ کر اپنے بجتے ہوئے سیل کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ جہاں عمر کی کال آرہی تھی۔ ماما نے اسکرین پہ عمر کالنگ دیکھا تو اسے اپنا خیال رکھنے کی تاکید کرکے باہر کی طرف بڑھ گئی تھیں۔ چند لمحے سوچنے کے بعد اس نے عمر کی کال پک کرلی تھی۔ جانے کیوں اتنے دنوں سے اس کا عمر سے بات کرنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اسے لگا کہ اس رات جو کچھ میرو نے کیا۔ وہ سب عمر کو کرنا چاہیے تھا۔

"کیسی ہو تم... کہاں ہو اتنے دن سے۔" اس کی آواز سنتے ہی وہ بے قراری سے بولا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں..." وہ دھیمے سے بولی تھی۔

اس رات کا منظر جیسے آنکھوں کے سامنے کسی فلم کی طرح چلنے لگا تھا۔ چند ہی لمحوں میں عمر نے اس کی بے رخی کو محسوس کرلیا تھا۔

"تم ابھی تک ناراض ہو؟" عمر کے پوچھنے پر دوسری طرف خاموشی چھاگئی تھی۔

"سسی!"... اس کی گمبھیر آواز ایرپیس میں ابھری تھی۔

"تو کیا نہیں ہونا چاہیے۔"

"آئی ایم سوری اکین... میں سچ میں بہت شرمندہ ہوں۔ مجھے واقعی اس رات تمہیں ریسٹورنٹ کے باہر اکیلا نہیں چھوڑنا چاہیے تھا۔ پر مجھے اندازہ نہیں تھا کہ یہ سب ہوجائے گا۔ انکل آنٹی نے کچھ کہا کیا؟" اسے درحقیقت آنٹی سے زیادہ شہباز انکل کی فکر تھی۔

"انہیں پتا نہیں ہے۔" وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔

"تھینک گاڈ... تمہیں پتا ہے' میں کتنا ڈر گیا تھا۔"

"تم سے زیادہ میں ڈر گئی تھی عمر! ابھی بھی یہ سوچ کر ڈر جاتی ہوں کہ اگر وہاں شاہ میر نہ آتا تو... اور اس تو کے آگے میں ابھی بھی ڈر رہی ہوں اور تم صرف ماما اور بابا کے ری ایکشن سے پریشان ہو۔ تمہیں مجھ سے کوئی کنسرن نہیں ہے۔ میں نے اس وقت کیا سوچا اور ابھی کیا سوچ رہی ہوں۔ وہاں اس وقت جو کچھ شاہ میر نے کیا وہ سب تمہیں کرنا چاہیے تھا۔ میں تمہارے ساتھ وہاں تھی۔ شاہ میر کے ساتھ نہیں اور کیا اندر جاکے چابی لانے میں اتنا ٹائم لگ جاتا ہے۔"

بالآخر وہ آج پھٹ پڑی تھی۔ اسے یہ سوچ بھی شرمندگی کررہی تھی کہ شاہ میر عمر کے بارے میں کیا سوچتا ہوگا کہ وہ کس قدر غیر ذمہ دار انسان ہے۔

"یار! میں تمہیں کیسے سمجھاؤں... چابی مینیجر کے پاس تھی۔ اس لیے تھوڑا ٹائم لگ گیا۔ ورنہ تم خود سوچو میں تمہیں وہاں اکیلا کیسے چھوڑ سکتا تھا۔"

عمر نے پھر سے اسے سمجھانا چاہا تھا۔ اب وہ اسے یہ تو نہیں کہہ سکتا تھا کہ اسے اپنی برانڈ نیو گاڑی کی فکر منگیتر سے زیادہ پڑگئی تھی۔ جو اس نے ایک ہفتہ پہلے ہی شوروم سے نکلوائی تھی اور یہ بھی کہ وہ ان مسلح افراد سے ڈر گیا تھا۔

"او کے... اب معاف کردو' آئندہ ایسا کبھی کچھ نہیں ہوگا۔" وہ سسی کی خاموشی سے گھبرا کر بولا تھا۔

جواب میں ایک گہری سانس عمر نے سنی تھی۔ جس کا مطلب تھا کہ وہ اب عمر کی بات سننے کے لیے تیار ہے۔

"اور جہاں تک بات ہے شاہ میر کی' تو وہ ٹھہرا گاؤں کا بندہ' ان جیسے لوگوں کے لیے تو یہ ڈاکو وغیرہ روٹین کی باتیں ہیں یار۔۔۔ گاؤں میں تو ایسی باتیں ہوتی رہتی ہیں۔"

عمر کے لہجے میں شاہ میر کے لیے کچھ ایسا تھا جو سسی کو ناگوار گزرا تھا۔

"ایسی بات نہیں عمر۔ شاہ میر ایسا نہیں ہے اور نہ ہی وہاں ہمارے گاؤں میں ایسا کچھ ہوتا ہے اور ایک بندہ وہاں میرے لیے اپنی گاڑی ۔۔۔ بنا کسی تردد انہیں دے دیتا ہے' تاکہ وہ مجھے کوئی نقصان نہ پہنچائیں اور ان کے بارے میں اس طرح کہہ رہے ہو۔"

"او کے بابا۔۔۔ اب ہم کوئی اور بات کریں۔ کھانا آئندہ نہیں ہوگا۔ اب کیا جان لوگی۔"

عمر کو سسی کا یہ شاہ میر نامہ خاصا ناگوار گزر رہا تھا۔ وہ مسلسل شاہ میر کو اس پہ اہمیت دے رہی تھی اور عمر کو اپنی غلطی ہونے کے باوجود یہ سب برا لگ رہا تھا۔ حالانکہ وہ جانتا تھا کہ شاہ میر ساری حقیقت سے واقف ہے۔ اسی لیے اس نے باتوں کا رخ دوسری طرف موڑ دیا تھا اور بہر حال وہ لفظوں کا جادوگر تھا اور سسی اس کے گمبھیر لہجے اور لفظوں کی اسیر اور مرد اگر اچھے لفظ بولنا جانتا ہو تو عورت کو جیت ہی لیتا ہے اور خاص کر وہ مرد جو آپ کا ہونے والا شریک سفر ہو تو وہ لفظ آپ کے اردگرد مستقبل کا حصار بننے لگتے ہیں۔ ایک خوب صورت من چاہا مستقبل۔۔۔ محبت کے لفظوں سے بھرا۔۔۔

☆ ☆ ☆

"کیا سوچ رہی ہیں' اماں مٹھی۔" میرو جب حویلی کے بڑے سے صحن کو عبور کرکے اندر آیا تو وہیں برآمدے میں رکھے تخت پہ بیٹھی اماں مٹھی جانے کس سوچ میں مگن تھیں کہ انہیں شاہ میر کے آنے کی خبر ہی نہیں ہوئی تھی' جو نہایت خاموشی سے ان کے پاس آبیٹھا تھا اور جب ان کے پاؤں پہ ہاتھ رکھ کر انہیں مخاطب کیا تھا تو وہ چونک کر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھیں۔

"کچھ نہیں پتر (بیٹا) بس ایسے ہی۔۔۔" وہ اس کے سر پہ پیار دے کر سیدھی ہو کر بیٹھی تھیں۔

"کچھ تو ہے' کیا ہوا ہے؟ مجھے بتائیں۔" شاہ میر نے پھر سے ان سے پوچھا تھا' کیونکہ ان کے چہرے کی خاموشی اسے بتا رہی تھی کہ کوئی بات ہے' جو انہیں اداس کر رہی ہے۔

"شہباز کا فون آیا تھا۔ اس نے سسی کی شادی کی تاریخ طے کر دی ہے۔"

بالآخر انہوں نے شاہ میر کو بتایا تھا۔

"اچھا۔۔۔ یہ تو بہت خوشی کی بات ہے' کب ہے شادی؟" شاہ میر کے ذہن میں ایک لمحے کو عمر کی صورت لہرائی تھی۔ اس رات کے بعد سے وہ اپنے دل میں عمر کے لیے کچھ خاص جذبات نہیں رکھتا تھا۔ لیکن یہاں بات اس کی پسند ناپسند کی نہ تھی۔ اماں مٹھی اب اسے ادا شہباز سے ہونے والی گفتگو کے بارے میں بتانے لگی تھیں اور شاہ میر بہت غور اور ادب سے ان کی بات سن رہا تھا۔

"اچھا ٹھیک ہے' تو اب آپ مجھے یہ بتائیں کہ آپ کیوں پریشان ہیں۔" شاہ میر نے محبت سے ان کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

"پتر۔۔۔ میں یہ چاہتی ہوں کہ سسی کی رخصتی یہاں اس حویلی سے ہو۔ بیاہ کر تو اس نے وہیں شہر میں ہی رہنا ہے۔ تو کیا ہی اچھا ہو کہ وہ باپ' دادا کے آبائی گھر سے رخصت ہو' پر یہ بات سسی اور اس کی ماں دونوں کو ہی پسند نہیں آئی۔" بالآخر انہوں نے اپنے دل کی بات اسے بتا ہی دی تھی۔

"تو ٹھیک ہے نا اماں مٹھی' اس میں برائی کیا ہے۔ اگر وہ لوگ نہیں چاہتے تو نہ سہی۔ آپ کیوں اپنا دل خراب کرتی ہیں اور پھر ان کے بہت سارے مہمان وغیرہ ہوں گے۔ انہیں یہاں مسئلے ہو سکتے ہیں۔"

"اور یقیناً" شاہ میر جانتا تھا کہ انہیں کیسے سمجھانا ہے

اور اس نے انہیں اپنے طریقے سے سمجھا بھی لیا تھا۔
تب ہی اماں مٹھی کی نظر شاہ میر کے عقب میں کھڑی چھوٹی سی بچی پہ پڑی تھی۔ جو سر تاپا اجرک میں لپٹی سہمی سی شاہ میر کے پیچھے کھڑی تھی۔

"میروابا... یہ چھوکری کون ہے۔"

اماں مٹھی کے پوچھنے پر شاہ میر نے بے ساختہ پلٹ کر دیکھا تھا۔ وہ حقیقتاً" باتوں میں لگ کر اس بے چاری بچی کو بھول چکا تھا۔

"اماں مٹھی یہ سونھ ہے۔ اکبر کی چھوٹی بہن... اب یہ یہیں رہے گی' آپ کے پاس..."

"کیوں کیا ہوا ہے ابا... خیر تہ آھی... (خیر تو ہے)
انہوں نے بچی کو اپنے پاس ہی بٹھا لیا تھا۔

"وہی اماں مٹھی اس کے بھائی کے مسئلے... لیکن اس بار تو اس نے حد ہی کر دی ہے۔ اس معصوم سی بچی کو جوئے میں ہار آیا تھا اور جھوٹ یہ بول رہا تھا کہ اس نے اس ساٹھ سالہ بوڑھے سے قرض لیا ہے۔ جو وہ واپس نہیں کر سکتا۔ اس لیے اپنی بہن کا رشتہ اس سے طے کر دیا ہے۔ وہ تو شکر ہے کہ اس کی ماں کو کہیں سے خبر مل گئی اور وہ اسے میرے پاس لے آئی۔ میں نے اس آدمی کو اس کے پیسے دے دیے ہیں اور اس کو اس کے ماں باپ کی مرضی سے یہاں لے آیا ہوں۔ اب یہ یہیں رہے گی۔"

شاہ میر کی رگوں میں اکبر کا ذکر کرتے ہوئے پھر سے غصہ عود آیا تھا۔ وہ گاؤں کا اوباش ترین لڑکا تھا اور سب کی لاکھ کوششوں کے باوجود بھی وہ اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتا تھا۔

"تم نے بہت اچھا کیا میرو پت! جو اسے یہاں لے آئے۔ اللہ سائیں تمہیں اس کا اجر دے گا۔"

شاہ میر کے عمل سے انہیں سچ میں خوشی پہنچی تھی۔ انہوں نے سکھاں کو آواز دے کر سونھ کو اس کے حوالے کیا تھا' تاکہ وہ بچی کو کچھ کھلا پلا دے۔
سکھاں بچی کو اپنے ساتھ لے گئی تھی۔

"اماں مٹھی اسکول تو یہ جاتی ہے۔ یہاں رہ کر اماں بی بی سے دینی تعلیم بھی حاصل کر لے گی اور آپ کا دل بھی بہلا رہے گا۔"

"ارے ہاں اسکول سے یاد آیا ابا... تم جو یہاں کالج بنوا رہے تھے۔ وہ مکمل ہو گیا۔" انہیں اچانک ہی یاد آیا تھا۔

"جی اماں مٹھی آپ کی دعاؤں سے وہ بھی مکمل ہو گیا ہے اور جلد ہی اس کا افتتاح ہو جائے گا۔"

شاہ میر نے گاؤں کے لیے بہت سے ترقیاتی کام کیے تھے۔ پینے کا صاف پانی... پکی اور کشادہ سڑکیں... ہاسپٹل... لڑکے لڑکیوں کے الگ الگ اسکول' اور اب یہ لڑکیوں کے لیے الگ سے کالج بھی بن گیا تھا۔ اس نے حقیقتاً" گاؤں کو ایک چھوٹے سے شہر کی شکل دے دی تھی اور اماں مٹھی اور اداشہباز اس سے بہت خوش تھے۔ اس نے سچ میں بزرگوں کا نام روشن کیا تھا۔ ورنہ شہباز تو کب سے سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر شہر جا بسے تھے' اور وہیں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ اماں مٹھی اس سے بہت خوش تھیں۔ ان کی دعائیں اور خوشی شاہ میر کو کئی سال پیچھے لے گئی تھی۔ جب وہ اپنی ماں اور بہن کے ساتھ اس حویلی میں آیا تھا۔ اماں بی بی یعنی شاہ میر کی والدہ... اماں مٹھی کی بھانجی تھیں۔ ان کی شادی ان کے والد کے رشتے داروں میں ہوئی تھی۔ وہ گاؤں کے روایتی سوچ کے حامل لوگ تھے۔ جو انسانوں سے زیادہ دولت جائیداد کو اہمیت دیتے تھے۔ شاہ میر بارہ سال کا تھا جب اس کے والد خاندانی دشمنی کی نذر ہوئے۔ جائیداد کی خاطر ان کے سوتیلے بھائیوں نے انہیں موت کے گھاٹ اتار دیا اور ان کے بیوی بچوں کو دھکے دے کر گھر سے نکال دیا تھا۔ ماں باپ کے مرنے کے بعد اماں بی بی کا اور کوئی ٹھکانہ نہیں تھا۔ وہ کہاں جائیں۔ ایسے میں جب اماں مٹھی تک خبر پہنچی تو وہ انہیں ان کے بچوں سمیت حویلی لے آئیں اور اپنے پروں میں سمیٹ لیا۔

بارہ سالہ شاہ میر اور آٹھ سالہ سوہائے... کتنے ہی دن حویلی کے در و دیوار سے سہمے سہمے سے پھرتے تھے۔ مگر جلد ہی اماں مٹھی کے پیار نے انہیں اپنا گرویدہ بنا دیا اور آج تک وہ انہیں اسی طرح اپنے پروں میں سمیٹے

بیٹھی تھیں۔ ادا شہباز ان دنوں شہر کے کالج میں پڑھ رہے تھے۔ انہیں صرف اپنے ماں باپ سے بے پناہ محبت تھی۔ باقی انہیں گاؤں یا ان زمینوں' جاگیروں سے کچھ خاص دلچسپی نہیں تھی۔ یوں کچھ عرصے بعد یہ ذمہ داری خود بخود شاہ میر کے کاندھوں پہ آن پڑی اور پھر ادا شہباز کے والد کے انتقال کے بعد تو اس نے بخوبی سارا بوجھ اٹھالیا تھا اور آج تک امانتاً" اٹھائے ہوئے تھا اور اماں مٹھی اور ادا شہباز بھی اس پہ اندھا اعتماد کرتے تھے اور وہ بھی ہمیشہ ان کے اعتماد پہ پورا اترا تھا۔

☆ ☆ ☆

سسی اور عمر کی شادی کیا طے ہوئی' جیسے ہر طرف ہنگامے جاگ اٹھے۔ اردل جو کچھ عرصے پہلے پڑھنے کے لیے باہر جاچکا تھا۔ خاص طور پر بہن کی شادی میں شرکت کے لیے آیا تھا۔ شہباز' اماں مٹھی کو بے حد اصرار کے بعد ایک ہفتہ پہلے ہی لے آئے تھے اور وہ بھی اپنے بچوں کی خوشی کی خاطر سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر "شہباز ولا" چلی آئی تھیں۔ شہباز کو ان کی خواہش پہ کوئی اعتراض نہیں تھا کہ سسی کی رخصتی حویلی سے ہو' لیکن چونکہ رباب اور خود سسی بھی ایسا نہیں چاہتی تھی۔ سو انہوں نے اماں مٹھی سے معذرت کرلی تھی۔ جس پر وہ ان سے بے حد شرمندہ بھی تھے۔ کیونکہ انہیں احساس تھا کہ وہ کبھی بھی اپنے ماں باپ کی خواہشوں پہ پورے نہیں اترے تھے۔ جس پر گزرتے وقت کے ساتھ ساتھ ان کی شرمندگی بڑھتی جارہی تھی۔ لیکن اماں مٹھی ماں تھیں اور ماں کا تو خمیر ہی محبت سے گندھا ہے تو بھلا وہ کیسے اکلوتے لاڈلے بیٹے کو شرمندہ دیکھ سکتی تھیں۔ سو خوشی سے ان کے ساتھ چلی آئی تھیں اور ویسے بھی سسی ان کی لاڈلی پوتی تھی اور ہر ماں کی طرح وہ بھی اپنے بچوں کی خوشی میں خوش تھیں۔

شاہ میر کو البتہ باقی لوگوں کے ساتھ شادی سے ایک دن پہلے آنا تھا۔ لیکن ادا شہباز کی مدد کے لیے اس کا تقریباً" ہر دوسرے دن ہی یہاں کا چکر لگ رہا تھا۔ کیونکہ اردل ابھی چھوٹا تھا اور قدرے لاپروا بھی۔ اس پہ ابھی اتنی ذمہ داری نہیں ڈالی جاسکتی تھی۔ سو شاہ میر ہی ان کی مدد کررہا تھا' اور شہباز کو شاہ میر پہ بھروسا بھی بہت تھا۔ کیوں کہ ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی کی شادی تھی اور وہ اس میں کوئی کسر' کوئی کمی نہیں چھوڑنا چاہتے تھے۔

☆ ☆ ☆

نکاح کا انتظام گھر میں کیا گیا تھا۔ کیونکہ اماں مٹھی ہال میں جانے سے انکاری تھیں اور نکاح میں ان کی شرکت لازمی تھی۔ سو شہباز نے نکاح کا انتظام گھر میں ہی کرلیا تھا۔ نکاح کے بعد ان لوگوں کو ہال میں جانا تھا۔ جہاں باقی کی رسومات اور رخصتی ہونا تھی۔ رباب نے ناگواری سے ہی سہی' لیکن ان کی بات مان لی تھی۔

بیوٹیشن سسی کو تیار کرکے جاچکی تھی۔ نکاح کے لیے اس نے سفید لباس کا انتخاب کیا تھا۔ خوب صورت شفاف دیدہ زیب لباس' دیدہ زیب کام سے مزین۔ جس کا بھاری دوپٹا سرخ رنگ میں تھا اور سہاگ کی تمام علامتیں اپنے اندر سموئے ہوئے تھا۔ خوب صورت اور بھاری زیورات میں سسی کی چھب ہی نرالی تھی۔ بے شک دیکھنے والوں نے دیکھا اور سننے والوں نے سنا کہ اتنی خوب صورت اور پاکیزہ دلہن انہوں نے آج سے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ جس کی آنکھوں سے روشنی پھوٹ رہی تھی اور جس کا تبسم پرنور تھا اور کیوں نہ ہوتا وہ نکاح جیسے پاک بندھن میں بندھنے جارہی تھی۔

"شاہ میر۔ سب تیاری مکمل ہے نا' وہ لوگ بس راستے میں ہیں۔" پاس سے گزرتے شاہ میر کو ادا شہباز نے روکا تھا۔

"جی ادا۔۔۔ سب مکمل ہے۔ آپ بالکل فکر نہ کریں۔" شاہ میر نے انہیں تسلی دی تھی۔ وہ مطمئن سے آگے بڑھ گئے تھے۔ پھر تھوڑی ہی دیر میں عمر اپنے والدین اور چند اور لوگوں کے ساتھ آن پہنچا تھا۔

اس لمحے شہباز اور رباب دونوں کی آنکھیں بے

ساختہ ہی بھر آئی تھیں۔ مولوی صاحب نکاح شروع ہی کرنے والے تھے کہ عاصمہ نے انہیں روک دیا تھا اور عمر یا کسی نے بھی انہیں حیرت سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی کچھ پوچھا تھا۔۔۔ گویا وہ سب لوگ پہلے سے جانتے تھے کچھ۔۔۔ تیار تھے اس بات کے لیے۔۔۔ پتا تھا کہ وہ کیا کرنے جا رہی ہیں۔

"بھائی صاحب! مجھے آپ سے کچھ ضروری بات کرنی ہے۔" وہ شہباز کے پاس آکر رکی تھیں۔ شہباز نے اس لمحے بہت حیرانی سے انہیں دیکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

"شاہ میر۔۔۔ کیا تم ابھی اور اسی وقت میری بیٹی سے نکاح کرو گے۔" ادا شہباز کے لفظوں نے جیسے اس لمحے اسے سر سے پاؤں تک ہلا دیا تھا۔ وہ پتھر کا بن گیا تھا۔ بالکل ساکت۔۔۔ غیر متوقع باتیں انسان کو اسی طرح پتھر کا بنا دیتی ہیں۔

"یہ آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں شہباز۔۔۔ ایسا کیسے ہو سکتا ہے۔" رباب کے تو ہوش ہی اڑ گئے تھے ان کی بات سن کر۔ یہ بھلا کیسے ممکن تھا۔

"شاہ میر۔۔۔ میں تم سے پوچھ رہا ہوں' کیا تم سسی سے نکاح کرنے کو تیار ہو۔ جواب دو مجھے؟" انہوں نے بیوی کو قطعی نظر انداز کر کے پھر سے شاہ میر سے پوچھا تھا۔

اس وقت کمرے میں صرف وہ تینوں ہی موجود تھے۔ شاہ میر ابھی تک بت بنا کھڑا تھا۔ گویا کسی نے اس کی گویائی سلب کر لی ہو۔

"اس کا مطلب ہے تم بھی مجھے اس لمحے تنہا کر رہے ہو۔ شاہ میر۔۔۔ میری محبتوں کا یہ صلہ دیا ہے شاہ میر۔۔۔ کیا میں تم پہ اتنا حق بھی نہیں رکھتا کہ تم سے کچھ مانگ سکوں۔"

"مگر ادا! آپ بتائیں تو سہی کہ ہوا کیا ہے۔ ایسی کیا بات ہوئی ہے۔" شاہ میر بے ساختہ ان کے قریب آ کھڑا ہوا تھا۔ وہ بھلا انہیں پریشان کیسے دیکھ سکتا تھا۔

"شہباز! آپ مجھے بتائیں' آخر ہوا کیا ہے' عاصمہ نے آپ کو آخر ایسا کیا کہہ دیا ہے۔" رباب کے چہرے پہ ہوائیاں سی اڑ رہی تھیں۔ وہ اس لمحے ازحد پریشان تھیں۔

"وہ چاہتی ہیں کہ یہ نکاح اس صورت میں ہو گا کہ اگر میں یہ گھر اور جائیداد عمر کے نام کر دوں۔۔۔ اور گاؤں والی حویلی بھی جس پر آج تک کبھی میں نے اپنا حق سمجھا ہی نہیں۔ دوسری صورت میں وہ لوگ یہ نکاح نہیں کریں گے اور ان سب میں عمر کی مرضی بھی شامل ہے۔ مجھے ان کی نیت پہ شک تو پہلے ہی تھا' لیکن آج معلوم ہوا کہ وہ کس قدر لالچی لوگ ہیں۔ میں ایسے لوگوں میں اپنی بیٹی نہیں دے سکتا رباب۔۔۔ اور اب اس وقت میرے پاس کوئی اور آپشن نہیں ہے۔ سوائے اس کے کہ میں سسی کا نکاح عمر کے بجائے شاہ میر سے کر دوں۔"

وہ بات کرتے کرتے جیسے تھک کر بیٹھے تھے اور سر کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا تھا۔ وہ ان لالچی لوگوں کی شرط مان کر اپنے ہاتھ پاؤں نہیں کٹوا سکتے تھے اور سسی ان کی اکلوتی اولاد نہیں تھی۔ ان کا ایک بیٹا بھی تھا اور وہ اردل کے ساتھ کسی بھی قسم کی کوئی زیادتی یا ناانصافی کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ ایسے میں اس وقت ان کے پاس شاہ میر سے بہتر اور کوئی آپشن نہیں تھا۔ انہیں پورا یقین تھا کہ شاہ میر اس لمحے میں ان کا مان ضرور رکھے گا۔

شاہ میر ابھی تک ماؤف دماغ کے ساتھ وہیں کھڑا تھا۔ اسے قطعی سمجھ نہیں آرہا تھا کہ وہ انہیں کیا جواب دے۔

"شہباز۔۔۔ یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔۔۔ میں آپ کو ایسا کبھی نہیں کرنے دوں گی۔ میں آپ کو اپنی بیٹی کی زندگی برباد نہیں کرنے دوں گی۔ اس کی شادی عمر سے ہی ہو گی۔ میں نے کہہ دیا ہے۔ لوگ کیا کہیں گے کہ ہم نے دولت جائیداد کی خاطر اپنی بیٹی کی زندگی خراب کر دی۔"

"بس بہت ہو گیا ہے رباب۔۔۔ اب تم خاموش رہو۔ سسی جتنی تمہاری بیٹی ہے' اتنی ہی میری بھی

ہے۔ ایک فیصلہ تم نے کیا تھا اس کے لیے' ایک اب میں کر رہا ہوں۔ میں نے اتنے سالوں کی محنت سے جو سب کچھ بنایا ہے' وہ اس لیے کہ میں ان لالچی لوگوں پر لٹا دوں۔ ویسے بھی تم میری مرضی کے خلاف کافی انہیں دے چکی ہو۔ اب اور نہیں۔"

اس سے پہلے کہ رباب کچھ بولتیں' اسی لمحے اماں مٹھی کمرے میں داخل ہوئی تھیں۔ وہ کافی دیر سے مہمانوں کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں' مگر وہ دونوں وہاں سے غائب تھے اور شاہ میر بھی کہیں نظر نہیں آرہا تھا۔ کافی دیر دیکھنے کے بعد وہ اٹھ کر شہباز کے کمرے کی طرف چلی آئی تھیں۔ جہاں سے تیز تیز بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"شہباز... پٹ خیرتی آھی نا۔"

(شہباز... بیٹے خیر تو ہے نا۔) وہ گھبرا گئی تھیں کہ وہاں انہیں عمر اور اس کے گھر والوں کے تیور بھی ٹھیک نظر نہیں آرہے تھے۔

"اماں مٹھی! میں شاہ میر اور سسی کا نکاح کر رہا ہوں۔ آپ کو کوئی اعتراض تو نہیں ہے۔" انہوں نے اس طرح ایک دم اتنی غیر متوقع بات کی تھی کہ وہ حیرانی سے بھی انہیں دیکھنے لگی تھیں۔ سمجھ ہی نہیں پائی تھیں۔

"شاہ میر... تم نے کوئی جواب نہیں دیا۔" وہ پھر سے شاہ میر کی طرف پلٹے تھے۔

"اوا... میں..."

وہ ابھی تک ہچکچاہٹ کا شکار تھا۔ لیکن انہیں انکار کرنا بھی شاہ میر کے لیے موت کے برابر تھا کیونکہ آج وہ جہاں کھڑا تھا وہ صرف اور صرف اوا شہباز کی مدد کی وجہ سے تھا۔ اللہ سائیں نے اوا شہباز اور اماں مٹھی کو ان کے لیے وسیلہ بنا کر بھیجا تھا۔ اگر وہ نہ ہوتے تو اس کی ماں کبھی بھی اتنی عزت سے اپنی بیوگی بھری زندگی نہ گزار پاتی۔ اس کی بہن ایک خوش و خرم بھرپور ازدواجی زندگی نہ گزار رہی ہوتی اور وہ خود... اس کی تو ہر سانس ان کی احسان مند تھی۔ لیکن ان ساری باتوں پہ ایک بات اس لمحے اسے بھاری لگ رہی تھی

کہ وہ اپنے سے پندرہ سال چھوٹی لڑکی سے نکاح کے لیے ہامی کیسے بھرے۔

وہ جو کسی اور کے نام کی مہندی لگائے بیٹھی ہے۔ کسی اور کے نام کا جوڑا پہنے بیٹھی ہے۔ وہ کیوں کر بھلا من پسند ساتھی کو چھوڑ کر خود سے بڑی عمر کے مرد کو قبول کرے گی اور اس مرد پر ترجیح دے گی جس سے وہ محبت کرتی ہے۔

"شاہ میر... ہاں یا نہ... بولو بیٹا۔" انہوں نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھا تھا اور وہ لمحہ شاہ میر کے لیے سب سے بھاری تھا۔ ہر چیز پیچھے چلی گئی تھی اور یاد تھا تو صرف وہ اوا شہباز کا مان بھرا لمس... لمحہ بھر کی بات تھی اور فیصلہ ہو گیا تھا۔

"آپ کا حکم سر آنکھوں پہ اوا سائیں... آپ کی عزت سے بڑھ کر میرے لیے کچھ نہیں ہے۔ میں تیار ہوں۔"

وہ شاہ میر تھا بھلا کیسے سر اٹھا سکتا تھا اور جو اطمینان اس لمحے اوا شہباز کے چہرے پہ پھیلا تھا وہ شاہ میر کی زندگی بھر کا حاصل تھا۔ اماں مٹھی کے چہرے پہ بے ساختہ ہی مسکراہٹ اتر آئی تھی۔ ایک اطمینان بخش مسکراہٹ۔

بس ایک رباب کا چہرہ تھا جو بجھ سا گیا تھا۔ انہیں ایک پینڈو کسی طور اپنے داماد کے روپ میں قبول نہیں تھا اور یہ ہی وہ لمحہ تھا جس سے وہ بچنا چاہتی تھیں۔ مگر بھلا کن کے آگے کس کی مجال... کس کا زور... وہ تنتناتی ہوئی کمرے سے باہر چلی گئی تھیں۔

☼ ☼ ☼

چند لمحے پہلے جس خوشی اور سرشاری کا احساس اسے گھیرے ہوئے تھا۔ وہ لمحوں میں بھاپ بن کر اڑی تھی۔ جب بابا نکاح خواں کے ساتھ اندر آئے اور اسے بتایا کہ اس کا نکاح عمر کے بجائے شاہ میر سے ہو رہا تھا۔ وہ پل اسے ساکت کر گیا تھا۔ وہ آنکھوں میں حیرت اور بے یقینی لیے انہیں دیکھ رہی تھی۔ اماں مٹھی اس کے پاس ہی بیٹھی تھیں' کیونکہ ماما اسے کہیں دکھائی

نہیں۔ رہی تھیں۔ ایسا کیا ہو گیا تھا کہ چند لمحوں میں بابا نے اتنا بڑا فیصلہ کرلیا تھا اور وہ بھی اس سے پوچھے بغیر۔ گویا اس کی کتاب زندگی کو بدل کر رکھ دیا ہو۔

بارات واپس جاچکی تھی۔ عاصمہ۔ رباب کے سمجھانے پر بھی اپنی ضد پہ اڑی ہوئی تھیں اور شہباز مسلسل ان کی بات ماننے سے انکاری تھے۔ رباب نے دونوں کو ہی سمجھانے کی بہت کوشش کی تھی۔ مگر نتیجہ صفر رہا اور عمر نے اس سب میں بس خاموش تماشائی کا کردار ادا کیا تھا اور یوں وہ خوشی۔۔۔ وہ شادی جس کی مہینوں سے تیاریاں ہو رہی تھیں اس کا پانسہ یوں پلٹا کہ عمر خالی ہاتھ رہا اور شاہ میر خوش بخت ٹھہرا۔ پر اب سسی پہ تھا کہ وہ اس خوش بختی کو قبول کرپاتی ہے یا نہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ماں باپ کی ہمیشہ سے لاڈلی رہی تھی۔ اپنی زندگی میں اس نے اپنے لیے ہر چھوٹی بڑی چیز خود پسند کی اور جب زندگی کا ساتھی چننے کا وقت آیا تب بھی اس پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ اس نے عمر کو چنا اور اس کے ماں باپ نے بنا کسی اعتراض کے اسے اس کی زندگی میں شامل کردیا۔ مگر اللہ نے عمر کو اس کے لیے نہیں چنا تھا اور جسے چنا تھا وہ اب سامنے آیا تھا اور اسے اب ہر حال میں اسی کو قبول کرنا تھا۔ چاہے رو کر کرتی یا خوشی سے ہنس کر۔۔۔

"میری بیٹی بہت سمجھ دار ہے۔ اس نے ہمیشہ اپنے بابا کا مان رکھا ہے اور بابا اپنی سسی کے لیے کبھی کوئی غلط فیصلہ نہیں کریں گے۔ اس بات کا یقین رکھنا میری جان۔"

بابا چند لمحوں کو اس کے پاس بیٹھے تھے اور اس کا چہرہ دونوں ہاتھوں میں تھام کر اس کی پیشانی کا بوسہ لیا تھا اور نکاح نامہ اس کے سامنے رکھا تھا۔

"سائن کرو سسی۔۔۔ اپنے بابا کا کہا مانو میری جان۔" سر پہ رکھا بابا کا ہاتھ۔۔۔ لفظ جیسے اس کے لبوں پہ آکر ٹھہر رہے تھے۔ شکوے نوک زبان پہ دم توڑ رہے تھے۔ قلم حنائی ہاتھوں میں لرز رہا تھا۔ کتنی صدیاں اس بیچ گزری تھیں۔ اسے اندازہ نہیں ہوا تھا۔ صفحے پلٹتے گئے اور دل میں ہزاروں شکوے شکایتیں لیے، لبوں پہ خاموشی کا قفل لگائے، لرزتے ہاتھوں سے سائن کرتی گئی۔

٭ ٭ ٭

خوابوں کا ٹوٹنا اور خواہشوں کا ادھورا رہ جانا کس قدر تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اس کا احساس سسی کو آج ہو رہا تھا اور بہت شدت سے ہو رہا تھا۔ وہ اپنی آنے والی زندگی کو بہت خوب صورت دیکھتی تھی۔ من پسند زندگی، من پسند شریک سفر کے ساتھ۔ ان گنت خواب اس کی آنکھوں میں سجے تھے۔ لاتعداد خواہشیں دل میں پنپ رہی تھیں۔ ابھی کل تک وہ عمر کے ساتھ زندگی گزارنے کے پلان بنا رہی تھی۔

ولیمہ کے اگلے روز انہیں ورلڈ ٹور کے لیے جانا تھا۔ ساری دنیا گھومنی تھی۔ ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے خوابوں کو پورا کرنا تھا۔ لیکن آج جیسے ایک لمحے میں اس کی پوری زندگی کا نقشہ ہی بدل کر رہ گیا تھا۔ ایک بے یقینی نے اس کے پورے وجود کو اپنے حصار میں لے لیا تھا۔ دل جیسے رک رک کر چل رہا تھا اور آنکھیں ساکت جھیل کی مانند تھیں۔ اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا تھا کہ وہ اپنی باقی کی زندگی اپنی مرضی کے بغیر جیے گی۔

اس وقت پہ اس کا کوئی زور کوئی بس نہیں چل رہا تھا۔ وہ جیسے خاموش تماشائی بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے سارے لفظ جیسے گونگے ہو گئے تھے۔ بابا جیسے کہتے گئے اور وہ کرتی گئی۔ وہ خاموش رہی کیوں۔۔۔ اپنے ساتھ اس زیادتی پہ خاموش رہی کیوں۔۔۔ کچھ بھی جانے بغیر۔۔۔ پوچھے بغیر کہ بابا نے یکایک اتنا بڑا فیصلہ کیسے کرلیا۔ وہ خاموش رہی۔

اتنے سارے لوگوں کی موجودگی میں وہ اپنا اور اپنے ماں باپ کی عزت کا تماشا نہیں بنوانا چاہتی تھی۔ شاید اسی لیے چپ رہی تھی۔ لیکن بہرحال جو بھی تھا، اس نے شاہ میر کو کبھی بھی اپنے لائف پارٹنر کے طور پر

نہیں سوچا تھا۔ تصور تک نہیں کیا تھا۔ مگر سچ یہ ہی تھا کہ اب وہ اس کا شوہر تھا اور یہ بات یاد آتے ہی اس کا دل کرلانے لگا تھا۔ اس کا سنگھار بین کرنے لگا تھا۔ وہ خوش نہیں تھی۔ قطعی خوش نہیں تھی۔ وہاں کوئی بھی شاید خوش نہیں تھا۔ مگر نہیں وہاں صرف دو لوگ خوش تھے۔ شہباز نظامانی اور اماں مٹھی۔۔۔۔

☼ ☼ ☼

گزرے ہوئے پچھلے دو دن سسی کی زندگی کے بدترین دن تھے۔ اس نے کبھی بھی تصور نہیں کیا تھا کہ یوں اس کی زندگی ایک ہی جھٹکے میں بدل کر رہ جائے گی اور وہ خاموش تماشائی بنی بس دیکھتی رہے گی۔ شاہ میر سے نکاح کے بعد اس نے خود کو کمرے میں بند کرلیا تھا۔ خوب صورت سرخ دوپٹا ایک جھٹکے سے اتار کر دور پھینکا تھا۔ آئینے میں جب اپنے عکس پر نظر پڑی تو آنکھوں میں جیسے ایک سیلاب سا اتر آیا تھا۔ شاید کبھی اس نے اپنی پوری زندگی میں اتنے آنسو نہیں بہائے ہوں گے۔ جتنے اس ایک رات میں بہائے تھے۔ اپنا ایک ایک سنگھار اپنے ہی ہاتھوں سے نوچ نوچ کر اتارا تھا' لیکن جو ہونا تھا وہ ہوچکا تھا اور اسے کوئی نہیں بدل سکتا تھا۔

ماما کے کتنی ہی دیر تک دروازہ بجانے کے بعد اس نے دروازہ کھولا تھا اور ان کے گلے لگ کر اس نے اپنے دل کی ساری بھڑاس نکالی تھی۔ رباب تو جیسے پہلے ہی بھری بیٹھی تھیں۔ انہوں نے سارا الزام شہباز اور اماں مٹھی پہ رکھ دیا تھا کہ ان لوگوں نے معمولی بات کو بنیاد بنا کر اتنا بڑا فیصلہ کرلیا تھا اور پورے زمانے میں ان کی جگ ہنسائی کرائی تھی۔ وہ شاید بھول گئی تھیں کہ جگ ہنسائی تب ہوتی اگر بارات بغیر نکاح کے چلی جاتی۔ ان کے ذریعے ہی سسی کو پوری بات پتا چلی تھی اور اسے بھی زندگی میں پہلی بار اپنے بابا کا فیصلہ غلط لگا تھا۔

"بابا۔۔۔ میرے ساتھ ایسا کیسے کرسکتے ہیں ماما۔۔۔"

"میری جان۔۔۔ تم پریشان مت ہو' میں ہوں نا۔۔۔ میں سب ٹھیک کرلوں گی ہم خود کو ہلکان مت کرو۔"

ان سے روتی ہوئی سسی کا ہلکان وجود قطعی برداشت نہیں ہورہا تھا۔ لیکن اس وقت ان کا اپنا ذہن بالکل ماؤف ہورہا تھا۔ عاصمہ سے اس بے وقوفی کی قطعی امید نہیں تھی' لیکن وہ شہباز سے بھی اس جذباتی فیصلے اور جلد بازی کی توقع نہیں کررہی تھیں' مگر فی الحال جو ہوچکا تھا۔ اسے وہ بدل نہیں سکتی تھیں۔ انہیں اب آگے کا سوچنا تھا۔

وہ رات سسی نے جیسے کانٹوں پہ گزاری تھی۔ اگلا پورا دن اس نے اپنے کمرے میں بند رہ کر ہی گزارا تھا۔ آج کا دن اس کے ولیمے کا دن ہوتا' اگر اس کی شادی عمر سے ہوئی ہوتی' مگر اب شاہ میر سے نکاح کے بعد اس کا ولیمہ گاؤں میں ہونا تھا اور یہ اماں مٹھی کی خواہش تھی اور اس وقت وہ دل میں ہزاروں گلے شکوے لیے اماں مٹھی اور شاہ میر کے ساتھ رخصت ہوکر گاڑی میں آبیٹھی تھی۔ آتے وقت وہ ماما اور بابا دونوں سے ہی نہیں ملی تھی۔ وہ دونوں ہی اسے اب اپنی بربادی کے ذمہ دار لگتے تھے اور اردل سے بھی بس سرسری سا ملی تھی۔

"گزرتا وقت تمہیں بتائے گا میری جان! کہ میں نے تمہارے لیے کس قدر درست فیصلہ کیا تھا جاؤ اللہ کی امان میں دیا۔"

گاڑی میں ذرا سا جھک کر بابا نے اس کے سر پہ ہاتھ رکھا تھا۔ اس نے تڑپتے مچلتے دل اور بھیگتی آنکھوں کو سر جھکا کر چھپالیا تھا۔

شاہ میر آگے ڈرائیور کے ساتھ بیٹھا تھا۔ وہ اور اماں مٹھی پیچھے بیٹھے تھے۔ چمکتا چہرہ اس لمحے کس قدر زرد اور اداس تھا۔ یہ ایک نگاہ ڈالتے ہی شاہ میر کو اندازہ ہوگیا تھا۔ کالی شیشوں والی چادر میں سر جھکائے خاموش بیٹھی سسی کو دیکھ کر شاہ میر کا دل اس لمحے اس چھوٹی سی لڑکی کے لیے دکھ سے بھر گیا تھا۔ اس نے اسی پل سوچ لیا تھا کہ وہ جو کچھ ہوسکا اس کے لیے کرے گا اور اس کی خوشی کا ہمیشہ خیال رکھے گا۔

☼ ☼ ☼

آج پورے گاؤں کی رونق اور سجاوٹ دیکھنے سے تعلق رکھتی تھی۔ آج پورا دن گاؤں کے کسی گھر میں کھانا نہیں پکا تھا۔ کیونکہ آج شاہ میر نظامانی کے ولیمے کی دعوت تھی اور سب گاؤں والوں۔۔۔۔ ذات برادری کے لوگوں کے لیے کھلی دعوت تھی۔ اماں مٹھی نے اپنے سارے ارمان نکالے تھے۔ ان کی برسوں کی خواہش جو پوری ہوئی تھی۔ ان کا لاڈلا میرو اور جان سے پیاری سسی ہمیشہ کے لیے ایک ہو چکے تھے۔ چاہے کیسے بھی حالات تھے، مگران کے لیے یہ ہی کافی تھا۔

وہ گاؤں کی سادہ لوح سی خاتون تھیں۔ ان کے لیے بس یہ ہی کافی تھا کہ ان دونوں کی شادی ہو چکی تھی۔ اب وہ دونوں کیا سوچ رہے ہیں۔ کیا چاہتے ہیں یا انہوں نے اس شادی کو قبول کیا ہے یا نہیں۔ انہوں نے یہاں تک نہیں سوچا تھا۔ بس وہ اپنی ہی خوشی میں خوش تھیں۔ پوری حویلی جگ مگ کر رہی تھی۔ خوشی کے سہرے گانے والیاں صبح سے گاتے نہیں تھک رہی تھیں۔ شہباز بھی اردل کے ساتھ ولیمہ کی دعوت میں شرکت کے لیے آئے تھے۔ رباب نے البتہ آج بھی آنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ آج ان کی بیٹی کو ان کی کس قدر ضرورت ہے۔ روایتی دلہنوں کے لباس میں سجی سنوری سسی اس لمحے خود کو بے انتہا تنہا اور اکیلا محسوس کر رہی تھی۔ ایسے کہ جیسے چاروں طرف سے اجنبیوں میں گھر گئی ہو۔

سوہائے کی شادی میں اسے یہ رونق، یہ ہنگامہ بہت اچھا لگ رہا تھا، کیوں کہ وہ چند دن کے لیے یہاں آئی تھی۔ اسے پتا تھا کہ وہ چند دن یہاں رہ کر واپس اپنی معمول کی زندگی میں لوٹ جائے گی۔ لیکن اب ساری عمر یہاں رہنے کا سوچ کر ہی اس کا دل گھبرانے لگا تھا۔ بھاری لباس اور بھاری زیور، اسے گھٹن ہو رہی تھی، اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ لمحے بھر کی تاخیر بغیر یہاں سے اٹھ کر کہیں بھاگ جائے، کسی ایسی جگہ جہاں کوئی اسے ڈھونڈ نہ سکے۔

"اماں مٹھی۔۔۔ ادا شاہ میر جی کنوار تہ ادی سھنٹی آ۔" (اماں مٹھی، ادا شاہ میر کی دلہن بہت خوب صورت ہے۔)

کسی نے پاس بیٹھی اماں مٹھی کے کان میں سونھ نے گھس کر سرگوشی کی تھی۔ جسے سسی نے بھی بخوبی سنا تھا اور اس کے جواب میں اماں مٹھی نے ماشاء اللہ کہا تھا۔ اسی لمحے ہال کمرے میں داخل ہوتے وائٹ شلوار قمیص پہ روایتی شال ڈالے شان دار سے شاہ میر پہ سکھاں سمیت کتنی ہی نظریں ٹھہری تھیں۔

"اسان جو ادا شاہ میر بہ کنھن کان گھٹ تھوڑی آ۔"

(ہمارے ادا شاہ میر بھی کسی سے کم تھوڑی ہیں۔)

سکھاں کے جواب پہ ایک بھرپور قہقہہ پڑا تھا۔

"رابیل جی گل جھڑو یار آ۔"

(رابیل کے پھول جیسا محبوب ہے۔)

"سہتو سھٹو منجھو یار آ"۔

(بے حد خوب صورت میرا محبوب ہے۔)

"چو جانی جا گلا کیان۔"

(کیوں میں اس کی برائی کروں۔)

"ماں نہ لکھ پیرا بسم اللہ کیان۔"

(میں تو لاکھ دفعہ اسے بسم اللہ کہوں۔)

گانوں کے بولوں میں وہ قہقہہ دب کر رہ گیا تھا۔

٭ ٭ ٭

وہ اس وقت شاہ میر کی سیج سجائے بیٹھی تھی۔ ایسے شخص کی جس کے بارے میں اس نے کبھی خواب میں بھی نہیں سوچا تھا۔ وہ اس کے بابا کا کزن تھا۔ اس سے عمر میں بہت بڑا تھا۔

وہ گاؤں میں بابا کی زمینیں سنبھالتا تھا۔ اماں مٹھی کا خیال رکھتا تھا اور چونکہ بابا اس کی عزت کرتے تھے۔ اسے عزیز رکھتے تھے۔ سو وہ ان کے لیے بھی قابل احترام تھا۔ کیونکہ وہ ان کا فیملی ممبر تھا اور بس۔۔۔ اس سے آگے اس نے کبھی شاہ میر کے لیے کچھ نہیں سوچا تھا اور آج۔۔۔ اس کا وجود جیسے دھنس رہا تھا۔ ان بھاری

کپڑوں اور زیور کے نیچے تہہ در تہہ۔ سجے سجائے کمرے میں پھولوں کی مہک جیسے اس کے گلے میں دھواں سا بن کر اتر رہی تھی۔ روایتی دلہن کے لباس میں سجی سنوری وہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ اس کا لباس سرخ خیری کے کپڑے سے بنا تھا۔ جس پہ نہایت خوب صورت دبکے اور سلمہ کے علاوہ گوٹے سے بھی دلکش اور دیدہ زیب کام کیا گیا تھا اور اماں بی بی کے پہنائے ہوئے بھاری زیور نے جیسے اس لباس کے ساتھ مل کر اس کی شان بڑھا دی تھی۔

اماں بی بی نے اسے بری میں اپنا شادی کا دری سیٹ چڑھایا تھا۔ جو نولڑی تھا۔ جسے انہوں نے برسوں سے شاہ میر کی دلہن کے لیے سنبھال کر رکھا تھا۔ سندھ میں لڑکے والوں کی طرف سے دلہن کو بری میں دری سیٹ چڑھایا جاتا ہے۔ یہ ایک روایت ہے جسے لوگ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق نولڑی' سات لڑی' یا پانچ لڑی اور تین لڑی بھی بنواتے ہیں اور اس کے ساتھ بڑی کٹوریوں والے جھمکے ہوتے ہیں اور انگوٹھی میں ایک خاص قسم کی انگوٹھی جسے "ڈیڑھ" (ویڑھ) کہا جاتا ہے اور ساتھ میں جھومر ٹیکا پہنایا جاتا ہے' اس کے وجود کی گھٹن بڑھ رہی تھی۔ سرتاپا ایک چبھن کا احساس تھا جو اس وقت مسی کے پورے وجود میں سرائیت کر رہا تھا۔

وہ لمحے کے ہزارویں حصے میں اپنے وجود کو اس بوجھ سے آزاد کرنا چاہتی تھی۔ شاہ میر نے اس کے سجے سنورے وجود کی بس ایک جھلک ہی دیکھی تھی۔ جس وقت وہ کمرے میں داخل ہوا تو وہ ایک تیکھی نگاہ اس پر ڈال کر اپنے کپڑے اٹھا کر واش روم میں چلی گئی تھی۔ پر اس چھوٹی سی لڑکی کا وہ سجا سنورا روپ لمحہ بھر میں شاہ میر کو چونکا گیا تھا۔ اس کے دل میں کھب کر رہ گیا تھا۔ کیا کوئی لڑکی دلہن بن کر اتنی حسین بھی لگ سکتی ہے۔ شاہ میر نے پل بھر کو رک کر یہ سوچا ضرور تھا۔ اس نے اپنا موبائل اور گھڑی اتار کر بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی اور شال اتار کر لاپروائی سے بیڈ کراؤن کے ایک سائیڈ پہ ڈال دی تھی اور خود بیڈ پہ نیم دراز ہو کر بیٹھ گیا تھا۔ بلاشبہ آج کا دن بہت تھکا دینے والا تھا۔ ذہنی اور جسمانی دونوں حساب سے اس نے پل بھر کو آنکھیں موندی تھیں کہ کوئی چیز اس کے پیروں سے ٹکرا کر بیڈ پر گری تھی شاہ میر نے چونک کر آنکھیں کھولی تھیں یہ کپڑے اور زیورات تھے جو مسی نے ایک جھٹکے سے بیڈ پہ ڈھیر کیے تھے۔ وہ خود اس وقت وائٹ ٹراؤزر اور بلیک لانگ شرٹ میں ملبوس تھی۔ دھلے دھلائے چہرے کے ساتھ۔ اس نے بالوں کو سمیٹ کر ایک کندھے پہ ڈال رکھا تھا۔

وہ شاہ میر پہ ایک بھی نگاہ ڈالے بنا خفا خفا سی صوفے پہ جا بیٹھی تھی۔ اس کا خفا ہونا ناراض ہونا بنتا تھا۔ جب شاہ میر ایک مضبوط مرد ہو کر خود اس غیر متوقع صورت حال سے اس قدر شاکڈ تھا تو وہ تو ایک کم عمر سی جذباتی لڑکی تھی۔ جس نے آنکھوں میں کتنے ہی خواب سجا رکھے تھے۔ تو اب کرچیاں تو چبھنی تھیں نا۔ چند لمحے خاموشی سے اسے دیکھنے کے بعد شاہ میر اس کے پاس جا بیٹھا تھا۔

"تم ٹھیک ہو۔" شاہ میر نے ایک نگاہ اس کے روئے روئے سے چہرے پہ ڈالی تھی۔ شاید وہ واش روم میں بھی روتی رہی تھی۔ جواب میں وہ خاموش رہی تھی۔

"مسی! میں جانتا ہوں جو کچھ ہوا' وہ نہیں ہونا چاہیے تھا مگر تم یقین کرو اس میں میری قطعی کوئی ایماء شامل نہیں تھی۔ بس میں ادا شہباز کو انکار نہیں کر سکا۔ لیکن میں وعدہ کرتا ہوں کہ اس رشتے کو نبھانے کے لیے تم پہ کبھی بھی کوئی زبردستی نہیں ہوگی۔"

شاہ میر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اس سے کیا بات کرے اور کہاں سے شروع کرے۔ کیونکہ اس کے چہرے کے سرد تاثرات اسے کچھ بھی کہنے سے روک رہے تھے۔

"زبردستی۔ اس سے بڑھ کر اور کیا زبردستی ہوگی شاہ میر! تم سب لوگوں نے مل کر میری زندگی کو تماشا بنا دیا۔ میرے خواب توڑ ڈالے۔ اور کہتے ہو زبردستی نہیں ہوگی۔ میں کوئی پلاسٹک کی بے جان گڑیا نہیں کہ جسے

کھیل کھیل میں گڈا پسند نہیں آیا تو بدل کر کسی اور سے بیاہ دیا۔ جیتی جاگتی انسان ہوں میں۔ اور تم یہ بھی مت سمجھنا کہ تم سے ہوئے اس زبردستی کے نکاح کو میں تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کرلوں گی۔ میں یہاں نہیں رہوں گی۔ میں تمہارے ساتھ کبھی بھی زندگی نہیں گزار سکتی۔ نفرت کرتی ہوں میں تم سب سے۔ تم سب نے مل کر مجھے جہنم میں دھکیل دیا ہے۔" وہ عجیب ہسٹریائی سی ہو رہی تھی۔

آنسوؤں کا بند پھر سے ٹوٹ چکا تھا اور اب وہ ایک تواتر سے گر رہے تھے اور شاہ میر تاسف سے اسے دیکھ رہا تھا' وہ قصوروار نہ ہوتے ہوئے بھی قصوروار ٹھہرایا جا رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے سمجھائے' کیسے تسلی دے۔ اس لیے اس نے کمرے سے چلے جانا ہی بہتر سمجھا تھا اور وہ پوری رات سسی نے وہیں صوفے پر گھٹنوں میں سر دیئے دیئے ہی گزار دی تھی۔

☼ ☼ ☼
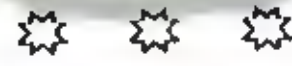
سسی کو یہاں ایڈجسٹ ہونے میں ازحد دشواری پیش آ رہی تھی۔ وہ یہاں رہنا ہی نہیں چاہتی تھی تو بھلا ایڈجسٹ کیونکر ہو پاتی۔ شاہ میر سے اس کے تعلقات ہنوز کشیدہ تھے۔ بات چیت بھی نہ ہونے کے برابر تھی۔ اماں مٹھی نے بھی اس بات کو محسوس کرلیا تھا۔ لیکن وہ ان سے بھی کھنچی کھنچی سی تھی۔ اپنے ماں باپ سے بھی اس نے بات کرنا چھوڑ دی تھی۔ کیونکہ اسے سب ہی اس زبردستی کے ذمہ دار نظر آتے تھے۔ حویلی میں سب ہی اس کا دل بہلانے اور اس سے بات چیت کی کوشش کرتے تھے۔ مگر اسے کوئی بات بھی اچھی نہیں لگتی تھی۔ وہ بس سارا دن اپنے کمرے میں ہی بند رہ کر گزار دیتی تھی۔ ہاں سوہنہ سے بھی کبھار بات کرلیتی تھی کہ بھلا اس بچی نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ اور سوہنہ تو تھی ہی بھابی کی دیوانی۔

اس رات بھی وہی سسی کو ڈائننگ ٹیبل تک گھسیٹ لائی تھی۔ تاکہ وہ سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکے۔ اماں مٹھی تو اسے دیکھ کر کھل اٹھی تھیں۔ شاہ میر نے بھی اس کا کفر ٹوٹنے پر اسے حیرت سے دیکھا تھا۔ سوہنہ نے اسے لاکر بالکل شاہ میر کے سامنے والی کرسی پہ بٹھا دیا تھا اور خود اس کے برابر والی کرسی پہ بیٹھ گئی تھی۔

"منھنجی دِھی۔ رانی۔ کیا کھائے گی۔ جو کھانا ہے بتادو میں ابھی سکھاں سے کہہ کر بنوا دیتی ہوں۔" اماں مٹھی ہمیشہ کی طرح اس کے واری صدقے جا رہی تھیں۔

"نہیں ٹھیک ہے اماں مٹھی جو بنا ہے میں کھالوں گی۔"

اس نے سر جھکا کر پلیٹ اپنے سامنے کھسکائی تھی۔ وہ فطرتاً "بدتمیز یا جھگڑالو نہیں تھی۔ بس پے در پے ہونے والے واقعات نے اسے ایسا کر دیا تھا۔ ورنہ یہی سسی تھی جو اماں مٹھی اور شاہ میر کے گن گایا کرتی تھی۔ پر وہی شاہ میر اسے اس نئے رشتے میں قبول نہیں تھا۔ سسی نے ایک نگاہ ٹیبل پر ڈالی تھی۔ وہاں کچھ بھی اس کی پسند کا نہیں تھا۔ سوہنہ نے ایک ڈش اٹھا کر اس کی طرف بڑھائی۔

"نہیں۔ میں یہ نہیں کھاتی۔"

اس نے نرمی سے اسے منع کر کے اپنی پلیٹ میں ذرا سے چاول نکالے تھے۔ شاہ میر نے بہت غور سے اسے دیکھا تھا۔

گزرے ہوئے اس ایک مہینے میں وہ پہلے سے بہت کمزور ہو گئی تھی۔ آنکھوں کے نیچے پڑے حلقے بہت نمایاں ہو رہے تھے۔ شاہ میر کو اسی لمحے اس چھوٹی سی لڑکی پہ بہت ترس آیا تھا۔

"سکھاں۔" شاہ میر نے قریب کھڑی سکھاں کو آواز دی تھی۔

"حاضر سائیں۔" وہ لپک کر پاس آ گئی۔

"کل سے آپ سسی بی بی سے پوچھ لیا کریں۔ انہیں جو کھانا ہو' بنا دیا کریں۔ ان سے پوچھ کر جو منگوانا ہو۔ وہ بچل سے کہہ کر منگوا لینا۔ میں اسے کہہ دوں گا۔"

"حاضر سائیں۔ جئیں تو ہاں جو حکم۔" (جو آپ کا حکم)

شاہ میر کھانا کھا چکا تھا۔ اس نے پانی کا گلاس لبوں سے لگالیا۔ پانی پیتے شاہ میر کو سسی نے ایک نگاہ دیکھا تھا اور یہ سچ تھا کہ اس لمحے وہ ایک نگاہ شاہ میر کو اندر تک گھائل کر گئی تھی۔ کیا وہ خود سے پندرہ سال چھوٹی لڑکی کی محبت میں گرفتار ہو رہا تھا۔ وہ خود سمجھ نہیں پایا تھا۔

☼ ☼ ☼

"میں شہر جا رہا ہوں۔ کیا تم چلو گی۔"

شاہ میر نے سی ڈی ریک کے پاس بیٹھی بے مقصد انہیں الٹ پلٹ کرتی سسی کو ایک نگاہ دیکھ کر کہا تھا۔

"نہیں۔" وہ مختصر سا جواب دے کر دوبارہ اپنے مشغلے میں مصروف ہو چکی تھی۔ جیسے کوئی اہم کام کر رہی ہو۔ بلاشبہ شاہ میر کے پاس میوزک اور کتابوں کا ایک بہت بڑا کولیکشن موجود تھا۔ جس میں ہر قسم کی عمدہ اور بہترین کتابیں موجود تھیں اور علاقائی میوزک سے لے کر انگلش میوزک تک ہر قسم کا انتخاب تھا۔

سسی پہلی دفعہ اس کا انتخاب دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ کیونکہ ان دونوں چیزوں میں بابا اور شاہ میر کی پسند کافی ملتی جلتی تھی۔ بابا کو بھی اچھا میوزک اور اچھی کتابیں بہت پسند تھیں اور اس وقت بابا کی یاد آتے ہی اس کی آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔

"ادا شہباز اور بھابھی کچھ عرصے کے لیے ملک سے باہر اردل کے پاس جا رہے ہیں۔ تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ تم ان سے فون پہ بھی بات نہیں کر رہی ہو۔ وہ دونوں تم سے ملنا چاہتے ہیں سسی! بے وقوف مت بنو۔ وہ تمہارے ماں باپ ہیں۔ ان سے ناراض ہو کر کیا ملے گا تمہیں۔ چلو اٹھو تیار ہو جاؤ۔ چلتے ہیں۔ تمہارا موڈ بھی ٹھیک ہو جائے گا۔"

شاہ میر گھٹنوں کے بل کارپٹ پہ اس کے پاس بیٹھا تھا۔

"میں نے کہہ دیا ناں۔ مجھے نہیں جانا۔ تم جاؤ یہاں سے۔ مجھے ان لوگوں سے نہیں ملنا۔ کیا ان کو میری پروا ہے؟ نہیں ہے۔ تو اب مجھے بھی ان کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔" وہ غصے اور بے بسی کے احساس سے جیسے رو دینے کو تھی۔

"تم نہیں جانتے میرو۔ میں۔" بے ساختگی میں کچھ کہتے کہتے وہ لب بھینچ گئی تھی۔ شادی کے بعد پہلی بار اس نے اسے میرو کہہ کر پکارا تھا۔

"میں سن رہا ہوں سسی۔ تم مجھ سے ہر بات کہہ سکتی ہو۔" چند لمحے اس کی خاموشی کو سننے کے بعد شاہ میر نے کہا تھا۔

"نہیں بس کچھ نہیں۔ مجھے کہیں نہیں جانا۔" وہ بہتی آنکھوں کے ساتھ اٹھ کر واش روم میں بند ہو گئی تھی۔

شاہ میر کتنی ہی دیر اس کا انتظار کرتا رہا تھا۔ اس کا دل اب سسی کی حالت دیکھ کر کٹنے لگا تھا۔ وہ اٹھ کر باہر چلا آیا تھا۔ تاکہ اماں مٹھی کو اپنے شہر جانے کا بتا سکے۔

"اچھا بیٹا! خیر سے جاؤ اور خیر سے آؤ۔ سسی نہیں جا رہی تمہارے ساتھ۔" انہوں نے شاہ میر کے سر پہ پیار دیتے ہوئے اس سے پوچھا تھا۔

"نہیں وہ نہیں جا رہی اماں مٹھی۔" وہ آہستگی سے کہہ کر باہر کی جانب بڑھ گیا تھا۔ اماں مٹھی چند لمحے شاہ میر کو حویلی سے باہر جاتا دیکھتی رہیں تھیں۔ پھر کچھ سوچ کر سسی کے کمرے میں چلی آئی تھیں۔ وہ تکیے میں منہ دیے اوندھی لیٹی تھی۔ انہیں دیکھ کر سیدھی ہو بیٹھی۔ چہرے پہ اب بھی آنسوؤں کے مٹے سے نشان تھے۔

"آپ یہاں کیوں آگئیں اماں مٹھی۔ مجھے بلا لیا ہوتا۔" وہ ان سے لاکھ ناراض سہی مگر وہ اس کی بڑی تھیں۔ اس کی دادی اور وہ ان سے کسی بھی بدتمیزی کا کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

"کوئی بات نہیں دھی۔ کبھی کبھار بڑوں کو چھوٹوں کے پاس آنا ہی پڑتا ہے۔ شہباز تمہیں بہت یاد کر رہا تھا۔ مل آتیں جا کر۔" انہوں نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔ جواب میں وہ بس خاموش رہی تھی۔

"میرا دل نہیں چاہ رہا تھا جانے کو۔" چند لمحوں بعد وہ دھیمے سے بولی تھی۔
"اپنے دل کو سمجھاؤ میری بیٹی۔ تمہاری قسمت میں جو لکھا تھا جیسے لکھا تھا۔ وہ ہو چکا ہے۔ اب خود کو قسمت کے لکھے میں ڈھالو۔ تمہارے باپ نے تمہارے ساتھ ایسا کچھ غلط بھی نہیں کیا۔ وہ باپ ہے تمہارا اُسے حق ہے کہ اپنی اولاد کے حق میں جو بہتر سمجھے وہ کرے۔ اس وقت جو حالات تھے۔ اس کے مطابق اس نے جو فیصلہ کیا۔ ٹھیک تھا۔ اب ان سے ناراض رہ کر تم انہیں تو دکھ پہنچا ہی رہی ہو۔ لیکن ساتھ میں خود کو بھی اذیت دے رہی ہو رہا شاہ میر تو اس نے تو صرف اس وقت شہباز کی عزت کی خاطر یہ فیصلہ کیا۔ اس کا تو کوئی قصور نہیں۔"
"آپ تو یہ کہیں گی نہ اماں مٹھی کہ آپ کے یہاں بھی سب تو ہوتا ہے۔ عورت کو بھیڑ بکری کی طرح کہیں بھی کسی بھی کھونٹے سے باندھ دیا جاتا ہے اور یہ توقع کی جاتی ہے کہ وہ گونگی بہری بن کر اپنی پوری زندگی گزار دے۔" وہ آج جیسے پھٹ پڑی تھی۔
کئی دنوں کا غبار تھا جو اس وقت آنکھوں اور لفظوں کے ذریعے نکل رہا تھا۔
"میں مانتی ہوں بہت ساری جگہوں پر ایسا ہوتا ہے۔ لیکن میں نے اپنے گاؤں میں آج تک ایسی کوئی ناانصافی نہیں ہونے دی اور ان شاء اللہ جب تک میں زندہ ہوں نہیں ہونے دوں گی اور جہاں تک تمہاری بات ہے تو میری جان بیٹی! تمہارے ایک ہاتھ میں اگر میں کوئلہ رکھ دوں اور دوسرے میں ہیرا تو تم کیا اٹھاؤ گی؟؟"
انہوں نے سوالیہ نگاہوں سے سسی کو دیکھا تھا۔ وہ ناسمجھی سے انہیں دیکھ رہی تھی۔
"یقیناً ہیرا ہی اٹھاؤ گی کیونکہ کوئلہ تو تمہارے ہاتھ کالے کر دے گا۔ تو تم یوں سمجھ لو کہ اس کالک سے تمہارے باپ نے تمہیں بچا لیا ہے۔ اور تمہارے ہاتھ میں ہیرا پکڑا دیا ہے اور اس ہیرے کی قدر تمہیں وقت کے ساتھ ساتھ ہی آئے گی۔ تم سمجھ دار ہو۔ خود کو اذیت مت دو۔ دیکھو تو کیا حال کر لیا ہے تم نے اپنا۔ شاہ میر بھی اتنا پریشان ہے تمہاری وجہ سے اور تمہارا باپ بھی دن میں کئی کئی بار فون کرتا ہے۔"
اب وہ سسی کو خود سے لگائے دھیرے دھیرے سمجھا رہی تھیں اور سسی کو لگا کہ جیسے ان کے الفاظ اس کے دل کو چھو رہے تھے۔ اس کے آنسو تھمے تھے اور دل کو قرار آنے لگا تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہ میر ابھی ابھی اٹھ کر گیا تھا اور تب سے رباب غصے میں بھری بیٹھی تھیں۔ البتہ شہباز قطعی طور پر ان کی طرف متوجہ نہیں تھے۔ رباب نے پھر سے عاصمہ سے ملنا جلنا شروع کر دیا تھا اور ان کے الٹے سیدھے مشورے اور باتیں رباب کا پارہ ہر وقت ہائی کیے رکھتے تھے۔ عاصمہ آج کل زور و شور سے عمر کے لیے کسی امیر ترین لڑکی کا رشتہ تلاش کر رہی تھیں جو کہ تاحال مل نہیں سکا تھا۔
"شہباز۔ آپ میری بات سن رہے ہیں۔" رباب نے غصے سے ان کے ہاتھ سے اخبار جھپٹا تھا۔
"یہ کیا بدتمیزی ہے رباب۔"
"بدتمیزی۔ یہ بدتمیزی ہے۔ آپ کو میری اتنی چھوٹی سی غلطی نظر آجاتی ہے اور آپ نے میری بیٹی کی زندگی برباد کر دی وہ نظر نہیں آئی آپ کو۔" غصے میں ان کی آواز اس قدر اونچی ہو گئی تھی کہ شہباز کو پورے گھر میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
"آہستہ بولو رباب! گھر میں ہمارے علاوہ نوکر بھی موجود ہیں۔" شہباز نے انہیں تنبیہہ کی تھی۔
"کیوں آہستہ بولوں اس پینڈو نے میری بیٹی کو اپنی حویلی میں قید کر کے رکھا ہوا ہے اور آگر ہمیں یہ تاثر دے رہا ہے کہ وہ ہم سے ناراض ہے اور ملنا نہیں چاہتی۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ سسی مجھ سے ناراض ہے۔ یہ آپ کا قصور ہے سب شہباز۔ آپ نے اس ادھیڑ عمر شخص سے اس کی شادی کر دی۔ وہ گاؤں کا گنوار پینڈو کیا میری کم عمر بیٹی کے قابل تھا اور آپ کی

وہ سو کالڈ اماں مٹھی... کیا وہ اسے ہم سے ملوانے نہیں لاسکتیں۔ کتنے مہینے ہوگئے ہیں۔ میں نے اپنی بیٹی کی شکل بھی نہیں دیکھی۔"

"میری ماں کے بارے میں آئندہ ایک لفظ بھی مت کہنا رباب!" ان کی ایک دھاڑ نے پل بھر میں چیختی چلاتی رباب کو ساکت کردیا تھا۔

"اور سسی جتنی تمہاری بیٹی ہے اتنی ہی میری بیٹی بھی ہے۔ تم نے اسے لالچ کے جس اندھے کنویں میں دھکا دینا چاہا تھا۔ میں نے اسے وہاں سے نکال کر اپنی ماں کی تحویل میں دے دیا تو کیا برا کیا اور شاہ میر بقول تمہارے پینڈو ضرور ہے مگر جاہل اور گنوار ہرگز نہیں ہے۔ شاہ میر نے ہماری عزت، ہمارا مان اس وقت رکھا جب تمہاری بہن نے ہماری عزت کو نیلام کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ صرف اس لیے ناکہ ہم ایسے وقت میں مجبور ہوجائیں گے اس کی بات ماننے پر... مگر میں نے اس کا کھیل بگاڑ دیا۔ ہاں۔ میں شاہ میر پہ بہت بھروسا کرتا ہوں اور مجھے پورا یقین ہے کہ وہ میری بیٹی کو بنا کسی مفاد کے بہت خوش رکھے گا اور تم نہ وہاں جاؤ گی اور نہ اس سے مل کر کچھ بھی کہنے کی کوشش کرو گی۔ اپنی پیکنگ کرلو کل ہم اردل کے پاس لندن جارہے ہیں اور مٹھی یہیں رہے گی۔ اماں مٹھی خود ہی اسے سنبھال لیں گی اور اب مزید ایک لفظ نہیں سنوں گا میں..."

"کیا یہ گھن گرج شہباز کی شخصیت کا حصہ تھی۔" انہوں نے ہمیشہ شہباز کو ایک محبت کرنے والے شخص کے روپ میں دیکھا تھا۔ پر اب وہ ایک باپ بن کر سوچ رہے تھے۔ رباب ان کے وہاں سے چلے جانے کے بعد بھی کتنے ہی لمحے وہیں خاموش بیٹھی رہی تھیں۔

✡ ✡ ✡

شاہ میر اپنا زیادہ وقت ابھی بھی زمینوں پر اور ڈیرے پہ گزارتا تھا۔ حویلی آتا تو سسی کی صورت دیکھ کر اسے احساس جرم ہونے لگتا تھا۔ جیسے وہ اس چھوٹی سی لڑکی کا مجرم ہو۔ اس کا دل اب اس کی طرف کھنچنے لگا تھا۔

شاید اماں مٹھی کی کئی بار کی کہی بات کہ سسی کو میں اپنے شاہ میر کی دلہن بناؤں گی کا احساس اب شاہ میر کے دل میں بھی کہیں جاگنے لگا تھا۔ وہ اب اس کے نکاح میں تھی اور اس کے پاس تھی۔ اس رات اس کا دل نہ زمینوں پہ لگ رہا تھا اور نہ ڈیرے پر... سو وہ حویلی چلا آیا تھا۔ رات کا ابھی پہلا پہر تھا، مگر حویلی پہ سناٹا چھایا ہوا تھا۔

وہ صحن میں بچھے اماں مٹھی کے تخت پہ آ بیٹھا تھا۔ جاتی گرمیوں کے دن تھے۔ اب رات کو خنکی سی محسوس ہونے لگتی تھی۔ سرسراتی ہوا جسم کو اچھی لگ رہی تھی۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ برآمدے میں رکھے جھولے پہ ہولے ہولے کوئی جھول رہا ہے۔

"سسی..." اس احساس کے آتے ہی وہ اٹھ کر وہاں چلا آیا تھا۔ وہ سسی ہی تھی۔

"نیند نہیں آرہی تھی تو میں یہاں چلی آئی۔" سیاہ جوڑے میں ملبوس وہ اس وقت تاریک رات کا ہی ایک حصہ لگ رہی تھی۔ شاہ میر کتنے ہی لمحے اسے دیکھتا رہا تھا۔ احساس بدلا تو دل کی پوری دنیا ہی جیسے بدل گئی تھی۔

"کیا ہم تھوڑی دیر کے لیے کہیں باہر جاسکتے ہیں۔" بے ساختہ ہی سسی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا تو اس کی نگاہوں کا ارتکاز ٹوٹا تھا۔

"باہر... اس وقت..." شاہ میر نے پل بھر کو گھڑی پہ نگاہ ڈالی تھی۔ جہاں رات کے گیارہ بجنے والے تھے۔

"ٹھیک ہے؟ رہنے دو۔" یکایک ہی سسی کو احساس ہوا کہ وہ اس وقت گاؤں میں ہے۔ یہ شہر کی پررونق رات نہیں ہے۔ جہاں دن کا آغاز ہی اب رات بارہ بجے کے بعد ہوتا ہے۔ یہاں کے لوگ محنت کرتے ہیں اور تھک کر جلدی ہی سوجاتے ہیں۔

"آجاؤ چلتے ہیں۔" یک دم ہی شاہ میر نے فیصلہ کیا تھا اور اسے لے کر جیپ کی طرف آگیا تھا۔ سرخ اور سیاہ چنری کے دوپٹے کو سنبھالتی وہ بھی اس کے پیچھے ہی چلی آئی تھی۔ پورے گاؤں میں اس وقت تاریکی چھائی تھی۔ گاؤں کی زیادہ تر سڑکیں کشادہ تھیں۔ اسی لیے

گاڑی سبک رفتاری سے جارہی تھی۔

"یہ..." راستے میں آتے سسی چلڈرن پارک کا نام پڑھ کر وہ چونکی تھی۔

"یہ چلڈرن پارک ہے۔ یاد ہے جب تم پہلی بار گاؤں آئی تھیں تو تمہیں ایکسرسائز کے لیے ایک پارک چاہیے تھا' جو کہ اس وقت یہاں نہیں تھا' تب ہی میرے ذہن میں آیا کہ سچ میں یہاں بچوں کے لیے ایک پارک ضرور ہونا چاہیے۔ یہاں لوگ اب خیر ایکسرسائز تو نہیں' مگر تفریح کے لیے ضرور آتے ہیں اور چونکہ آئیڈیا تمہارا تھا تو نام بھی تمہارا ہی رکھ دیا میں نے..."

اس بات کو یاد کر کے بے ساختہ مسکراہٹ سسی کے لبوں پہ اُمڈ آئی تھی اور اب اس پارک کو اپنے نام پہ بنا دیکھ کر خوشی بھی ہو رہی تھی۔ گاؤں بہت بدل چکا تھا۔ وہ اب ایک چھوٹے شہر کا سا ہی منظر پیش کر رہا تھا۔ سسی اتنے دن سے یہاں تھی اور آج پہلی بار باہر آئی تھی۔ اس لیے اسے سب نیا نیا سا لگ رہا تھا۔ تب ہی دور سے اسے اسی درگاہ کے گنبد نظر آئے تھے۔ جس نے اسے پہلی بار یہاں آتے ہوئے فیسی نیٹ کیا تھا۔

"شاہ میر! کیا ہم یہاں جا سکتے ہیں۔ پلیز..." درگاہ کے قریب آتے ہی وہ بے ساختہ ہی بولی تھی۔ شاہ میر وقت کا احساس کر کے چند لمحوں کو خاموش ہو گیا تھا۔ لیکن سسی کو وہ بھلا انکار کیسے کر سکتا تھا۔

"آجاؤ..." وہ اسے لے کر جیپ سے اتر آیا تھا۔

درگاہ کے مجاور نے ادا شاہ میر کو دیکھ کر چھوٹا دروازہ وا کر دیا تھا۔

شاہ میر اسے لے کر اندر چلا آیا تھا۔ تاحد نگاہ چکنا چکنا فرش تھا۔ چاروں طرف اونچے درختوں کے سائے اور ان کے گرد جلتے دیے عجیب سا منظر پیش کر رہے تھے۔ ان باتوں پر یقین نہ رکھنے کے باوجود شاہ میر صرف سسی کی خاطر یہاں آیا تھا۔ اس نے اپنے کاندھوں پہ پڑی چادر سسی پر پھیلا دی تھی۔

دور صحن میں ایک نوجوان اک تارہ ہاتھ میں لیے دھیمے سروں میں کچھ گا رہا تھا۔

کیا... وہ کیا گا رہا تھا۔ یہ سسی کو سننا تھا۔ اس نے شاہ میر کی طرف اجازت طلب نگاہوں سے دیکھا تھا۔ کیونکہ اس طرف بہت سناٹا اور تاریکی تھی۔ شاہ میر نے اس کے ساتھ قدم بڑھا دیے تھے۔ اس نوجوان کے پاس زمین پہ بیٹھتے ہوئے شاہ میر نے لمحے بھر میں پہچان لیا تھا کہ وہ کون ہے۔ سسی بہت محویت سے اسے سن رہی تھی۔ اتنے عرصے سے یہاں رہتے ہوئے اب وہ پوری طرح سندھی سمجھ سکتی تھی۔ البتہ بولنے میں وہ اب بھی ہچکچاہٹ کا شکار تھی۔

"یا خدا... تو جھان پیدا نہ کرین ھٹا۔"

جی جھان پیدا کیو تہ موت پیدا نہ کرین ھٹا۔

جی موت پیدا کیو تہ دوزخ پیدا نہ کرین ھٹا۔

جی دوزخ پیدا کیو تہ محبت پیدا نہ کرین ھٹا۔

جی محبت پیدا کئی تہ ھون کھے پیدا نہ کرین ھٹا۔

جی ھون کی پیدا کئی نہ منھنجو جانی پیدا نہ کرین ھٹا۔

جی منھنجو جانی پیدا کیو تہ پی ھون کان جدا نہ کرین ھٹا۔

"اے خدا... تو یہ دنیا نہ بناتا اور اگر دنیا بنائی تھی تو موت نہ بناتا اور اگر موت کو پیدا کر دیا تھا تو دوزخ نہ بناتا اور اگر دوزخ کو بھی بنا دیا تھا تو محبت نہ بناتا اور اگر محبت کو پیدا کر دیا تھا تو میرے محبوب کو نہ بناتا اور اگر میرے محبوب کو پیدا کر دیا تھا تو مجھ سے جدا نہ کرتا۔"

اس نوجوان کی آواز کا سوز اور درد سسی کو اپنے دل میں محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سر جھکائے خود میں مگن تھا۔ اسے خبر نہیں تھی کہ کوئی اس کے پاس بیٹھا اسے کس قدر محویت سے سن رہا تھا۔ تازہ عشق میں گرفتار شاہ میر کا دل جیسے اس کے لفظوں سے پگھل رہا تھا۔ اس لمحے میں اس نوجوان کو محویت سے سنتی اس لڑکی سے شاہ میر کو عشق ہو رہا تھا۔ کتنے ہی لمحے گزرے تھے۔ وہ نوجوان اب تھک کر جیسے خاموش ہوا تھا۔ مگر ہنوز سر جھکائے بیٹھا تھا۔

"یہ سچل ہے۔ اپنی بیوی سے حد سے زیادہ محبت کرتا

تھا۔ بچپن کی منگ اور محبت تھی اس کی۔ شادی ہوئی... شادی کے بعد پہلے بچے کی پیدائش پر ماں اور بچہ دونوں ہی چل بسے۔ تب سے یہ یہاں ہے' اسی حال میں...."

وہاں سے واپس آتے ہوئے شاہ میر نے اسے بتایا تھا۔ سسی ابھی تک اس کی آواز کے سحر میں گرفتار تھی۔ شاہ میر کی پہنائی ہوئی چادر کو اس نے مضبوطی سے تھام رکھا تھا۔

☆ ☆ ☆

اس رات کا سحر ابھی تک سسی کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔ کیا محبت اتنی ہی طاقت ور ہوتی ہے کہ ایک ہوش مند انسان کو دیوانہ بنادے۔ یہ عشق کی کون سی قسم تھی۔ یہ منزل عشق اس نے پہلی بار دیکھی تھی۔ ایک وہ محبت تھی جو عمر نے اس سے کی تھی۔ جو جلد ہی لالچ کے لبادے میں لپٹی اور پھر دم توڑ گئی اور ایک یہ محبت تھی جو اس نے اس رات شاہ میر کی آنکھوں میں اپنے لیے محسوس کی تھی۔ اس کی چادر کی خوشبو نے اسے ابھی تک اپنے حصار میں لے رکھا تھا۔ وہ عمر اور اپنی محبت کو سوچنا چاہ رہی تھی' پر جانے کیسے خود بخود ہی اس کی سوچوں کا رخ شاہ میر کی طرف مڑ گیا تھا۔

چند دن پہلے عمر نے اسے کال کی تھی۔ عاصمہ آنٹی سے بھی اس کی بات ہوئی تھی۔ وہ دونوں اس سے اپنے رویے کی معافی مانگ رہے تھے۔ انہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا تھا۔ عمر نے کہا تھا کہ اس کی ماں نے جو کیا' وہ غلط تھا اور عاصمہ آنٹی بھی شرمندہ تھیں۔ سوچ کے دھارے پھر سے عمر کی طرف مڑنے لگے تھے۔ اس کا دم گھٹنے لگا تھا یہاں پر... ماما اور بابا کچھ عرصے کے لیے ارول کے پاس لندن میں تھے اور وہ یہاں اکیلی تھی۔ ایسے میں عمر اور عاصمہ آنٹی سے بات کرنا اسے بہت اچھا لگا تھا۔ ان لوگوں نے کہا تھا کہ وہ چاہے تو ان کے پاس آسکتی ہے اور سسی کو لگا کہ یہی موقع ہے یہاں سے نکلنے کا۔ ایسے وقت میں جب بابا بھی یہاں نہیں ہیں۔ وہ بڑی آسانی سے یہاں سے جاسکتی ہے اور اگر بابا اس سے ناراض بھی ہوئے تو ماما اور عاصمہ آنٹی تو ہیں ہی اس کے ساتھ اور پھر عمر بھی ہے نا۔

اس سوچ کے آتے ہی وہ کھل سی اٹھی تھی۔ اپنی من پسند خوش گوار زندگی پھر سے ملنے کا خیال ہی اسے سرشار کر گیا تھا۔ اس نے شاہ میر سے بات کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا اور اسے پورا یقین تھا کہ شاہ میر اس کی بات ضرور مانے گا۔ آج بڑے دنوں بعد وہ مسکرائی تھی۔ اس نے سونہا اور اماں مٹھی سے باتیں بھی کی تھیں اور اماں مٹھی تو اسے خوش دیکھ کر ہی خوش ہو گئی تھیں اور اس رات وہ پہلی بار شاہ میر کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

"مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" وہ اپنی وارڈروب کھولے کھڑا تھا' جب سسی نے اسے مخاطب کیا تھا۔

"ہوں... بولو... میں سن رہا ہوں۔"

وہ اپنے کچھ کاغذات وغیرہ دراز سے نکال رہا تھا۔ تب ہی سسی کی نگاہ اس کی وارڈروب پہ پڑی تھی۔ شاید بلیک اور براؤن اس کے فیورٹ کلرز تھے۔ اس کی وارڈروب ان ہی رنگوں کے ملبوسات سے بھری ہوئی تھی اور وہ اکثر ان ہی دونوں رنگوں میں ملبوس نظر آتا تھا۔

"میں گھر جانا چاہتی ہوں۔"

"گھر..." وہ چند لمحوں کو بات کو سمجھ نہیں سکا تھا۔ کاغذات ہاتھ میں تھامے اس نے ناسمجھی سے سسی کو دیکھا تھا۔ جواب خاموشی سے اس کے جواب کا انتظار کر رہی تھی۔

"او... اچھا... پر ادا لوگ تو ابھی واپس نہیں آئے ہیں تو تم اکیلی وہاں خالی گھر میں جا کر کیا کرو گی۔"

چند لمحے لگے اس کو بات سمجھنے میں۔

"وہ میرا گھر ہے شاہ میر... میں وہاں اکیلی رہ سکتی ہوں اور پھر نوکر وغیرہ تو ہیں نا وہاں پہ... میں چند دن وہاں اکیلے رہنا چاہتی ہوں۔" سسی نے دانستہ اس سے آنٹی اور عمر کا ذکر نہیں کیا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کے

ذکر کے بعد شاہ میر اسے کبھی بھی اجازت نہیں دے گا۔

"لیکن میں تمہیں وہاں اس طرح اکیلے جانے کی اجازت کبھی نہیں دوں گا۔ اداشہباز آجائیں پھر بے شک چلی جانا۔"

اس کے دوٹوک جواب نے سسی کو سرتاپا سلگا دیا تھا۔

"میں نے تم سے اجازت نہیں مانگی ہے۔ صرف بتایا ہے کہ میں وہاں جارہی ہوں اور تم مجھے زبردستی نہیں روک سکتے ہو۔" وہ ٹی وی کا ریموٹ بیڈ پہ پٹخ کر اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ وہ بھی تو ان ہی کا خون تھی۔ غصہ تو جیسے ناک پہ دھرا تھا۔

"روک سکتا ہوں زبردستی... تم پہ حق رکھتا ہوں... کیونکہ شوہر ہوں تمہارا۔" شاہ میر چند قدم اس کے قریب چلا آیا تھا۔

"تم ایسے کسی خیال میں مت رہنا۔ میں نے نہ کبھی اس رشتے کو تسلیم کیا ہے اور نہ کبھی کروں گی۔ میں اب مزید یہاں تمہارے ساتھ نہیں رہنا چاہتی۔ میں ایک باشعور' پڑھی لکھی لڑکی ہوں۔ اپنی زندگی کا فیصلہ کرنے کا حق رکھتی ہوں۔ اپنا اچھا برا سمجھتی ہوں میں۔"

وہ بھی دوبدو بولی تھی۔ ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ پھر سے عمر کی لچھے دار باتوں میں پھنس رہی تھی۔ اس کی کایا پلٹ رہی تھی۔

"یہ سب کچھ میں جانتا بھی ہوں اور سمجھتا بھی ہوں۔ یہ رشتہ کیوں اور کس وجہ سے جڑا' یہ بھی پتا ہے مجھے۔ پر جب تک اداشہباز واپس نہیں آجاتے' تب تک تم مکمل طور پر میری ذمہ داری ہو اور میں تمہیں وہاں اکیلے جانے کی قطعی اجازت نہیں دوں گا۔ بات سمجھ میں آگئی تمہارے۔"

وہ اس کے اس قدر قریب کھڑا تھا کہ اس کے لباس سے اٹھتی مدھم مدھم سی خوشبو سسی کو مکمل طور پر محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دھیما اٹل لہجہ سسی کو پل بھر میں خاموش کرا گیا تھا۔

☼ ☼ ☼

پھر دن گزرنے کے ساتھ ساتھ سسی کی ضد بڑھتی گئی اور تنگ آکر شاہ میر کو اس پہ سختی کرنی پڑی۔ نتیجتاً" وہ اپنے کمرے میں بنا کچھ بھی کھائے پیے بند ہو کر رہ گئی اور اماں مٹھی اس کی فکر میں ازحد پریشان... ان سے سسی کی یہ حالت دیکھی نہیں جارہی تھی' لیکن شاہ میر بھی اپنی جگہ ٹھیک تھا۔ انہیں تو دونوں ہی یکساں عزیز تھے اور دونوں کی تکلیف ہی دکھی کرتی تھی۔ لیکن اب سسی کو ہر حال میں یہاں سے نکلنا تھا اور اس نے بالآخر اس کا راستہ بھی تلاش کر لیا تھا۔ شاہ میر کل سے گھر پر نہیں تھا۔ وہ قریبی گاؤں میں اپنے کسی دوست کی شادی میں شرکت کے لیے گیا تھا۔ آج رات تک اس کی واپسی متوقع تھی۔

دوپہر کے قریب اماں مٹھی اپنے کمرے میں دوا لے کر سو رہی تھیں۔ موتی بھی ان کے ساتھ ہی تھی۔ باقی لوگ اپنے اپنے کاموں میں مصروف تھے۔ جب سسی نے اپنا بیگ لیا اور باہر نکل آئی تھی۔ چوکیدار اور ڈرائیور اسے دیکھ کر مؤدب سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ اس کا وجود بڑی سی میرون چادر میں لپٹا تھا۔ صرف ذرا سا چہرہ ہی نظر آرہا تھا۔

اس نے ڈرائیور کو کچھ بھی کہنے کا موقع دیے بغیر شہر چلنے کو کہا تھا اور ڈرائیور نے فوراً" حکم کی تعمیل کی تھی۔ کیونکہ شاہ میر کی طرف سے اسے اجازت تھی' بلکہ حکم تھا کہ چھوٹی بی بی جب چاہیں' کہیں بھی آجاسکتی ہیں اور وہ جب کہیں انہیں شہر لے جایا کرو۔ سو ڈرائیور نے اس کے بیٹھتے ہی گاڑی اسٹارٹ کر کے شہر والے راستے پہ ڈال دی تھی۔ سسی نے شکر ادا کرتے ہوئے ایک اطمینان بھری سانس لی اور سر گاڑی کی سیٹ سے ٹکا دیا تھا۔

شام ہوئے اماں مٹھی کو سسی کی فکر نے ستایا تھا۔ وہ خود اٹھ کر اس کے کمرے میں چلی آئی تھیں' مگر سسی وہاں ہوتی تو ملتی نا۔ انہوں نے سکھاں کو چاروں طرف حویلی میں دوڑایا تھا' لیکن وہ حویلی میں ہوتی تو ملتی نا' تب

ہی چوکیدار سے انہیں پتا لگا کہ سسی بی بی ڈرائیور کے ساتھ شہر کے لیے نکل گئی ہیں اور اب تک پہنچ بھی چکی ہوں گی۔ اماں مٹھی نے گھبرا کر فوراً ہی شاہ میر کو فون کیا تھا۔

☆ ☆ ☆

”ہر ہھر جاء پرین۔۔۔ ہر محفل ھر۔“
تنھنجو یادون سنبھالی رکیمدل ھر۔
پر تنھنجی کمی محسوس تیئی ٹی۔
(ہر جگہ۔۔۔ ہر محفل میں۔۔۔ مجھے تمہاری کمی محسوس ہوتی ہے۔ تمہاری یادوں کو دل میں سنبھال رکھا ہے، لیکن پھر بھی تمہاری کمی محسوس ہوتی ہے۔)

آج اس کے دوست کا ولیمہ تھا۔ جس میں محفل موسیقی کا اہتمام کیا گیا تھا۔ جہاں گلوکار کی پرسوز آواز شاہ میر کے دل کے تاروں کو مسلسل چھیڑ رہی تھی۔ سیاہ چادر میں لپٹا وجود دیے کی مدھم روشنی میں اس کے دل کے نہاں خانوں کو روشن کر رہا تھا۔

”چا گالھ آ دوست۔ یا بی یاد تی اچی چا؟“
(کیا بات ہے دوست۔ بھابھی کی یاد آرہی ہے کیا۔)

ڈارک براؤن سوٹ پہ آف وائٹ شال کاندھوں پہ ڈالے گم صم سے بیٹھے شاہ میر کو اس کے دوست نے مخاطب کیا تھا۔

”ارے نہیں یار۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ یہ گانا ہے ہی دل میں اتر جانے والا۔“ شاہ میر نے مسکرا کر جواب دیا تھا۔

اسی لمحے اس کا موبائل مدھم سی آواز میں گنگنایا تھا۔ حویلی سے فون آرہا تھا اور فون سنتے ہی شاہ میر سرعت سے اٹھ کھڑا ہوا تھا۔

”کیا بات ہے شاہ میر! سب خیر ہے نا۔“ اس کا دوست پریشان سا اس کے پیچھے لپکا تھا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں سب خیر ہے۔۔۔ بس مجھے ابھی نکلنا ہوگا۔“

شاہ میر اسے مطمئن کرتا جیپ میں آ بیٹھا تھا اور آدھے گھنٹے کی طوفانی ڈرائیونگ کے بعد وہ حویلی میں موجود تھا۔

”کہاں تھے آپ سب لوگ۔۔۔ کسی نے مجھے اس وقت اطلاع کیوں نہیں دی۔“ شاہ میر کو اتنا غصے میں سب نے پہلی بار دیکھا تھا۔ وہ سب خاموش کھڑے تھے۔

”ڈرائیور کہاں ہے اسے بلاؤ۔“
لمحوں میں ڈرائیور اس کے سامنے موجود تھا۔

”چھوٹی بی بی کو تم شہر لے کر گئے تھے۔“ اس نے ایک نظر اسے دیکھا تھا۔

”جی سائیں۔۔۔ کوئی غلطی ہوگئی کیا۔“ وہ ہنوز سر جھکائے کھڑا تھا۔

”کس کی اجازت سے۔۔۔ تم نے مجھے اطلاع دینا بھی ضروری نہیں سمجھا۔“ شاہ میر نے کڑے لہجے میں اس سے پوچھا تھا۔

”سائیں! انہوں نے کہا کہ آپ نے حکم دیا ہے کہ انہیں شہران کے بابا کے گھر چھوڑ آؤں۔۔۔ تو سائیں! میں ان کی بات پہ کیسے یقین نہ کرتا۔ معافی چاہتا ہوں سائیں! اگر کوئی غلطی ہوگئی ہے تو۔۔۔“

شاہ میر نے خاموشی سے اسے واپس جانے کا اشارہ کیا تھا۔ وہ اس غریب آدمی کو کیا کہتا۔ کیونکہ شاہ میر نے اسے یہ کہہ رکھا تھا کہ وہ جب کہیں انہیں شہر لے جایا کرو، شاہ میر نے اس پہ کبھی کوئی پابندی نہیں لگائی تھی اور چوکیدار نے بھی شاہ میر کو یہ ہی بتایا تھا۔ تو وہ کیونکر ان کی بات پہ یقین نہ کرتا۔ اس نے سب ملازموں کو وہاں سے جانے کا کہا تھا اور خود فون پہ ادا شہباز کے گھر کا نمبر ملایا تھا۔ فون گھر کی ملازمہ نے اٹھایا تھا۔

”سسی بی بی ہیں؟“ شاہ میر نے اس سے تصدیق چاہی تھی۔

”جی صاحب جی! وہ تو دوپہر میں ہی آگئی تھیں۔ ابھی اپنے کمرے میں ہیں بلادوں۔“

”نہیں۔۔۔ بس تم ان کا خیال رکھنا اور ہاں انہیں میرے فون کا مت بتانا میں انہیں خود کال کرلوں گا۔“

ملازمہ سے اچھی طرح تسلی کرنے کے بعد اس نے فون بند کردیا تھا۔ چند لمحوں کو اس نے سوچا تھا کہ اب اسے کیا کرنا ہے۔ پھر اس نے اپنے ایک بہت خاص اور بھروسے کے آدمی کو وہاں بھیج دیا تھا کہ جب تک میں وہاں نہیں آتا' تم وہاں رہو اور مجھے پل پل کی رپورٹ دیتے رہو۔

وہ فوراً" حکم ملتے ہی وہاں سے روانہ ہوگیا تھا اور شاہ میر تھکا تھکا سا اماں مٹھی کے پاس آبیٹھا تھا۔ جو پریشان حال سی بیٹھی تھیں۔ یہ سوچ کر کہ شہباز کیا سوچے گا کہ اماں میری بٹی کی حفاظت نہ کرسکیں اور اسے تنہا کردیا۔

"اماں مٹھی! آپ فکر نہ کریں۔ میں صبح ہوتے ہی وہاں چلا جاؤں گا اور تب تک وہیں رہوں گا جب تک اداشہباز نہیں آجاتے۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ ورنہ آپ کی طبیعت بگڑ جائے گی۔ میرے ابھی ایک دم سے وہاں جانے پر وہ ضد میں آجاتی' اس لیے مجھے ذرا ٹھہر کر ہی جانا مناسب لگا۔"

اس نے انہیں اچھی طرح تسلی دے کر سکھاں کے ساتھ ان کے کمرے میں بھیج دیا تھا اور خود کتنے ہی لمحے وہ وہیں بیٹھا رہا تھا۔ اسے سسی پر بے انتہا غصہ تھا۔ لیکن اس وقت اسے غصہ نہیں کرنا تھا۔ یہ سوچنا تھا کہ اب آگے کیا کرنا ہے۔

☆ ☆ ☆

آج کتنے دنوں بعد وہ اپنے کمرے میں آئی تھی۔ سب کچھ ویسا ہی تھا' جیسا وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ ایک خوش گوار سا احساس اس کے وجود کو گھیرے ہوئے تھا۔ ایک آزادی کا احساس تھا جو اسے محسوس ہو رہا تھا۔ ابھی کچھ دیر پہلے ہی آنٹی اور عمر اس سے مل کر گئے تھے۔ آنٹی نے بہت کہا کہ وہ ان کے پاس چل کر رہے' مگر وہ نہ مانی۔ وہ اپنے گھر میں رہنا چاہتی تھی۔

ان دونوں نے اس کی بات مان لی تھی۔ مگر انہوں نے وعدہ لیا تھا کہ وہ روزانہ ان کی طرف چکر لگائے گی اور ڈنر ان کے ساتھ کرے گی۔ کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ سسی خود کو اکیلا محسوس کرے اور سسی نے ہامی بھرلی تھی۔ اسے آج بھی ان کے خلوص پہ کوئی شک نہیں تھا۔ جب ان دونوں نے معافی مانگ لی تو پھر کیسی ناراضی۔

اب اس نے سوچ لیا تھا کہ وہ کل ہی بابا کے وکیل سے مل کر شاہ میر کو خلع کا نوٹس بھجوادے گی۔ وہ جانتی تھی کہ یہ سب ذرا مشکل ہوگا' مگر اب وہ مزید شاہ میر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی تھی۔ اسے لگ رہا تھا کہ اگر وہ چند دن مزید وہاں رہتی تو وہ گاؤں اسے اپنے حصار میں لے رہا تھا۔ شاہ میر کی قربت اسے سحر زدہ کر رہی تھی۔ اس کا دل اختیار سے نکل رہا تھا اور وہ یہ نہیں چاہتی تھی۔

وہ واپس اپنی دنیا میں آنا چاہتی تھی' پر وہ یہ بھول گئی تھی کہ اب وہی اس کی اصل دنیا تھی۔ جسے اللہ نے اس کے لیے چنا تھا اور شاہ میر نظامانی کا ساتھ آسمانوں میں اس کے ساتھ لکھ دیا گیا تھا۔ وہ جب ساتھ ہوتے تھے تو فرشتے انہیں دعائیں دیتے تھے۔ پریاں انہیں دیکھ کر مسکراتی تھیں۔ پر سسی ابھی تک سراب کے پیچھے بھاگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

"بس اب کی بار کوئی جلد بازی مت کیجئے گا ماما! اتنی مشکل سے سب کچھ دوبارہ سے ٹھیک ہونے لگا ہے۔"

"ہاں... تم صحیح کہہ رہے ہو۔ پچھلی بار... مجھ سے غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے جلد بازی کردی تھی اور مجھے بھی کیا پتا تھا کہ اس کا باپ اڑ جائے گا۔ میں تو سمجھی تھی کہ اپنی عزت کے خیال سے چپ ہو جائے گا اور جو میں کہوں گی' وہ مان لے گا اور ہم عیش کریں گے' لیکن اس نے تو ہٹ دھرمی کی حد کردی۔"

عاصمہ بھی پچھلا تجربہ بھولی نہیں تھیں۔ سو اس بار بہت احتیاط سے کام لے رہی تھیں۔

"لیکن اب کی بار میں بہت سوچ سمجھ سے کام لے رہی ہوں۔ اس کے ماں باپ تو یہاں ہیں نہیں۔ اپنے شوہر کو وہ ویسے ہی چھوڑ آئی ہے اور ویسے بھی وہ اس

کے ساتھ خوش نہیں ہے۔ رباب نے مجھے سب بتا دیا ہے۔ اب ذرا پیار اور محبت سے اسے اپنی مٹھی میں کرنا ہے' تاکہ وہ اپنے ماں باپ کے سامنے ہمارے لیے ڈٹ جائے اور ہم اپنے سارے خواب پورے کر سکیں۔ عمر! تم بس سسی کو اپنے قابو میں کرنے کی کوشش کرو' باقی کام میرا ہے۔"

عاصمہ نے اپنے ذہن میں پوری پلاننگ کر رکھی تھی۔

"جی ماما.... آپ فکر ہی نہ کریں۔ وہ اب پوری طرح سے میرے قابو میں آچکی ہے۔ اب میں کوئی غلطی نہیں کروں گا۔ پہلے بھی وہ ریسٹورنٹ والی بات کی وجہ سے میں شاہ میر کی نظر میں آگیا تھا۔ پر شکر ہے کہ اس نے انکل یا سسی کو یہ بات نہیں بتائی تھی کہ میں وہاں چھپ کر سب کچھ دیکھ رہا تھا' تاکہ ڈاکو میری ایک دن پہلے خریدی ہوئی بیس لاکھ کی گاڑی نہ لے جائیں۔ پر اب میں ایسی کوئی غلطی نہیں کروں گا۔ بس ایک بار میری سسی سے شادی ہو جائے۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے ماں باپ کا پتا صاف کر کے میں سب کچھ اپنے نام کروالوں گا۔ پھر آپ دیکھیے گا ماما! میں آپ کو کتنے عیش کرواتا ہوں۔ پوری دنیا گھماؤں گا۔ جان چھوٹ جائے گی ہماری اس غریب ملک سے۔"

وہ دونوں اور بھی بہت کچھ کہہ رہے تھے' پر سسی سے صرف یہ ہی سنا گیا تھا۔ اس سے آگے وہ مزید کچھ سن ہی نہیں پائی تھی۔ پچھلے دو دن سے آنٹی مسلسل اسے بلا رہی تھیں۔ سو آج وہ ڈنر ان کے ساتھ کرنے کے خیال سے چلی آئی تھی۔ اسے عمر سے اپنی اور شاہ میر کی خلع کے بارے میں بھی کچھ ڈسکس کرنا تھا۔ پر آنٹی کے کمرے سے آتی آوازوں نے اس کے قدم وہیں روک دیے تھے۔ اتنا بڑا دھوکا.... وہ آج تک اپنے جان سے پیارے بابا کو غلط سمجھتی رہی تھی۔ شاہ میر کو۔ اماں مٹھی کو برا بھلا کہتی رہی تھی۔ اللہ سے شکوے کرتی رہی تھی۔

پر اب یہ سب سن کر اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ کوئی اس قدر بھی گر سکتا ہے۔ عمر کی ریسٹورنٹ والی بات سن کر اس کا دل چاہ رہا تھا کہ جا کر ایک تھپڑ اس کے منہ پر لگائے پر اس نے خود کو روک لیا تھا۔ وہ اب اس کے سامنے بھی جانا نہیں چاہتی تھی۔ وہ ان کم ظرف اور لالچی لوگوں کے چنگل سے بچ چکی تھی۔ اسے اسی بات پہ خدا کا شکر ادا کرنا تھا۔ اس کی آنکھیں بھی چھلکنے کو تیار تھیں۔ تب ہی کسی نے اس کے سر ہاتھ رکھا تھا۔

"بیٹا! خدا کا شکر ادا کرو کہ تم ان دونوں کی پلاننگ کا شکار ہونے سے بچ گئی ہو۔ تمہارے باپ کے ایک بروقت فیصلے نے تمہاری پوری زندگی کو تباہ ہونے سے بچا لیا ہے۔ ابھی بھی وقت ہے۔ جاؤ واپس پلٹ جاؤ۔ تمہارا شوہر ایک بہترین انسان ہے۔"

وہ عمر کے پاپا تھے جنہوں نے بیوی بچوں کے آگے ہمیشہ ایک خاموش تماشائی کا کردار ادا کیا تھا۔ وہ چپ چاپ وہاں سے نکل آئی تھی۔ خوش گوار موسم کی وجہ سے وہ پیدل ہی ان کے گھر کی طرف آگئی تھی۔ کیونکہ ان کا گھر بس پانچ منٹ کی دوری پہ تھا۔ لیکن اس وقت ہلکی برستی بارش کی بوندیں اس کے سر پہ جیسے ہتھوڑے کی مانند لگ رہی تھیں۔ پانچ منٹ کا فاصلہ اسے صدیوں پہ مشتمل لگ رہا تھا۔ کس طرح گھر تک پہنچی تھی۔ یہ صرف وہی جانتی تھی۔ شرمندگی' غصہ' بے بسی کتنے ہی عناصر تھے جو اس وقت اسے مل کر گھیرے ہوئے تھے۔ امیر محمد نے بہت غور سے جاتے اور پھر واپس آتے دیکھا تھا۔ اس نے اس کی حالت دیکھ کر فوراً ہی شاہ میر کا نمبر ڈائل کیا تھا۔

☼ ☼ ☼

شاہ میر اگلی صبح ہی یہاں آگیا تھا۔ انیکسی میں رکا ہوا تھا اور تمام ملازموں کو سختی سے ہدایت تھی کہ سسی کو پتا نہ لگے کہ شاہ میر یہاں ہے۔ اس نے ادا شہباز کو بھی فون کر کے ساری صورت حال بتا دی تھی۔ وہ بھی جلد ہی آنے والے تھے اور سسی کا تو آج کل کسی طرف دھیان ہی نہیں تھا۔

وہ تو جیسے ہواؤں میں اڑنے لگی تھی۔ سوا سے پتا

نہیں چل سکا تھا کہ شاہ میر اس سے بس چند قدم کی دوری پر موجود ہے اور اس کے پل پل کی خبر رکھے ہوئے ہے۔ ابھی بھی وہ امیر محمد کی کال سن کر پریشان ہوگیا تھا اور چاہتا تھا کہ جلد از جلد اس تک پہنچ جائے۔ لیکن اسے شک نہ ہوجائے کہ وہ گاؤں سے اتنی جلدی کیسے آگیا۔ دانستہ طور پر وہیں رکا رہا تھا اور تقریباً" آدھے گھنٹے بعد وہ انیکسی سے نکل کر اس طرف آیا تھا۔ لاؤنج کا دروازہ کھولتے ہی اس کی نظر سامنے ہی صوفے پہ گھٹنوں میں سر دیے بیٹھی سسی پہ پڑی تھی۔ دور سے ہی محسوس ہورہا تھا کہ وہ رو رہی ہے۔ ملازمہ اس کے سر پہ پانی کا گلاس لیے کھڑی تھی۔ پر وہ اس کی طرف سے بے نیاز ہنوز رونے میں مصروف تھی۔

شاہ میر کا دل اس لمحے جیسے اپنی دھڑکن کھونے لگا تھا۔ اس کے آنسو اس کے دل پہ گر رہے تھے۔ وہ تیزی سے اس کے پاس آیا تھا۔ ملازمہ اسے وہاں آتا دیکھ کر پانی کا گلاس ٹیبل پہ رکھ کر وہاں سے چلی گئی تھی۔ وہ اس کے پاس آبیٹھا تھا۔

"سسی۔۔۔!" شاہ میر نے دھیرے سے اسے پکارا تھا۔ اس نے گھٹنوں سے سر اٹھا کر شاہ میر کو دیکھا تھا۔

"کیا ہوا ہے؟ اس قدر کیوں رو رہی ہو۔"

وہ سمجھ تو چکا تھا کہ کچھ ہوا ہے "مگر کیا" یہ وہ اس کے منہ سے سننا چاہتا تھا۔ لیکن وہ بس خاموش نگاہوں سے اسے دیکھتی رہی تھی۔

"سسی۔۔۔!" شاہ میر کا دل اب گھبرانے لگا تھا۔ اس نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کر اس کا رخ ذرا سا اپنی طرف موڑا تھا۔ اس کے اس ذرا سے التفات کی دیر تھی۔ وہ بے ساختہ ہی اس سے لپٹ کر پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھی اور شاہ میر پل بھر کو جیسے ساکت سا ہوگیا تھا۔ یہ لمس' یہ قربت اسے پہلی بار نصیب ہوئی تھی۔ شاہ میر کے بازو کب اس کے گرد لپٹ گئے تھے اسے پتا بھی نہیں چلا تھا۔

"کچھ بولو بھی یار۔۔۔ کیوں خود کو اور مجھے اس طرح سے ہلکان کررہی ہو۔" شاہ میر نے اس کے ریشمی بالوں والا سر سہلایا تھا۔ یکایک ہی سسی کو اس قربت کا احساس ہوا تھا۔ وہ بے ساختہ ہی پیچھے ہٹی تھی اور دور ہٹ کر بیٹھ گئی تھی۔ اس کا چہرہ مزید سرخ ہوگیا تھا۔ رونے سے اس کی ناک اور آنکھیں ویسے ہی سرخ ہورہی تھیں۔ شاہ میر اس کے گریز پہ مسکرا دیا تھا۔

"دیکھو میں اتنی دور سے صرف تمہیں سننے کے لیے آیا ہوں اور تم رو کر مجھے مزید پریشان کررہی ہو۔ جانتی ہو' وہاں سب کس قدر پریشان ہیں۔ تمہارے یوں اس طرح بنا بتائے آجانے سے۔۔۔ کوئی یوں بھی کرتا ہے سسی۔"

شاہ میر اس کے سامنے رکھی سینٹرل ٹیبل پہ آبیٹھا تھا۔ وہ ہنوز کونے میں سمٹی بیٹھی آنسو بہارہی تھی اور اپنی بے خودی پہ شرمندہ بھی تھی۔

"سسی۔۔۔ آخری بار تم سے پوچھ رہا ہوں۔ بتاؤ مجھے ایسا کیا ہوگیا ہے۔"

وہ مسلسل نرمی سے اس سے بات کررہا تھا۔ ورنہ پچھلے دو تین دن سے وہ کس قدر اذیت سے گزرا تھا۔ یہ صرف وہی جانتا تھا۔ ایک غیرت مند مرد کے لیے یہ بات کس قدر اذیت کا باعث بن سکتی ہے کہ اس کی بیوی کسی اور مرد کی خاطر اسے چھوڑ آئی ہو' بلکہ مسلسل اس کے وجود سے انکاری ہو۔ رشتے سے انکاری ہو۔ یہ شاہ میر ان تین دنوں میں اچھی طرح جان گیا تھا۔

"تو کیوں آئے ہو تم یہاں۔۔۔ میں نے تمہیں یہاں آنے کو نہیں کہا تھا۔ اکیلا چھوڑ دو تم بھی مجھے۔۔۔ مجھے سب نے چھوڑ دیا ہے۔ ماما' بابا مجھے یہاں اکیلا چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ عمر نے چھوڑ دیا ہے۔ کیا میں اس قابل ہوں۔ اتنی بے وقوف ہوں کہ ہربار آسانی سے ٹریپ ہوجاؤں۔ کیا میری زندگی اتنی بے وقعت ہے کہ اس سے ہربار اتنی آسانی سے کھیلا جاسکے۔"

آنسوؤں کا پھندا گلے میں لگا تو وہ لمحہ بھر کو خاموش ہوگئی تھی۔ اب شاہ میر خاموشی سے اسے سننے لگا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ سسی اپنے دل کی بھڑاس نکال لے۔

"تم جاؤ یہاں سے۔۔۔ میں اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔" وہ اب آنسو صاف کرکے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ شاہ

میر کا پارہ ایک دم ہی چڑھا تھا۔ وہ مسلسل اس کی نرمی کا ناجائز فائدہ اٹھا رہی تھی اور وہ برداشت کر رہا تھا۔

"کیا مطلب ہے تمہارا... چلے جاؤ میں اکیلی رہنا چاہتی ہوں۔ تم آخر کس بات کا سوگ منا رہی ہو۔ جو گزر چکا ہے اسے بھول کر آج میں رہنا سیکھو سسی بی بی! جو تمہارے قابل نہیں تھا۔ اس کے پیچھے کیوں خود کو خوار کر رہی ہو۔ تم خود کو خوار زار اور بے وقوف بنا رہی ہو۔ وہ تو صرف آگ لگا کر تماشا دیکھ رہے ہیں۔ تمہیں آج بھی ان لوگوں کی پروا ہے۔ جنہوں نے تم پر تمہاری بے لوث محبت پر دولت کو ترجیح دی۔ جانتی ہو، اس رات عمر تمہیں اس ریسٹورنٹ میں اکیلا ان لوگوں کے درمیان چھوڑ کر خود چھپ کر تماشا دیکھ رہا تھا۔ ان اسلحہ بردار لوگوں کے درمیان... چابی نہ ملنے کا تو صرف ایک بہانا تھا۔ میں نے خود اسے دیکھا تھا وہاں۔ سوچو اگر میں وقت پر نہ پہنچتا تو کیا ہوتا۔ مگر نہیں جس طرح آج تمہیں کچھ بھی بتانے کا کوئی فائدہ نہیں ہے اس طرح تب بھی نہ ہوتا۔"

"تو نہ آتے وہاں... زیادہ سے زیادہ کیا ہوتا' مر جاتی میں... شہر میں روزانہ اتنے لوگ مرتے ہیں ایک میں بھی سہی۔ تم کیوں آجاتے ہو ہر بار مجھے بچانے۔ میری جان عذاب میں ڈالنے' فرشتے نہیں ہو تم جو ہر جگہ آن موجود ہوتے ہو۔"

اس کی دھیمی بڑبڑاہٹ نے شاہ میر کو بھک سے اڑا دیا تھا۔

"ہاں ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ جس انسان کو رشتوں کی' محبتوں کی قدر نہ ہو۔ اس کے پیچھے نہیں جانا چاہیے۔ میری غلطی ہے جو تم جیسی پتھر دل سے سر پھوڑ رہا ہوں۔ تم رہو ان کے درمیان' تمہیں صرف وہی شخص پیارا ہے۔ جو تمہیں دولت کے ترازو میں تولتا ہے۔ تمہاری نظر میں ہماری محبت' اپنے باپ کی عزت کچھ نہیں ہے۔ جا رہا ہوں میں... رہو تم اکیلی یہاں۔"

وہ جھٹکے سے اٹھا تھا اور پلٹ کر جانے لگا تھا۔ شاہ میر کا دل چاہ رہا تھا کہ کھینچ کر ایک تھپڑ اسے مارے' تاکہ اس کے ہوش ٹھکانے آسکیں۔ بڑی مشکل سے اس نے خود کو روکا تھا۔

"میرو...!" اسے جاتے دیکھ کر وہ دھیمے سے بڑبڑائی تھی۔ وہ بری طرح ٹوٹ چکی تھی۔ پر اس بات کو قبول نہیں کر پا رہی تھی۔ شاہ میر جا رہا تھا اور اسے جاتا دیکھ کر اسے احساس ہوا کہ اس کی اصلی متاع تو اب لٹنے جا رہی ہے۔ بہتی آنکھوں کے سامنے اندھیرا سا چھانے لگا تھا۔ ماما... بابا اور پھر جو چہرہ اس کی نگاہوں میں لہرایا تھا وہ میرو کا تھا۔ دل اپنا ہر غم بھول بیٹھا تھا۔ یہ نئی چوٹ سنگین تھی۔ صرف دہائی دے رہا تھا کہ میرے مکین کو جانے نہ دو۔ اسے روک لو۔ اللہ نے اسے میرا مکین بنایا ہے اور وہ مجھے جی جان سے قبول ہے' لیکن نگاہوں کے سامنے چھاتا اندھیرا اس کے لبوں سے نکلتی آواز کو قید کر رہا تھا۔

وہ بمشکل اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ پیروں کو چھوتے دوپٹے کا پلو راہ میں حائل ہوا تھا۔ لاؤنج سے نکل کر انیکسی کی طرف جاتے شاہ میر نے دل کے ہاتھوں پلٹ کر لاؤنج کی شیشے کی دیوار سے اندر نگاہ کی تھی۔ امید تھی کہ وہ وہیں بیٹھی رو رہی ہوگی۔ مگر اندر کے منظر نے اس کے ہوش اڑا دیے تھے۔ وہ بے ہوش ہو کر صوفے پہ گری سسی کو دیکھ کر الٹے قدموں لاؤنج کی طرف دوڑا تھا۔

☆ ☆ ☆

شاہ میر کی گاڑی ہوا سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ وقتاً" فوقتاً" پیچھے مڑ کر بھی دیکھ رہا تھا۔ جہاں ملازمہ سسی کا سر اپنی گود میں رکھے بیٹھی تھی۔ جو مسلسل بے ہوش تھی۔ اسے بازوؤں میں بھر کر گاڑی تک اٹھا کر لاتے ہوئے شاہ میر نے جس ضبط سے کام لیا تھا' یہ صرف شاہ میر کا دل ہی جانتا تھا۔ وہ ایک پل ان دونوں کے لیے ہی بہت بھاری تھا۔ جہاں سسی اسے دور جاتا دیکھ کر سہہ نہیں پائی تھی' وہاں شاہ میر کو بھی اس کے دور جانے کا احساس ہی مار گیا تھا۔ اسپتال پہنچ کر فورا" ہی اسے ایمرجنسی میں لے جایا گیا تھا اور وہ ایک ایک پل شاہ میر

کے لیے پہاڑ جیسا تھا۔ جب تک کہ ڈاکٹر نے آکر اسے تسلی نہیں دے دی تھی۔

"وہ اب ٹھیک ہیں مسٹر شاہ میر... بس ذہنی دباؤ اور ویک نیس کے سبب ایسا ہوا ہے۔ ورنہ پریشانی کی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم نے انہیں ایمرجنسی ٹریٹمنٹ کے بعد روم میں شفٹ کر دیا ہے۔ تھوڑی دیر میں انہیں ہوش آجائے گا۔"

ڈاکٹر اسے تسلی دے کر وہاں سے جاچکا تھا۔ تھوڑی دیر میں سسی کو روم میں شفٹ کر دیا گیا تھا اور اس سے ملنے کی اجازت بھی مل گئی تھی۔ وہ فوراً" ہی اندر چلا آیا تھا۔ جہاں سکون آور دوائیوں کے زیر اثر وہ پرسکون نیند سو رہی تھی۔ اس کے چہرے پہ زردی کھنڈی تھی۔ شاہ میر کو اس پہ بے پناہ ترس آیا تھا۔ وہ قریب رکھی چیئر کھینچ کر بیڈ کے قریب آن بیٹھا تھا۔ قطرہ قطرہ ڈرپ اس کے وجود میں جارہی تھی۔ اس کے چہرے پہ ابھی بھی آنسوؤں کے مٹے مٹے سے نشان تھے اور پلکیں سوتے میں بھی لرز رہی تھیں۔ جانے کتنا وقت گزرا تھا' جب اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ دھیرے دھیرے پلکیں جھپک کر اپنے اردگرد دیکھا تھا۔ ماحول سے مانوس ہونے میں اسے ذرا وقت لگا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ اپنے دائیں ہاتھ پہ پڑی جو کسی مردانہ گرفت میں تھا اور ہاتھ سے ہوتی ہوئی اس کی نگاہ جاکر شاہ میر پہ ٹک گئی تھی۔ وہ پوری طرح اس کی طرف ہی متوجہ تھا۔

"کیسا محسوس کر رہی ہو... اب کیسی طبیعت ہے سسی۔"

دھیمے سے مسکرا کر شاہ میر نے اس سے پوچھا تھا۔ چند لمحے پہلے کے غصے کا اس کے چہرے پہ نام و نشان بھی نہیں تھا۔ سسی نے دھیرے سے اثبات میں سر ہلایا تھا۔

"تم نے میری جان نکال کر رکھ دی۔ کوئی اس طرح بھی کرتا ہے بھلا۔ راستے میں میرا ایکسیڈنٹ ہو جاتا تھا۔"

شاہ میر نے دھیرے سے اس کے چہرے پہ بکھرے بال سمیٹے تھے۔ وہ ہولے سے مسکرائی تھی۔ اسے کہتے ہیں عشق۔ ہر لمحہ... ہر جگہ ثابت قدم اور شاہ میر اس کے لیے ایسا ہی ایک عشق بن چکا تھا۔ ایسا...

"میرو...!" وہ دھیرے سے بڑبڑائی تھی۔ پر شاہ میر نے سن لیا تھا اور وہ جی جان سے اس کی طرف متوجہ تھا۔ سسی کے میرو کا روم روم اسے سن رہا تھا۔

"پلیز مجھے چھوڑ کر کہیں مت جانا... پلیز..." اس کی آنکھیں پھر سے بند ہو رہی تھیں۔ اس نے میرو کے ہاتھ کو مضبوطی سے پکڑ رکھا تھا۔ میرو ہولے سے مسکرا دیا تھا۔ اسے آرام کی ضرورت تھی۔ سو میرو نے اسے ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ پر وہ ساری رات میرو نے اسی طرح اس کا ہاتھ تھامے اسی چیئر پہ گزار دی تھی اور پلک تک نہ جھپکی تھی۔ تو کیا یہ عشق نہیں تھا۔

صبح سسی کی آنکھ اسی اسپتال کے کمرے میں کھلی تھی۔ وہ اب کافی بہتر محسوس کر رہی تھی اور آنکھ کھلتے ہی اسے جو چہرہ سب سے پہلے نظر آیا تھا' وہ بابا کا تھا۔ وہ اس کے سرہانے بیٹھے تھے اور ماما بھی ان کے قریب ہی بیٹھی تھیں۔ وہ لوگ کب آئے تھے۔ کب پہنچے تھے۔ سسی کو کچھ خبر نہیں تھی۔ وہ خوشی سے بابا سے لپٹ گئی تھی۔ اتنے عرصے بعد انہیں اتنے قریب دیکھ کر وہ اپنی ہر تکلیف' ہر ناراضی بھلا بیٹھی تھی۔

"میری جان!" بابا نے اس کی پیشانی چوم کر اسے خود سے لگالیا تھا۔ سسی کا دل پھر سے بھر آیا تھا۔

"آئی... آئی ایم سوری بابا... آئی ایم ایکسٹریملی سوری فار ایوری تھنگ... میری ہر بات' ہر رویے کے لیے جس سے آپ کو دکھ پہنچا ہو۔" اس نے لمحے بھر کی بھی تاخیر کیے بنا بابا سے کہا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ اس سے دوری نے بابا کو کس قدر دکھی کر دیا ہے۔

"سسی! خود کو سنبھالو بیٹا! پہلے ہی تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" ماما کی آنکھیں بھی بھر آئی تھیں یہ سوچ کر کہ کس طرح اس نے اکیلے اتنی تکلیف سہہ لی۔ اگر شاہ میر اس کے ساتھ نہ ہوتا تو... اس لمحے ان کے دل میں پہلی بار شاہ میر کے لیے نرم جذبات نے سر

ابھارا تھا۔

"میرے بچے... بیٹیاں معافی نہیں مانگا کرتیں۔ تم نے اس وقت جس فرماں برداری سے میری بات مانی تھی۔ میرے لیے وہی لمحہ زندگی بن گیا تھا۔ جو ہوا' اسے بھول جاؤ۔ مجھے خوشی ہے کہ میرے ایک بروقت فیصلے نے تمہیں تمام عمر کے پچھتاوے سے بچالیا۔ سچ کہتے ہیں کہ وقت اور عقل ہر کسی کے پاس ہوتی ہے' مگر صحیح وقت پہ عقل کا استعمال ہر کوئی نہیں کر سکتا۔ بہت سے لوگ وقت گنوا کر صرف پچھتاتے ہیں۔

چلو اب اٹھو... بہت رہ لیا اسپتال' اب گھر چلنے کی تیاری کرو۔ ڈاکٹر نے تمہیں ڈسچارج کر دیا ہے۔"

بابا اس کے پاس سے اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ تو ماما کے سہارے وہ بھی اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس کا سامان سمیٹا جا چکا تھا۔

"لیکن میرو... میرو کہاں تھا... وہ اتنی دیر سے کہاں ہے۔" رات کو وہ اس کے پاس تھا۔ وقفے وقفے سے جتنی بار بھی سسی کی آنکھ کھلی اس نے شاہ میر کو اپنے قریب پایا تھا۔ تو پھر اب... یکایک اس کے دل میں کتنے ہی خدشوں نے سر اٹھانا شروع کر دیا تھا۔

"چلو نا بیٹا... کیا سوچ رہی ہو... شاہ میر باہر گاڑی میں ہمارا انتظار کر رہا ہے۔"

ماما نے اسے خود سے لگا کر محبت سے کہا تھا۔ سسی نے ایک اطمینان بھری سانس لی تھی اور ان کے ساتھ باہر نکل آئی تھی۔ جہاں بابا اور شاہ میر کاؤنٹر کے پاس کھڑے ان کا انتظار کر رہے تھے۔ شاہ میر ان دونوں کے سسی کے پاس آجانے سے اسپتال کے واجبات ادا کرنے کے لیے باہر نکل آیا تھا۔ اس وقت سسی سو رہی تھی۔ اسے دیکھ کر سسی کے چہرے پہ ایک اطمینان سا پھیلا تھا۔ وہ مطمئن سی ہو کر گاڑی میں آ بیٹھی تھی کہ اس کے سب اپنے اس وقت اس کے پاس تھے۔

٭ ٭ ٭

اسے اسپتال سے آئے دو دن ہو چکے تھے اور ان دو دنوں میں بابا اور ماما نے اس کا بے حد خیال رکھا تھا۔ ایک لمحے کو بھی اسے اکیلا نہیں چھوڑا تھا اور نہ ہی اسے اس کی کسی غلطی کا احساس دلایا تھا۔ کیونکہ اس کے چہرے سے ہی نظر آرہا تھا کہ وہ کس قدر شرمندہ ہے تو انہیں کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اماں مٹھی بھی اس کی طبیعت کا سن کر فوراً" ہی آگئی تھیں۔ ان گزرے دو دنوں میں شاہ میر انیکسی میں ہی ٹھہرا تھا اور اس کی سسی سے ملاقات نہیں ہوئی تھی۔ جبکہ سسی کا روم روم جیسے اس کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ اس سے بہت کچھ کہنا چاہتی تھی۔ اپنی غلطی کی معافی مانگنا چاہتی تھی۔ مگر یہ تب ہوتا نا کہ اگر اس کی شاہ میر سے ملاقات ہوتی۔ اماں مٹھی اس کے پاس ہی اس کے کمرے میں ٹھہری ہوئی تھیں۔ وہ خود اس کا خیال رکھ رہی تھیں۔ سارا دن نہ جانے کیا کیا پڑھ کر اس پہ پھونکتی رہتی تھیں۔

اس دوپہر بھی ان سے باتیں کرتے کرتے کب اس کی آنکھ لگی اسے پتا ہی نہیں چلا تھا اور جب آنکھ کھلی تو کمرے میں ملگجا سا اندھیرا پھیلنے لگا تھا۔ اماں مٹھی وہیں کمرے کے ایک کونے میں نماز ادا کر رہی تھیں۔ تب ہی دروازے پر دستک دے کر کوئی اندر چلا آیا تھا اور میرو کو اندر آتے دیکھ کر وہ بے ساختہ ہی اٹھ بیٹھی تھی۔ پاس پڑا دوپٹا اٹھا کر سلیقے سے لے لیا تھا۔ اس کے ہاتھ پیروں میں لرزش اتر آئی تھی۔ سو وہ گھڑی بالآخر آن پہنچی تھی جس کا وہ پچھلے دو دنوں سے انتظار کر رہی تھی۔ کہنے سننے کا اب وقت آ ہی گیا تھا۔

"اب کیسی طبیعت ہے۔" وہ اس کے پاس آرکا تھا۔ جس کا ستا چہرہ کچی نیند سے جاگنے کی گواہی دے رہا تھا۔ آنکھوں میں گلابی ڈورے ابھی بھی نظر آرہے تھے۔

"اب تو ٹھیک ہوں۔ آپ بیٹھیں نا پلیز..." وہ کمبل ہٹا کر اٹھ بیٹھی تھی۔ میرو وہیں بیڈ کے ایک کونے پہ پر تکلف انداز میں بیٹھا تھا۔

"سسی... مجھے تم سے کچھ بات کرنی ہے۔" اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتی' میرو کے انداز نے اسے

خاموش کرادیا تھا۔ اب وہ خاموشی سے اسے دیکھنے لگی تھی۔

"میں نے ہمارے رشتے کے بارے میں ان پچھلے دو دنوں میں بہت سوچا ہے۔ یہ رشتہ کیوں جڑا' اس کے پیچھے کیا وجوہات تھیں۔ اس بات کو اب رہنے دیتے ہیں۔ اب سوچنا یہ ہے کہ آگے کیا کرنا ہے اور یہ اب تمہیں طے کرنا ہے۔ میں اپنی زندگی میں زبردستی کا قائل نہیں ہوں۔ جو بھی فیصلہ کرتا ہوں' پورے دل سے کرتا ہوں اور جو ذمہ داری اٹھاتا ہوں' اسے پورا کرنے کی کوشش بھی کرتا ہوں۔ اب تمہارے والدین آچکے ہیں اور تم ان کے ساتھ مل کر جو بھی فیصلہ کروگی' مجھے قبول ہوگا۔"

اپنی بات ختم کرکے وہ اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ وہ جو اس کی طرف سے کچھ اور ہی توقع کررہی تھی۔ وہ بالکل خاموش سی ہوکر رہ گئی تھی۔ ایک لفظ بھی اس کے منہ سے نہیں نکلا تھا۔ تو کیا وہ دو دن بیٹھ کر بس یہ ہی سوچتا رہا ہے کہ اسے اپنی زندگی سے نکال دے گا۔

"شاہ میر... میں تو..." آنکھوں میں جمع ہوتے پانی کو پیچھے دھکیل کر اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی تھی۔

"میں جانتا ہوں' تم کیا سوچ رہی ہو' میں نے کہا نا' تم جو فیصلہ کروگی' مجھے قبول ہوگا۔ میری غیرت یہ گوارا نہیں کرتی سسی کہ میں کسی عورت سے زبردستی کا رشتہ رکھوں اور ساری زندگی اس کے لیے ان چاہا رہوں۔ چلتا ہوں' مجھے ابھی گاؤں کے لیے نکلنا ہے۔ اپنا خیال رکھنا۔"

وہ اماں مٹھی سے مل کر باہر نکل گیا تھا۔ جو نماز مکمل کرچکی تھیں اور اب تسبیح کررہی تھیں اور اس کے بعد حسب توقع ان کو ان دعاؤں کا حصار سسی کے گرد باندھ دینا تھا' مگر آج اس حصار میں شاہ میر پہلے آیا تھا۔ وہ جاچکا تھا۔ صرف اپنی سنا کر۔ بنا اس کی سنے' اس کی مرضی جانے بغیر۔ وہ میرو جو پیچھے گزرے تین ماہ میں اس کے ستے چہرے کو دیکھ کر جان جاتا تھا کہ وہ آج روئی ہے یا آج وہ پریشان ہے۔ آج وہ اس کی آنسوؤں سے بھری آنکھیں نہیں دیکھ سکا تھا۔ ایک غصہ... بے بسی... دکھ... وہ کیا محسوس کررہی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پارہی تھی۔ وہ فورا" ہی اٹھ کر اس کے پیچھے گئی تھی۔

"کیا بات ہے سسی! کہاں جارہی ہو بیٹا۔"

اماں مٹھی نے فورا" ہی اس سے پوچھا تھا۔ وہ اپنی عبادات میں مصروف ہونے کی وجہ سے ان دونوں کی گفتگو سن نہیں پائی تھیں۔ اس لیے بے خبر تھیں کہ میرو نے کیا کہا ہے۔ سسی انہیں جواب دیے بنا کمرے سے باہر نکل آئی تھی۔ پہلی سیڑھی پہ قدم رکھتے ہی اس کی نگاہ لان میں ماما اور بابا سے بات کرتے شاہ میر پہ پڑی تھی۔

ماما آج پہلی بار اس سے مسکرا کر مل رہی تھیں اور وہ سر جھکائے ان کی بات سن رہا تھا۔ اس بات سے بے خبر کہ کوئی اس کی ایک نگاہ کا منتظر کھڑا ہے۔ لاؤنج سے باہر نکلتے ہوئے غیر ارادی طور پر شاہ میر کی نگاہ اوپر کی طرف اٹھی تھی۔ جہاں سسی بے حال ننگے پاؤں سیڑھیوں پہ کھڑی تھی۔ ان نگاہوں میں کیا کچھ تھا' وہ سمجھ نہیں سکا تھا۔ پچھلے دو دن سے وہ منتظر رہا تھا۔ سسی کی طرف سے کسی بھی بات کا۔ کسی کال کا۔ کسی پیغام کا۔ پر وہاں صرف خاموشی تھی اور یہی خاموشی شاہ میر سے اتنا بڑا فیصلہ کراگئی تھی۔

فی الحال اس نے کسی کو کچھ بھی نہیں بتایا تھا اور فیصلہ کا اختیار سسی کو دے دیا تھا۔ پر دل میں ابھی بھی کہیں یہ خیال جاگزین تھا کہ اللہ اس کی قسمت میں دچھوڑا نہ لکھے۔ وہ سسی کے دل کے حال سے بے خبر تھا۔ مگر اس پل وہاں سے نکلتے ہوئے شاہ میر اپنا دل وہیں کہیں اس بے حال سی ننگے پاؤں کھڑی لڑکی کے آس پاس ہی چھوڑ آیا تھا۔ دوری کا احساس یکدم ہی دل میں جاگا تھا۔ بے چینی حد سے سوا تھی۔ ماما اس سے کچھ کہہ رہی تھیں پر اسے تو اس وقت کچھ بھی سنائی نہیں دے رہا تھا۔ یکایک جسم میں خنکی کا احساس جاگا تھا۔ تب ہی اسے احساس ہوا کہ وہ ٹھنڈے فرش پر ننگے پاؤں کھڑی ہے۔ پر وہ ستمگر جاچکا تھا۔ اس کی سنے بغیر۔ بس ظالم اپنا فیصلہ سنا گیا تھا۔ وہ یکدم ہی بھاگی ہوئی کمرے میں آئی تھی۔ اور تکیے میں منہ چھپا کر رو

پڑی تھی۔

☼ ☼ ☼

شاہ میر کو گاؤں آئے ایک ہفتے سے بھی اوپر ہو چکا تھا۔ پر ابھی تک فیصلے کی گھڑی نہیں آئی تھی۔ جس پہ وہ فیصلہ چھوڑ آیا تھا۔ وہ تو بڑی ہی ظالم نکلی تھی۔ اسے سولی پہ لٹکا رکھا تھا۔ اس کا دل کسی بھی کام میں نہیں لگ رہا تھا۔ نہ زمینوں پہ۔ نہ ڈیرے پہ۔ اور نہ حویلی میں۔ نہ ہی دوستوں میں۔ وہ جب پاس تھی ایسی بے قراری، بے کلی تو تب بھی نہیں تھی۔ پھر اب کیا ہوا تھا بچھڑنا تو طے تھا کیونکہ بے جوڑ رشتے عموماً" ٹوٹ ہی جایا کرتے ہیں، پھر یہ کیسا درد تھا جو دل میں گڑ کر بیٹھ گیا تھا۔ کنڈلی مار کر۔ اس رات وہ درگاہ کے صحن میں کتنی ہی دیر اکتارہ بجاتے بچل کے پاس بے مقصد ہی بیٹھا رہا تھا۔ کاندھوں پہ وہی چادر اوڑھ آیا تھا۔ جس میں اب اس کی خوشبو بس چکی تھی۔ ایک منزل تھی جو نظر نہیں آتی تھی اور اک عشق تھا جو روم روم میں بس چکا تھا۔

یاد ھيئِ کنھن جاءِ تي تھنجو ھجڻ ۽ منھنجو اچڻ
غور سان ۽ شوق سان تنھنجو ڏسڻ ۽ منھنجو نکڻ
ھاءِ ھاءِ نظرن سان نظرن جو ملڻ ۽ تورو کلڻ
راھ بندي کنھن مسافر کي ھوئي قيدي کرڻ
کين ھو واجب مگر جيکي ٿيو سو خوب ٿيو
يا ماضي دل نہ کر جيکي ٿيو سو خوب ٿيو

(تمہیں یاد ہے کسی جگہ پہ تمہارا ہونا اور میرا آنا
غور سے اور شوق سے تمہارا دیکھنا اور میرا تکنا
ہائے ہائے نظروں کا نظروں سے ملنا اور تھوڑا مسکرانا
واجب نہیں تھا مگر جو ہوا، سو خوب ہوا
اے دل ماضی کو یاد مت کر، جو ہوا سو ہوا

سسی کی حالت بھی اس سے جدا نہ تھی۔ یہ محبت کا کون سا احساس تھا۔ کیسا احساس تھا جو اس کے دل میں جاگ کر اس کی رگ رگ میں سرائیت کر گیا تھا۔

اسے تو پتا ہی نہیں چلا تھا کہ اسے آخر میرو سے محبت ہوئی کب تھی۔ اس رات جب اس کا میرو سے نکاح ہوا تھا یا اس رات جب وہ حویلی میں سب کو اس کا خیال رکھنے کی تاکید کر رہا تھا۔ لیکن ہاں اس رات تو ضرور ہوئی تھی۔ جب وہ اسے آدھی رات کو اس کے کہنے پہ درگاہ پہ لے گیا تھا اور وہ لمحہ تو آج بھی سسی کی آنکھوں میں بسا تھا جب اس نے اپنی محبت کے لمس سے بھری چادر اس کے کاندھوں پہ ڈالی تھی اور شاید تب بھی جب وہ بدحواس سا اسے لے کر ہسپتال بھاگا تھا اور پوری رات اس کی خاطر اس بے آرام چیئر پہ گزار دی تھی۔ تو کیا یہ احساس شاہ میر کو میری نگاہوں میں۔ میرے وجود میں دکھائی نہیں دیا۔ وہ نرم دل سا میرو۔ یکایک اتنا سخت دل کیسے ہو گیا کہ وچھوڑے کا درد اسے دے گیا۔

سسی نے پوری بات اماں مٹھی کو بتادی تھی اس شام جب وہ روتے ہوئے کمرے میں آئی تھی تو اماں مٹھی پوری جان سے دہل گئی تھیں اور پوری بات سننے کے بعد وہ مسکرادی تھیں کہ بے شک فرشتوں کی دعا پوری ہوئی تھی۔ پریوں کا رقص شروع ہوا تھا۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا کہ وہ خود میرو کے کان کھینچیں گی بس ذرا سا انتظار کرو۔ پر میرو ان کے ہاتھ بھی نہیں آ رہا تھا اور سسی کی بے چینی دن بدن بڑھتی جا رہی تھی۔

☼ ☼ ☼

رباب نے اماں مٹھی اور شہباز سے معافی مانگ لی تھی۔ اپنے غلط رویے کی اور انہیں غلط سمجھنے کی۔ اماں مٹھی تو جان بھی اولاد پہ نچھاور کرنے والی خاتون تھیں۔ انہوں نے کھلے دل سے انہیں معاف کر دیا تھا اور اب وہ شہباز کے پاس آ بیٹھی تھیں۔ جو اخبار پڑھ رہے تھے۔

"شہباز! میں بہت شرمندہ ہوں کہ میں ہمیشہ آپ اور اماں مٹھی کو غلط سمجھتی رہی۔" انہوں نے شریک حیات کے بازو پہ ہاتھ رکھا تھا۔

"ہوں۔ تمہیں شرمندہ ہونا بھی چاہیے رباب! میں نے یا میری ماں نے کبھی بھی تمہارا برا نہیں چاہا۔ میں نے تم سے محبت کی شادی کی۔ انہوں نے کچھ نہیں کہا۔ میں نے ان کی پرواہ نہیں کی اور یہاں گھر بسایا تب بھی انہوں نے کچھ نہیں کہا اور بدلے میں انہوں نے تم سے کیا مانگا صرف عزت اور محبت۔ زیادہ تو کچھ نہیں چاہا انہوں نے۔ یہ تو ہر انسان کا حق ہوتا ہے اور خواہش بھی۔ اور میں نے کچھ سوچ کر ہی سسی کا ہاتھ شاہ میر کے ہاتھ میں دیا تھا۔ وہ ایک پڑھا لکھا باشعور انسان ہے۔ گاؤں میں رہتا ضرور ہے کیونکہ اسے وہاں رہنا پسند ہے مگر اس نے آرکیٹیکچر پڑھ رکھا ہے اور زراعت میں ماسٹرز بھی کیا ہے' بے شک وہ سسی سے عمر میں بڑا ہے۔ مجھے وہ بالکل اپنے بچوں کی طرح عزیز ہے کیونکہ وہ ایک قابل بھروسا انسان ہے اور اس نے جس طرح میری ماں کا خیال رکھا ہے۔ میری غیر موجودگی میں وہ تمام ذمہ داریاں نبھائی ہیں جو کہ میری ذمہ داریاں تھیں۔ تو وہ مجھے عزیز کیوں نہ ہو۔" انہوں نے رباب کے دونوں ہاتھ تھام لیے تھے۔

"آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ مجھے احساس ہے میں غلط تھی مجھے سسی نے سب کچھ بتادیا ہے ۔شاہ میر کے بارے میں میرا اندازہ غلط تھا۔ جس طرح اس نے سسی کو ہر جگہ ہر لمحہ پروٹیکٹ کیا ہے۔ شاید کوئی اور نہیں کرپاتا۔"

انہوں نے مسکرا کر ان کے ہاتھ تھپتھپائے تھے۔

تب ہی ملازمہ نے آکر اطلاع دی تھی کہ عمر صاحب آئے ہیں اور رباب کے کہنے پر وہ اسے وہیں لے آئی تھی۔ شہباز نے اسے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا تھا۔

"وہ آنٹی! میں سسی سے ملنا چاہتا تھا۔"

عمر نہیں جانتا تھا کہ وہ لوگ واپس آچکے ہیں۔ اب یہاں آکر پچھتا رہا تھا۔ کیسی محبت تھی یہ کہ سسی اتنی تکلیف سے گزر آئی تھی اور اسے کچھ خبر ہی نہیں تھی اور دعوا محبت کا تھا۔

"کیوں۔؟"

"سسی مصروف ہے۔ وہ اپنے گھر جانے کی تیاری کررہی ہے۔ تم سے نہیں مل سکتی۔ اور آئندہ اس سے ملنے کی کوشش مت کرنا۔ وہ اپنے گھر میں شاہ میر کے ساتھ بہت خوش ہے۔" رباب کے کڑے تیوروں سے وہ گڑبڑا گیا تھا۔

"اب جاؤ۔ کھڑے میرا منہ کیا دیکھ رہے ہو۔ جو کچھ تم لوگ کرچکے ہو کیا اس کے بعد بھی تمہیں کوئی امید ہے۔ مانا کہ سسی ابھی کم عمر ہے' کم عقل ہے۔ لیکن اس کے ماں باپ ابھی موجود ہیں۔ اس کو صحیح راہ دکھانے اور اس کے لیے صحیح فیصلہ کرنے والے۔ اب تم جاسکتے ہو۔"

ان کے الفاظ عمر کے منہ پر جیسے تھپڑ بن کر لگے تھے۔ ایک شکست سے بھرپور تھپڑ۔ بہت پہلے بھی وہ سسی کو دل سے پسند کرتا تھا۔ مگر آہستہ آہستہ ماما کی باتوں میں لگ کر اس پسند میں لالچ بھی آگیا اور اس لالچ اور ہوس میں اس نے محبت جیسے پاک صاف جذبے کی توہین کردی اور اپنی عزت بھی گنوادی۔ وہ شرمندہ سا باہر نکل آیا تھا اور اندر رباب اور شہباز ایک دوسرے کو دیکھ کر مسکرادیے تھے۔ ایک اطمینان بخش مسکراہٹ۔

☆ ☆ ☆

"میری جان۔ میں جانتی ہوں تم کیا سوچ رہی ہو۔ پر بچے! میرا خیال ہے اس بار پہل تمہیں کرنی ہوگی۔ اس نے فیصلہ تم پہ چھوڑا ہے تو اب یہ تم پر ہے کہ تم اس کے پاس جاؤ اور اسے اپنا فیصلہ سنادو۔ دیکھنا وہ کھلے دل سے تمہارا استقبال کرے گا۔ میں جانتی ہوں۔"

کتنے ہی دن گزر جانے کے بعد بھی شاہ میر نے اس سے کوئی رابطہ نہیں کیا تھا اور اس کے دل کو جیسے پر لگ گئے تھے۔ وہ اڑ کر اس تک پہنچ جانا چاہتی تھی۔ پر اندر ہی اندر کہیں وہ چاہتی تھی کہ وہ خود سے اس کے پاس آئے۔

"مگر اماں مٹھی! مجھے ڈر لگتا ہے۔ میں وہاں کس طرح جاؤں۔ اگر انہوں نے مجھے قبول نہ کیا تو۔" ڈر

اس کے چہرے پر صاف لکھا تھا۔

"ڈرنے کی کیا بات ہے' گھر ہے تمہارا۔ حق سے جاؤ۔ اور سچ کہوں تو میرے بچے تم وہاں سے خود آئی تھیں۔ اسے کچھ بھی بتائے بنا۔ کہے سنے بغیر۔ مگر وہ پھر بھی تمہارے پاس آیا۔ اس نے اپنا فرض نبھا دیا۔ اب تمہاری باری ہے۔ اب جبکہ تمہیں اپنی غلطی کا احساس ہو گیا ہے تو تمہیں اس کے پاس جانا چاہیے اور میرو میرا بیٹا ہے میں اسے جانتی ہوں۔ وہ تم سے محبت کرنے لگا ہے۔ کبھی نہیں دھتکارے گا تمہیں۔ بس مرد ہے نا۔ ذرا سا اڑ گیا ہے۔ پھر اتنی انا اور ناراضی تو اس کا حق بنتا ہے نا۔ تمہیں دیکھے گا تو سب بھول جائے گا۔ مجھے یقین ہے۔"

"ٹھیک ہے اماں مٹھی۔ میں اپنے گھر واپس جاؤں گی۔ میں خود ہی وہاں سے آئی تھی۔ اب خود ہی وہاں جاؤں گی۔" وہ فیصلہ کر کے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

پریوں کا رقص پھر سے جاری ہوا تھا۔ فرشتوں کی دعائیں رنگ لائی تھیں شام جیسے گلابی سی ہو گئی تھی۔ مسکرانے لگی تھی۔ ہر شے گنگنانے لگی تھی۔ کیونکہ سسی شاہ میر بہت خوش تھی' ماما اور بابا کو اس کے واپس حویلی جانے پہ کوئی اعتراض نہیں تھا۔ انہوں نے خوشی سے اسے وہاں جانے کی اجازت دے دی تھی۔ ہاں اماں مٹھی ابھی چند دن یہاں رہنے کا ارادہ رکھتی تھیں کیونکہ ماما اور بابا نے انہیں وہاں روک لیا تھا۔

وہ ان سب سے مل کر اپنا سامان لے کر گاڑی میں آ بیٹھی تھی' خوب صورت خیالات کے ساتھ سفر بھی خوب صورت اور خوشگوار گزرا تھا اور جس وقت وہ حویلی پہنچی دوپہر ڈھلنے کو تھی۔ گاؤں کی وہی چہل پہل تھی۔ صبح سے اپنے اپنے کاموں میں لگے تھکے ہارے لوگ اب اپنے اپنے کام سمیٹنے کو تھے۔ وہ جھجکتی ہوئی اندر چلی آئی تھی۔ جہاں صحن میں دریاں بچھی تھیں اور اندر ایک طرف لگے ہینڈ پمپ سے اماں بی بی وضو کر رہی تھیں کیونکہ ان کا بچوں کو قرآن پاک پڑھانے کا وقت ہو رہا تھا اور بچے آنے شروع ہو گئے تھے۔ سسی پہ سب سے پہلی نظر سونہا کی پڑی تھی۔ وہ

بھاگتی ہوئی اس تک آئی تھی۔

"دادی! آپ آگئی ہیں۔ میں آپ کو بہت یاد کرتی تھی۔" وہ آکر اس سے لپٹ گئی تھی۔ سسی نے بھی اسے محبت سے لپٹا لیا تھا۔

"ارے میری ترئی آئی ہے۔"

اماں بی بی فوراً ہی اس کے پاس چلی آئی تھیں۔ وہ شاہ میر کی والدہ تھیں مگر بیوگی کی ساری زندگی انہوں نے گوشہ نشینی میں گزاری تھی۔ اپنے کمرے سے انتہائی ضرورت کے علاوہ اسی وقت باہر آتی تھیں۔ جب بچوں کو سبق دینے کا وقت ہوتا تھا۔ اس وقت سسی کو دیکھ کر خوشی سے بے حال تھیں۔ بھلا بیٹے کو اداس و بے قرار کون سی ماں دیکھ سکتی ہے۔ سسی بھی آگے بڑھ کر ان سے لپٹ گئی تھی۔ ایسے پر خلوص اور بے غرض رشتوں کو وہ چھوڑ کر گئی تھی۔ پوری حویلی میں اس وقت جتنے بھی لوگ تھے۔ وہ سارے اس وقت اس کے ارد گرد جمع ہو گئے تھے۔

"سکھاں۔ جاؤ میری نوں کے لیے کھانے کا بندوبست کرو۔" اماں بی بی نے سکھاں سے کہا تھا جو قریب ہی کھڑی تھی۔

"نہیں اماں بی بی! اس وقت کچھ نہیں چاہیے۔"

اس نے انہیں روک دیا تھا۔ اسے تو بس شاہ میر سے ملنے کی جلدی تھی۔ پر شاید وہ حویلی میں نہیں تھا۔

"اچھا تو ٹھیک ہے۔ پھر تم جا کر اپنے کمرے میں آرام کرو۔ سکھاں' جاؤ سسی کو اس کے کمرے میں لے جاؤ۔ میں ذرا بچوں کو دیکھ لوں' کب سے نجانے میرے انتظار میں بیٹھے ہیں۔" وہ اس کو تاکید کرتی اٹھ کر بچوں کے پاس باہر صحن میں چلی گئی تھیں۔ جہاں بچے ان کے انتظار میں بیٹھے تھے اور سسی اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ جہاں سکھاں پہلے سے ہی اس کے سامان کے ساتھ موجود تھی۔

"سائیں! آپ کا سامان الماری میں رکھ دوں۔" وہ اب اس سے پوچھ رہی تھی۔

"ہاں رکھ دو۔" وہ اس سے کہہ کر بیڈ پہ آبیٹھی تھی جہاں بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پہ شاہ میر کی فریم تصویر رکھی

تھی۔ سیاہ لباس میں کاندھوں پہ شال ڈالے وہ مسکراتا چہرہ۔ اس نے فریم اٹھا لیا تھا۔ تو اس کو میر و سے محبت ہو ہی گئی تھی۔ جس کے ثبوت کے طور پر وہ آج یہاں موجود تھی۔

"شاہ میر کہاں ہے سکھاں۔" اس نے خاموشی سے اپنا کام کرتی سکھاں کو پکارا تھا۔ نگاہیں ہنوز تصویر پر ٹکی تھیں۔

"ادا شاہ میر تو کسی کام سے برابر والے گوٹھ گئے ہیں۔ کہہ رہے تھے رات تک آؤں گا۔ آپ کہیں تو ان کو فون کر دوں۔" سکھاں اپنا کام چھوڑ کر اس کی طرف متوجہ ہو گئی تھی۔

"نہیں اس کی ضرورت نہیں ہے اور جب وہ آجائیں نا تو انہیں مت بتانا کہ میں آگئی ہوں۔ میں خود ہی ان سے مل لوں گی۔" اس نے سکھاں کو تاکید کی تھی۔

"حاضر سائیں۔ جیکو حکم (جو حکم)"

وہ تابعداری سے کہہ کر اپنا کام ختم کر کے کمرے سے چلی گئی تھی اور سسی وہیں بیٹھی تھیں اسے اب شاہ میر کا انتظار کرنا تھا۔ جان لیوا۔ جان گسل۔ مگر میٹھا انتظار۔"

☆ ☆ ☆

شاہ میر کی واپسی رات گئے ہوئی تھی۔ پوری حویلی میں سناٹا چھایا ہوا تھا اس کے وجود کی طرح۔ آج طبیعت بوجھل سی تھی' پورا دن کسی کام میں اس کا دل نہیں لگا تھا۔ روزمرہ کے کام بھی اس نے بس مارے باندھے ہی نمٹائے تھے۔ آج ہمیشہ کی طرح کچھ دیر صحن میں بیٹھنے کے بجائے وہ سیدھا اپنے کمرے میں ہی آیا تھا۔ کمرے میں مکمل اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ اس نے سب لائٹس آن کرنے کے بجائے صرف ایک نائٹ بلب آن کر لیا تھا۔ اس نے شال اتار کر بیڈ پہ رکھی تھی۔ والٹ اور موبائل سائیڈ ٹیبل پہ جہاں اس کی فریم شدہ تصویر اوندھی پڑی تھی۔ اس نے چند لمحے اسے تعجب سے دیکھا تھا۔ پھر واپس اسے سیدھا کر کے

رکھ دیا تھا۔

وہ بیڈ پہ بیٹھ کر جوتے اتارنے لگا تھا۔ تب ہی اس کی نگاہ صوفے پہ رکھی میرون چادر پہ گئی تھی جس میں لگے ننھے منے شیشے اندھیرے میں چمک رہے تھے۔ وہ جوتے اتارنا چھوڑ کر اٹھا تھا اور دروازہ کھول کر سکھاں کو آواز دی تھی۔

"حاضر سائیں۔" وہ لمحے بھر میں سامنے موجود تھی۔

"کیا میرے کمرے میں کوئی آیا تھا۔" بس اسے ایک گماں سا گزرا تھا۔ کمرے میں کسی بہت اپنے کی موجودگی کا۔

"نہ سائیں۔ کوئی بہ نہ آیو ہو۔" (نہیں سائیں کوئی نہیں آیا تھا۔) وہ نگاہیں جھکائے کھڑی تھی۔ اسے سسی کی تاکید یاد تھی۔

"اچھا ٹھیک ہے تم جاؤ۔"

وہ دروازہ بند کر کے واپس اندر آگیا تھا۔ تھکے تھکے سے انداز میں وہ جوتوں سمیت ہی بیڈ پہ لیٹ گیا تھا۔ اس نے آنکھوں پہ بازو رکھ لیا تھا۔ جانے کتنے لمحے یوں ہی گزر رہے تھے وہ سونا چاہتا تھا۔ مگر اسے نیند نہیں آرہی تھی اور پچھلے کئی دنوں سے اس کا یہی حال تھا۔ تب ہی اسے لگا کہ کوئی سایہ سا اس کی آنکھوں کے آگے لہرایا ہو۔ اپنا وہم جان کر وہ ویسے ہی لیٹا رہا تھا۔

"مجھے کیوں اس کی موجودگی کا بار بار احساس ہو رہا ہے۔"

وہ اٹھ بیٹھا تھا۔ پھر اٹھ کر باہر چلا آیا تھا۔ رات کے اس پہر سب ہی سو رہے تھے۔ صرف وہی بے چین تھا۔ پر نہیں جانتا تھا کہ کوئی ہے جو آج اس لمحے اس کی بے قراری اور بے چینی میں برابر کا حصہ دار ہے۔ وہ باہر صحن میں رکھے تخت پہ آ بیٹھا تھا۔

تاروں بھری رات بے انتہا خوب صورت تھی۔ پر فسوں منظر۔ چودھویں کا چاند ہر سو چمکتا اجالا کیے ہوئے تھا اور اس کی روشنی میں جیسے ہر شے سنہری سنہری سی لگ رہی تھی۔

کہو میرے چاند سے۔ رہ جائے میرے پاس رات

دے جا کوئی یاد۔ جو میری سانس کو برقرار رکھے

تب ہی اپنے پیچھے اسے کچھ احساس ہوا تھا۔ قدرے اندھیرے میں رکھا جھولا ہولے ہولے ہوا کے زور سے جھول رہا تھا۔ پر نہیں وہ ہوا سے نہیں جھول رہا تھا۔ اس پہ کوئی بیٹھا تھا۔ جو اسے اپنے پاؤں کی مدد سے دھیرے دھیرے ہلا رہا تھا۔

"کون؟" میری تیزی سے اٹھ کر اس طرف آیا تھا۔

تو کیا گمان سچ ہونے لگا تھا یا پچھلے کئی دنوں کی طرح یہ بھی اس کا وہم تھا کہ اسے وہ ہر جگہ نظر آتی تھی۔ چاند کے ہالے میں۔ سورج کی کرنوں میں۔ دیے کی روشنی میں۔ کمرے کے اندھیرے میں۔ حویلی کی محرابوں سے جھانکتی ہر جگہ۔ اپنے دل کے ہر کونے میں۔ پر نہیں یہ گمان نہیں حقیقت تھی۔ ایک اٹل روشن حقیقت۔ وہ مجسم اس کے سامنے تھی۔ ہولے ہولے سے جھولے کو جھلاتی۔

"سسی! یہ سچ میں تم ہو۔"

شاہ میر نے جھولے کی زنجیر پہ رکھے اس کے ہاتھ پہ اپنا ہاتھ رکھا تھا گویا اسے محسوس کیا تھا۔

"یا میرا کوئی گماں ہے۔"

میرو نے ہاتھ بڑھا کر اس صبیح چہرے کو چھوا تھا۔ وہ ذرا سا مسکرائی تھی۔ گویا گمان کو حقیقت میں بدلا تھا۔ آس پاس چاندنی سی چٹکی تھی۔

"یہ سچ میں میں ہوں سائیں۔ میں یہاں سے خود گئی تھی اور خود ہی واپس آگئی ہوں تاکہ آپ مجھے خود سے دور نہ کر سکیں سائیں۔"

وہ جھولے سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ ایک ہاتھ ابھی بھی وہیں جھولے کی زنجیر پہ میرو کے ہاتھ تلے دبا تھا۔ اور میرو کا دوسرا ہاتھ ابھی بھی اس کے دائیں رخسار پہ رکھا تھا۔

"خود سے دور تو تمہیں کبھی بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ پر چاہتا تھا کہ اس بار تم دل سے فیصلہ کرو اور میرے پاس آؤ۔ اور دیکھو میری لگن سچی تھی۔ تمہیں کھینچ لائی۔"

میرو کی نگاہوں میں اس سے اس کا عکس بہت واضح تھا۔ جو سسی کو مسرور کر رہا تھا۔ وہ ابھی تک یہی سمجھ رہی تھی کہ صرف وہی بے قرار ہے۔ وہی جل رہی ہے' پر یہاں آکر معلوم ہوا کہ عشق کی آگ نے دونوں کو برابر سلگا رکھا ہے۔ اور یہ وہ آگ ہے جس میں سلگنا بھی مقدر والوں کی حصے میں آتا ہے۔

"اور اگر میں نہ آتی تو۔" لاڈ سے پوچھا تھا۔ سننا چاہتی تھی اس کے منہ سے بے قراریوں کے قصے۔ عشق کی داستان۔

"تمہیں میرے پاس ہی آنا تھا سسی۔ کیونکہ سسی ازل سے شاہ میر کی قسمت میں لکھ دی گئی تھی۔ اسے حیلوں بہانوں سے ہی سہی پر آنا شاہ میر کے پاس ہی تھا۔ اللہ نے مجھے تمہارے لیے منتخب کیا ہے۔ اس کے رسول صلی اللہ کو گواہ بنا کر تمہیں اپنی حفاظت میں لیا ہے۔ تمہیں تو میرے پاس ہی آنا تھا۔"

محبت نے کب چپکے سے اس کے وجود کے گرد حصار باندھ دیا تھا۔ اسے پتا ہی نہیں لگا تھا۔ وہ تو بس سن رہی تھی۔ اسے نہیں پتا تھا کہ میرو اس کے لیے اتنی چاہت رکھتا ہے۔ یا وہ اپنے جذبوں کو زبان دینا بھی جانتا ہے۔

"ہوں۔ صحیح کہہ رہے ہیں آپ۔ میں ہی پاگل تھی جو سمجھ نہ سکی۔" اس نے مکمل آسودگی سے اس کے سینے پر سر رکھ دیا تھا۔

"آپ۔" میرو نے مسکرا کر کہا تھا۔ کیونکہ اب تک وہ اسے تم کہتی آئی تھی۔

"ہاں۔ آپ میرے شوہر ہیں۔ آپ کی عزت کرنا مجھ پہ فرض ہے۔" جواب میں میرو کا قہقہہ اسے سرخ کر گیا تھا۔

"شکر ہے شوہر تو مانا۔ پر یہ آپ تک ٹھیک ہے مگر مجھے تمہارے منہ سے شاہ میر اچھا نہیں لگتا۔ تمہارے لیے میں میرو ہی ٹھیک ہوں۔ مجھے وہی پکارو۔"

محبت کا لمس پیشانی پہ بکھرا تھا۔ وہ سمیٹ کر مسکرا دی تھی۔

"میں بہت شرمندہ ہوں آپ سے میرو۔ میں۔"

"شش۔" اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی میرو نے اسے ٹوک دیا تھا۔

"اب کچھ مت کہو۔ تمہارا یہاں خود چل کر آنا ہی میری جیت ہے۔ یہی میری فتح ہے اور مجھے اس سے بڑھ کر اور کچھ نہیں چاہیے۔ وعدہ کرتا ہوں تمہیں زندگی کی ہر وہ خوشی دوں گا جو میرے اختیار میں ہوگی۔ کیونکہ میں بہت محبت کرنے لگا ہوں اس چھوٹی سی لڑکی سے۔"

میرو نے اسے خود میں سمو لیا تھا۔ چاند کھل کر مسکرایا تھا۔ چاندنی مٹک مٹک کر مسکرائی تھی۔

"میں بھی وعدہ کرتی ہوں کہ آئندہ کوئی بے وقوفی نہیں کروں گی کیونکہ مجھے بھی ہر لحہ اپنی حفاظت کرنے والے میرو سے بے پناہ محبت ہو گئی ہے۔" وہ کھل کر ہنسی تھی اور شاہ میر نے اس کا بھرپور ساتھ دیا تھا۔ ایک بھرپور زندگی ان کی منتظر تھی۔ اماں مٹھی کے تخت پہ بیٹھے ہوئے چاندنی میں نہائے دو وجود نہال تھے۔

سسی نے شاہ میر کے کاندھے سے سر ٹکا رکھا تھا۔ حویلی کی محرابوں میں چاندنی رقص کر رہی تھی۔

☆

سحر ساجد

آدم اور حوا

"اللہ جانے کون سی اولاد ہوتی ہوگی جو کہ ماؤں کو ان کے دن پہ وش کرتی ہوگی اور میری اولاد.... کسی ایک کو بھی روک کر پوچھ لو' مجال ہے کہ پتا ہو کہ آج مدرز ڈے ہے۔ سب کے سب مگن' اپنے اپنے کاموں میں.... کسی کو جاب پیاری.... تو کسی کو پڑھائی.... ماں کسی کو نہیں پیاری.... بیٹیوں کو اتنی توفیق نہیں کہ آج کے دن چھٹی ہی کر لیتیں اور کچھ نہیں تو کم از کم ماں کو کچن سے آزاد تو کرواویں.... بیٹے ہیں تو اپنی دنیا میں مگن' اتنا نہ ہوا کہ ایک آدھ سوٹ' جوتا ہی لے دیتے.... ساری عمر.... گھس گئی ان کے پیچھے پیچھے ہلکان ہوتے۔ اس دن کے لیے جوان کیا تھا؟ اس دن کے لیے پڑھایا لکھایا تھا کہ ایک جملہ نہ کہہ سکے ماں کو.... یہ تک نہ بول سکے کہ امی بہت پیار ہے ہم کو آپ سے...."

"آج کے دن بھی ماں ہی کھپتی رہے کچن میں.... ان کے لیے کھانے بنا بنا کر رکھے.... میز سجا کر رکھے یا الماریاں بھروے کپڑے دھو دھو کے۔ بس.... یہ ہی اوقات ہے.... ماں نہ ہوئی نوکرانی ہو گئی۔

وہ اتنے غصے اور اونچی آواز سے بول رہی تھیں کہ سوئے ہوئے عثمان کو اٹھنا پڑ گیا تھا۔ وہ بے چارا ساری رات پڑھنے کے بعد صبح فجر کی نماز کے بعد سویا تھا۔ بی ایس سی کے ایگزامز ہونے والے تھے اس کے' اور وہ آج کل پڑھ پڑھ کر ہلکان ہوتا رہتا تھا کہ بی ایس سی کرنا خالہ جی کا گھر بالکل بھی نہیں تھا۔ اسے سوئے بمشکل دو تین گھنٹے ہی ہوئے تھے کہ امی.... اور وہ تو صبح فجر کی نماز کے بعد مسجد میں درس کی کلاس بھی اٹینڈ کر کے آیا تھا۔ اس بے چارے کی شکل رونے والی ہو گئی تھی۔

امی کو چپ ہونے کا کہتا تو وہ اور بولتیں اور اس "شور" میں بندہ ہر کام کر سکتا تھا ماسوائے سونے کے۔

ابو آفس جا چکے تھے' بہنیں کالج اور بڑے بھائی لیکچرر تھے' سو وہ بھی جا چکے تھے۔ ایسے میں لے دے کر بچتا تھا عثمان' جو کہ اپنے ایگزامز کی وجہ سے آج کل گھر پہ ہی پایا جاتا تھا۔

اس نے دو تین کروٹیں بدل کر سونے کی کوشش کی.... مگر ناکام رہا تھا۔

وہ اٹھ کر بیٹھا اور لیٹ گیا.... عجیب سی حالت ہو رہی تھی۔ سر بھاری اور بوجھل.... آنکھیں درد کر رہی تھیں.... نیند سے بھری ہوئی' مگر پھر بھی نیند سے کوسوں دور....

امی اب خاموش ہو چکی تھیں.... مگر.... ٹی وی آن ہو چکا تھا۔ وہ بھی بلند آواز میں.... کسی چینل پہ مارننگ شو میں مدرز ڈے منایا جا رہا تھا۔ ٹی وی کی آواز کانوں میں ضرور پڑ رہی تھی' مگر ذہن کے لیے اس آواز کا سمجھنا مشکل تھا.... کیونکہ.... وہ اپنی سوچوں میں مگن ہو چکا تھا۔

"امی ایسی کیوں ہو گئی ہیں؟ ایسا کیوں کرتی ہیں وہ؟" کل بھی فون پہ وہ خالہ سے بات کرتے ہوئے اسی بات کو لے کر آزردہ ہو رہی تھیں.... ایسا کیوں؟ کیا ماں کو کسی دن کی ضرورت ہے؟

وہ سوچے جا رہا تھا۔ سوچے ہی چلا جا رہا تھا۔ قریب تھا کہ وہ ان ہی سوچوں کے درمیان غرق.... پھر سے سو جاتا کہ یک دم.... وہ اچھل کر بیٹھا تھا۔ کسی خیال نے اس طرح سے ذہن کو ہٹ کیا تھا کہ وہ اب سونا ہی نہیں چاہتا تھا۔

"بیڈ سے پاؤں اتار کر چپل پاؤں میں اڑس کر کمرے سے باہر آیا تھا۔"

وہ اپنے دھیان میں مگن باہر آیا تھا... مگر...

☼ ☼ ☼

"آج کا دن ماؤں کا دن ہے... آج کا دن اپنی ماؤں کے ساتھ گزاریں... ان کا خیال رکھیں، کم از کم آج کے دن تو... ان کو یہ احساس دلائیں کہ وہ آپ کے لیے کتنی اہم ہیں۔ اپنی مصروفیت بھری زندگی میں آج کا یہ دن صرف اور صرف اپنی ماں کے نام کردیں۔"

کوئی مارننگ شو تھا اور ہوسٹ بولے جارہی تھی، بولے ہی چلی جارہی تھی۔

عثمان اپنی ہی دھیان میں مگن باہر آیا تھا... جہاں ایک زبردست سا جھٹکا اس کا منتظر تھا۔

امی دوپٹے کے پلو سے اپنی آنکھیں صاف کررہی تھیں۔" عثمان کا دل دھک سے رہ گیا تھا۔

اسے اپنی ماں سے اتنی محبت تھی کہ وہ پوری زندگی ان کے حکم پہ گزارہ سکتا تھا۔ "یاد رہے کہ وہ بھی ایک ٹانگ پر..." وہ اگر اسے کہتیں عثمان صبح ہونے والا اپنا پیپر مت دو۔ وہ وجہ پوچھے بنا نہ دیتا... وہ ایسا ہی کرتا جب اس کی ماں اس سے کہتی... کیونکہ...

وہ جانتا تھا اس کی ماں اولاد کے لیے برا سوچ ہی نہیں سکتی۔ مگر اب... امی کو کیا ہوگیا تھا؟! اس کی سمجھ سے باہر تھا۔

"ماں کی محبت کو اظہار کے لیے الفاظ کی ضرورت نہیں ہوتی اور اولاد... اس کی محبت... وہ بھی کسی تعریف کی محتاج نہیں ہے... کوئی حوالہ... کوئی اشارہ

نہیں چاہیے ان کو.....
یہ دونوں محبتیں مسلم ہیں تو اب کیا چاہنے لگی تھیں؟
عثمان نے ٹی وی پہ اک نظر ڈالی اور ایک شدید ابال اس کے اندر اٹھا۔
اس نے امی کے آگے رکھی ٹیبل پہ پڑا ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا تھا۔ امی نے سخت غصے سے اسے گھورا۔
"اپنی اولاد نے توفیق دینا نہیں..... یہ ہی دیکھ لینے دو کہ دوسروں کی اولادیں کیا کرتی ہیں۔"
انتہائی کڑا طعنہ جو بے حد کڑوے انداز میں عثمان کو لگا تھا۔ مگر وہ ٹھنڈا رہا۔
اس نے ماں کے ساتھ بیٹھتے ہوئے ان کے گلے میں بانہیں ڈال کر چٹاخ پٹاخ دو بوسے لیے اور کہا۔
"ہیپی مدرز ڈے امی.....!" امی شاکڈ ہوئیں اور پھر چپ سی ہو کر رہ گئیں۔
امی نے خاموشی سے اس کے بازو گلے میں سے ہٹائے تھے۔
"اگر آپ کی خوشی اس چیز میں ہے کہ سال کے ایک دن آپ کو اس طرح سے خوش کر دیا جائے تو زوار بھائی کو کیا ضرورت ہے کہ وہ ہر ماہ کی سیلری لا کر آپ کے ہاتھ پہ رکھیں۔ اگر آپ چاہتی ہیں کہ سال کے اس دن آپ کو آرام کرنے دیا جائے تو بینا اور فرح کو کیا مسئلہ ہے کہ ایک صبح فجر کے ٹائم اٹھ کر صفائی کر کے جاتی ہے۔ دوسری شام کو کچن کا سارا کام سنبھالتی ہے۔ وہ دونوں بھی مزے سے سال کے ایک دن کام کریں اور باقی دن آرام۔
اور میں..... میرا کیا دماغ خراب ہے سال کے 365 دن آپ کے دوپٹوں کی پیکو اور رنگائی کے لیے بازاروں میں خوار ہوتا رہوں' ایک پرفیکٹ میچنگ کے لیے گھنٹوں آپ کو بازار میں لے کر پھرتا رہوں۔ عینک کا فریم ٹوٹ جائے تو اسی وقت نیا بنوا کر لاؤں۔ روز سبزی لے کر آؤں اور جب آپ کو پسند نہ آئے تو واپس کروا کر اچھی اور تازہ سبزی لے کر آؤں۔ میرا کیا دماغ خراب ہے کہ ایک دن کا کام سال کے 365 دن میں ہی کرتا رہوں۔" اس نے کندھے اچکائے۔
"آپ کو اگر اس ایک دن کو منانے اور اسی دن آرام کرنے میں خوشی ملتی ہے تو ہمیں کیا اعتراض؟"
"بہت بولنا آ گیا ہے تمہیں' کسی مارننگ شو کے ہوسٹ کیوں نہیں لگ جاتے تم۔" امی نے پست آواز میں اس کے کندھے پہ دھپ مارتے ہوئے کہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ امی کو برا لگ رہا ہے' مگر وہ ایسا نہیں چاہتا تھا پر اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔
"امی!....." اس نے امی کے دونوں ہاتھ پکڑے۔
"کسی بھی بات پہ کہ وہ غلط ہے یا صحیح' قطع نظر اس کے آپ جانتی ہیں آپ کی اولاد کتنی فرماں بردار ہے۔"
امی کو بالکل ہی چپ لگ گئی تھی۔
قصور امی کا تھا نہ امی کی اولاد کا تھا۔ قصور اس روایت کا تھا جو کہ معاشرے میں رائج ہو چکی تھی
عثمان چند لمحے ان کے چہرے کو دیکھتا رہا۔
"اس ماں کو جانتی ہیں آپ جس نے اپنے "بچے" کے لیے "سعی" کی؟ لق و دق' تپتا' خاک اڑاتا صحرا' گرمی اور آگ برساتا سورج۔
اس ماں نے سات چکر لگائے۔ صفا و مروہ کے بیچ۔
سات چکر۔ بچہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر روتا رہا۔ ماں بے قراری سے چکراتی رہی اور پھر۔
پھر چشمہ پھوٹا۔ ایسا چشمہ جس کے لیے ماں کو "زم زم" کہنا پڑا۔
کیا چشمہ بچے کی ایڑیاں رگڑنے کی وجہ سے پھوٹا؟ نہیں امی۔
وہ ماں کی "سعی" کا اعتراف تھا۔ اللہ کی طرف سے۔ انعام تھا۔
دنیا میں اگر کوئی "مدرز ڈے" ہوتا نا امی! تو وہ اسی دن کو ہونا قرار پاتا کہ جس دن ایک ماں نے سعی کی تھی۔
دنیا میں اگر کوئی "فادرز ڈے" ہوتا نا امی! تو وہ اسی

دن کو ہونا قرار پاتا۔ جس دن صحرا کی تپتی ریت پہ ایڑیاں رگڑنے والا بچہ باپ کے ہاتھوں میں موجود چھری تلے تھا۔

میں یہ نہیں کہتا کہ یہ دن مت مناؤ۔ میرے لیے یہ اتنی بے ضرر سی چیز ہے کہ جو منانا چاہتا ہے۔ وہ منائے۔ جو نہیں چاہتا وہ نہ منائے۔ مگر ان سب باتوں سے پہلے ہم مسلمان ہیں امی۔ کسی بھی چیز کو اختیار کرنے سے پہلے، رک کر دیکھ لینا چاہیے کہ اسلام کیا کہتا ہے۔ میرا اپنا نقطہ نظر ہے جو مجھ سے کہتا ہے کہ۔ ہم مسلم ہیں۔ ہمارے اپنے طور طریقے ہیں۔ ہمارا مدرز ڈے ہوتا تو وہ ہی دن ہوتا کہ جس دن لاکھوں مسلمان صفا' مروہ کے درمیان دوڑتے ہیں۔ اور اس ماں کی ''سعی'' کو سلام کرتے ہیں' یاد کرتے ہیں۔

ہم مسلم ہیں۔ ہمارے اپنے طور طریقے ہیں۔ ہمارا فادرز ڈے ہوتا۔ تو وہ ہی دن ہوتا کہ جس دن لاکھوں مسلمان قربانی کرتے ہیں۔ اور باپ کے ''حوصلے'' کو سلام کرتے ہیں۔ اس سے بڑا کوئی طریقہ۔ کوئی رواج؟.... سنت سے بڑا کوئی رواج ہو سکتا ہے۔''

ہمارا وصف ''تابعداری'' ہے ہمیں حکم ہے کہ ''اف'' بھی نہ کیا جائے۔ اور ہم پہ فرض ہے کہ ماں ہو یا باپ ان کا ہر ''فرض'' ادا کیا جائے۔ اور ایک دن؟۔ یہ ایک دن کا کام نہیں ہے۔ ایک دن تک محدود نہیں۔

امی نے ایک دفعہ پھر سے آنسو پونچھے تھے۔ اور یہ دکھ کی وجہ سے ہرگز ہرگز نہیں تھے۔ انہوں نے اس کا ماتھا چوما تھا۔ فرط جذبات سے۔

''ماں'' ہونے کی عظمت ''سعی'' میں ہے ''باپ'' ہونے کا رتبہ ''قربانی'' میں ہے۔

اگر دنیا میں کوئی ''مدرز ڈے'' ہوتا تو۔
وہ ''سعی'' کا دن ہوتا۔
اگر دنیا میں کوئی ''فادرز ڈے'' ہوتا تو۔
تو وہ ''قربانی'' کا دن ہوتا۔

اور سعی کا انعام۔ زم زم۔ آج چشمہ نہ سہی۔ وہ اولاد ہی سہی جو میٹھے' ٹھنڈے پانی جیسی ہوتی ہے۔ اپنی ماں کے لیے۔ اپنے باپ کے لیے۔ زم زم۔

☆

ایمل رضا

تعویذِ حُب

وہ دلہن کے لباس میں تھی اور بدحواس سی گاڑی سے اتر کر بھاگتی ہوئی شہرام کے گھر پہنچی تھی۔ اس سے پہلے وہ سینٹرل پارک اور فالی ریسٹورنٹ میں اسے تلاش کر چکی تھی' وہاں نہیں ملا تو اس کے گھر پر آئی تھی۔ یہاں بھی اسے مایوسی ہوئی تھی۔ لینڈ لیڈی نے بتایا تھا کہ وہ اپنے ملک البانیہ واپس جا چکا ہے۔

بیانکا شہر کی مقبول ترین ڈی جے تھی۔ بظاہر خوش باش نظر آنے والی بیانکا کی روح میں گہرے زخم تھے جنہیں کوئی نہیں جانتا تھا۔

شہرام اس کے ہوٹل میں آیا اور ایک اتفاقی حادثے میں زخمی ہو گیا' تو اس کے بازو کی ہڈی میں فریکچر آ گیا۔

بیانکا شہرام سے پہلی نظر میں متاثر ہو جاتی ہے۔ وہ اسپتال میں اس کے لیے پھول رکھ کر جاتی ہے۔ شہرام جو محبت میں ناکام ہو کر بری طرح شکستہ ہے۔ اس مہربانی پر چونک جاتا ہے۔

بیانکا نے مختلف گانوں کے ردھم سے ایک میش اپ تیار کیا تھا۔ جوزف کا خیال تھا اس میں افسردگی کا رنگ غالب ہے۔ یہ رنگ بیانکا کا اصلی رنگ تھا۔ زندگی نے اس کے ساتھ بھی اچھا سلوک نہیں کیا تھا۔

بیانکا کے والد الیاس احمد پاکستان سے امریکا آئے تھے۔ انہوں نے یہاں محنت کر کے اپنا مقام بنایا پھر لبنان کی حیفہ سے شادی کر لی۔ اب دونوں کی ایک ہی بیٹی تھی۔ بیانکا' ساری جائیداد اس کے نام پر تھی۔

الیاس احمد نے پاکستان سے اپنے بھائیوں کو بھی امریکا بلا لیا تھا۔ الیاس احمد کی اچانک وفات ہو جاتی ہے۔ ان کے گلے پر ایک سرخ لکیر ہوتی ہے۔

الیاس احمد کی وفات کے بعد ان کے بھائی حیفہ اور بیانکا کو بلا کر کہتے ہیں کہ وہ الیاس احمد کی ساری جائیداد ان کے نام منتقل کر دیں۔ ان دونوں کے انکار پر وہ انہیں تہہ خانے میں بند کر دیتے ہیں۔ بیانکا کا چچا زاد احمد میڈیکل کا ریسٹورنٹ ہے۔

دوسری قسط

بیانکا کو شک ہے کہ وہ انہیں کھانے میں کچھ غلط دوائیں دے رہا ہے۔

شہرام سیرین کو ٹوٹ کر چاہتا تھا' وہ اس کی منگیتر تھی۔ منگنی کے بعد شہرام پڑھنے کے لیے امریکا چلا جاتا ہے۔ جب واپس آتا ہے تو سیرین بدلی ہوئی نظر آتی ہے۔ وہ شادی' محبت ہر چیز سے منکر ہو جاتی ہے۔ شہرام کو یقین ہو جاتا ہے کہ اس کے پیچھے کوئی لڑکا ہے۔ وہ اس کا پتا لگا کر اسے مارنے کا تہیہ کر لیا ہے۔

حیفہ اور بیانکا کو اس کے چچاؤں نے تہ خانے میں قید کر رکھا ہے۔

مکمل ناول

اس نے اپنی خوراک بستر مرگ پر پڑے ہوئے مریض سے بھی کم کردی تھی اور صبح شام نفرت کی اس کہانی کو بار بار اپنے ذہن میں دہرانے لگی تھی۔ کہانی کے اختتام تک وہ اس بات پر قائم بھی رہتی تھی کہ وہ کسی صورت کاغذات پر دستخط نہیں کرے گی۔ آج ان کی بچھائی بساط کے سارے مہروں نے بیانکا کی بساط کی ترتیب کو مات دے دی تھی۔

"کھانا کھالو بیانکا بیٹی..."

اپنی کھانسی کو اسے مزید پریشان نہ کرنے کی غرض سے روکے ہوئے مام اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہہ رہی تھیں۔ بیانکا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور حیفہ مام جیسے سانس لینا بھول گئیں۔

وہ رو نہیں رہی تھی۔ آنکھوں میں اتنی طاقت ہی نہیں رہی تھی بس نمکین پانی کی تہہ تھی جو آنکھ کی شفاف پتلی پر چڑھ گئی تھی۔ نیم اندھیرے میں یہ آنکھیں کسی پہاڑی قلعے پر واقع لائٹ ہاؤس کی طرح چمکتی تھیں اور ان آنکھوں سے بیک وقت شیر کی سی بہادری اور گیدڑ کی سی بزدلی جھلک رہی تھی۔

"اٹھو بیانکا..." آنسو ضبط کرتے ہوئے حیفہ مام نظریں چرا گئیں۔

بیانکا کو حیفہ مام کا چہرہ افسردہ کر گیا۔ دونوں بے بس تھیں۔ وہ دکھ سے حیفہ موم کی طرف دیکھنے لگی۔

"یہ... یہ کیا ہے؟" اچانک بیانکا ایک جھٹکے سے اٹھی تھی۔ حیفہ مام کی گردن کے نیچے دائیں طرف سرخ نشان کی ایک لمبی سی دھار تھی۔

"کیا...؟"

"یہ..." وہ حیفہ مام کو مزید روشنی میں لے گئی۔ یہ ہی نشان وہ ڈیڈ الیاس کی گردن پر بھی آخری وقت میں دیکھ چکی تھی۔ بیانکا نے خود کو تیزی سے پاتال کی طرف گرتے ہوئے محسوس کیا۔

"ہاں... مجھے بھی یہاں جلن سی ہو رہی ہے۔ میرے خیال سے تکیے کی سائیڈوں کی ڈوری ہے جس نے گردن پر یہ نشان چھوڑ دیا ہے۔"

حیفہ مام نے وضاحت دی تھی۔ بیانکا نے تیزی سے آگے بڑھ کر تکیہ اٹھایا تھا۔ تکیے کے ارد گرد واقعی موٹی ڈوری بنی ہوئی تھی۔

"کیا ہوا بیانکا...؟ اتنی پریشان کیوں ہو گئی ہو۔ صرف جلن کا نشان ہی تو ہے۔ خود بخود ٹھیک ہو جائے گا۔"

وہ بڑی دیر تک تکیے کو دونوں ہاتھوں میں تھامے ساکت رہی تھی اور جب اس نے پلکیں اٹھائی تھیں تو اس کی پتھرائی آنکھیں اور چٹان چہرہ حیفہ مام کو نظر آیا تھا۔ ان کو رونا آگیا تھا۔

"یہ... یہ..." وہ کچھ کہہ نہ سکی۔ اس کے تصور کی آنکھ بھٹکتے بہت دور نکل گئی تھی۔

ڈیڈ الیاس کا وجود اور اوپر کے پانچوں ابلیسوں میں سے کسی ایک کا تکیے سے ان کا منہ ڈھانپ دینا... کسی دوسرے کا ان کے بازو پکڑ لینا اور کسی تیسرے کا ان کی ٹانگیں... ڈیڈ الیاس ہاتھ پاؤں چلا رہے ہیں۔ بندھے ہوئے کسی جانور کی طرح جو ذبح ہونے کے لیے چھری دیکھ لیتا ہے' تڑپ رہے ہیں' لیکن ان کے چہرے سے تکیہ نہیں ہٹایا جارہا۔ ان پر ترس نہیں کھایا جارہا۔ وہ سانس ڈھونڈ رہے ہیں اور سانس کی ہلکی سے ہلکی ہوتی درز کسی اندھیرے غار میں بدلتی جارہی ہے۔ بالآخر غار کے آگے پتھر آجاتا ہے... گھپ اندھیرا... انسان کا مقسوم...

"بولو بیانکا... اللہ کے لیے کچھ تو بولو..."

وہ چونکی' لیکن بول نہ سکی۔ اس کا تصور ٹوٹ گیا تھا' لیکن اس حقیقی تصور کی ہیبت ختم ہونے میں نہیں آرہی تھی۔ اس کی پتھرائی آنکھوں میں پانی بھر آیا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دیتی اگر اسے حیفہ مام کے بھی ایسا ہی کرنے کا ڈر نہ ہوتا۔

"بیانکا دل کرے تو رو لیا کرو... لیکن خدا کے لیے اس طرح ساکت نہ ہو جایا کرو... یہ غار مجھے شاید نہ مار سکے' لیکن تمہاری ایسی صورت مجھے ضرور ختم کردے گی۔"

بیانکا نہیں چاہتی تھی کہ تصور کی جس آنکھ سے اس نے ڈیڈ الیاس کو تکیے تلے چہرہ دبے سانس اکھڑتے

اور لمحہ بہ لمحہ مرتے دیکھا ہے۔ حیفہ مام بھی اس کی زبان سے اس بھیانک تصور کو جا لیں۔

"کچھ نہیں۔۔۔ بس مجھے ڈیڈ الیاس کی یاد آ گئی تھی۔"

وہ حیفہ مام کی نظروں کی تاب سے پرے ہٹ گئی۔ ہونٹوں کو سختی سے بھینچ کر اور آنکھوں کو تیزی سے ایسے بند کرتے ہوئے کہ جیسے ان میں مرچیں بھر دی گئی ہوں اس نے ڈیڈ الیاس کے قتل کے راز کو دبانے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش نے اس کے چہرے کے سارے خدوخال کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا۔

"کھانا کھالو۔۔۔" حیفہ مام کہتی جا رہی تھیں۔۔۔ اور وہ دل ہی دل میں دھاڑیں مار مار کر رونے لگی تھی۔ جیسے ابھی ابھی اس نے ڈیڈ الیاس کی موت کی خبر سنی ہو۔

تب پہلی بار بیانکا کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ کسی مشکل میں گرفتار نہیں ہوئی ہیں' بلکہ اگر اس نے کوئی بھی فیصلہ کرنے میں دیر کر دی تو وہ ایک ایسے خونی کھیل کا حصہ بن جائیں گی جس میں دونوں طرف سے ان کا ہی خسارہ ہو گا۔

☼ ☼ ☼

"وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔"

مدہوش صبح کو کوئی پانی کے چھینٹے مار مار کر جگا رہا تھا۔ صاف آسمان پر قوس قزح کے ساتوں رنگ بکھرے تھے۔ یہ قوس کسی کمان کی طرح اور اس میں سے نکلنے والی شعاع کسی تیر کی طرح دکھتی تھی اور یہ تیر کمان سفید بالوں والے **قنطور** (آدھا انسان آدھا گھوڑا) کے ہاتھ میں تھی۔

"اس نے کل صبح مجھے بتایا۔"

شہرام نے آسمان پر ٹکٹکی باندھتے ہوئے کہا۔ طامیر کے گھر کے صحن میں پڑے بند پنجرے میں موجود رومالی کبوتروں کی غڑغوں اس آواز سے کہیں زیادہ تیز تھی۔

"تم اس کا کہا مان کیوں نہیں لیتے۔ تم واقعی اسے بھول کیوں نہیں جاتے۔ جو کچھ اس نے کیا قصوروار صرف وہ ہے۔ پھر تم کیوں خود کو اذیت دے رہے ہو۔" طامیر کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہرام کو کیسے سمجھائے۔

"وہ یہ کیسے بھول گئی کہ وہ میری منگیتر ہے۔۔۔ میری محبت۔۔۔ ایسی غفلت کا تو ایک لمحہ بھی گناہ ہوتا ہے اور دل بدل جانا لمحوں کی بات نہیں ہوتی۔ بہت دنوں تک انسان کے اندر کشمکش چلتی رہتی ہے۔ انسان جوڑ توڑ کرتا رہتا ہے۔"

شہرام کے تیور طوفان کی زد میں آئے درختوں کی طرح بگڑ رہے تھے اور طامیر کو ان بگڑتے ہوئے تیوروں سے بڑا خوف محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اسے گھنٹوں سمجھا سکتا تھا اگر اسے ذرا سا بھی یقین ہوتا کہ اس کی باتوں کو سنا ہی جا رہا ہے۔

"پورا ارجیر جانتا ہے کہ ہم دونوں کی منگنی ہو چکی ہے۔ ایسے میں اس کے قریب آنے کی جسارت کون کر سکتا ہے؟"

سورج کی شعاعیں تیکھی ہو گئی تھیں۔ اور تیر کمان سے نکل گیا تھا۔ معصوم **قنطور** سوچ سمجھ کر لگائے جانے والے ہدف کو بھیگی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا۔

"تم۔۔۔ تم اس لڑکے کو جانتے ہو طامیر۔۔۔؟ کسی پر شک ہے تمہیں؟"

شہرام کہتے ہوئے پلٹا تھا اور طامیر اپنی نظروں کے زاویے کسی ایک جگہ مرتسم نہ کر سکا تھا۔

"نہیں۔۔۔" بڑی مدھم آواز سے اس نے کہا۔ "تم نے سیرین سے ہی کیوں نہ پوچھ لیا۔"

"اس نے نہیں بتایا۔"

"یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جسے تم اتنی شدت سے جاننا چاہتے ہو۔ اس جان کاری میں تکلیف کے علاوہ اور کچھ بھی نہیں ہے۔"

"نہیں میں جاننا چاہتا ہوں۔" شہرام چلایا تھا۔ "اسے گریبان سے پکڑ کر جھنجوڑنا چاہتا ہوں۔۔۔ در حقیقت۔۔۔ در حقیقت میں اس لڑکے کو جان سے مار دینا چاہتا ہوں۔۔۔ جس نے سیرین کو بہکایا۔"

"تم اس لڑکے کو کیوں جان سے مار دینا چاہتے

ہو۔ اگر وہ قصوردار ہے تو سیرین بھی بے قصور تو نہیں۔"

زمین پر نظریں گاڑے گاڑے وہ اپنے عزائم میں جیسے ردوبدل کرنے لگا۔

"ہاں۔ ٹھیک کہا۔۔۔ سیرین بے قصور تو نہیں۔۔۔ ٹھیک ہے میں دونوں کو ماردوں گا۔۔۔ ختم کردوں گا۔۔۔ کم از کم اس طرح دنیا سے ایک بے وفا تو کم ہوگا۔۔۔ محبت کی بے قدری کرنے والا۔"

"اتنی شدت سے مت سوچو شہرام۔۔۔ ایسا رویہ تم پر نہیں جچتا۔"

"کیا تم میرا ساتھ دوگے؟"

"تم غصے میں ہو شہرام۔۔۔ بہتر ہے کہ تم امریکا واپس چلے جاؤ۔ یہاں تم پاگل ہوجاؤ گے بلکہ کسی حد تک ہوچکے ہو۔"

"مجھے اپنی یہ صورت حال قبول ہے۔۔۔ میں ٹھیک ہونا نہیں چاہتا۔"

طامیر نے دکھ بھری نظروں سے اپنے دوست کو دیکھا تھا۔

"اس لڑکے کو ڈھونڈو گے کیسے۔۔۔؟" بڑی دیر بعد اس نے پوچھا۔

"جب وہ سیرین سے ملنے آئے گا تب۔۔۔"

شہرام سب کچھ پلان کرکے بیٹھا تھا۔ اس بات نے طامیر کو مزید دکھی کردیا۔

☆ ☆ ☆
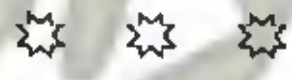
روشنی کی ایک لمبی تکونی لکیر تھی جو سنگ برج سیناں کی تختی کے اوپر بچھ کر ساکن تھی۔ بابا زلاری اسی روشنی کی لکیر کو دیکھ کر ٹھٹک کر رکے تھے۔ شاید ملازم آج اندر ریسٹورنٹ کی لائٹس کو بند کرنا بھول گئے تھے' لیکن پھر شٹر کو دیکھ کر وہ مزید پریشان ہوگئے تھے۔

شٹر کے دونوں طرف کے تالے غائب تھے۔ زنوبیہ کے ہوتے ہوئے کوئی ملازم اتنی بڑی غلطی کیسے کرسکتا ہے ارجیر ایک پرامن علاقہ تھا' چوری چکاری کا زیادہ ڈر نہیں تھا' لیکن احتیاط میں تو کسی بھی صورت کوتاہی نہیں ہونی چاہیے۔

دوپہر کو ریسٹورنٹ کے تالے کھولتے وقت تالوں کو شٹر کے آہنی کنڈوں میں اٹکا دیا جاتا تھا۔ رات گئے جب ریسٹورنٹ بند ہوتا تو شٹر کے ساتھ تالے بھی واپس نیچے آجاتے تھے۔ اس طرح تالا لگانے میں چوک چاہ کر بھی نہیں ہوسکتی تھی۔

تو کیا اندر چور تھے؟

دیوار کے ساتھ جڑ کر انہوں نے شٹر کے ساتھ کان لگادیے۔

کچھ مبہم سی آوازیں تھیں۔ اندر ہی کہیں سے آتی ہوئی پر جو بھی گفتگو ہورہی تھی بہت غصے اور تیزی سے ہورہی تھی۔ بڑی دیر تک وہ گفتگو کی نوعیت کو سمجھ نہ پائے۔ پھر انہوں نے ایک آواز کو پہچان لیا تھا۔

وہ شہرام کی آواز تھی۔ تب گفتگو کی نوعیت بھی ان کی سمجھ میں آنے لگی۔

ہلکے سے شٹر کے کنڈے پر ہاتھ ڈال کر انہوں نے اسے اوپر اٹھا ڈالا۔

اسٹور روم کا دروازہ کھلا ہوا تھا۔ شہرام اور طامیر کی آوازیں وہاں سے ہی آرہی تھیں۔ اندر جانے سے پہلے وہ سب کچھ جان لینا چاہتے تھے۔

طامیر کرسی پر جھکا بیٹھا تھا اور شہرام زمین پر پڑی "سان" پر کوئی پرانا خنجر تیز کرنے میں مصروف تھا۔

"تو تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو؟" ایک آہنگ نرمی سے بابا زلاری نے پوچھا۔ دونوں نے چونک کر بابا زلاری کو دیکھا۔ شہرام کے کام کرتے ہاتھ رک گئے تھے اور اس کی جھکی آنکھیں اٹھ کر دوبارہ مزید نیچے تک جھک گئی تھیں۔

"بولو۔۔۔ تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو۔۔۔ تم قاتل بننے جارہے ہو۔"

شہرام کچھ نہیں بولا تھا اور طامیر اپنے اندر نظریں چار کرنے کی ہمت نہیں پاتا تھا۔

"جو لفظ تمہیں اتنی شرم دلا رہا ہے۔ اتنا ہیبت ناک ہے کہ تم اس کی تصدیق بھی نہیں کرپارہے۔۔۔ وہ عمل

تم کیونکر کر گزرو گے؟"

"ہاں' انہوں نے مجھے دکھ دیا ہے... میری زندگی کا سب سے بڑا غم دیا ہے... مجھے اس جنون میں مبتلا کرنے والے وہ دونوں ہیں... میں اکیلا اس آگ میں جلنا نہیں چاہتا... مجھے راکھ کے ڈھیر میں دھنسا کر وہ دونوں خوش نہیں رہ سکتے... میں ان سے ان کی ہر خوشی چھین لوں گا... میں دونوں کو ختم کر دوں گا۔"

شہرام نے تیزی سے کہا تھا' لیکن اس کے ہاتھ گزشتہ کام پورا کرنے کے لیے حرکت نہ کر سکے تھے۔

بابا زلاری اور طامیر نے بے ارادہ ایک دوجے کی طرف دیکھا تھا۔ دونوں دکھ کی وہ کیفیت محسوس کر رہے تھے جو کسی اپنے کی اذیت پر آنکھوں میں نجانے کہاں سے امڈ آئی ہے۔

"تم ہونہار تھے... مجھے دکھ ہوا کہ تم بھی فریبی جذبوں کے پجاری نکلے... کیا اس طرح تمہارے دل کو قرار آجائے گا؟"

"پتا نہیں... لیکن اس بے قراری سے بہت بہتر کہ میں آنے والے وقت کے قرار کو حاصل کرنے کے لیے اپنی سوچ پر عمل در آمد کر گزروں۔"

"حالانکہ وہ قرار سراسر شک پر مبنی ہے۔"

"آپ میں اور ہم میں یہ ہی تو فرق ہے بابا... آپ کی تعلیم اس قدر مستند ہے کہ ہماری اسناد اس کے آگے خود بخود ہی رد ہو جاتی ہیں۔ بہتر ہے آپ مجھے جاہل ہی رہنے دیں۔" شہرام تلخی سے بولا تھا۔

"اور اگر پھر بھی تم مطمئن نہ ہوئے تو؟"

"تو میں... میں خود کو ختم کر لوں گا۔"

"تمہاری چھٹیاں کل ختم ہو جائیں گی... تم امریکا واپس چلے جاؤ... وہاں جا کر سکون سے سوچ... یقیناً وقت گزرنے کے ساتھ تم اپنی آج کی سوچ پر پچھتاؤ گے... تمہاری ماں کی حالت بھی مجھ سے دیکھی نہیں جاتی... اس نے اب "سلی" کہنے پر چڑنا بھی بند کر دیا ہے۔ وہ تمہارا دکھ نہیں دیکھ سکتی اور میں غم زدہ حالت میں اس کو... اس کے کباب بھی اب جلنے لگے ہیں۔ اس کا بیس سال کا تجربہ رائیگاں ہو رہا ہے۔ ان میں اب کوئی خوشبو نہیں آتی... آنسوؤں کی نمی کا گمان غالب رہتا ہے... کسٹمرز شکایت کرتے ہیں تو وہ آگے سے رونے لگتی ہے... اس کے بس میں تمہارے لیے کرنے کو کچھ ہوتا تو وہ ضرور کر گزرتی... وہ سیرین کو غلام کی حیثیت سے خرید لیتی... چاہے... چاہے بدلے میں ساری زندگی خود اس کی غلام بن جاتی' لیکن افسوس یہ دل کے رجحان کسی کے کہنے سے نہیں بدلتے... ان پر ازل سے اللہ ہی غالب رہا ہے... اس لیے ہمار... [illegible] ر تمہارے لیے یہ ہی بہتر ہوگا کہ تم کل واپس چلے جاؤ... جو بے وفا ہے اس کے لیے اپنی زندگی اپنا کیریئر داؤ پر مت لگاؤ۔"

ان سب باتوں کا شہرام پر الٹا ہی اثر ہوا تھا۔

"آپ کے لیے یہ سب کہنا آسان ہے بابا... کیونکہ آپ کی زندگی میں اماں زیتو سیہ جیسی خاتون رہی ہیں' جنہوں نے ہمیشہ ہر مشکل کو آپ تک پہنچنے سے پہلے خود پر سہا ہے... آپ پر ہر مشکل... ہر غم چھن کر پہنچا ہے بابا... اس لیے آپ میرے غم کا اندازہ بھی نہیں لگا سکتے... میرا دل درد سے پھٹا جا رہا ہے اور آپ چاہتے ہیں کہ میں یہاں سے چلا جاؤں... کیا آپ ایک بیٹے کا پاگل ہو جانا برداشت کر پائیں گے... بولیے... بولیے بابا..."

"تم پاگل نہیں ہو گے... محبت میں سیاہ چوغہ پہن لینا آسان نہیں ہوتا... یہ پہن بھی لو تو نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

"آپ کہتے تھے نا کہ عورت سلی ہے۔ چھوٹے وار کرنے والی اور مرد سان ہوتا ہے پھر مجھے مرد بننے دیں بابا... مجھے بڑا وار کرنے دیں۔" شہرام کی آنکھوں میں نمی بھر گئی تھی۔

اب بابا زلاری کچھ نہیں بولے تھے۔ شہرام کی آنکھوں کی نمی دیکھ کر ان کی اپنی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے تھے۔ طامیر بھی زمین پر بچھی جاجم کے جال کو کھوجنے لگا تھا۔

پھر بابا زلاری بھی شہرام کے ساتھ زمین پر بیٹھ گئے اور خنجر کو انہوں نے شہرام کے ہاتھ سے لے لیا۔

”کیا تم اتنے بہادر ہو؟“ خنجر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے پوچھا تھا۔ ”بدلہ تمہاری سرشت میں شامل نہیں ہے شہرام..... تمہیں تو گلہریوں جن سے تم اتنی نفرت کرتے ہو ان پر بھی ترس آجاتا ہے۔“

”اب میں وہ بزدل شہرام نہیں رہا۔“ وہ دو ٹوک گویا ہوا۔ بابا زلاری کی مداخلت اسے اب بری لگنے لگی تھی۔

”بے خوفی بعض اوقات بے ضمیر بھی کردیتی ہے..... یہ بڑی تشویش ناک حالت ہوتی ہے۔ پھر اب تو میں بھی تمہاری اس بے خوفی کو دیکھنا چاہوں گا۔ تمہاری ہمت اور جرات کو پرکھنا چاہوں گا۔“

خنجر کو ٹیڑھا کرکے بابا زلاری نے اس کی دونوں طرف کی دھار کو باری باری انگلی کی پور سے چھو کر جانچا تھا اور پھر شہرام کو واپس پکڑایا تھا۔

”اس طرف سے دھار کو تھوڑا اور تیز کرو شہرام..... ! کسی اپنے پیارے کے سینے میں خنجر اتارنے کے لیے ہمارا جنون صرف چند لمحوں کا ہی ہوتا ہے..... اگر تم نے اس طرح عجلت میں کام کیا تو وہ بھی تڑپتے رہیں گے اور تم بھی..... بہتر ہے کہ کوئی ایک تو تسلی حاصل کرے۔“

بابا زلاری نے بڑے پتے کی بات بتائی تھی اور سان پر خنجر کی رگڑ کی آواز دوبارہ پھیلنے لگی تھی۔

☼ ☼ ☼

تہہ خانے کی دیواریں کچھ مزید تنگ ہوگئی تھیں۔ اور چھت اور فرش نے آپس میں مل جانے کی ٹھان لی تھی۔ ایسے میں حیفہ مام کی آواز اس کھنکھناتے سکے کی مانند تھی جو کسی دھاتی ڈبے میں اندر ہی اندر کہیں بجتا چلا جارہا ہو۔

”مجھ سے وعدہ کرو بیانکا..... تم ایسا ہرگز نہیں کروگی۔“

حیفہ مام نے اپنی کھانسی ضبط کرکے رکاوٹ اور لق زدہ آواز میں کہا تھا۔ یہ جملہ بولنے کے لیے انہیں اپنی بہت سی قوتوں کو یکجا کرنا پڑا تھا۔ جیسے اس ننھے سے تہہ خانے میں ایک جگہ بیٹھے رہنے کے باوجود بھی ان کے پیروں پر چھالے پڑ کر درد کرنے لگے ہوں۔

”چاہے کچھ بھی ہوجائے..... میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے..... تم ان لوگوں کو ایک پینی بھی نہیں دوگی۔“

رک کر حیفہ مام نے اپنا سانس درست کیا۔ دوبارہ بولنے میں انہیں کئی زمانے بیت گئے۔

”یہ سب الیاس نے صرف محنت سے نہیں بنایا..... ان ساری چیزوں میں اس کے ہاتھوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ میں ان چیزوں کو کبھی ان کے ناپاک ہاتھوں میں جاتے ہوئے برداشت نہیں کرپاؤں گی۔“ اب حیفہ مام باقاعدہ بے قاعدہ طریقے سے رونے لگی تھیں۔

”وعدہ کرو بیانکا تم ایسا کچھ بھی ہرگز نہیں کروگی..... ایسی سوچ کو بھی گناہ سمجھو گی۔ یہ لوگ شیطانی حربے آزما رہے ہیں ان کو آزمانے دو..... یہ مزید کیا کریں گے..... کیا تمہیں اور مجھے قتل کردیں گے..... کسی کو قتل کرنے کے لیے بڑی ہمت چاہیے اور یہ لوگ اتنے ہی بزدل ہیں۔“

وہ خاموشی سے اور بھیگی آنکھوں سے حیفہ مام کی باتیں سنتی رہی۔ اس نے حیفہ مام کی غلط فہمی دور کرنے کی کوشش نہیں کی تھی کہ یہ لوگ کس حد تک نڈر اور جرات مند ہیں اور یہ کہ ان کی بہادری گناہ کے درجوں پر فائز ہوچکی ہے۔

سردی دن بدن بڑھنے لگی تھی۔ موسم میں ایک دم سے ہی شدت آتی جارہی تھی۔ پہاڑی علاقوں پر برف باری کا آغاز ہوچکا تھا۔

اس صبح جب پہلے زینے پر کھانا رکھا گیا تو بیانکا نے تقریباً ”چیخ کر اور التجا آمیز لہجے میں مزید کمبلوں کا مطالبہ کیا تھا۔ اسے خود کی تو کوئی پروا نہیں تھی، لیکن حیفہ مام روز بروز کمزور ہوتی جارہی تھیں اور چھال اترے سفیدے کی طرح سفید..... ایک ایک لحاف ان دونوں کے لیے ناکافی تھا۔ وہ دونوں لحاف اکٹھے بھی جوڑ کر

سوتی تب بھی سردی کپکپاہٹ رکنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ ان کی جھریوں زدہ نحیف آنکھوں میں کاجل کی کالی دھار سلوٹوں میں بٹ گئی تھی۔

پندرہ دنوں کے گزرتے وقت نے ہر آس کو ختم کر دیا تھا۔

دوپہر کے وقت جب پھر کھانا رکھا گیا تو بیانکا نے دوبارہ کمبلوں کا مطالبہ کیا۔

اور رات کے کھانے پر اسے جواب مل گیا۔

کسی طرح کی امید رکھنا عبث تھی۔۔۔ ہاں ٹھیک کہا تھا ان لوگوں نے کہ وہ کسی فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام نہیں کر رہیں۔ وہ ان دونوں کو جب چاہے ختم کر سکتے ہیں۔"

پھر ساری رات حیضہ مام کی بندش زدہ کھانسی سنتے رہنے کے بعد اس نے دل کڑا کر کے رات ہی رات میں ایک فیصلہ کر لیا تھا۔

"مام کو میڈیسن کی ضرورت ہے۔۔۔" اس نے دروازے کی نچلی ہٹی ہوئی درز سے منہ لگا کر کہا تھا۔ تختی دوبارہ لگانے والے ہاتھ تھوڑی دیر کو رکے تھے۔

"ان کی طبیعت بہت خراب ہو رہی ہے۔"

اپنی بات پر توجہ دیے جانے پر وہ مزید جوش سے چلائی۔ اب کے رکے ہوئے ہاتھ تختی کو دوبارہ چوکھٹے میں لگانے لگے تھے۔

"میں ایک بڑی رقم دینے کے لیے تیار ہوں۔"

اس نے آخری ہتھیار چلایا۔ رات ہی اس نے یہ فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ ایک بڑی رقم ان سب کے منہ پر دے مارے گی اور وہ کتوں کی طرح اس کی پھینکی ہڈی پر قناعت کر لیں گے۔ دروازہ کھول کر اسے باہر بلایا گیا تھا۔

بڑے دنوں بعد۔۔۔ جیسے ایک عرصے کے بعد وہ تازہ کھلی فضا میں آئی تھی۔

حیضہ مام تہہ خانے میں بند نہ ہوتیں تو وہ کسی بھی طرح یہاں سے بھاگ جانے میں کامیاب ہو جاتی چاہے اسے ان پانچوں کو قتل ہی کیوں نہ کرنا پڑتا۔

"تم اتنی بے وقوف نہیں ہو جتنی تمہاری ماں۔۔۔ تم یقیناً" سمجھتی ہو کہ بھائی زندہ ہوں تو مرے ہوئے بھائی کی دولت پر ان بھائیوں کا حق زیادہ ہوتا ہے۔" تایا غفار نے کہا تھا۔

"مام کی طبیعت خراب ہے۔۔۔ انہیں ڈاکٹر کے پاس جانے کی ضرورت ہے۔" وہ ان پانچوں کے ہجوم میں کھری صوفے پر بیٹھی لاحاصل مطالبہ کر رہی تھی۔

"یہ اب تم پر منحصر ہے کہ تم ساری صورت حال کو کس رخ پر موڑتی ہو۔" تایا غفار نے کاغذات نکال کر ایک بار پھر اس کے آگے رکھے تھے۔

"میں ایک بڑی رقم دے سکتی ہوں، لیکن میں ان کاغذات پر سائن نہیں کروں گی۔"

"بے وقوفی کرو گی۔۔۔"

"ایک جوتی ماریے اس کے منہ پر، کیسے نہیں مانے گی یہ۔" چاچی فیروزہ نے کہا تھا۔

"اپنی ماں پر گئی ہے۔۔۔ ڈھیٹ، کمینی، مکار، حرافہ۔۔۔" تائی شہناز بھی بولی تھیں۔ انہیں حیضہ سے سالوں کی خار تھی۔

"ڈھیٹ، کمینی، مکار، حرافہ۔۔۔" اسے یہ چاروں وصف خود میں اور اپنی مام میں ڈھونڈنے سے بھی نظر نہیں آتے تھے۔

"ہم تم پر کوئی ظلم نہیں کر رہے۔۔۔"

وہی پرانی بات۔۔۔ پتھرائی آنکھوں والے اندھے لوگ۔۔۔

بیانکا غم سے ان کی طرف دیکھنے لگی۔

"تمہارے پاس حیضہ کا اپارٹمنٹ اور بینک بیلنس۔۔۔"

"بس کیجیے بھائی صاحب۔۔۔ بہت سمجھالیا اس حرافہ کو۔"

چچا جلال نے تایا غفار سے کہا تھا۔ پھر انہوں نے بیانکا کے بال پکڑ کر اسے جیسے نیند سے جگایا تھا۔ اس اچانک حملے کے لیے وہ تیار نہیں تھی۔ ایک کراہ اس کے حلق سے نکلی۔

"حرام زادی کرو دستخط۔۔۔" وہ تکبر سے چلائے تھے۔

"حرام زادی۔۔۔" وہ اس لفظ کا مطلب نہیں جانتی

تھی ورنہ اسی وقت مرجانے کو ترجیح دیتی۔
"نہیں کروں گی۔۔۔" وہ اپنے بال چھڑانے کے لیے مزاحمت کرنے لگی۔
"تیل چھڑک کر آگ لگا دو اس کو اور اس کی ماں کو بھی۔۔۔" شہناز نے کہا۔
"آخری بار پوچھ رہا ہوں۔۔۔ یہاں سائن کرو گی یا واپس نیچے جاؤ گی۔"
احمد آگے بڑھ کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر پوچھنے لگا تھا۔ قدرت کے نظام میں اس کے انجام کو دیکھ کر ایک استہزائیہ مسکراہٹ بیانکا کے لبوں پر آئی تھی۔ احمد نے اپنی دانست میں اس مسکراہٹ کو انکار سمجھا تھا۔ بالکل صحیح سمجھا تھا۔
"پھر مرو اپنی ماں کے ساتھ۔۔۔"
ایک جھٹکے سے اٹھ کر اس نے بیانکا کے بال پکڑے تھے۔ پھر گھسیٹتا ہوا واپس تہہ خانے پر لایا تھا اور سیڑھی سے نیچے لڑھکا دیا تھا۔ ایک بار پھر تعفن زدہ تہہ خانے کی فضا نے اس کا دم گھونٹ دیا تھا۔
فٹ بال کی طرح سیڑھیوں سے لڑھک کر گرتے ہوئے وہ نیچے جا کر ساکت ہو گئی تھی۔ مام نے جلدی سے آگے بڑھ کر اسے سنبھالا تھا۔ پھر دونوں ایک دوسرے کے گلے لگ کر رونے لگی تھیں۔
"تم نے ایسا کیوں کیا بیانکا۔۔۔ جو لوگ خود ہاتھوں میں کاسہ لیے ہوئے ہوں وہ کسی دوسرے کی التجا کب سنیں گے۔۔۔ تمہیں میرے علاج کی بھیک نہیں مانگنی چاہیے تھی۔۔۔ ابھی میں اتنی بھی کمزور نہیں ہوئی۔"
بڑی دیر تک روتے رہنے کے بعد حیفہ مام نے اس سے کہا تھا۔ ہمت نہیں ہارنا میری بچی۔۔۔ گھبرانا نہیں۔۔۔ ورنہ تمہارے ڈیڈ الیاس کی روح برا مان جائے گی۔"
"مجھے اپنے سے زیادہ آپ کی فکر ہے مام۔" وہ مزید رونے لگی۔
"میری فکر نہ کرو میری بچی۔۔۔ میں ٹھیک ہوں۔۔۔ لیکن تم ایسا کرنے کا دوبارہ نہ سوچنا۔۔۔ میں مر کر بھی ایسا نہیں ہونے دوں گی۔"

حیفہ مام کے ان الفاظ نے بیانکا کے اندر ایک نئی ہمت اور طاقت پیدا کی تھی۔ آنسو خشک کر کے وہ ایک نئے عزم سے سوچنے لگی تھی۔
اگلے دن صبح اس کے سارے عزائم رخصت ہو گئے تھے۔

ساری رات بیانکا جاگتی رہی تھی اور حیفہ مام بھی۔۔۔ کھانسی کو ضبط کرتے کرتے جب وہ نڈھال ہو جاتی تھیں تو اپنا منہ لحاف کے اندر تک لے جاتی تھیں۔
پھر جب صبح کی پہلی کرنیں تہہ خانے کے اندر اترنے لگیں تو ایک منظر نے بیانکا کا سارا وجود تاریک کر دیا تھا۔
حیفہ مام کا لحاف خون آلود تھا۔
وہ دیوانہ وار دروازے کی طرف بھاگی تھی۔۔۔ اور دونوں ہاتھوں سے دروازہ بجاتے ہوئے وہ پوری جان لگا کر چلائی تھی۔
"میں سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔ میں سائن کرنے کے لیے تیار ہوں۔"
اسے زیادہ دیر تک چلانا نہیں پڑا تھا۔ دروازہ تھوڑی دیر بعد ہی کھل گیا تھا۔

وہ رات حاملہ تھی۔۔۔ ان گنت اندھیروں سے۔
اماں زیتونیہ نے اسے منع کیا تھا کہ وہ آج کی رات گھر سے باہر نہ نکلے۔ وہ ہر روز صرف آج کی رات پر خاص تاکید کیا کرتی تھیں۔ شہرام جانتا تھا کہ یہ آج کی رات کل بھی آئے گی۔ وہ بہانے بہانے کی گئی ان تاکیدوں کو بھلا اب کہاں سننے والا تھا۔
اس کی چھٹیاں ختم ہوئے کافی دن گزر چکے تھے۔ لیکن وہ واپسی کا فی الحال کوئی ارادہ نہیں رکھتا تھا۔ گزشتہ کافی دنوں سے اس کی سرگرمیاں بھی بڑی حد تک پر اسرار ہو گئی تھیں یا کم از کم اماں زیتونیہ کو ایسا ہی لگتا تھا۔ اس کے ہر دفعہ رات گئے گھر واپس آنے پر بابا زلاری کی نظروں سے ایک ہی سوال عیاں ہوتا تھا۔
"تو ہو گئی تسلی؟"
اور شہرام کی آنکھوں میں دہکتے خونی گلابوں کو دیکھتے

ہوئے انہیں جیسے خود ہی جواب مل جاتا تھا۔
"نہیں.... ابھی نہیں.... ورنہ ان روشن آنکھوں سے جھلکتی بدلے کی آگ بجھ چکی ہوتی۔"
ان دس دنوں میں وہ رات دن سیرین کے گھر کے باہر پہرہ دیتا رہا تھا۔
دروازے کے بند کواڑ آج بھی اس کی نظروں کے سامنے تھے۔ ان دس دنوں میں نہ تو کوئی وہاں اپنے نقب کی یاد تازہ کرنے آیا تھا اور نہ ہی سیرین کسی سے ملنے کہیں باہر گئی تھیں۔ شہرام کو اب بے زاری ہونے لگی تھی۔ لیکن اسے اپنے دل کی بے چینی کو ختم کرنے کے لیے مستقل مزاجی سے کام لینا تھا۔
ہوا کی خنکی اس کے بھاری کوٹ کی نہ جانے کس درز سے اندر آ کر اسے سن کر رہی تھی۔ اس کے اس کوٹ کی اندرونی جیب کے اندر صیقل کیا ہوا خنجر بھی موجود تھا جس کی ٹھنڈی سطح پر شہرام کے ہاتھ بار بار ٹکراتے تھے۔
اس کے شکوک و شبہات بھی کچھ کچھ اس خنجر کی طرح ہی ٹھنڈے ہو گئے تھے۔ وہ سوچنے لگا تھا کہ شاید سیرین کی زندگی میں کوئی نہ ہو اور اس نے اپنی ہی کسی ذہنی سوچ کے تحت شہرام کو چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا ہو۔
شہرام نے سر اٹھا کر چاند کو دیکھا.... چاند اور اس کا سرا اوس سے تر تھا چودھویں کا چاند صنوبر کے درختوں کی کالی بھیانک شاخوں سے جھلکتا پوری آب و تاب سے چمک رہا تھا۔ اوس اور خنکی کے باعث اس پر غنودگی اور تھکن طاری ہونے لگی تھی۔ وہ اس کھیل سے تنگ آنے لگا تھا۔
طامیر نے اسے صرف اتنا ہی بتایا تھا کہ وہ جو کوئی بھی ہے رات کے اندھیرے میں سیرین سے ملنے آتا ہے۔ اور وہ سام (زہر دینے والا) ان دس دنوں میں ایک بار بھی نہیں آیا تھا۔
شہرام آج رات بھی ناکام و نامراد ہو کر واپس گھر جانے کے ارادے باندھنے لگا تھا۔ تب ہی دو عمل ایک ساتھ ہوئے تھے۔
چاند گرہن کے شکم میں داخل ہونے لگا تھا۔
اور دلکی چال سے آتے سرسراتے قدموں کی چاپ شہرام کے کانوں میں پڑنے لگی تھی۔
خشک گھاس اور اکڑے پتوں سے ڈھکی پگڈنڈی پر کوئی بڑے سبج سبج کر قدم رکھ رہا تھا۔ اور مردہ پتے ایک چور کی آمد کا اعلان چیخ چیخ کر کر رہے تھے۔ شاید وہ سوکھے پتے مر کر بھی ارجیر کی پرامن سرزمین سے باوفا تھے۔ اور اس نقب زنی کی واردات کے کسی صورت طرف دار نہیں بن پا رہے تھے۔
شہرام کو ایک ایک پیڑ چلاتے ہوئے محسوس ہوا۔ درختوں، شاخوں، پتھروں، پانی کے قطروں پر کسی نے جیسے اسے اشارہ دیا۔" وہ آ رہا ہے.... وہ، تمہارا مجرم...!"
پھر رفتہ رفتہ قدموں کی سرسراہٹ قریب آنے لگی۔ اندھیرے سے نتھرا ایک انسانی ہیولا اسے دکھائی دیا۔
گرہن رفتہ رفتہ بڑھنے لگا تھا وہ انسانی ہیولا شہرام کی نظروں کے مدمقابل سیرین کے گھر کے دروازے کے سامنے تک گیا۔ شہرام نے اپنے جسم کا بال بال کھڑا ہوتا ہوا محسوس کیا تھا۔
شجر صفت گہرے سائے نے بند چوبی دروازے پر دستک دی تھی۔ ایک، دو.... تین بار.... خاص انداز سے....
کوٹ کے اندر موجود خنجر پر شہرام کی گرفت مضبوط ہو گئی۔ لیکن اس کا دل کسی صورت مضبوط نہیں ہو تا تھا۔
گرہن مکمل ہو گیا اور سیرین کے گھر کا دروازہ کھل گیا۔
دو انسانی جسم جن میں ایک مرد تھا اور دوسری عورت، چند لمحے ایک دوجے کو دیکھتے رہنے کے بعد کل دار گڈوں کی طرح ایک دوجے سے دیوانہ وار لپٹے تھے۔
شہرام کو اپنا سانس درست کرنے میں جیسے ایک صدی بیت گئی تھی۔ سیرین اکیلی نہیں رہی تھی اس کی زندگی میں واقعی کوئی اور آ چکا تھا۔ اس بات پر ایمان

لے آنے کے بعد یک لخت شہرام کے دل کی دھڑکنیں اِدھر اُدھر کر بکھر گئیں۔

اس کی محبت پانی پر لکھی تحریر تھی ' اس سوچ نے اسے زخمی کر دیا۔

دروازے کے پار صحن کے اندر ایک قندیل جل رہی تھی ' جس کی مدھم گلابی روشنی پورے صحن میں پھیلی ہوئی تھی۔ سیرین پیچھے ہوتے ہوئے اس قندیل کے نیچے جا کھڑی ہوئی۔

اور شہرام آگے ہوتے ہوئے ایک بڑے پتھر پر چڑھ گیا۔ نقب زن نے اپنے سیاہ کوٹ کا کالر گردن سے اوپر اٹھا رکھا تھا وہ اس کی شکل نہیں دیکھ پا رہا تھا۔

دونوں قندیل کے نیچے کھڑے تھے۔ وہ دونوں کیا کر رہے تھے ' اس میں دو رائے قائم کرنے کی گنجائش باقی نہیں رہی تھی۔ مدھم گلابی روشنی یہ منظر بڑی وضاحت سے دکھا رہی تھی۔

دونوں جو آپس میں گم تھے .... رکے .... چند القابات کہے گئے اور پھر ایسے گم ہو گئے جیسے ناگ اور ناگن بہار میں ہوتے ہیں۔ ایک ہوک شہرام نے اپنے دل میں اٹھتی محسوس کی۔

چودھویں کا روشن چاند رفتہ رفتہ گرہن کے ظرف سے باہر جھلکنے لگا تھا۔ قندیل کی روشنی اور خنجر کی سطح سرد تر ہو چکی تھی۔

پھر اونچے کالر کے کوٹ والا تاریک انسانی ہیولا گھوما تھا۔ اب سیرین کی پشت شہرام کی طرف تھی اور اس آدمی کا چہرہ شہرام کے روبرو .... لیکن دور .... بڑے توقف اور دل کی تسکین کے بعد کالر والا سر اوپر کو اٹھا تھا .... اور دودھیا روشنی نے اس چہرے کو منعکس کیا تھا۔

اور پھر دو عمل ایک ساتھ ہوئے تھے۔

درد کا ایک گولا تھا جو شہرام کے اندر پھٹا تھا اور اس کے پیروں کے نیچے موجود پتھر سرک گیا تھا شہرام پھسل کر منہ کے بل گرا تھا۔

وہ نقب زن .... سام .... اس کا مجرم .... اس کے حق پر ڈاکا ڈالنے والا .... وہ کوئی اور نہیں تھا وہ حسنی تھا ....

دلائی حسنی زلادی .... شہرام کا سگا بھائی۔

شہرام کے دل نے کسی بارودی سرنگ کی طرح پھٹنا شروع کر دیا ' چاند ایک بار پھر گہنانے لگا ' ہمیشہ کے لیے اور اس رات میں اسقاط ہوا .... ان گنت روشنیوں کا۔

☆ ☆ ☆

حیفہ مام کو تہہ خانے سے باہر نکال لیا گیا تھا۔

بیانکا نے دستخط کر دیے تھے۔ جہاں جہاں ان کو درکار تھے۔ فی الحال اس کے ذہن میں حیفہ مام کی سلامتی سے زیادہ بڑھ کر اور کوئی چیز نہیں تھی .... دستخط لینے کے بعد وہ لوگ کسی بھی طرح کے علاج سے مکر بھی سکتے تھے ان سے یہ امید زیادہ عبث نہیں تھی ' لیکن بیانکا کو اب یہ جوا کھیلنا تھا .... پوری طرح سے .... اپنا سب کچھ داؤ پر لگا کر .... اور اس نے اپنا سب کچھ داؤ پر لگا دیا .... حیفہ مام کی کی گئی تاکید اور نصیحت کی پروا کیے بغیر .... ان کی التجا کو نظر انداز کر کے۔

تہہ خانے سے باہر نکلنے کے بعد حیفہ مام کہاں تھیں۔ یہ بیانکا نہیں جانتی تھی۔ ان کا علاج ہو رہا تھا۔ اس بات کا بھی اسے صرف اندازہ ہی تھا۔ وہ بدستور اسی تہہ خانے میں بند تھی۔ جائیداد منتقلی کے سارے عمل تک اسے یہاں ہی رہنا تھا۔

اس کے بے حد اصرار پر ان سات دنوں میں صرف دو بار سیل فون پر اس کی بات حیفہ مام سے کروائی گئی تھی۔ کمزوری حیفہ مام کی آواز سے جھلکتی تھی ' تاہم انہوں نے بیانکا کو تسلی دی تھی کہ ان کا علاج ہو رہا ہے۔ کہاں ہو رہا ہے ' یہ بات وہ نہ بتا سکی تھی۔ بیانکا کو حیرت تھی کہ حیفہ مام جہاں بھی ہیں ' آخر خود کسی طرح سے باہر نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کر رہیں۔

اس کی سوچ کمزور تھی۔

جو لوگ انہیں قید کرنے کے لیے دنوں یا شاید مہینوں منصوبے بناتے رہے تھے ' وہ کیا حیفہ مام کو کسی بڑے ہسپتال لے گئے ہوں گے؟ تاکہ ان کی ساری محنت ' ساری چال بازی پر پانی پھر جائے۔ پھر ایک خیال

اچانک سے بیانکا کے دماغ میں آیا۔
"احمد میڈیکل کا اسٹوڈنٹ ہے۔"
تو کیا مام کا علاج اوپر کے ہی کسی کمرے میں ہو رہا ہے۔ ایک نا تجربہ کار اور شیطان صفت انسان کے ہاتھوں۔۔۔؟

سوچ کر ہی بیانکا کا سر گھومنے لگا۔
لیکن اس چیز نے اسے اطمینان دلائے رکھا کہ کالے اور سرخ سرکل میں ایک خانہ ہرے رنگ کا بھی ہوتا ہے۔ جو زیادہ تر جواریوں کی نظروں سے چھپا ہی رہتا ہے۔
ابھی صرف کاغذات پر دستخط ہوئے تھے بہت سے آسان مراحل کے ساتھ ساتھ یونین کے آفس میں بذات خود بیانکا کی ظاہری حاضری کا مشکل ترین مرحلہ ابھی آنے والا تھا۔
بیانکا اس ایک دن کے لیے دن رات ایک کرنے والی تھی۔۔۔ یہ لوگ شاطر تھے بلا شک و شبہ۔۔۔ لیکن دریا کی گہرائی کی بھی ایک حد ہوتی ہے۔۔۔ بیانکا اس حد سے آگے جا کر سوچنے لگی تھی۔
ان لوگوں نے وہاں کے کتنے لوگوں کو خرید لیا ہو گا۔۔۔ دولت نے اپنی کس حد تک طاقت دکھائی ہو گی۔۔۔ پانچ لوگ۔۔۔ دس لوگ۔۔۔ پورا عملہ۔۔۔ یونین کا پورا آفس۔۔۔ لیکن سڑکوں، دکانوں پر پھرنے والے ہزاروں لوگوں کو تو یہ نہیں خرید سکتے ناں۔۔۔ تو پھر یہ مجھے مدد کے لیے پکارنے سے کیسے روک پائیں گے۔
بیانکا نے اپنی ہی ہنسی دبائی تھی۔
اس نے سوچ رکھا تھا کہ اس گھر سے باہر نکلنے کے بعد جیسے ہی خود کو رش میں محسوس کرے گی چیخ چیخ کر لوگوں کو اکٹھا کرے گی۔ تب ان لوگوں کے پاس موت کے علاوہ بچنے کا اور کوئی راستہ باقی نہیں بچے گا۔
یہ لوگ مجھے مام کی جان کی حفاظت کی دھمکی دے کر وہاں لے جائیں گے۔۔۔ میں ان کو ان کی ہی دھمکی پورا کرنے کا وقت نہیں دوں گی۔
وہ ہر روز اپنے اس خیال کو مزید سے مزید پختہ کر رہی تھی اپنے اس خیال میں موجود مختلف ممکن خامیاں دور کرنے کی کوشش کر رہی تھی اگر ایسا ہو گیا تو؟ اگر انہوں نے ویسا کر لیا تو۔۔۔؟ یہ لوگ بکتر بند گاڑی کا انتظام تو کرنے سے رہے۔۔۔ اور میرے منہ پر کپڑا باندھنے یا ٹیپ لگانے سے بھی۔۔۔ وہ ہر سوچ ہر زاویے پر غور کر چکی تھی اور ہر مسئلہ کا مکمل حل نکال چکی تھی۔
یہ لوگ نہیں جانتے کہ مجھے یونین کے آفس لے جا کر یہ اپنی زندگی کی کتنی بھیانک غلطی کرنے والے ہیں۔ یہ لوگ وہاں اپنی موت کو دعوت دینے جا رہے ہیں۔
تصور ہی تصور میں اس نے خود کو چلاتے پایا۔ پھر لوگوں کو اور سیکیورٹی گارڈز کو اپنی طرف بڑھتے لوگوں کو، احمد، غفار تایا کا گھیرا تنگ کرتے۔ پولیس کو آتے اور ان باغیوں کو پولیس وین میں بند ہوتے۔ یہ خیال خوش کن تھا۔ اس کا سیروں خون بڑھ گیا۔
وہ سوچنے لگی کہ ان پر کون کون سی دفعات لگ سکتی ہیں۔
حبس بے جا، تشدد، ظلم، اغوا، قتل، جائیداد کی غیر قانونی منتقلی، جعلی اقرار نامہ۔
پھر وہ سوچنے لگی کہ ان لوگوں کو کس کس طرح کی سزائیں مل سکتی ہیں۔ سزائے موت، الیکٹرک چیئر، زہر کا انجکشن، پندرہ سال قید۔۔۔ شعبہ زراعت کی طرف سے ملا یہ گھر تو کریاں، احمد کا میڈیکل کیریر۔۔۔ یہ لوگ پاکستان واپس جانے کے بند ہو چکے راستے کھوجتے پھریں گے۔
بیانکا کی ایک چیخ سب ختم کر دے گی۔ یہ لوگ ڈی پورٹ ہونے کی التجائیں کریں گے۔
اسے ہنسی آئی تھی کہ یہ لوگ کاغذ کے ایک پرزے پر دستخط کروا کر کتنے مطمئن ہو چکے ہیں اور اسے خود پر بھی غصہ آیا تھا اس نے کیوں اتنے دنوں اس کام کو لٹکائے رکھا بھلا اصل کام تو یونین کے آفس میں ہی ہونا تھا اور اب تو واقعی اصل کام یونین کے آفس میں ہی ہو گا۔
جب سارے پانسے بیانکا کے حق میں جائیں گے۔

تہہ خانے میں بھی کافی تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔
اس کے لیے ایک بیڈ لگا دیا گیا تھا مزید لحاف فراہم کیے گئے تھے اور ایک برقی گرمالے (ہیٹر) کا بھی انتظام کر دیا گیا تھا۔ کھانا بھی پہلے کی نسبت بہتر آنے لگا تھا۔ اگر ان چیزوں کا انتظام نہ بھی کیا جاتا تو جو کچھ وہ ان دنوں سوچ رہی تھی وہ اس کے ہر طرح کے آرام اور ذہنی سکون کے لیے کافی تھا۔

وہ بے چینی سے ایک ایک دن گن گن کر گزار رہی تھی۔ چھٹیوں کے بعد کے پہلے ورکنگ ڈے اسے آفس میں حاضر ہونا تھا اور..... اور اس دن.....

اس نے اپنے بلند بانگ قہقہوں کو بمشکل دبایا کہ کہیں وہ پاگل ہی نہ ہو جائے۔ پانچوں نفرت انگیز چہروں پر اسے ترس آیا تھا۔ جو عنقریب بیانکا سے رحم کی اپیل کریں گے۔

پیپر آنے میں مزید دس دن درکار تھے اور یہ دس دن اس نے خوش خوش گزارنا تھے۔

☼ ☼ ☼

پہاڑوں کی تلچھٹ میں کسی سنگ آہن ربا کا ظہور ہوا تھا۔ اس آہن کی کشش قیامت خیز تھی۔ جو شہرام کے پورے وجود سے لپٹ کر اس کو اپنی اور کھینچ رہی تھی۔

وہ نیچے کی اور سرکتا جا رہا تھا تیز تیز..... تیز تیز..... چاند نے اپنی روشنی بڑھائی تھی کہ اگر اسے ٹھوکر لگی تو بڑی جان لیوا ثابت ہو گی۔

لیکن شہرام کو کسی چیز کی پروا نہیں تھی۔ نوکیلے پتھروں نے اس کے جوتے پھاڑ دیے تھے۔ اس کے ہاتھ جھاڑیاں پرے کرتے کرتے چھل گئے تھے۔ گہری تاریکی اور چاند کی اعلیٰ ظرفی کے باوجود بھی اسے راستے نظر نہیں آتے تھے سوائے ایک راستے کے جو پاتال کی طرف جاتا تھا۔

"تم ہونہار تھے..... مجھے افسوس ہوا کہ تم بھی فریبی جذبوں کے پجاری نکلے۔" اسے بابا زلاری کی بات یاد آئی تھی۔

آنسوؤں کی نم لکیر جو اس کے دونوں گالوں پر ایک بار پھر نئے سرے سے گیلی ہونے لگی تھی۔

"کیا تم اتنے بہادر ہو؟"

اس کا سانس..... ہر سانس اس کے منہ سے کسی سسکی کی طرح برآمد ہونے لگا تھا۔

"پھر تو میں بھی تمہاری بے خوفی کو دیکھنا چاہوں گا۔ تمہاری ہمت اور جرات کو پرکھنا چاہوں گا۔"

وہ سرکتا جا رہا تھا۔ نیچے کی اور..... کسی بے وزن شے کی طرح..... کسی بے روح جسم کی طرح۔

"کسی اپنے پیارے کے سینے میں خنجر اتارنے کے لیے ہمارا جنون صرف چند لمحوں کا ہی ہوتا ہے۔"

"بابا آپ سب جانتے تھے آپ نے اس ادھورے راز کو میرے دل میں صیقل ہوئے خنجر کی طرح اتارا ہے۔"

وہ میلوں کا سفر طے کر چکا تھا لیکن تھکا نہیں تھا۔

زنگی ہٹز (کالی بلبل) کی پراسرار رینی تھی جو زغالی (بے جلے کوئلہ ذالی) رات کے ذروں پر اپنی بو پھونکتی تھی..... یہ تو گری حیات سے لرزاں تھی..... بے وزن... لیکن خوفناک بھی۔

اور پھر اچانک وہ رک گیا۔

سنگ آہن ربا نے اپنی کشش روک لی۔

اس کی آنکھوں کے آگے کدام کا ایک گھنا اور..... سایہ دار درخت تھا۔ ایک فسوں خیز درخت..... جس کی ایک پرجاتی برگد سے ملتی ہے۔

برگد..... راجہ گدھ کا استعارہ۔

اور "پال ساز" کا پیامبر.....

شہرام ایک ٹک اس شاخ کو دیکھنے لگا جو انسانی ہاتھوں سے کندہ ہو چکی تھی۔ گلاب کے پھول کے ساتھ لالے کا بے ڈھنگا پھول..... جیسے اس پر ہنس رہا تھا۔ اپنی جیت پر خوش تھا اور اس کی ہنسی میں ہتک تھی۔

"تم انہیں قتل کرنا چاہتے ہو..... جو لفظ تمہیں اتنی شرم دلا رہا ہے..... وہ عمل تم کیوں کر کر گزرو گے؟"

کوٹ کی اندرونی جیب سے اس نے ٹھنڈی سطح والا

تازہ صیقل کیا ہوا خنجر نکالا تھا۔ صدیوں پرانے خنجر کو۔۔۔ جب کسی روز ڈوبتے سورج نے اس خنجر کے وار کو دیکھا اور سہا ہو گا۔

پھر یک لخت شہرام نے وہ خنجر کدام کے پیڑ کی شاخ پر تبسم لالے کے پھول کے عقب میں اتار دیا تھا' پھول کی استہزائیہ مسکراہٹ لمحے بھر میں بگڑ گئی تھی۔

پتا نہیں یہ اس کے ہاتھوں کی لرزش تھی یا اسے "سان" پر صیقل ہوئے خنجر کا وار کرنا ہی نہ آیا تھا کہ خنجر کی تیز دھار لالے کے پھول کو چیرتی ہوئی فاصلے پر نقش گلاب کے پھول کی ایک پتی سے ٹکرائی تھی اور شاخ سے پھوٹتی حقیقت سے بھیانک حد تک قریب گلاب کے پھول کی ایک پتی مسخ ہو گئی تھی۔

شہرام ٹکٹکی باندھے اس مسخ پتی کو گھورنے لگا۔ جمع اوس کا ایک قطرہ اس پتی سے ٹپکا تھا۔

شہرام کی آنکھیں پھیل گئیں۔

اس قطرے کا رنگ سرخ تھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سرخ خون جیسے قطروں کے بہنے کی رفتار متواتر ہوتی چلی گئی۔

☼ ☼ ☼

سارا آسمان سلوٹ زدہ تھا گویا ریشم کے نیلے تھان کو کسی نے بلوری مرتبان میں بھر دیا ہو۔

بڑے دھندلے' انجان اور عجیب و غریب مناظر تھے جو ایک کے بعد ایک آتے چلے جا رہے تھے۔ جنہیں دیکھتے دیکھتے اس کی آنکھیں تھک گئی تھیں۔ پتا نہیں کیوں آج صبح سے ہی اس کی آنکھیں درد کر رہی تھیں جیسے ان میں کوٹ کوٹ کر نیند بھر دی گئی ہو اور وہ سونے کی عادت کو ترک کر چکی ہو یا مدتوں سے بھولی بیٹھی ہو۔

اس نے اپنے کوٹ کی جیبوں میں ہاتھ دے لیے تھے۔ یہ صورت حال بھی عجیب تھی۔ جسے وہ سمجھ نہیں پا رہی تھی صبح سے ہی اسے سردی بھی کافی محسوس ہو رہی تھی۔

شاید وہ اس طرح کے موسم کے لیے ناکافی لباس میں تھی۔

اس کے پاس تایا غفار بیٹھے ہوئے تھے آگے احمد اور چچا جلال۔

وہ پیر کا دن تھا یونین کے آفس میں جانے کا دن۔

آنکھیں مسل مسل کر اس نے کچھ یاد کرنے کی کوشش کی تھی۔

"ہم یونین کے آفس میں جا رہے ہیں ناں۔۔۔ ہاں ڈیڈ کے اٹارنی بھی ہوں گے۔"

اس نے ایک بار پھر کمزور آواز میں تصدیق چاہی تھی۔ احمد نے ڈرائیونگ کرتے بیک ویو مرر سے اسے دیکھا تھا۔ اور تایا غفار نے ناگواری سے ہاں میں سر ہلایا تھا۔

اپنی بات کی تصدیق پر اس نے ایک بار پھر ذہن پر زور ڈالا اور یاد کرنے کی لاحاصل کوشش کی کہ اسے آج کے دن کا اتنی شدت سے انتظار کیوں تھا؟ وہ اس دن کے لیے ایک ایک دن کیوں گن رہی تھی۔

لیکن یہ بات بارہا یاد کرنے کے باوجود بھی اسے ٹھیک سے یاد نہیں آ پا رہی تھی۔

دو گھنٹے کے تمام سفر کے دوران میں وہ تقریباً" ایک گھنٹہ یہ ہی کچھ سوچتی رہی تھی' آج اس کے پیٹ میں بھی درد ہو رہا تھا شاید اس نے آج باہر آ کر اپنے لیے دوائی لینی تھی یا شاید تایا غفار اسے حیفہ مام سے ملوانے لے کر جا رہے تھے۔۔۔ سارے خیالات آپس میں گڈمڈ ہو رہے تھے۔

سفر جیسے صدیوں بعد ختم ہوا تھا۔

گاڑی میں سے باہر نکل کر اس نے دیکھا۔ مختلف دوکانیں اور اسٹالز تھے۔ جن کے بیچوں بیچ وہ کھڑی تھی۔ بہت سے لوگ تھے۔ بہت رش تھا جو اس کے اطراف میں چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔

ہاں کچھ کچھ ایسا ہی منظر اس نے سوچا تھا۔ دیکھا تھا آزمایا تھا لیکن کہاں؟ کب؟ وہ یاد نہ کر پائی۔

ساری یادداشتوں اور خیالات کو مجتمع کر کے اس نے اپنے قریب سے گزرتے ایک لڑکے کو پکارا تھا۔ اسے شاید کچھ ایسا ہی کرنا تھا۔

"جی میں آپ کی کیا مدد کر سکتا ہوں۔"

اجنبی اسے اجنبی نظروں سے دیکھتے ہوئے دوبارہ پوچھ رہا تھا۔ اور بیانکا کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا اس نے اس لڑکے کو آخر کیوں روکا ہے۔ لڑکا کندھے اچکا کر آگے بڑھ گیا۔ تایا غفار سمیت سب ہی کار میں سے نکل کر اس کے پاس آگئے۔ چچا جلال نے اسے کسی مریض کی طرح پکڑ لیا۔ وہ واقعی گرنے والی تھی۔ ذہن پر کوئی دباؤ تھا شاید....

اندر آفس میں سیٹ پر بیٹھ کر اسے کچھ سکون محسوس ہوا تھا۔ اگرچہ تب بھی وہ تذبذب کے عالم سے ہی گزر رہی تھی کہ اس نے سڑک پر اس لڑکے کو روکا کس وجہ سے تھا۔ شاید کوئی ضروری کام تھا۔ جسے وہ اچانک بھول گئی تھی۔

کچھ سوالات ہوئے تھے جنہیں چچا جلال نے زور دار آواز میں دہرا کر بیانکا کو سمجھایا تھا۔ ڈیڈ الیاس کے اٹارنی (جواب اس کا بھی اٹارنی تھا) نے بھی اس سے بعض معاملات کی تصدیق چاہی تھی۔ اس کے چہرے پر بڑی زہرخند سی مسکراہٹ تھی' بیانکا کو اس حالت میں بھی نہ جانے کیوں اس مسکراہٹ سے نفرت سی محسوس ہوئی تھی۔

اس کی جو سمجھ میں آیا وہ جواب دیتی گئی۔

پھر یونین کے ایک کارندے نے اس کے آگے ایک فائل کی تھی اور اسے انگلی رکھ کر سائن کرنے کو کہا تھا۔

اس نے قلم پکڑ لیا لیکن وہ کچھ لکھ نہ سکی۔

اسے سائن کرنے سے پہلے کچھ کرنا تھا' سائن کرنے تک کی تو نوبت ہی نہیں آنی تھی "آریو آل رائٹ (کیا آپ ٹھیک ہیں؟)"

اس سے پوچھا گیا تھا۔

"جی..." اس نے بردبار لڑکی کی طرح جواب دیا تھا۔ اور آگے جھک کر ایک کاغذ پر سائن کر دیے تھے۔ صفحہ پلٹا گیا تھا اور دوسری طرف بھی سائن کرنے کو کہا گیا تھا۔

یقیناً" کسی اچانک ہوئے دھماکے کی طرح اسے یاد آیا تھا کہ اسے چلانا تھا... بے تحاشا۔

لیکن اسے ایسا کیوں کرنا تھا بہت چاہ کر بھی یہ بات اسے یاد نہ آسکی۔

اگر اس نے یہاں چیخ ماری تو کہیں یہ لوگ اسے پاگل ہی نہ سمجھ لیں' کوئی پڑھی لکھی لڑکی بھلا ایسا کیسے کر سکتی ہے۔ ایک آفس میں بیٹھ کر یوں چیخنا چلانا اور جب کہ کوئی بات بھی نہ ہوئی ہو۔

اس نے دوسرے صفحے پر بھی سائن کر دیے۔ پھر تیسرے پر بھی۔

باقی کے آدھے گھنٹے کے دوران بھی وہ خود کو لعنت ملامت کرتی رہی تھی کہ آج کل وہ نہ جانے کیا کیا سوچنے اور منصوبے بنانے لگی ہے۔ اگر جلد ہی اس نے اپنی ذہنی حالت کو اپنے کنٹرول میں نہ لیا تو وہ پاگل بھی ہو سکتی ہے۔

وہ ایک بار پھر باہر آئی تھی اور تب ہی اسے یاد آرہا تھا کہ اسے سارے چلتے پھرتے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ کرنا ہے۔ اپنے پاس بلانا ہے۔ اپنے اوپر ہو رہے ظلم کے بارے میں بتانا ہے۔

اس نے بے تحاشا شعوری جدوجہد کے بعد چیخنا چاہا تھا' لیکن اس کی چیخ کسی بڑبڑاہٹ سے زیادہ نہیں تھی۔

وہ واپس کار میں بٹھا دی گئی۔ سفر شروع ہوا ایک بار پھر سے... اور وہ لوٹ آئی... اپنے مدفن' اپنے مسکن' تہہ خانے میں اسی طرح پریشان اور ہر چیز بھولی ہوئی کہ جس طرح مجسم یہاں سے گئی تھی۔

رات کی تاریکی جوں جوں بڑھتی گئی اس کو دی گئی دوائی کا اثر زائل ہوتا گیا۔ سارے واقعات آہستہ آہستہ اسے یاد آئے تھے۔

اسے یاد آیا کہ صبح وہ آنے والے وقت کو لے کر بہت خوش تھی اور اسی خوشی میں اس نے صبح کا ناشتہ اور کل رات کا کھانا بھی خوب دل لگا کر کھایا تھا۔ ناشتہ بھی معمول سے ہٹ کر اور مزے کا تھا۔ وہ خوش نہ بھی ہوتی تو نہ جانے کتنا کھا جاتی۔

پھر آگے کیا ہوا۔

پھر یہ ہوا کہ اس نے اپنا سب کچھ کھو دیا۔
آدھی رات کے بعد جب اس کے اعصاب پوری طرح جاگ گئے تو اس کے آنسو بھی خود بخود ہی جاری ہو گئے۔
"میں نے سب کچھ کھو دیا ڈیڈ.... مجھ سے میرا سب کچھ چھین لیا گیا ماما۔"
وہ بڑی دیر تک بے آواز روتی رہی تھی اور آنسو اس کا چہرہ بھگوتے رہے تھے۔ اس نے دل ہی دل میں احمد کی تعلیمی قابلیت کی داد دی تھی۔ وہ واقعی ایک ماہر ڈاکٹر بننے والا تھا۔ اس کا علم کامل تھا۔

☆ ☆ ☆

دود چراغ سی اٹی فضا میں گم وہ ایک ٹیڑھی بل کھاتی ڈھلوانی سڑک کے عین بیچ و بیچ بیٹھا تھا۔
اس کے رونے کی آواز اس قدر اونچی تھی کہ گیدڑوں کے غول کے غول اس آواز کے بھیانک بین کو سن کر دہشت سے چنگھاڑتے ہوئے ایک دوجے کو کسی انجانے خطرے سے خبردار کر رہے تھے۔
دور ایک ٹرک تیز رفتاری سے آتا ہوا۔ ہارن دیتا ہوا شہرام کے قریب بڑھتا چلا آ رہا تھا اس وزنی ٹرک کی دھمک اتنی دور سے بھی شہرام کے وجود کے نیچے تھرتھراہٹ پیدا کر رہی تھی۔
ہارن گیدڑوں کی چنگھاڑ اور شہرام کے رونے کی آواز نے فضا پر بڑا دہشت ناک ماحول طاری کر دیا تھا۔
پھر ہارن کی آواز میں انجن کی آواز بھی شامل ہو گئی جو رفتہ رفتہ قریب آتی جا رہی تھی.... وہ وہاں سے نہیں اٹھا تھا۔
"اور اگر پھر بھی تم مطمئن نہ ہوئے تو؟" بابا زلاری نے اسٹور میں اس سے پوچھا تھا جب وہ سان پر خنجر تیز کر رہا تھا۔
"تو میں خود کو ختم کر لوں گا۔" اسے اپنا جواب یاد آیا۔
"محبت میں سیاہ چوغہ پہن لینا آسان نہیں ہوتا.... یہ پہن بھی لو تو نبھانا مشکل ہو جاتا ہے۔"

اس نے وہاں سے نہ اٹھنے کا جیسے عزم کر لیا تھا۔
دائیں طرف سڑک بالکل گھوم کر گول دائرے کی صورت پیچھے کو جاتی تھی اور وہاں سے تیزی سے آتے کسی بھی شخص کو ساری صورت حال کا اندازہ تب ہی ہوتا تھا جب تک سڑک کے درمیان بیٹھے شخص کی ہڈیاں چور چور ہو چکی ہوتی تھیں۔
وہ بیٹھا رہا اور گھٹنوں میں منہ دیے روتا رہا۔ وہ آخری بار رو رہا تھا۔
"تم اپنے کام سے کام رکھا کرو شہرام.... اپنی پڑھائی کا رعب مجھ پر ڈالنے کی کوشش مت کرنا۔" ولائی حسنی نے غصے سے کہا تھا۔ شہرام سن سا ہو گیا تھا اور اب دوبارہ یاد کر کے پتھر کا بن گیا تھا۔
"اب تم مجھے سکھاؤ گے اصول؟"
ولائی حسنی کو واقعی کوئی اصول سیکھنے کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ انہوں نے کمال کی بے اصولی جو کی تھی۔
"بدقسمتی میرے ساتھ تھی.... میں آزمائی گئی اور آزمائش میں پوری نہ اتر سکی، مجھے بہکنا تھا۔ میں بہک گئی۔" سیرین نے کتنی آسانی سے اپنی بے وفائی کے معاملے کو قدرت اور قسمت کا نام دے دیا تھا۔
"میری خوشی اب تمہارے ساتھ وابستہ نہیں ہے۔"
"وقت آنے پر تم جان جاؤ گے کہ وہ کون ہے۔"
شہرام جان گیا تھا اور یہ وقت کتنا برا تھا۔ اس کی آواز مزید اونچی ہو گئی تھی۔
تیتری نے اس آواز کو اپنی آواز پر غالب ہوتے دیکھا اور خاموش ہو گئی، صنوبر کے دیو قامت درخت اپنی شاخیں موڑ موڑ کر گردنیں جھکا جھکا کر اس گٹھڑی بنے جوان کو دیکھنے لگے۔
ٹرک اتنا قریب آ چکا تھا کہ اس کی روشنی بل کھاتی سڑک سے جھلک کر باہر کو لپکنے لگی تھی اور اندھیرے میں ڈوبے شہرام کا وجود واضح کرنے لگی تھی۔ وہ وہیں ساکت بیٹھا رہا۔
"کوئی کسی کے بغیر نہیں مرتا.... زندگی بہت ٹھوس

اور ڈھیٹ ہے۔ یہ ہر حالت میں گھستی ہے۔"

"نہیں۔۔۔" اس نے جیسے فیصلہ کر لیا تھا "اس زندگی کا اب کوئی فائدہ نہیں۔ وہ زندگی کے میدان میں پہلا کھیل، کھیل کر ہار چکا تھا اور یہ ہار ایسی تھی جس نے اسے مزید کسی کھیل کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ اس کی سانسیں اب ساری زندگی ہموار نہ ہونے والی تھیں۔ اس کا دل تڑپتے رہنے کو اپنا شعار بنانے والا تھا۔ ایسے میں اس نے جی کر کیا کرنا تھا۔"

ٹرک گھوم کر بالکل سامنے آگیا تو وہ سر اٹھا کر اس کی تیز روشنی دیتی ہیڈ لائٹس کو دیکھنے لگا۔

بس چند لمحوں کی دوری اور پھر فنا ہو جانے کا ان چاہا ذائقہ۔۔۔ شہرام نے آنکھیں بند کر لیں اور ان چند لمحوں کی دوری کو کسی نے بہت طویل کر دیا۔

دو مضبوط ہاتھوں نے اسے پکڑ کر اٹھایا تھا اور اوندھے منہ ڈھلوان پر لڑکھڑا دیا تھا۔

ٹرک گونجتا ہوا آگے نکل گیا۔ وہ تھوڑا سا لڑکھڑا کر رک گیا تھا۔ لیکن اٹھا نہیں تھا ویسے ہی لیٹا رہا تھا، طامیر نے اسے گریبان سے پکڑ کر کھڑا کیا تھا۔

"تم پاگل تو نہیں ہو گئے؟" وہ چلایا تھا۔

جواب دینے کے لیے شہرام کے پاس کچھ نہیں تھا وہ پاگل ہوا نہیں تھا، بلکہ کر دیا گیا تھا۔

"میں سمجھا تھا کہ تم بہادر ہو گئے ہو۔۔۔ تم تو بزدل بھی نہیں رہے۔" طامیر غصے سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

"میں۔۔۔ میں نہیں رہا۔۔۔"

"اگر تمہیں کچھ ہو جاتا تو میرے پاس زندہ رہنے کا کوئی جواز باقی رہتا؟" وہ خود ہی نرم ہوا تھا۔ پھر اس نے شہرام کو ایک ٹیلے پر بٹھا دیا تھا۔

کافی دیر تک دونوں میں سے کوئی بھی نہیں بولا تھا۔

"تو تم نے جان لیا کہ وہ ولائی حسنی ہے۔" شہرام چونکا تھا۔

"تم۔۔۔ تمہیں پہلے سے پتا تھا۔۔۔؟"

شہرام نے پوچھا تو طامیر نے نظریں جھکا لی تھیں۔

"ہاں!" بہت دھیمی آواز میں طامیر نے کہا۔ جیسے چاہتا ہو کہ شہرام سن ہی نہ سکے۔۔۔ شہرام نے سن لیا۔

لیکن اس نے کوئی شکوہ نہیں کیا تھا۔

"اور کیا کیا جانتے ہو؟"

"دونوں دو ماہ پہلے نکاح کر چکے ہیں اور سیرین حسنی کے بچے کی ماں بننے والی ہے۔"

طامیر نے اٹکے بغیر کہا تھا۔ اب کچھ بھی چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔

آروہی کی گرہیں جو صبح کی دھوپی جالی پر دوبارہ بندھنے کے لیے نیند سے جاگ کر اپنا بناؤ سنگھار کر رہی تھیں۔ ان ساری گرہوں کو آن کی آن میں اجل کی ہواؤں نے آن گھیرا اور نوبت کے ٹوٹتے ہوئے سر چاند کی لہروں میں گھل مل گئے۔

"وجہ بتا سکتے ہو؟" شہرام کی آواز دوسری دنیا کے پہاڑوں پر سے آتی محسوس ہوئی تھی۔

"ہاں۔۔۔ سرکش اور منہ زور نفس۔۔۔!" طامیر کے پاس وجہ بتانے کے لیے اس سے بہتر الفاظ نہیں تھے۔

"بابا جانتے ہیں؟"

"ہاں۔۔۔ صرف خالا زینت ہی بے خبر ہیں۔" شہرام کے چہرے پر کسی قسم کا کوئی رد عمل ظاہر نہیں ہوا تھا۔

"لیکن اب نہیں رہیں گی۔" شہرام اٹھ کھڑا ہوا۔

طامیر بھی اٹھا تھا۔

"کہاں جا رہے ہو؟" شہرام کے قدموں کی چاپ تیز ہو گئی تو طامیر نے پوچھا تھا۔

شہرام چلتے چلتے رکا اور طامیر کے چہرے کو ایسے دیکھنے لگا جیسے پہلی بار دیکھ رہا ہو۔

"وقت آگیا ہے۔۔۔ دوستی کا فرض ادا کرنے کا۔"

رات کی تاریکی میں شہرام کی آواز سناٹے کے ساتھ ساتھ خوف کی صورت سنائی دی۔ طامیر کا دل بیٹھنے لگا تھا۔ کچھ اس آواز سے۔۔۔ کچھ اس کے گالوں پہ بہہ کر سوکھ چکی۔ آنسوؤں کی لکیر دیکھ کر۔۔۔

"تو پھر بولو۔۔۔"

"میں روپوش ہونا چاہتا ہوں۔۔۔ ہر ایک سے۔۔۔ ہر اس شخص سے جسے میں جانتا ہوں۔۔۔ چھپ جانا چاہتا ہوں۔۔۔ اپنے آپ سے بھی۔۔۔ تم سے بھی۔۔۔ بابا۔۔۔ اماں سے بھی۔۔۔ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے۔۔۔ میری مدد کرو۔"

"بولو... کیا مدد چاہیے؟" طامیر اداسی سے بولا تھا۔
"مجھے کچھ پیسے چاہئیں۔ امریکا جانے کے لیے... اور گھر سے میرا پاسپورٹ... صرف پاسپورٹ... اور کچھ بھی نہیں۔"
شہرام نے کہا تو طامیر مزید افسردہ ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

بھاگ بھری سرد دھوپ کا ایک کھوکھلا چوکھٹا تھا۔ جو بڑے ہال نما کمرے کے نیم اندھیرے میں اس کی نظروں کے سامنے تھا۔

دروازے کے دائیں بائیں اور اوپر تقریباً" ادھ فٹ شیشے کے فریموں میں سے آتی تیز دھوپ اس کی آنکھوں میں گھستی تھی۔ اسے اس چوکھٹے کے علاوہ اور کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ جلد سے جلد باہر نکل جانا چاہتی تھی۔ پر دروازے تک کا راستہ بہت لمبا اور پل صراط کی طرح تیز دھار تھا۔ اتنا کہ وہ ایک ایک قدم پر ایک ایک صدی جتنا سفر طے کر رہی تھی۔

اس کے بال بری طرح بکھرے ہوئے تھے اور اس کا جسم کسی دق زدہ مریض کی طرح کانپ رہا تھا۔ پرسوں دن سے آج صبح رہائی تک کے ان لمحات نے اس کے جسم کا سارا خون چوس لیا تھا اور وہ ایسی ہو گئی تھی جیسے شہد نکل جانے کے بعد خالی خولی کھوکھلا کھگا رہ جاتا ہے۔ سب کچھ ہار جانے اور کھو دینے کا غم اس قدر تباہ کن تھا کہ وہ اپنے آپ سے بھی نظریں نہیں ملا پا رہی تھی۔

یہ ان لوگوں کی باقی ماندہ شرافت اور رحم دلی تھی کہ وہ اسے سیدھے بھاؤ گھر سے باہر کر رہے تھے۔

اس کے دائیں طرف شہناز اور فیروزہ کھڑی تھیں۔ بائیں طرف چچا جلال اور تایا غفار... وہ ان چاروں کے درمیان میں سے گزر رہی تھی۔ سامنے نظریں گاڑے ہوئے... ان چہروں سے اسے اتنی نفرت ہو چکی تھی کہ وہ ان کو اب آنے والی زندگی میں خواب میں بھی دیکھ لے تو دنوں نہ سو پائے۔

شہناز نے اسے حیفہ کی شال پکڑائی تھی۔ بیانکا نے دھوپ کے چوکھٹے پر نظریں گاڑے وہ شال تھام لی تھی۔

"ہمارا طریقہ کار غلط ہو سکتا ہے۔ لیکن اپنے حق کے معاملے میں ہمارا موقف بالکل درست تھا۔" چچا جلال نے اسے کہا تھا۔ اس نے جیسے سنا ہی نہیں۔ وہ سیدھ میں چلتی رہی۔ ان باتوں پر تکرار اب لاحاصل تھی۔ اس کا وجود کسی اجڑی زمین کی طرح ہو چکا تھا۔ ایسی زمین جس پر ایٹم بم پھٹ چکا ہو اور جس پر پھر سالوں شجر کاری نہ کی جا سکے۔

فیروزہ نے اسے دو ہینڈ بیگ پکڑائے تھے۔ ایک خود اس کا اور ایک حیفہ مام کا۔ اس نے دونوں ہینڈ بیگز تھام لیے تھے۔ کمزوری کی وجہ سے دونوں ہینڈ بیگز اس کے ہاتھ میں جھولنے لگے تھے۔

"باہر ٹیکسی کھڑی ہے۔ وہ تمہیں حیفہ تک لے جائے گی۔" غفار تایا نے کہا اور ساتھ ہی دروازے کا ہینڈل نیچے کو گھما دیا۔
اور مقفل دروازہ کھل گیا... لیکن بڑی دیر کے بعد...

تیز پیلی دھوپ کی برچھی اس کی آنکھ میں لگی تھی۔ وہ تیزی سے بھاگ جانے کے انداز میں باہر جانے کے بجائے ایک قدم پیچھے کو ہوئی تھی اور بے اختیار ہی اس نے آنکھوں کے اوپر ہاتھ رکھ لیے تھے۔ دھوپ بھی بڑی سازشی تھی۔ سب جانتی تھی اور جیسے بیانکا کے دشمنوں سے ہی جا ملی تھی۔

پھر آنکھوں کو آہستہ آہستہ دوبارہ کھولتے ہوئے وہ باہر کی طرف بڑھی تھی۔ اس کے پیچھے کھڑے وہ چاروں دروازے تک آکر اسے باہر جاتے ہوئے دیکھنے لگے تھے۔

ٹیکسی کے پاس کھڑا احمد اسے باہر آتا دیکھ کر ڈرائیور سے کچھ کہتے کہتے رکا تھا۔ ڈرائیور نے اپنی سیٹ سے نیچے اتر کر اس کے لیے دروازہ کھولا تھا۔ وہ سیٹ پر بیٹھ گئی تو ڈرائیور نے دروازہ بند کر دیا تھا۔ احمد پرے ہٹ گیا تھا اور ٹیکسی چل پڑی تھی۔
سڑکوں پر معمول کا رش تھا۔ ہر طرح کے لوگ ہر

روز کی طرح چل پھر رہے تھے۔ کچھ سنجیدہ' کچھ خوش گوار موڈ میں' کچھ تاثرات سے عاری چہرہ لیے۔ بیانکا کا دل چاہا کہ وہ باہر نکل کر ان سب چلتے پھرتے لوگوں کے منہ پر چانٹے مارے' اور ان سب سے کہے کہ وہ بھی اسی طرح روئیں جس طرح اس وقت اس کا دل رو رہا ہے۔ پتا نہیں سفر زیادہ لمبا تھا یا موسم نے بدلنے میں وقت نہ لیا۔

بھاگ بھری دھوپ کی لہریں اب کالے اودے بادلوں سے الجھ رہی تھیں۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے سارا ماحول گندم کی سنہری بالیوں کے رنگ میں ڈھلتا چلا گیا۔ مناظر کو واضح طور پر دیکھنے کے لیے بیانکا کو اپنی آنکھیں بار بار مسکنی پڑتی تھیں۔ ہوا میں ٹھنڈے جھونکے بھی شامل ہو چکے تھے۔

پھر ٹیکسی رک گئی... ایک انجان جگہ پر...

ڈرائیور نے اتر کر پچھلا دروازہ کھول دیا۔ بیانکا کچھ نہ سمجھتے ہوئے باہر نکل آئی تھی۔ جس جگہ ٹیکسی رکی تھی' وہاں اسپتال تو دور کسی دو منزلہ بلڈنگ کا بھی نام و نشان نہیں تھا۔ وہ اجنبی نظروں سے اپنے اردگرد دیکھنے لگی۔ یہ جو بھی جگہ تھی بیانکا کے لیے نئی نہیں تھی۔ اس جگہ میں پہچان کی چھاپ ضرور دفن تھی۔ ذہن پر زور دینے کے باوجود بھی بیانکا کو یاد نہ آیا کہ وہ پہلے یہاں کیوں اور کب آئی تھی۔

ڈرائیور اپنی سیٹ پر واپس بیٹھ چکا تھا۔ پھر اس نے کھڑکی سے ہاتھ باہر نکال کر ایک تہ کیا ہوا کاغذ بیانکا کی طرف بڑھایا۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے بیانکا نے وہ کاغذ تھام لیا تھا۔

ٹیکسی ریورس ہوئی تھی اور پھر بیانکا کے دیکھتے ہی دیکھتے بہت دور نکل گئی تھی۔

کالے بادل کسی جلوس کی شکل میں اس کے سر کے اوپر آکر ڈھیریاں جمانے لگے تھے۔

جس وقت بیانکا نے وہ تہ شدہ کاغذ کھولا' تب تک اس پر بارش کی دو تین بوندیں گر چکی تھیں... اور... پھر اندر کی تحریر تو گویا "طوفان نوح" ہی لے آئی تھی۔

"ہم نے اپنی طرف سے بہت کوشش کی' لیکن خدا کو شاید ایسا ہی منظور تھا۔ الیاس کے دائیں طرف حیفہ کی قبر ہے۔"

ڈزن... کی آواز کے ساتھ ساری دھرتی اس کے قدموں کے نیچے پھسلتی چلی گئی تھی اور کائنات کے سارے ستارے ٹوٹ کر اس کے اوپر آگرے تھے۔

☼ ☼ ☼

اس کا چہرہ گیلی زمردی گھاس کے قطعات کے اوپر کسی بے جان شے کی طرح پڑا تھا۔ اس نم گھاس میں سے گیلی بوئے گل کے بھبکے اٹھ رہے تھے۔ چوبیس گھنٹے اسی حالت میں پڑے رہنے کے باوجود اسے اس بو کی عادت نہیں ہوئی تھی۔ ہر آن بدلتی بو میں سے حیفہ مام کے وجود کی خوشبو اس کے وجود پر ایک نئی طرز سے حملہ آور ہوتی تھی۔ اس کے پاس نہ تلوار تھی۔ نہ میان اور نہ ہی ڈھال... وہ نڈھال ہوتی رہی۔

ژالے ملی بارش نے زمین اور اس کے لباس کو بری طرح سے گیلا کر دیا تھا' اسے یاد آیا... حیفہ مام کہا کرتی تھیں۔

"زندگی بہت چھوٹی' لیکن اس کے محسوسات بہت طویل ہیں... نہ ختم ہونے والے... صرف ایک بار نماز کسوف (سورج گرہن کے وقت پڑھی جانے والی نماز) پڑھ لینے سے زندگی کے اندھیرے روشنیوں میں نہیں بدلے جاسکتے... یہ نماز کسوف تو زندگی کے ایک باب میں ہی نہ جانے کتنی بار آتی ہے... تم تھکنا نہیں۔"

اسے زندگی کی نصیحت بھی کی گئی تھی تو کتنی تلخ...

وہ تھکی نہیں تھی۔ لیکن بے بس' بے ہمت اور نڈھال ضرور ہو گئی تھی۔ ضرورت سے زیادہ... اور حیثیت سے بڑھ کر...

مٹی کی تازہ قبر پر لیٹے لیٹے روتے ہوئے وہ بارش کے باعث پوری طرح گیلی ہو گئی تھی۔ پھر شام ہونے لگی اور بارش رک گئی' وہ وہیں لیٹی رہی۔ اس کا غم بے کنار تھا۔

رات آئی اور اسے پتا بھی نہ چلا۔

صبح سے رات کا عالم ہی تو چل رہا تھا۔
وہ وہیں لیٹی رہی۔ دو آپس میں جڑی قبروں کے درمیان۔۔۔ جس میں سے ایک ڈیڈ الیاس کی تھی اور ایک حیفہ مام کی۔۔۔ وہ خود ان دو قبروں کے درمیان تیسری قبر بن جانا چاہتی تھی۔
سخت اذیت والی رات سردی کی شدت سے پر تھی۔۔۔ لیکن اسے احساس تک نہ ہوا۔ وہ ہر احساس سے ماورا ہو چکی تھی۔
صبح ہوئی تو اس کے وجود کے ساتھ ساتھ زمین بھی خشک ہونے لگی۔ وہ کھلی آنکھوں سے ساکت لیٹی رہی۔ گیلی مٹی کے داغ جا بجا اس کے لباس پر مردہ کیچوؤں کی طرح چپکے ہوئے تھے۔
اسے اپنے وجود سے گھن آنے لگی تھی۔
وہ اس قدر بے حس و حرکت تھی کہ ننھی چیونٹیوں کی ایک لمبی لائن اس کے وجود سے ہو کر آگے گیلی قبر کے اندر دھنسی ہوئی مٹی کے اندر جا رہی تھی۔ وہ اس متحرک لائن کو دیکھتی رہی۔ بے روح بے نور آنکھوں کے ساتھ۔۔۔ دیکھتی رہی۔۔۔
اور سورج طلوع ہو گیا۔ اس کی شعاعوں میں کل صبح والی تیزی نہیں تھی' نہ جگا دینے۔۔۔ جلا دینے' جھلسا دینے اور نہ پگھلا دینے کی طاقت۔۔۔ اس کا سنسناتا دماغ ماؤف ہونے لگا تھا۔
خدا جانے زمین نیچے کی طرف کھسک گئی تھی یا بیانکا کی بینائی راتوں رات کمزور ہو گئی تھی کہ اپنے اوپر جھکتے ایک سایے کو بھی وہ نہ دیکھ سکی۔ نہ ہی اس کی آنکھیں کسی طرح کے تاثر کا اظہار کر سکیں۔
وہ سایہ لاٹھی ٹیکتا ہوا نیچے بیٹھا تھا۔ اس نے بیانکا کے ماتھے پر ہاتھ پھیر کر اس کے بالوں کو پرے کیا تھا اور اس ایک ذرا سے لمس میں ہی اس کے ہاتھ نے اس کے دہکتے وجود کے مرض کو جان لیا تھا۔
''اتنا تیز بخار۔'' کانپتا ہوا بوڑھا رابن بڑبڑایا تھا۔
اس نے بیانکا کی سوختنی لکڑی جیسی آنکھوں میں جھانکا تھا۔ جہاں سے نخل مریم کی جڑیں باہر نکلی ہوئی لگتی تھیں۔
''مٹی کے ساتھ تب تک مٹی نہیں ہوا جا سکتا جب تک اوپر سے حکم نہ آجائے۔'' بوڑھے رابن نے پارہ زدہ انگریزی لہجے میں بڑے کام کی بات کی تھی۔ ''یہ تمہارا جو کوئی بھی تھا اس کا نعم البدل دنیا میں کوئی اور نہیں ہو سکتا۔ لیکن وقت کا تقاضا اور خدا کا حکم یہی ہے کہ خود کو زندوں میں شمار رکھو۔''
بیانکا نے کچھ نہیں کہا تھا۔ اس نے کچھ سنا ہوتا تو یقیناً'' کچھ کہتی۔
رابن نے اسے سہارا دے کر اٹھایا تھا۔
وہ اسے اپنے ساتھ اپنے گھر لے آیا تھا۔ دو منزلوں پر مشتمل وہ پرانی طرز تعمیر کا گھر آدھے سے زیادہ خالی تھا۔ اس گھر میں صرف دو افراد رابن اور اس کی بیوی کے علاوہ تیسرا کوئی جانور یا پرندہ بھی نہیں رہتا تھا۔
جس دن رابن بیانکا کو اپنے گھر لے کر گیا' اسی دن رات سے بیانکا کا علاج شروع ہو گیا تھا۔
بیانکا اپنا ذہنی توازن کھو چکی تھی۔

☼ ☼ ☼

''کہاں جاؤ گے؟'' طامیر نے شہرام کو گھر سے اس کا پاسپورٹ لا دیا تھا اور اپنی حیثیت کے مطابق ایک بڑی رقم بھی زبردستی شہرام کے حوالے کر دی تھی۔
''امریکا۔۔۔''
شہرام دو دن کے بعد امریکا واپس آگیا تھا۔
پتا نہیں اس وقت اس کی ذہنی حالت کس طرح کے خطرے سے باہر تھی' یا خطرے کے اندر کہ وہ اپنی یونی ورسٹی اپنے اسپتال جانے کے بجائے نیویارک آگیا تھا۔ کسی شناسا چہرے کا سامنا کرنے کی اس میں ہمت نہیں تھی اور کسی اپنے کو ملنے کی اسے چاہ نہیں رہی تھی۔
طامیر کو رتی برابر بھی شبہ ہوتا کہ شہرام امریکا جا کر اس طرح بھٹکنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ تو وہ کسی صورت دوستی کا فرض سمجھ کر کیے گئے کام کو نہ کرتا اور نہ ہی شہرام کو ادھر سے باہر نکلنے دیتا۔۔۔ لیکن جو کچھ ہوتا گیا' وہ شہرام کے لیے بھی بلا ارادہ ہی تھا۔

جب رہبر رہزنوں سے مل جائیں تو قافلے والوں کا بھی وہ ہی حال ہوتا ہے' جو اس وقت شہرام کا تھا۔ مزید لٹنے کے لیے اس کے پاس کچھ بھی نہیں بچا تھا۔۔۔ لیکن لٹ چکے قافلے کو اتنا دکھ اپنے نقصان کا نہیں ہوتا' جتنا وسیع و عریض دنیا میں بے راستہ و بے منزل بھٹکنے کا خوف۔۔۔

وہ بھی بے راستہ و بے منزل ہو چکا تھا۔ لیکن بنا خوف زدہ ہوئے۔۔۔ سارا دن وہ آوارہ بادلوں کی طرح ادھر ادھر گھومتا رہتا بے مقصد۔۔۔ کبھی وہ گھنٹوں کسی پارک۔۔۔ بینچ یا بس اسٹاپ پر بیٹھے بیٹھے گزار دیتا۔۔۔ رات کے قیام کے لیے اسے زیادہ سوچ بچار نہیں کرنی پڑتی تھی۔ پارکوں' سڑک کنارے لگے بینچوں سے وہ آسانی سے رات بسر کرنے کا کام لیے جا رہا تھا۔ جو پیسے اس کے پاس تھے وہ بھی رفتہ رفتہ ختم ہونے لگے تھے' لیکن اسے قلاش ہو جانے کی کوئی پروا نہیں تھی۔ محبت کے بدلے بے وفائی اور پشت کے وار کا سانحہ اس قدر غمگین کر دینے والا تھا کہ اب اجڑنے کا ڈر نہیں رہا تھا۔

وہ اس چیز کو لے کر ضرورت سے زیادہ لاپروا تھا کہ پیسے ختم ہو جانے کے بعد وہ اپنی گزر اوقات کیسے پوری کرے گا۔ شاید اس نے خود کو ختم کرنے کا یہ انوکھا طریقہ ڈھونڈ نکالا تھا۔

وہ چاہتا تو نیوجرسی پرنسٹن یونی ورسٹی واپس جا سکتا تھا' یا کم از کم اپنے کلاس فیلوز کے پاس تو جا ہی سکتا تھا' لیکن وہ یہاں بالکل کنگال اور بے یارومددگار ہو جانے کے بعد بھی وہاں جانے کی سوچ پر کوئی مثبت فیصلہ کرنے کی قوت نہیں رکھتا تھا۔

پھر ایسے ہی دنوں میں سے ایک دن شاپنگ کلب میں گر کر اس کا بازو فریکچر ہو گیا اور اسپتال کے بیڈ پر لیٹے لیٹے اسے احساس ہوا کہ اس نے اپنی زندگی کا کیا حال کر لیا ہے۔

"جو بے وفا ہیں ان کے لیے اپنی زندگی' اپنا کیریر داؤ پر مت لگاؤ۔" بابا زلاری نے اسے سمجھایا تھا اور جسے وہ اب سمجھا تھا۔

چند دن کے بعد اسپتال میں ہی جب اس نے اپنے بیڈ کی سائیڈ پر آبی للی کے پھولوں کا گلدستہ دیکھا تو جیسے بڑے لمبے عرصے کے بعد اس کا سویا ہوا دماغ جاگا تھا۔

"کیا یہ واقعی میرے لیے ہیں۔" اس نے نرس سے ایک بار پھر تصدیق چاہی تھی۔

"یس سر۔۔۔ یہ آپ کے لیے ہی ہیں۔۔۔ ایک لڑکی ان کو رکھ کر گئی ہے۔۔۔ کیا ان میں کوئی کارڈ نہیں ہے؟"

"نہیں۔۔۔ کوئی کارڈ نہیں ہے۔"

وہ حیران ہوا تھا کہ اس کے لیے ایک اجنبی شہر میں کون پھول رکھ کر جا سکتا ہے۔ ہسپتال سے ڈسچارج ہونے کے بعد پھر اس کی ملاقات اس لڑکی سے ہو گئی تھی۔ وہ جو انسانوں سے کتراتا پھر رہا تھا' نہ جانے کس مانوس کشش کے باعث اس کے قریب بیٹھ گیا تھا۔

زندگی کی طرف واپس آنے کے لیے اس لڑکی نے ہی اس کی مدد کی تھی۔ اسی نے شہرام کی رہائش کا بندوبست بھی کیا تھا۔۔۔ اور کتنا پیارا سا نام تھا اس لڑکی کا۔۔۔ بیانکا۔۔۔

☼ ☼ ☼

مقصود لڑکی۔۔۔ بیانکا۔

ایک ماہ بعد اپنے ہوش و حواس بحال کرنے میں کامیاب ہوئی تھی۔

سب سے پہلے اس نے جس شناسا چہرے کو دیکھا وہ چہرہ کیھتی کا تھا۔ رابن کو نمبر دے کر اس نے کیھتی کو وہاں رچرڈ ہاؤس میں ہی بلا لیا تھا۔

"بیانکا۔۔۔" کیھتی نے اس کی حالت دیکھ کر ایک بے اختیار سی چیخ مار دی تھی۔ "اوہ گاڈ۔۔۔ کیا ہوا بیانکا تمہارے ساتھ۔۔۔ تم تو حیفہ آنٹی کے ساتھ لبنان میں نہیں تھیں۔"

کیھتی کے اس ایک فقرے نے بیانکا پر اس کی غیر موجودگی کے سارے حالات واضح کر دیے تھے۔ ظاہری بات ہے جو لوگ ایک ایک چیز میں اتنے طاق

تھے' وہ یہ پوائنٹ کیسے بھول سکتے تھے۔
"خدارا مجھے بتاؤ بیانکا... تمہاری اس حالت کے اسباب کیا رہے؟"
کیتھی کی آنکھیں حیرت سے پھٹ رہی تھیں۔ تب بیانکا نے پہلی بار خود کو کسی اور کو ساری تفصیل بتانے کے لیے تیار کیا تھا۔
ڈیڈ الیاس کے قتل سے لے کر حیفہ مام کے قتل تک کی ساری کہانی... جسے سن کر کیتھی کے چہرے کے تاثرات لحہ بہ لحہ ہیبت ناک ہوتے جا رہے تھے۔
"کیا حیفہ آنٹی... کیا حیفہ آنٹی کی ڈیتھ ہو گئی؟" کیتھی سب سن لینے کے باوجود بھی بے یقینی کی کیفیت میں تھی۔
"ہاں..." آنسو بیانکا کا چہرہ بھگونے لگے تھے۔ کیتھی نے اس کے کانپتے وجود کو اپنی بانہوں میں سمولیا تھا۔
"تمہارے باپ کے خاندان والے اس قدر گھٹیا نکلے... صرف جائیداد کی خاطر انہوں نے اتنے ظلم کیے۔" کیتھی کی اپنی آنکھیں غم سے نم ہو چکی تھیں۔
"کتنا تلاش کیا... میں نے اور آریز نے تمہیں... تم لوگوں کا گھر بھی بند تھا... بڑی مشکلوں سے تمہارے رائنے اپارٹمنٹ کا ایڈریس حاصل کر پائے ہم لوگ... لیکن اپارٹمنٹ بھی بند تھا... اور وہاں کسی کو تم لوگوں کے وہاں شفٹ ہو جانے کی خبر بھی نہیں تھی۔ پھر احمد کے ذریعے ہی پتا چلا کہ تم اور حیفہ آنٹی لبنان جا چکے ہو... اپنے آبائی ملک... حیفہ آنٹی کے خاندان کے پاس... مجھے اور آریز کو تو یقین ہی نہ آیا کہ تم اور حیفہ آنٹی اس طرح اچانک بھی جا سکتے تھے' بنا کسی کو کچھ بتائے... لیکن پھر سوچا کہ شاید کچھ مجبوری آ گئی ہو... واپس آؤ گے تو پوچھوں گی کہ اس طرح اچانک جانے کی وجہ کیا تھی؟
جہاں تک مجھے یاد ہے' اتنی دیر تک احمد ہی تمہاری پراپرٹی کو لک آفٹر کر رہا ہے... وہ کس قدر اطمینان سے تمہاری پراپرٹی اور اسٹور کا کیئر ٹیکر بنا رہا... یقیناً" اس نے جعلی کیسٹر آف اتھارٹی بھی بنوا رکھا ہو گا... کسی کو خبر بھی نہ ہوئی کہ وہ لوگ اندر ہی اندر اس قدر گھناؤنا کام کر رہے ہیں۔"
بیانکا خاموشی سے سنتی رہی تھی اور بے آواز روتی رہی تھی۔
"میں... میں تمہارا غم کس طرح ہلکا کروں بیانکا! میری کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔" کیتھی خود کو لاچار محسوس کر رہی تھی۔
"مجھے یہاں سے لے جاؤ کیتھی... مجھے گھر جانا ہے... آریز کو بلاؤ' مجھے اس سے ملنا ہے۔"
"فی الحال ہمیں پولیس اسٹیشن جانا ہے۔" کیتھی نے کہا تو بیانکا نے اسے حیرت سے دیکھا تھا۔
"پولیس کے پاس جانے کا بھلا اب کیا فائدہ ہو گا کیتھی۔"
"یہ تم پولیس والوں پر چھوڑ دو... قاتل اور چور کہیں نہ کہیں اپنا سراغ ضرور چھوڑ جاتے ہیں۔"
"وہ لوگ بہت بے خوف' بہت گھناؤنے ہیں کیتھی... مجھے ان سے خوف..."
"تمہیں ان سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں... پولیس ہمارے ساتھ ہو گی۔"
"پولیس ان کا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکے گی۔" بیانکا نے مایوسی سے کہا تھا۔
"نہیں ایسی بات نہیں ہے۔ کچھ چیزوں کو پولیس عام لوگوں کی نسبت زیادہ جانتی ہے... یقیناً" کوئی حل نکل آئے گا۔"
"کوئی حل نہیں نکلے گا... وہ لوگ ہر صورت بچ جائیں گے کیونکہ وہ بہت سازشی ہیں۔"
"تم ہمت سے کام لو اور اٹھو... ہم دیر نہیں کریں گے۔ ہم یہ کام آج ہی کریں گے۔"
کیتھی' بیانکا کے منع کرنے کے باوجود اسے لے کر اسی دن پولیس کے آفس گئی تھی۔ بیانکا کی ساری بات کو بہت توجہ سے سنا گیا تھا۔
"آپ ہمارے ساتھ چل کر اس گھر اور ان لوگوں کی نشاندہی کریں۔" آفیسر نے کہا تو بیانکا کو مزید حیرت ہوئی تھی۔ یہ درخواست ایک طرح کی کارروائی شروع

ہو جانے کا ابتدائی مرحلہ تھا۔ بیانکا کی طبیعت جیسے کافی دنوں کے بعد ٹھیک ہوئی تھی۔

"کیا واقعی اب بھی کچھ ہو سکتا ہے۔" اس سوچ نے اسے ذہنی طور پر مستحکم کیا تھا اور کیتھی نے جیسے ایک ہی دن میں کوئی مشن مکمل کر لیا تھا۔

"اب دیکھنا ان لوگوں کو کیسی سزائیں ملتی ہیں۔ کسی کی ساری جائیداد کو نگل لینا اور قتل کر دینا اتنا آسان نہیں ہوتا۔ تمہاری حالت اتنے دنوں خراب نہ رہی ہوتی تو یہ کارروائی اگلے دن ہی سے شروع ہو جاتی' لیکن خیر ابھی بھی زیادہ دیر نہیں ہوئی۔ قاتلوں کی آزادی کے دن زیادہ نہیں رہے۔"

دو گھنٹوں کے طویل سفر کے بعد وہ لوگ کنیکٹی کٹ کے مضافات میں بنا پھول والی سورج مکھی کی فصل والے تاحد نگاہ پھیلے کھیتوں کے درمیان بنے بڑے سے زرعی ہاؤس میں آئے تھے۔

اطلاعی گھنٹی بجانے کے بعد جو چہرہ برآمد ہوا بیانکا اس چہرے کو ہرگز نہیں پہچانتی تھی۔ وہ تو کسی درمیانی عمر کی مرد نما امریکی عورت کا چہرہ تھا۔

"مسٹر غفار۔۔۔ جلال اور احمد۔۔۔ کیا یہ ان لوگوں کا گھر ہے؟" پولیس کے ایک آفیسر نے پوچھا تھا۔

کیتھی اور بیانکا بھی گاڑی میں سے باہر نکل آئی تھیں۔

"نہیں' یہ ان لوگوں کا گھر نہیں ہے' یہ ان کا گھر تھا' اب یہ ہماری ملکیت ہے۔ محکمہ زراعت نے یہ گھر اب ہمیں الاٹ کر دیا ہے۔ وہ اس گھر کے پرانے رہائشی تھے۔" امریکی مرد نما عورت نے کہا تھا۔

"آپ لوگوں کو یہ گھر کب الاٹ ہوا؟"

تقریباً" چالیس دن پہلے۔۔۔ لیکن ہم لوگوں کو یہاں شفٹ ہوئے ایک ماہ ہی ہوا ہے۔۔۔ دراصل ان لوگوں نے گھر ایک ماہ پہلے ہی خالی کیا تھا۔ پاکستان جانے کے لیے ان کی سیٹیں کنفرم نہیں ہو رہی تھیں۔

"پاکستان۔۔۔"

فاصلے سے بھی اس نے یہ لفظ سن لیا تھا اور ایک بار پھر اس نے خود کو کائناتی بلیک ہول کے دہانے پر کھڑا پایا تھا۔

"آپ ہمیں اس گھر کے الاٹمنٹ کی فائل چیک کروا سکتی ہیں؟"

"جی ضرور۔۔۔" عورت دروازہ بند کر کے اندر غائب ہو گئی تھی۔ چند لمحوں بعد وہ واپس باہر آئی تو اس کے ہاتھ میں ایک فائل بھی تھی۔

پولیس آفیسر نے فائل کے صفحے الٹ پلٹ کر کے اسے جانچا تھا۔

"تو کیا وہ لوگ پاکستان جا چکے ہیں؟" فائل پر نظریں گاڑے بارعب پولیس آفیسر نے پوچھا تھا۔

"میری معلومات کے مطابق تو ایسا ہی ہے۔"

"ٹھیک ہے۔۔۔ ہمیں وقت دینے کے لیے آپ کا شکریہ۔"

فائل پکڑ کر اور سر ہلا کر خاتون نے دروازہ بند کر لیا تھا۔ افسردہ کیتھی نے سہارا دے کر بیانکا کو گاڑی میں واپس بٹھایا تھا۔ جو امید اس نے بیانکا کو دلائی تھی وہ شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گئی تھی۔ آنے والے دنوں میں بیانکا کو پتا چلا کہ ڈیڈ الیاس اور حیفہ مام کے محنت سے بنائے گئے سارے اثاثوں کو ان شیطان صفت لوگوں نے کیسے یکے بعد دیگرے اونے پونے بیچا اور پاکستان فرار ہو گئے۔ بیانکا نے دل میں انہیں ڈھیروں بددعائیں دی تھیں۔ تاہم قرار اسے پھر بھی نہیں آیا تھا۔

اور ان دنوں اس نے ایک بار پھر خود کو ذہنی توازن کھو دینے سے بڑے جتنوں سے بچایا تھا۔

☼ ☼ ☼

مورپنکھوں سے سجی شام' دن کے چوبارے پر گھات لگائے چاند کے جام میں انڈیلی جانے لگی تھی۔ افق کی ست رنگی دھار معدوم ہوتے ہوئے اپنے مقسوم کے ہاتھوں مجبور ہو کر منتشر ہونے لگی تھی۔ اس نے بند آنکھوں میں نظر آتے روشنیوں کے الوہی نقطوں کی طرح اس منظر کو بڑے دل سے دیکھا اور گم ہو جانا چاہا تھا۔ اب تو ویسے بھی وہ ان ہی مناظر کی کا بک

میں قید ہونے جارہی تھی۔

ایک ایک کر کے اس نے آسمان کے رنگ دیکھے تھے۔ آخر بار۔۔۔ پھر سے سفید، بھوری، بنفشی، ارغوانی، زور آسا اور دھواں آسا غبار سا پھر اس نے کھڑکی کو بند کر دیا تھا۔

وہ نیند کی ڈھیر ساری گولیاں کھا چکی تھی۔

باتھ روم میں آ کر اس نے ٹھنڈے اور گرم پانی والے باتھ ٹب کے دونوں نلکوں کو پوری طرح سے گھما ڈالا تھا۔

اس کے پاس ایک سادہ سا وائٹ لباس تھا۔ آج شام کے لیے اس نے اس لباس کو ہی منتخب کیا تھا۔ وہ باتھ ٹب میں لیٹ گئی تھی۔ گرم اور ٹھنڈے پانی کی اکٹھی دھار اس کے پاؤں پر کسی منہ زور جھرنے کی طرح پڑنے لگی تھی۔ ٹب آہستہ آہستہ بھرنے لگا تھا۔ اس نے پاؤں کو اونچا کر کے سر کو پوری طرح سے ٹب کی سطح پر لگا دیا تھا۔ اس کے اعصاب ڈھیلے پڑنے لگے تھے۔

بیانکا خودکشی کرنے جارہی تھی۔

اس اتنے بہت سارے گزرے دنوں میں بہت کچھ ہو گیا تھا۔

"بیانکا! جو ہونا تھا، وہ ہو گیا ہے۔ گزرے وقت اور گزر چکے رشتوں کو کوئی واپس نہیں لا سکتا۔۔۔ اب بہتر یہ ہی ہے کہ تم صبر سے کام لو۔۔۔ اور سب کچھ اللہ پر چھوڑ دو۔۔۔ اس کے علاوہ تم اور کچھ کر بھی تو نہیں سکتیں۔۔۔ تمہاری صحت کے لیے بھی ضروری ہے کہ تم باہر نکلو۔۔۔ اس طرح تمہارا ذہن بھی بٹے گا۔" کیٹی نے ایک دن اس سے کہا تھا۔

خود کیٹی کے لیے بھی اس طرح روز روز بیانکا کی طرف آنا اور اس کی دیکھ بھال کرنا مشکل ہوتا جارہا تھا۔ وہ اپنی ایک چھوٹی بہن اور ایک بھائی کی واحد کفیل تھی اور اسے اپنی جاب سے اس طرح روز روز چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔

"دوسری یہ بات اب حقیقت ہے، چاہے تم اسے مانو یا نہ کہ اب تمہارے پاس زیادہ کچھ نہیں بچا۔۔۔ بینک میں موجود پیسے بھی اگر اسی طرح خرچ ہوتے رہے تو ظاہری بات ہے، ایک دن وہ سیونگ بھی ختم ہو جائے گی۔ اس لیے۔۔۔ بھی۔۔۔ اور دوسرے اپنے خول سے باہر نکلنے کے لیے تمہیں کوئی کام کرنا چاہیے۔ میری ایک دوست ہے مارٹا۔۔۔ وہ کسی شائن نامی کلب میں کام کرتی ہے، وہ ہی مجھے وہاں کسی جاب کے بارے میں بتا رہی تھی، لیکن ایک تو مجھے میوزک کی کچھ زیادہ سمجھ بوجھ نہیں ہے۔۔۔ دوسرا میں ایڈون کے گھر خوش ہوں، لیکن میں نے تمہارے لیے تم سے بنا پوچھے ہی مارٹا کو ہاں کر دی ہے، مجھے پتا ہے کہ تمہیں میوزک کا شروع سے ہی جنون رہا ہے۔

تم ڈی جے لائیو پرسنل اپیرنس (Live personal Appearance) (D.J) کی جاب بہت آسانی سے کر لوگی یہ کوئی اتنا مشکل کام نہیں ہے۔ مارٹا تمہیں سب سمجھا دے گی۔ میں نے اسے تم پر گزری ساری داستان بھی سنائی ہے۔ اسے تم پر گزرے سارے حالات پر بہت دکھ ہوا ہے، وہ تمہارے ساتھ مکمل طور پر تعاون کرے گی۔

پائنیر Pioneer کو بس ایک آدھ بار سمجھنے اور اس کی (کیز Keys) کو یاد رکھنے کی ضرورت ہوتی ہے پھر یہ کام بہت آسان لگتا ہے۔ خصوصاً "ان کے لیے جو میوزک کو بہت پسند کرتے ہیں۔ تمہاری اس بارے میں کیا رائے ہے بیانکا؟"

بیانکا بیڈ پر نیم دراز مستقل طور پر چھت کو گھور رہی تھی۔ کیٹی کو شک گزرنے لگا کہ اس کی کسی بھی بات کو ذرہ برابر دھیان سے بھی نہیں سنا گیا۔

"بولو بیانکا۔۔۔ وہ کلب بھی زیادہ مصروف نہیں ہے۔ تمہارا کام یقیناً "انہیں پسند آجائے گا۔"

"آرین۔۔۔ آریز کو یہ کام پسند نہیں آئے گا کیٹی!" بڑی دیر کے بعد بیانکا نے کہا تھا اسے کنوینس کرتے کرتے کیٹی نے رک کر منہ بنایا تھا۔

"کیوں اس میں ایسی کیا برائی ہے؟"

"ڈانس کلب کے ماحول زیادہ اچھے نہیں ہوتے۔۔۔"

"تمہیں میں وہاں ڈانس کرنے کا تو نہیں کہہ رہی۔۔۔ اور ماحول تو انسان خود بناتا ہے۔۔۔ مارٹا کو بھی میں نے کبھی جینز اور ٹی شرٹ کے علاوہ کسی دوسرے ایسے لباس میں نہیں دیکھا جسے تم لوگ ذرا ناپسند کرتے ہو۔ باقی اگر تمہارا کام انہیں پسند آگیا تو تم اپنی ڈیمانڈز ان کے آگے رکھ دینا۔ جس طرح کے بھی تحفظات تمہیں درکار ہوں۔"

"آریز۔۔۔ کب واپس آئے گا کیٹی؟"

"ایسی سہل جاب بار بار نہیں ملتی۔ تم ابھی زیادہ ٹف کام کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہو۔"

"تم مجھے کسی بھی طرح آریز کا فرانس والا کانٹیکٹ نمبر لادو۔۔۔ میرا اس کے گھر جانا مناسب نہیں ورنہ میں خود چلی جاتی۔۔۔ کیا پندرہ دن گزر نہیں گئے؟"

"وہ ابھی واپس نہیں آیا۔۔۔ اس کے ڈیڈ نے کہا تھا کہ اسے فرانس میں دس دن مزید لگیں گے۔"

"تو پھر اس کے آنے تک انتظار کرلو۔۔۔ میں اس سے پوچھ کر ہی کوئی فیصلہ کرسکتی ہوں۔" کیٹی سمجھ سکتی تھی کہ بیانکا کو اس وقت جذباتی وابستگی کی کتنی ضرورت تھی اور آریز کے علاوہ اب دنیا میں اس کے پاس بھلا بچا ہی کیا تھا۔

"اور اگر اس نے انکار کردیا تو؟"

"تو تم اپنی دوست کو بھی انکار کردینا۔"

"ٹھیک ہے' وہ آئے تو اس سے پوچھ لینا۔" کیٹی نے اسے اچھی طرح سے کمبل اوڑھایا تھا۔

"اب تم سو جاؤ۔۔۔ ڈاکٹر نے تمہیں آرام کرنے کے لیے کہا ہے۔"

کیٹی نے ساتھ ساتھ تاکید کی تھی۔ بیانکا نے سونے کے لیے نیم وا آنکھوں کو بند کرلیا تھا۔

اگلے دن صبح کلینک جانے سے پہلے کیٹی نے اسے بریک فاسٹ بنا کر معمول کی طرح بیڈ پر ہی دے دیا تھا۔ خود وہ بیڈ کے ایک کونے میں بیٹھ گئی تھی۔

"تم جاؤ کیٹی! تمہیں دیر ہو رہی ہوگی۔"

کیٹی اپنی جگہ سے نہیں ہلی تھی بلکہ وہ عجیب سی نظروں سے بیانکا کو دیکھنے لگی تھی۔

"میری بات غور سے سنو بیانکا!" کیٹی نے سرگوشی کے انداز میں کہا تھا۔

بیانکا چونکی تھی' چچا جلال نے بھی فون پر اسے یہ ہی کہا تھا اور پھر بعد میں ڈیڈ الیاس کی موت کی خبر ملی تھی۔ بیانکا کے چہرے کے سارے رنگ یک دم بچھڑ گئے تھے۔

"آریز فرانس میں نہیں۔۔۔ وہ یہاں ہی ہے۔۔۔ امریکا میں۔۔۔ دس دن پہلے وہ فرانس سے واپس آچکا ہے۔" کیٹی نے اپنے سابقہ انداز میں بات جاری رکھی تھی۔

منہ تک لے جاتا مفن بیانکا کے ہاتھ سے گر گیا تھا۔

"تم کیا کہنا چاہتی ہو کیٹی۔۔۔ تم کیا بتانا چاہ رہی ہو؟"

"تم تو ٹھیک ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں' اس لیے میں نے تم سے آکر جھوٹ بولا کہ آریز ابھی بھی فرانس میں ہی ہے' جبکہ میں تمہارے پاس آتے وقت ایک دن آریز کے گھر چلی گئی تھی۔ میں نے ان کو وہ ساری باتیں بتائیں جو تم نے مجھے بتائی تھیں' ان لوگوں نے سنا اور افسوس کا اظہار کیا۔ بعد میں' میں نے آریز سے کہا کہ وہ میرے ساتھ چلے تم سے ملنے کے لیے۔۔۔ تب ہی اس کے ڈیڈ اسے لے کر دوسرے کمرے میں چلے گئے۔۔۔ اندر جانے ان دونوں میں کافی دیر تک کیا بات چیت ہوتی رہی بہرحال آریز پھر کمرے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

اس کے ڈیڈ نے مجھے کہہ دیا کہ جو کچھ ہوا' اس پر ان کو دکھ ہے' لیکن اب وہ اپنے بیٹے اور بیانکا کا ملنا پسند نہیں کریں گے۔"

میں تو شاکڈ رہ گئی اور میری کچھ سمجھ میں نہ آیا کہ میں ان سے کیا کہوں۔ پھر بھی ڈھیٹ بن کر میں نے ان سے آریز کو بلوانے کا کہہ دیا جس پر انہوں نے صاف صاف انکار کردیا۔ میں واپس آگئی۔ اگلے دن صبح میں تمہاری یونیورسٹی گئی تھی۔ آریز سے ملنے۔۔۔ وہ مجھے ملا اور مجھے حیرت ہوئی جب اس نے بھی اپنے ڈیڈ والی

بات ہی کہی۔

"بیانکا اب ہمارے اسٹیٹس کے برابر نہیں رہی۔ میرے والدین اس رشتے کے لیے نہیں مانیں گے۔ اور میں ان کے سامنے ضد نہیں کر سکتا۔" تم جانتی ہو کہ میرے اور بیانکا کے درمیان کس طرح کی محبت تھی۔ یہ بس ایک تعلق تھا۔ مجھے افسوس ہے کہ وقت آنے پر میں اس کی کسی بھی طرح کی مدد کرنے سے قاصر ہوں۔"

یقین جانو! میرا دل چاہا میں اس خبیث کا منہ نوچ لوں، لیکن میں ایسا نہ کر سکی۔ میں اسے منالیتی اگر وہ مان جانے کے لیے تیار ہوتا۔ اس نے کہا اور چلا گیا۔ تمہاری حالت ٹھیک نہیں تھی، ورنہ میں تمہیں یہ ساری باتیں تب ہی بتا دیتی، لیکن اب.... لیکن اب ان باتوں کو چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں.... میں تمہیں مزید اذیت نہیں دے سکتی۔ ایک نہ ایک دن تو تمہیں ان چیزوں کو فیس کرنا تھا۔"

کیتھی بہت کچھ کہہ کر خاموش ہو گئی اور دو آنسو بے تحاشا ضبط کرنے کے باوجود بھی بیانکا کی گھور سیاہ آنکھوں سے نکل کر اس کے گالوں پر پھسلتے چلے گئے۔

مشرق زوال کے سمندر میں آئے جوار بھاٹے سے نکل کر برآمد ہوا تھا۔ رنگوں کے سہل عکس جابجا پھیلنے اور پھسلنے لگے تھے۔ پرنور صبح اپنے آغاز پر تفاخر سے لبریز تھی، اس پرنور صبح کے تھال میں سے بیانکا نے اپنے لیے ایک جام اٹھانا تھا اور اس کے اندر اتنی سکت ہی تو نہ رہی تھی۔

"خود کو مضبوط کرو بیانکا!" کیتھی نے کہتے ہوئے اس کے شانے پر تھپکی دی تھی۔

"میں چلتی ہوں.... مجھے دیر ہو رہی ہے۔ شام میں جلدی آنے کی کوشش کروں گی۔" کیتھی اپنا ہینڈ بیگ اٹھا کر اٹھی تھی اور دھیمی چال چلتے ہوئے دروازے تک گئی تھی۔

"کیتھی!" بیانکا نے رندھی آواز سے پکارا تو کیتھی نے وہیں کھڑے کھڑے گردن موڑی تھی اور سوالیہ نگاہوں سے بیانکا کو دیکھا تھا۔

"تم اپنی دوست سے بات کرو، میں وہ ڈی جے کی جاب کرنے کے لیے تیار ہوں۔" جھکی آنکھوں سے بیانکا نے کہا تو کیتھی نے اسے فخریہ نگاہوں سے سراہا تھا۔

رات کو وہ دونوں شائن کلب میں تھیں۔

میوزک کی اسے جتنی بھی سمجھ تھی، وہ ساری اس نے کلب منیجر تھامس کو بتادی تھی، نئے پرانے البمز اور ملکی غیر ملکی سنگرز کے نام سمیت.... کچھ سازوں کے بارے میں بیانکا کی معلومات حیرت انگیز تھیں، اگرچہ اس ساری معلومات کی اس جاب میں ضرورت تو نہیں تھی، لیکن یہ باتیں اس کے حق میں گئی تھیں.... مارٹا نے اسے تین دن لگاتار آنے کے لیے کہا تھا تاکہ وہ Pioneer (پائینیر) کے بارے میں اسے مزید اچھی طرح سمجھا سکے۔

چوتھے دن اس کانٹیسٹ ہونا تھا جس کی بنا پر اسے وہ جاب ملنی تھی۔

وہ تین دن لگاتار آتی رہی تھی اور مارٹا کی مدد سے اس نے Pioneer چلانا سیکھا تھا، چوتھے دن یہ کام اس نے مارٹا کی مدد کے بغیر کیا تھا اور نیچے کھڑے ہجوم سمیت کلب کی انتظامیہ اور خود مارٹا بھی دنگ سی رہ گئی تھی۔

"کچھ انوکھا ہے.... کچھ ایسا انوکھا جسے میں سمجھ نہیں پا رہا۔" منیجر تھامس نے ٹریک ختم ہو جانے کے بعد اس سے کہا تھا۔

"تمہارا کام بہت اچھا ہے.... تمہاری انگلیوں میں جادو ہے.... لیکن کل سے سیڈ (افسردہ) گانوں کا انتخاب مت کرنا۔ فاسٹ میوزک اور زندگی سے بھرپور ٹریک کسی بھی کلب کے لیے ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتے ہیں۔"

اسے سراہنے کے بعد منیجر نے نصیحت کی تھی۔ جسے وہ بہت اچھی طرح سمجھ گئی تھی۔

لیکن اگلے دن منیجر اور بیانکا دونوں اس وقت حیران ہوئے تھے جب نیچے ڈانس فلور پر کھڑے ہجوم نے اسے کل والا ٹریک چلانے کی ہی فرمائش خوب زور و

شور سے کی تھی۔
اس کی انگلیوں میں Tishrei cloud (ابرنیساں) قید تھی۔ اس کے حوالے سے یہ بات پھر جلد ہی مشہور ہو گئی۔ یہ چیز اس کی ذات کی علامت بن گئی اور برسنے والے بادل سے بھلا کب کوئی یہ بات پوچھتا ہے کہ برس جانے کے بعد وہ خود کس قدر کھوکھلا ہو جاتا ہے۔
اس جاب سے اسے یہ فائدہ ضرور ہوا تھا کہ وہ رفتہ رفتہ ذہنی طور پر قدرے نارمل ہونے لگی تھی' لیکن دو ماہ بعد اس کے سارے زخم جیسے پھر سے تازہ ہو گئے تھے۔

وہ ایک روڈ شو تھا جو ٹی وی پر چل رہا تھا۔ سڑک پر نظر آتے بہت سارے لوگوں کے ہجوم میں سے احمد کو پہچاننے میں اسے سیکنڈ کا ہزارواں حصہ بھی نہیں لگا تھا اور وہ جیسے سانس لینا بھول گئی تھی۔
تو کیا احمد امریکا میں ہی تھا۔ کیا وہ پاکستان نہیں گیا تھا یا کوئی بھی پاکستان نہیں گیا تھا' بلکہ وہ سب امریکا کی ہی کسی اور ریاست میں منتقل ہو گئے تھے۔ بیانکا یہ بات اگلے دن پتا کر پائی تھی کہ وہ روڈ شو فلوریڈا میں ہو رہا تھا۔

احمد اور سارے گھرانے کا پتا کرنا اب زیادہ مشکل نہیں رہا تھا۔ اگر وہ تب ہی پولیس کو کارروائی کرنے سے نہ روکتی تو ایرپورٹ انکوائری کے ذریعے یہ بات آسانی سے پتا چل سکتی تھی کہ دراصل وہ لوگ پاکستان واپس گئے ہی نہیں۔
بیانکا نے ہر چیز کے لیے خود کو بہتر جانا تھا۔
"اب مجھے جلد بازی سے کام نہیں لینا... مجھے بھی اسی طرح کی پلاننگ کرنی ہے جیسے ان لوگوں نے میرے اور حیفہ مام کے لیے کی تھی۔" وہ بہت کچھ سوچنے لگی تھی۔
اب غصے یا عجلت میں اٹھایا گیا کوئی بھی قدم اس کے کام کو خراب کر سکتا تھا' یا اسے منزل سے ہی کوسوں دور کر سکتا تھا یہ بھی ہو سکتا تھا کہ غفار' جلال' احمد وغیرہ اپنا نیا گھر بار چھوڑ کر پھر سے کہیں اور شفٹ ہو جائیں۔

تب انہیں دوبارہ ڈھونڈنا تقریباً" ناممکن ہو گا اور قدرت نے جو موقع اسے دیا ہے اسے وہ ضائع نہیں کرے گی' بیانکا نے کیٹی سے بات کی تھی۔
"یہ تو بہت بڑی گڈ نیوز ہے بیانکا! کہ وہ لوگ ابھی تک امریکا میں ہی ہیں۔ پر اب تم کیا کرنا چاہتی ہو؟ تم ایک بار پہلے بھی پولیس کو کارروائی کرنے سے روک چکی ہو۔" کیٹی نے پوچھا تھا جبکہ بیانکا کچھ اور ہی سوچ رہی تھی۔
یہ بات تو طے تھی کہ وہ لوگ اس قدر چالاک تھے کہ ان کے پاس پولیس سے بچنے کے بھی ہزاروں طریقے ہو سکتے تھے اور بیانکا کو جھوٹا ثابت کرنے کے لیے انہیں زیادہ محنت کرنے کی بھی ضرورت نہیں پڑتی تھی۔ ان لوگوں نے یقیناً" اس چیز کے بارے میں بھی کافی کچھ سوچ رکھا ہو گا۔
"پہلے مجھے کسی اچھے وکیل سے ملنا ہو گا۔ اس سے مشورہ کرنا ہو گا۔"
بیانکا نے ساری رات مزید سوچنے کے بعد اگلے ہی دن اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانا شروع کیا تھا اور مزید ایک ہفتے تک وہ وکلا آفسز میں دربدر بھٹکتی رہی تھی۔
تقریباً" سب نے ہی اس کی بات کو سیریس ہو کر سنا تھا' لیکن وہ آگے سے اسے کوئی مشورہ نہیں دے پائے تھے۔
"مسٹر الیاس کا قتل صرف آپ کا قیاس ہے اور مسز حیفہ کا بھی... جائیداد کی منتقلی کے وقت آپ خود یونین کے آفس میں موجود تھیں یہ بات ثابت کرنا بہت مشکل ہے کہ آپ اس وقت دوائیوں کے زیر اثر تھیں۔"
"ڈیڈ باڈیز کے پوسٹ مارٹم کروانے پر آپ تیار نہیں ہیں اور اگر ایسا ہو گیا اور رپورٹ میں واضح طور پر کوئی شہادت ان کے خلاف نہ گئی تو۔"
"مسز حیفہ کی موت الرجی کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ ہو سکتا ہے ان کو سورج مکھی سے الرجی ہو اور اس بات سے آپ بے خبر ہوں۔"

"جس طرح کی کہانی آپ سنا رہی ہیں یہ کیس تو الٹا آپ پر بھی پڑ سکتا ہے کہ پہلے آپ نے اپنے ہی لوگوں کو مہنگے داموں اپنی پراپرٹی بیچی پھر اب یہ طریقہ اپنا کر واپس حاصل کرنا چاہ رہی ہیں۔"

وہ ساری زندگی کسی وکیل کے آفس میں نہیں گئی تھی اب گئی تو زندگی کی ایک نئی جہت سے متعارف ہو رہی تھی۔ مایوسی کے باعث بیانکا کا دماغ چکرانے لگا تھا۔

اپنا کیس وہ کسی عام سے وکیل کو دینا بھی نہیں چاہتی تھی ایسا کرنا کھیل کھیلنے سے پہلے ہی ہار جانے کے مترادف تھا۔

"کیتھی...! تم مشہور زمانہ وکیل ایڈون کے گھر کام کرتی ہو نا... کیا تم میری ایڈون سے ملاقات کروا سکتی ہو؟"

"ہاں... ٹھیک ہے۔"

کیتھی نے بے دلی سے کہا تھا کیوں کہ وہ جانتی تھی کہ یہ کام کس قدر مشکل ہے۔ مشہور زمانہ اور معروف ترین وکیل ایڈون سے سفارش کے ذریعے وقت مانگنا کیتھی کے لیے بہت کٹھن مرحلہ ثابت ہونے والا تھا۔

ایک ماہ کے سخت اذیت ناک انتظار کے بعد اس کی ایڈون سے ملاقات ہو پائی تھی۔ صرف بیس منٹ کی اور ملاقات کے اختتام تک بیانکا نے خودکشی کرنے کا پکا ارادہ باندھ لیا تھا۔

ایڈون کو ہائیر کرنا بیانکا کی پہنچ سے کافی دور تھا۔ دوسرا روتے ہوئے جس انداز سے بیانکا نے ایڈون کو ساری کہانی سنائی ایڈون کو یہ کیس بڑا ہی جھول وار اور بیانکا ہی کوئی سازشی سی لڑکی نظر آئی۔ اور گھر واپس آتے وقت وہ ڈھیر ساری نیند کی گولیاں لیتی آئی تھی۔ وہ سب کچھ سمیت اب زندگی بھی ہار دینا چاہتی تھی۔

ٹب آہستہ آہستہ بھرنے لگا تھا پانی اس کے سر سے کان کی طرف آنے لگا تھا۔

وہ اپنے بچپن سے لے کر اب تک کے سارے واقعات کو ایک ایک کر کے یاد کرنے لگی تھی نہیں یاد نہیں کر رہی تھی بلکہ واقعات تصویروں کی شکل میں اس کی نظروں کے سامنے آنے لگے تھے۔

جیفہ مام نے کہا تھا ڈیڈ الیاس نے سمجھایا تھا۔

نہیں۔ اسے کوئی ایسی بات یاد نہیں کرنی تھی جس میں امید کی ذرا سی بھی چاشنی ہوتی وہ مرنے کا فیصلہ کر چکی تھی اور یہ اس کا آخری فیصلہ تھا۔

اس کا سراپانی میں ڈوب چکا تھا۔

وہ نیند کی کیفیت میں گم ہو گئی تھی وہ مرنے کے لیے تیار ہو گئی تھی۔ بھرے ہوئے ٹب کا تلاطم زدہ پانی بہہ کر نیچے فرش پر گرنے لگا تھا بیانکا پوری طرح اس میں ڈوب چکی تھی۔

"مجھ سے وعدہ کرو بیانکا...! تم ایسا ہرگز نہیں کرو گی... میری جان ہی کیوں نہ چلی جائے تم ان لوگوں کو ایک پینی بھی نہیں دو گی۔" بیانکا کا وجود خوفناک حد تک ساکت تھا۔

"ان ساری چیزوں میں الیاس کے ہاتھوں کی خوشبو رچی بسی ہوئی ہے۔ میں ان چیزوں کو کبھی ان کے ناپاک ہاتھوں میں جاتا ہوا برداشت نہیں کر پاؤں گی۔"

"تم ایسی سوچ کو بھی گناہ سمجھو گی۔"

"ہمت نہیں ہارنا میری بچی... گھبرانا نہیں... ورنہ تمہارے ڈیڈ الیاس کی روح پریشان ہو جائے گی۔"

ذہن کو ہر طرح کے خیالات سے پاک کر دینے کے باوجود بھی وہ ان باتوں کو جھٹک نہیں پا رہی تھی۔

دفعتاً "رات کے جام میں انڈیلی جانے والی شراب کا رنگ سنہری ہو گیا۔ آہن گر سپاہیوں نے اپنی اپنی تلواریں میان سے نکال لیں۔ یہ اشارہ تھا۔ جنگ لڑنے کا آخری دم تک...

پھر بڑی دیر کے بعد بیانکا کے ساکت وجود میں حرکت پیدا ہوئی تھی اور پانی کا ایک بلبلا سطح تک آیا تھا۔

"ہمت نہیں ہارنا میری بچی... گھبرانا نہیں..."

بیانکا ایک جھٹکے سے اٹھی تھی اور ٹب سے باہر منہ نکال کر اس نے بھرپور سانس لینے کے ساتھ ساتھ

کھانسنا بھی شروع کر دیا تھا۔
وہ ایسے کیسے مر سکتی ہے؟ وہ ایسے کیوں مرے؟ تاکہ اس کے دشمن ہر لحاظ سے مطمئن ہو جائیں؟
نہیں، وہ اپنی آخری سانس... اپنے خون کے آخری قطرے تک ان سے بدلہ لینے کی کوشش کرتی رہے گی۔
مجھے اس اندھیرے ماضی کو یاد رکھنا ہے۔ اس اندھیرے میں ایک چیز چمکتی تھی... حیفر بام کی آنکھوں میں آئے آنسو... جن کی یاد مجھے آگ کی طرح جھلساتی ہے... مجھے اس آگ کی آبیاری کرنی ہے... دنوں سالوں کے گزرنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا... صدیوں کی لگاتار بارش بھی اس آگ کو ٹھنڈا نہیں کر پائے گی۔ یہاں تک کہ یہ آگ ایک تناور درخت بن جائے گی۔ ایک زہریلا درخت... پھر اس درخت پر ایک سیب اگے گا اور وہ زہریلا سیب گناہ گاروں کو چکھنا پڑے گا۔

☆ ☆ ☆

ایک نارنجی خط نے ورق آفتاب کے تار کو کھینچ کر پورے آسمان کی وسعت پر پھیلا دیا تھا۔ مکھنی سے نیچے آسمان میں سہ پہر کے ارغوانی رنگ تحلیل تھے اور سیلاب نور میں ڈوبے ہوئے محل طوفانی روشن سراپے اوڑھے ہوئے تھے۔
دونوں خاموش ہو چکے تھے۔ اتنا سب کچھ بتا دیا گیا تھا کہ مزید کہنے کو الفاظ نہ ملتے تھے۔
"پھر یہ اس نے تمہیں واپس کر دیا؟" بیانکا نے شہرام سے پوچھا تھا۔ خود اپنا ہی دھیان بدلنے کے لیے اس کے گلے پر لٹکے تعویذ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اور آنکھوں کی نمی کو انگلی کی پور سے صاف کر لینے کے بعد...
"نہیں، واپس نہیں کیا... بلکہ میرے منہ پر دے مارا..." خنجر کی دھار کی طرح کے تیز لہجے میں شہرام بولا تھا۔
"تو تم نے پھر یہ خود کیوں پہن لیا؟"
"اب میں صرف اپنے آپ سے محبت کروں گا یہ عہد کرنے کے بعد... میں نے اسے خود پہن لیا۔ میں اپنا محبوب خود ہوں۔ میں عاشق ہوں تو صرف اپنی ذات پر، فدا ہوں تو صرف اپنی زندگی پر۔"
شہرام کی بات کو سنتے ہوئے بیانکا نے اس کے کرخت چہرے کو دیکھا تھا۔
"جب ہمارے ساتھ کچھ برا ہوتا ہے تو ہم اپنی زندگی کے نئے عہد ضرور کرتے ہیں۔"
"کرنے بھی چاہئیں... کیا تم نے بھی خود سے کوئی عہد کر رکھے ہیں؟"
"ہاں... بہت سارے..."
"کیا... کیا میں جان سکتا ہوں۔"
"یہ ہی کہ انتقام کی آگ کو سب کچھ خاک ہو جانے سے پہلے راکھ نہ ہونے دوں گی۔"
شہرام چونک کر ایک ٹک بیانکا کی طرف دیکھتا رہ گیا تھا۔ اسے اس پتھر چہرے سے خوف سا آنے لگا تھا۔ جو ایک دم ہی اس کے معصوم چہرے پر پنجے گاڑے محسوس ہوا تھا۔
"تم نے عہد نہیں کیا... تم نے خود کو اذیت دینے کا سامان اکٹھا کر لیا ہے۔" بیانکا نے عجیب سی نظروں سے شہرام کی طرف دیکھا تھا۔ ان نظروں میں ایک قہر سا دبا ہوا تھا۔
"بابا زلاری تمہیں نہیں سمجھا سکے تھے اور تم مجھے نہیں سمجھا سکتے۔" شہرام لاجواب ہو گیا تھا۔
"میں صرف اتنا کہہ رہا ہوں کہ..."
"اب چلیں... کافی دیر ہو گئی ہے۔" بیانکا نے شہرام کی بات کاٹی تھی۔ اس کا صاف مطلب تھا کہ وہ اس موضوع پر مزید بات کرنے کا ارادہ نہیں رکھتی۔
"ہاں... چلو..."
دونوں اکٹھے اٹھے تھے۔ دہکتی سہ پہر میں شام کی جوت جاگنے لگی تھی۔ ادھ کھلی کلیاں واپس بند ہونے لگی تھیں اور بھینی خوشبو میں حبس کا بے جا عمل دخل شروع ہو چکا تھا۔
وکٹورین طرز کے بنے آہنی گیٹ کی طرف بڑھتے

ہوئے شہرام ایک دم سے بیانکا کے آگے آیا تھا۔
"تم نے یہ تو بتایا نہیں کہ تم بدلہ لوگی کیسے؟"
"ایک وکیل ہے... مجھے امید ہے کہ میں اسے اپنا مقدمہ لڑنے کے لیے راضی کرلوں گی۔ وہ راضی ہوگیا تو مسئلہ صرف اس کی فیس کا رہ جائے گا۔ فیس کے معاملے میں اس کے اصول دوسروں سے مختلف ہیں۔ میں اس کی فیس کے پیسے ہی اکٹھے کررہی ہوں۔ میرا میش اپ ہٹ ہوگیا تو یہ کام جلد ہی ہوجائے گا۔"
پارک کے دروازے سے نکل کر دونوں ٹیکسی اسٹینڈ کی طرف بڑھنے لگے تھے۔ سرد ہوا کے باعث پارک کا رش ختم ہوچکا تھا۔ سناٹے میں بیانکا کی ہیل کی آواز گونجنے لگی تھی۔
"میں تمہاری کامیابی کے لیے دعاگو رہوں گا۔" شہرام نے کہا تو بیانکا نے مسکرا کر شہرام کی طرف دیکھا تھا۔
"ہفتے کی رات کو کلب آؤ گے نا... وہ میش اپ کے ریلیز ہونے کا دن ہے۔" ٹیکسی کے اندر بیٹھتے ہوئے بیانکا نے پوچھا تھا۔
"ہاں... ضرور... کیوں نہیں... تمہاری زندگی کا انتہائی اہم دن ہے... میں بھلا اسے کیسے مس کرسکتا ہوں۔"
"تب تک شیو مت کرنا۔" بیانکا نے سنجیدہ لہجے میں عجیب سی بات کی تھی۔
"کیا..." وہ حیران ہوا بڑے معصومانہ انداز سے...
"کیوں..." اور نہ سمجھنے والے انداز سے وہ بیانکا کو دیکھنے لگا۔
بیانکا نے لمحہ بھر کو توقف کیا تھا اور یہ توقف شہرام کو بہت طویل لگا تھا۔
"شاید تمہیں معلوم نہ ہو... تمہاری شیو پر بالوں سے دو دائرے بنتے ہیں... اور... اور یہ تم پر بہت اچھے لگتے ہیں... خدا حافظ۔"
ٹیکسی آگے بڑھ گئی تھی۔ وہ وہیں کھڑا ٹیکسی کی پشت کی دور ہوتی روشنی کو دیکھتا رہ گیا تھا۔ پھر بے اختیار ہی اس نے اپنے رخساروں پر ہاتھ پھیر کر اپنی شیو کے بالوں کو محسوس کیا تھا اور مسکراہٹ اس کے لبوں پر آگئی تھی۔ ایک لمبے عرصے کے بعد اس کی مسکراہٹ سے سچائی جھلکی تھی۔

☼ ☼ ☼

بیانکا نہیں جانتی تھی کہ آسمان پر نظر آتے کبوتروں کے غول میں ایک زاغ آبی (آبی پرندہ) بھی ہے۔
ہفتے کی رات کو کلب کی اینورسری کے دن اس نے اپنا میش اپ ریلیز کیا تھا اور نتیجہ توقع سے بڑھ کر آیا تھا۔
میش اپ پر محنت کی گئی تھی جو اس کے ایک ایک سرے سے جھلک رہی تھی۔ ساتھ ہی ویڈیو بھی ریلیز کردی گئی تھی اور ویڈیو اپنی طرز کی مختلف ویڈیو تھی۔ جس میں میوزک کے ساتھ صرف رنگ بدلتے دکھائے گئے تھے۔ دراصل ایسا صرف کم بجٹ کی وجہ سے کیا گیا تھا اور بیانکا کو یقین بلکہ مجسم یقین تھا کہ اس کے مرتب کیے گئے گانوں اور دھنوں کو عوام کی پذیرائی حاصل کروانے کے لیے کسی اعلا ویڈیو کی ضرورت نہیں ہے۔ جو کچھ وہ اپنے تجربے کی بنا پر اس میش اپ کو دے چکی ہے وہ کسی کو بھی دیوانہ کردینے کے لیے کافی ہے۔
اس لیے اپنے میش اپ کی سی ڈیز مختلف میوزک کمپنیز کو بھجوادی تھیں اور سوشل میڈیا پر اس کے میش اپ کو کافی مداح بھی مل چکے تھے۔ یہ سب ایک ہفتے کے اندر اندر ہوا تھا۔
شہرام بھی بیانکا کے لیے خوش تھا۔ کلب کی اینورسری پر میش اپ کی ریلیز سے لے کر وہ ہر نئے پڑاؤ پر بیانکا کے ساتھ ساتھ رہا تھا۔ بیانکا کو بس اب میوزک کمپنیز کی طرف سے ملنے والے رسپانس کا انتظار تھا۔ آج کل اسے ہر چیز بڑی اچھی اور خوب صورت لگنے لگی تھی۔ ضیاریز (روشنی دینے والا) اس پر مہربان ہوچکا تھا۔ بڑے لمبے عرصے کے بعد اس کی آنکھیں چندھیا رہی تھیں۔
لیکن پھر نہ جانے کیا ہوا۔ روشنی کی دھاروں میں

سیاہی نہ جانے کیسے بھر دی گئی۔ کبوتروں کے غول میں جو ایک زاغ آلی بھی تھا تو رفتہ رفتہ وہ بھی سب کی نظروں میں آنے لگا اور دیکھتے ہی دیکھتے سارا غول زاغ آلی سے بھر گیا اور وہاں صرف ایک کبوتر رہ گیا۔

یہ زاغ آلی برطانیہ سے آیا تھا۔ اسٹار لائٹ کا ہورائزن اسٹار لائٹ تین نوجوان خوب صورت لڑکوں پر مشتمل برطانیہ کا مشہور میوزک بینڈ۔۔۔ انہوں نے اپنا میش اپ ہورائزن جاری کیا تو وہ دیکھتے ہی دیکھتے شہرت کی بلندیوں کو چھونے لگا۔ ایسا عموماً" ہوتا ہی ہے کہ ہر طرف لوگ اپنے اپنے کام کو لے کر کوششیں اور محنت کر رہے ہوتے ہیں 'لیکن بد قسمتی کا عنصر وہاں نمایاں ہوا جب بیانکا کو پتا چلا کہ اسٹار لائٹ کے ہورائزن میں موجود دس گانوں میں چار گانے وہ بھی ہیں جن کا انتخاب بیانکا نے بڑی محنت کے بعد کیا تھا۔

اس کا جو خیال تھا کہ اس کے منتخب کیے گئے گانوں کو لے کر امریکا کا کوئی بھی شخص میش اپ بنانے کا سوچ بھی نہیں سکتا تو یہ خیال درست تھا۔ امریکا میں کسی نے واقعی ایسا نہیں سوچا تھا' لیکن اس کے خیال کی حدود برطانیہ تک نہ جاتی تھیں۔ اسٹار لائٹ امیر ترین گروپ تھا۔ ان کے میوزک کی کوالٹی کا بیانکا کے میش اپ سے بھلا کیا مقابلہ کیا جا سکتا تھا۔ اسپیڈ اجوف قابل لڑکا تھا اور اس کی کمپنی اچھا کام کر رہی تھی' لیکن اسٹار لائٹ کے مقابلے میں وہ ابھی جدوجہد کرنے والی چیونٹی کی حیثیت رکھتی تھی۔ نہ جانے کس زعم' کس امید کے سہارے بیانکا پھر بھی پر امید رہی۔

ہورائزن (افق) دیکھتے ہی دیکھتے افق پار کرنے لگا اور بیانکا کا میش اپ ارتھ کوئیک (زلزلہ) دن بدن ریکٹر اسکیل پر اپنی شدت پہلے سے کم ظاہر کرنے لگا۔

لاتعداد میوزک کمپنیز کی طرف سے بھی کوئی جواب نہ آیا۔

ایسا نہیں تھا کہ وہ بری طرح گری تھی۔ بس وہ اچھی طرح اٹھ نہ سکی تھی اور اس دن اس نے اپنی ہار کو تسلیم کر لیا' جب کلب کے منیجر تھامس نے اسے ارتھ کوئیک چلانے کے بجائے ہورائزن چلانے کا کہا۔

شہرام نے ایک طرح سے اسے سمجھانے' دلاسا دینے اور نئی امید دلانے کی کوشش کی تھی' لیکن بیانکا ان دنوں کوئی نصیحت سننے کے موڈ میں نہیں تھی۔ اتنی ساری کوششوں' دعاؤں اور جدوجہد کے بعد وہ پھر سے ہار گئی تھی۔ یہ بات غم کے پہاڑ کی طرح اس کے ذہن پر سوار تھی اور یہ غم کا پہاڑ کسی اور طرف سرکنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔

تھامس کی ہورائزن چلانے کی ہدایت والے دن شہرام نے بیانکا کا ایک الگ ہی روپ دیکھا تھا۔ وہ بیانکا کو بہت نرم مزاج سمجھتا تھا۔ نہیں جانتا تھا کہ یتیم خانے کی قید نے اس کی ساری نرم مزاجی کو ختم کر کے اس کے اندر تک تلخی اور نفرت بھر دی ہے۔ بیانکا نے تھامس کو اتنی کھری کھری سنائی تھیں کہ شہرام کو شک ہونے لگا تھا کہ دراصل تھامس بے چارہ دونوں کانوں سے بہرہ ہو چکا ہے۔

بیانکا نے بتایا تھا کہ صرف اس کی وجہ سے اس غیر معروف کلب نے ترجمانی کی ہے اور وہ جب چاہے جہاں چاہے جا سکتی ہے۔ اس کلب سے بہت بڑی آفرز ہمیشہ اس کے پاس رہی ہیں۔

تھامس نے دوبارہ اس سے کوئی بات نہیں کی تھی۔ اس کا لہجہ منت بھرا ہو گیا تھا اور بھرپور انداز میں معذرت کرنے کے بعد اس نے بیانکا کو کھلی چھٹی دے دی تھی کہ وہ جس طرح کے گانے اور میش اپ چلانا چاہے چلا سکتی ہے۔ اس پر کسی طرح کی حدود لاگو نہیں ہوں گی۔

لیکن تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ منیجر کی بات سے بیانکا نے پورے ملک کے نظریے کو اخذ کر لیا تھا۔ وہ پیچھے رہ گئی اور اسٹار لائٹ کا ہورزن آگے نکل گیا۔ اس نے بالآخر تسلیم کر لیا۔

اپارٹمنٹ آ کر وہ اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گئی تھی اور نہ جانے کتنی دیر ایسے ہی بیٹھی رہی تھی۔ اس میش اپ کے لیے اس نے اپنی باقی ماندہ دولت کو بھی خیرباد کر دیا تھا۔ آگ میں جھونک دیا تھا۔

اب وہ صحیح معنوں میں مفلس۔۔۔ بلکہ مفلس تر

ہو گئی تھی۔

باتھ روم کاٹب اسے شاید ایک بار پھر بلا رہا تھا۔

بند کھڑکی کے نیچے کی اتھاہ گہرائی دکھا رہی تھی۔

اس نے ایک نظر کھلے دروازے سے نظر آتے ٹب کی سفید اور شفاف سطح کو دیکھا اور پھر بند کھڑکی سے باہر نظر آتی رات کی تاریکی کو۔۔۔ اگر اس بار وہ ٹب میں جانے کے بجائے ایک ہی بار میں کھڑکی سے کود جائے تو؟ کھڑے ہو کر وہ گہری نظروں سے کھڑکی کا مشاہدہ کرنے لگی۔ کھڑکی کے شیشے پر اسے اپنا پریشان حال عکس نظر آیا تھا۔ دس انگلیوں نے اس کے بالوں کو بے ترتیب کر دیا تھا۔ اسے اپنا وجود خشک پتوں کی طرح بکھرا ہوا نظر آیا۔ وہ کسی سال خوردہ درخت کی طرح بس گر جانے کو تیار تھی۔ لیکن اس گرنے سے پہلے نہ جانے کہاں سے آتی روشنی کے ایک ننھے سے قطرے نے چکور شیشے کو منور کر دیا۔

اس گھر میں اگر ایک باتھ ٹب تھا تو کیا ہوا۔ اس گھر میں ان گنت آئینے بھی تو تھے۔ آئینے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتے۔

اور پھر رات کے دو بجے عجیب بات ہوئی۔

بیانکا نے اپنا سب سے عمدہ لباس زیب تن کیا۔ پھر لباس کی مناسبت سے ہی اس نے جوتے پہنے اور جیولری کا انتخاب بھی اس نے خاص احتیاط سے کیا۔ گھر میں موجود سارے میک اپ کو اس نے کسی ماہر مصور کی طرح خود پر ملا تھا اور رولر سے بالوں میں کرل بھی ڈالے تھے۔

اس ساری تیاری میں دو گھنٹے لگے تھے۔

صبح چار بجے تمام کاموں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے کارنس کی لکڑی پر اپنی دونوں ہتھیلیاں جما کر اپنے جسم کا سارا بوجھ وہاں منتقل کیا تھا اور خود کو بڑے مفصل انداز سے دیکھنا شروع کیا تھا۔

لمبی پلکیں۔۔۔ بھرے بھرے ہونٹ۔۔۔ اور گہری سیاہ آنکھیں۔۔۔ اسے اپنے لبنانی ہونے پر ناز ہوا تھا۔

"یہ ہے وہ جام۔۔۔ تو یہ ہے وہ جام۔۔۔ جو بیک وقت شہد بھی ہے اور زہر بھی۔۔۔" خود کو آئینے میں دیکھتے ہوئے اس نے خود سے کہا تھا۔

اور اس رات دو اور حقیقتوں کا ادراک ہوا تھا بیانکا پر۔

ایک تو یہ کہ وہ کسی صورت سالے جریج (مس لبنان) سے کم خوب صورت نہیں ہے دوسری یہ کہ۔۔۔ جتنے پیسے اس نے میش اپ پر لگائے اگر خود پر لگائے ہوتے تو آج اسے اس طرح مایوس نہ ہونا پڑتا۔

ایک بے اختیار۔۔۔ دل فریب سی مسکراہٹ اس کے لبوں پر آئی تھی۔ اس نے اپنی گردن اور چہرے پر **لکسر** کا اسپرے کیا تھا۔

آج اس کا خود کو بڑی دیر تک دیکھتے رہنے کا ارادہ تھا۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

فریدہ فرید

عید شوق

تشنہ اسم بامسمیٰ تھی‘ اس کی ہر حرکت اور ہر بات سے تشنگی ظاہر ہوتی تھی۔ اسے لوگوں سے ملنا جلنا‘ ہنسنا بولنا ناپسند تھا۔ قابل فہم بات تھی تنہائیوں میں گزری حیات اس کی شخصیت سے عیاں تھی‘ وہ زبان سے کچھ نہ کہتی تھی مگر دیکھنے والے کو اسے سمجھنا دشوار نہ ہوتا تھا۔

بزمی انجم اسے ریاضی کے سوالوں کی طرح حل کرنے کی تگ و دو میں تھے جو سمجھنے میں آسان تھی مگر سمجھانے میں انتہائی مشکل معلوم ہوتی تھی۔

"عید نعمت الٰہی ہے‘ مومن کے لیے انعام خداوندی کو ویسٹ آف ٹائم قرار دینا اللہ کے فضل سے انکار کے مترادف ہے۔" بزمی انجم میتھ کے ٹیچر تھے مگر لیکچر اسلامیات کا دے رہے تھے تشنہ جبین کے منہ کے زاویے حسب روایت تھے لیکچر کوئی بھی ہو اس کا ری ایکشن یہی ہوتا تھا۔

"عید خوشی کا تہوار ہے۔ اصل چیز خوشی ہی ہے اور خوشی لامحدود ہوتی ہے۔ سوچ کو محدود رکھو گی تو خوش کیسے رہ پاؤ گی۔"

بزمی انجم جس طرح اس کے ذہن کو ریاضی میں پرفیکٹ کرنے میں مستقل مزاج تھے یونہی عید کے متعلق اس کی رائے تبدیل کرنے پر بھی کمربستہ دکھائی دیتے تھے جبکہ تشنہ جبین کی مثال ایسی ہی تھی (جو لاہور بھیڑے (برے) وہ پشاور بھی بھیڑے (برے)

"سر! کل میرا ریاضی کا پیپر ہے عید کا نہیں۔"

بزمی انجم کے مسلسل لیکچر سے عاجز آکر اس نے تیکھے چتونوں سے بات کاٹ دی تھی۔ وہ بزمی انجم کی مستقل مزاجی اور کمال ضبط سے تو واقف تھی جسے دل ہی دل میں وہ ڈھیٹ پن کا نام بھی دیتی تھی مگر یہ بے محل تقریر اس کی برداشت سے باہر تھی۔

معمولی سی بات تھی‘ سر جی نے اس سے عید کی تیاریوں کے بابت سوال کیا تھا اور اس نے اپنی ازلی لاپروائی سے چیونگم کو داڑھوں کی سائیڈ میں دبا کر کہا تھا۔

"عید کی تیاری اور تشنہ جبین۔ او نو سر عید از جسٹ ویسٹ آف ٹائم۔" اور پھر کیا تھا‘ بزمی انجم نے جو عید کی قصیدہ گوئی شروع کی تو تشنہ جبین کی ناک تک لاکر چھوڑی۔

بزمی انجم وہ واحد استاد تھے جو اسے پڑھانے کی ذمہ داری چھ ماہ سے انجام دے رہے تھے وگرنہ اس سرپھری کو چھ دن سے زیادہ کوئی ٹیچر افورڈ نہیں کرسکتا تھا۔

بزمی انجم کو تشنہ جبین کے والد کہاں سے ڈھونڈ کر لائے تھے‘ یہ جاننے کی اس نے کبھی کوشش نہیں کی تھی کیونکہ اسے یقین تھا کہ یہ چہرہ ایک ہفتے بعد دیکھنے کو نہیں ملے گا مگر بزمی انجم کا جیسے تیسے ایک ماہ گزرنا تھا کہ تشنہ جبین کے ماتھے کے بل پلس در پلس ہوتے چلے گئے تھے مگر بزمی انجم چکنے گھڑے کی مانند ثابت ہوئے تھے جن پر اس کی بدتمیزی کی حد تک تنگ مزاجی کا کوئی اثر دکھائی نہیں دیتا تھا۔ وہ مانند قطرہ اپنی نصیحت کی پھوار اس کے پتھر نما دماغ پر ٹپکاتے رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

عزیز احمد نے زندگی میں یوں تو کئی غلطیاں کی تھیں
سرفہرست اسے اپنے آپ سے دور رکھنے کا فیصلہ تھا۔
ابھی وہ اپنے اردگرد چہروں کو ڈھنگ سے جان بھی نہ
پائی تھی کہ اسے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے
ہوسٹل بھجوادیا گیا تھا کیونکہ عزیز احمد اپنے گاؤں کے
محدود معیار تعلیم سے مطمئن نہیں تھے۔ گو اس کے
کیریر کے لیے یہ فیصلہ غلط نہ تھا مگر تقدیر نے اسے باغی
تب بنایا جب وہ سات سال بعد اپنی ماں کی میت پر
واپس آئی تھی۔
اپنی ماں کی گود کی اکلوتی وارث ہونے کے باوجود وہ
موسم گرما کی طرح صرف چند ماہ اس گود کی گرمی محسوس

کرپائی تھی۔ بزنس مائنڈڈ والد سے اس کی شکایات نے اسے کس سوچ کا حامل بنادیا تھا اس کا عقدہ عزیز احمد پر تب کھلا جب وہ اپنے امتحانوں میں پے در پے ناکام ہونے لگی تب عزیز احمد کو اس کی ذات کی گہرائیوں کا قدرے اندازہ ہوا۔ حیرت کی بات تو تھی کہ اب تک کی ٹاپ کلاس اسٹوڈنٹ یکدم پاسنگ مارکس سے بھی محروم ہوگئی تھی۔ تب وہ ہوسٹل کی کال کوٹھریوں سے نکل کر گھر کی پرسکون فضاؤں میں تو لوٹ آئی مگر خود ساختہ سوچوں اور ماں سے ناگہانی جدائی نے اسے اپنے نام کا پرتو بنادیا۔ اس کی روح کی تشنگی اس کی ضدی طبیعت نے دوچند کردی تعلیم سے تو وہ الرجک ہو ہی چکی تھی۔ اسے معاشرے اور روایات سے بھی چڑ رہنے لگی تھی اپنی برتھ ڈے کے دن کمرا بند رہنا اور سیل آف کردینا تاکہ کسی کی وش بھولے سے اس کے کان میں نہ پڑے' یہ عادت شریف تو اب بہت پرانی ہوگئی تھی' کلاس میں ہر ایک سے الگ اپنی ہی دنیا میں مگن رہنے کی وجہ سے دوست نامی شے سے بھی محروم تھی۔ عزیز و اقرباء والد صاحب کے غیر روایتی رویے نے دور کیے تو دوستوں جیسی مٹھائی سے اس نے اپنی اکھڑ طبیعت کے باعث پرہیز شروع کردیا۔ بزمی انجم اسے مارے باندھے امتحان کلیئر کرانے والے اساتذہ میں کون سے نمبر پر تھے؟ گننا مشکل ہے مگر اس کے ہر حیلے کے باوجود مستقل مزاجی سے جمے رہنے والے رہنما وہ واحد ہی تھے جو پے منٹ تو میتھس کلیئر کروانے کی لیتے تھے مگر نصیحت اس کی ہر عادت بد پر کرتے تھے اور اتنے تسلسل سے روا رکھتے کہ اسے بات ماننے ہی بنتی تھی۔

☆ ☆ ☆

"پھر تیاری کہاں تک پہنچی؟" بزمی انجم نے چشمہ اتار کے میز پر رکھتے ہوئے اسے بغور دیکھا جو بک کھولے یوں مگن تھی گویا یہی مقصد ہو۔

"فارمولے یاد کرلیے ہیں۔ الجبرا آل موسٹ سمجھ میں آچکا ہے جیومیٹری کی تیاری ابھی تک نہیں ہوئی اور۔"

"میں میتھس کی تیاری کا نہیں عید کی بابت پوچھ رہا تھا۔" وہ جو جواب بھی سبق کی مانند رٹا رٹایا دے رہی تھی کہ بزمی انجم نے دانت چباتے اور آنکھیں نکالتے اپنے سوال کا متن بیان کیا۔

بزمی انجم نے سلسلہ نصیحت وہیں سے شروع کیا جہاں پہ کل ختم ہوا تھا' وہ اس معاملے میں غیر معمولی دلچسپی کا اظہار کررہے تھے جو کہ تشنہ جبین کے نزدیک ذاتیات میں دخل اندازی کے زمرے میں آتا تھا۔

"سر! میں نے تیاری کرلی ہے' مکمل پلاننگ بھی کی ہے۔" وہ تیکھے انداز سے گویا ہوئی۔

"اچھا مثلاً کیا؟" بزمی انجم ایسے پرجوش ہوئے گویا اس نے اپنی نہیں ان کی عید کی تیاری مکمل کرلی ہو۔

"خوب جی بھر کے سوؤں گی' ایگزام کی تھکان اتاروں گی اور بس۔" تشنہ جبین کی بےزاری بزمی انجم کی چڑ بن گئی تھی یا وہ اسے اس کے نام کے سحر سے باہر نکالنا چاہتے تھے نہیں معلوم مگر حق یہ تھا کہ وہ اسے جینا سکھانا چاہتے تھے۔

"تشنہ! نیند پوری کرنے اور تھکان اتارنے کے لیے دل کے ساتھ خوشی منانے سے بڑھ کر کوئی چیز نہیں ہوسکتی جتنا خود کو سوشل بناؤگی' دوسروں میں گھلو ملوگی اتنا ہی خود کو ہلکا محسوس کروگی۔"

بزمی انجم اس تشنہ کو اداسیوں کے اندھیرے سے نکال کر مسرتوں کی روشنی میں لانا چاہتے تھے چھ ماہ تک اس کے مزاج کی بےرنگی کو نوٹ کرنے کے بعد یہ فرض انہوں نے آپوں آپ خود پر لاگو کردیا تھا۔

"سر! مجھے عید سلیبریشن سے کوئی انٹرسٹ نہیں ہے' میرا کسی سے ملاقات کو دل نہیں کرتا لوگ مجھے اٹریکٹ نہیں کرتے تو میں کیا کروں؟"

اب کے تشنہ جبین نے قدرے تفصیلی جواب دیا۔

"اندھیروں کی خوگر آنکھوں کو روشنی کہاں اٹریکٹ کرتی ہے مگر جب ایک بار روشنی ان آنکھوں میں سما

جائے تو پھر اندھیرے کی وقعت نہیں رہتی۔"
"اوکے سر! اب یہ بھی ڈکٹیٹ کروا دیجئے کہ عید پر کیا کار خیر انجام دوں۔" تشنہ جبین کی تلخ گوئی اور چہرہ بگاڑ کے ادائیگی الفاظ گرچہ بزمی انجم کے رتبے کے منافی تھے مگر چونکہ وہ ایک غیر ضروری بحث خود پر مسلط کر چکے تھے اور مقابل کی تیکھی طبیعت سے آگاہی بھی پا چکے تھے تو ایسے میں وسیع قلبی ان کی فطرت ہو نہ ہو، مجبوری ضرور تھی۔
"اپنی فرینڈز کے ساتھ انگیج رہو۔ ڈسکس کرو کہ وہ عید کے لیے کیا سوچ رہی ہیں۔" بزمی انجم نے تحمل کے ساتھ بات کو آگے بڑھایا۔
"فرینڈز کون سی، وہ نک چڑھی، بد تمیز، اسٹوپڈ، ال مینرڈ، دھوکے باز لڑکیاں میں ان سے ڈسکس کروں گی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے۔ سر یو آر، آئی تھنک یو آر کمپلیٹلی کریزی اینڈ۔"
تشنہ جبین نے جہاں کلاس فیلوز کی ان گنت خوبیاں گنوائی تھیں وہیں بزمی انجم کے لیے بمشکل خود کو زیادہ سخت الفاظ کہنے سے روک پائی تھی۔
"بی ہیو یور سیلف۔ میں تمہارا استاد ہوں اور تمہاری خامیوں کو دور کرنا میرے فرائض میں شامل ہے۔" بزمی انجم واقعی متحمل مزاج تھے۔ تشنہ جبین نے بھی دل میں اعتراف کیا تھا۔
"فرینڈز صرف کلاس میں ساتھ بیٹھنے والے تو نہیں ہوتے ہم راز، دم ساز کو کہتے ہیں اور ایسا کوئی دوست مجھے آج تک نہیں ملا۔ آج تک جو بھی میرے ساتھ رہا اس نے مجھے دکھ دیا میں نے ایک بار اونہہ کی اس نے ہزار بار تف کی۔ آج تک کسی نے گفٹ نہیں دیا ۔ وہ میرے سامنے ایک دوسرے کو عید کارڈز دیتی اور لیتی ہیں۔ میری طرف کوئی دیکھتا بھی نہیں ہے مجھ سے کچھ نہیں گی تو دوسروں سے جاکے کچھ اور کوئی بھی مخلص نہیں ہے میرے ساتھ۔"
شاید تشنہ جبین اپنے رویے کی بدصورتی پر نادم تھی یا کہانی بیان چاہتی تھی وہ پہلی بار اپنا مطمع نظر بیان کر رہی تھی یوں تو شکایات اسے چلتی ہوا سے بھی

تھیں مگر نوعیت گلہ بزمی انجم نے آج جانا تھا۔
"تشنہ! اگر وہ تمہارے پاس نہیں آتیں تو تم ان کی طرف قدم بڑھاؤ انہوں نے گفٹ نہیں دیا تو تم دے کر دیکھو۔ ہو سکتا ہے وہ تمہاری پہل کی منتظر ہوں۔"
"او گاڈ سر! کیا سب کچھ میں ہی کروں۔ میرا دل نہیں چاہتا کہ کوئی میری ذات کی کشش میں میری طرف آئے۔ میری طرف محبت سے ہاتھ بڑھائے میری طبیعت، میرے مزاج کے مطابق چلے۔" تشنہ جبین پرت در پرت کھل رہی تھی تو بزمی انجم کے لیے اسے ڈیل کرنا آسان ہوتا جا رہا تھا۔
"تمہاری شخصیت کی کشش اور تمہارے مزاج سے ہم آہنگی سب ممکن ہے بشرطیکہ تم اپنے اردگرد کھینچی تناؤ کی لائن سے باہر آجاؤ۔" بزمی انجم اسے سمجھا رہے تھے۔

☼ ☼ ☼

کالج میں قدم رکھتے ہی چہکتی آوازوں نے اس کا استقبال کیا یہ روز ہی کا معمول تھا، وہ کالج میں داخل ہونے والی آخری اسٹوڈنٹ ہوتی دیر سے گرنہ آتی تو وقت سے پہلے آنا بھی اس کی شان کے منافی تھا۔ کوئی کیا کر رہا ہے، کیا کہہ رہا تھا اس کی توجہ سے محروم محرکات تھے مگر آج کیا کرشمہ ہوا کہ وہ ناک کی سیدھ میں چل کر اپنی بینچ پر بیٹھنے کے بجائے کھڑکی سے چپک کے کھڑی دبی دبی سرگوشیوں اور دھیمی ہنستی ان چاروں تتلیوں کے پاس چلی آئی۔
"تشنہ! طبیعت ٹھیک ہے تمہاری۔" تشنہ جبین کا ہائے کہنا تھا کہ رانی، دیا، گوہر اور ثانیہ کے لبوں سے ایک ساتھ سوال وارد ہوا کیونکہ ہر دم بیزار اور ہر ایک سے قطع تعلق رکھنے والی تشنہ نے سال بھر میں پہلی مرتبہ سلام عرض کیا تھا اور وہ بھی خود ان کے پاس آکر حالانکہ وہ سوال کا جواب دینے کی بھی زحمت کم ہی کیا کرتی تھی ایسے میں استفہام لازم تھا۔
"کیوں؟ بیمار لگ رہی ہوں تمہیں یا ابنارمل؟ ڈرپ لگی ہوئی ہے مجھے یا پاگل پن کا دورہ پڑا ہے۔" وہ

ایک دم بیٹھے سے اکھڑ گئی تھی مزاج کو غلط رنگ دینے کی یہ اس کی عادت ہی تھی جو اسے تنہا کر گئی تھی۔ وہ چاروں چونکہ کلاس فیلوز ہونے کی بنا پر اس کی مزاج آشنا ہو چکی تھیں اس لیے قطعاً حیران نہیں ہوئیں بلکہ ایک استہزائیہ مسکراہٹ اس کی طرف اچھال کر پھر سے ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ وہ جو

بزمی انجم کے لیکچر کے زیر اثر ذرا سا آگے بڑھی تھی اسے اپنی حد تک سمجھ کر پاؤں پٹختی واپس ہولی۔ آج بزمی انجم کی خیر نہیں تھی۔

"آپ کو شوق تھا پہل کرنے کا' مجھے تو پہلے ہی پتا تھا یہ لوگ منہ لگانے لائق نہیں ہیں۔" تشنہ جبین بزمی انجم پر چڑھ دوڑی تھی۔

"تشنہ جبین! تمہیں کیا لگتا ہے کہ تم نے جو بی ہیو کیا' وہ ایک نارمل پرسن کو سوٹ کرتا ہے۔" بزمی انجم نے ایک بار پھر اسے بتا دیا تھا اب کے کئی منٹ تک اس کی گلابی پنکھڑیوں سے ادا ہوئے الفاظ سننے لائق نہیں تھے۔

"اگر تم جواب میں کہہ دیتیں کہ ہاں طویل وقت کے بعد بخار کی کیفیت سے نکلی ہوں تو یقیناً" تمہارا آج کا دن ہلکے پھلکے چٹکلوں میں مزے کا گزر جاتا مگر تم۔"

بزمی انجم اپنے مخصوص انداز میں گل پاشی کرتے رہے۔ تشنہ جبین یا تو بک جھک کے تھک چکی تھی یا سر بزمی کی حد سے زیادہ تحمل سے گھائل ہو گئی تھی کچھ بھی تھا مگر اب کے خاموشی ساعت کو راحت فراہم کر رہی تھی۔

"تشنہ جبین! جس طرح تم اپنے موجودہ مزاج کی مسلسل غلامی کرتی آئی ہو کچھ وقت مثبت سوچوں کے لیے وقف کر کے دیکھو۔ تمہیں زندگی جینے اور زندگی گزار دینے کا فرق معلوم ہو جائے گا۔ اور عید کا دن اس کے لیے بہترین ہے۔"

بزمی انجم کا آج آخری دن تھا اس سر پھری کے ساتھ مغز ماری کرنے کا۔ اس کے امتحانات مکمل ہو چکے تھے اور دو دن بعد رمضان کی آمد تھی وہ جانتے تھے کہ آج کے بعد وہ دوبارہ تشنہ جبین کے مقابل نہیں ہوں گے۔

زرخیز زمین پر فصل تو ہر کوئی اگا سکتا ہے پتھریلی زمین کو نم کر کے بیج بونا اور حسب منشا کھیتی کی آبیاری کرنا کہاں ہر ایک کے بس کی بات ہے مگر بزمی انجم نے تشنہ جبین کے دل و دماغ کی بنجر زمین پر احساس و مروت کا دانہ ڈال دیا تھا۔ باقی محبت و ایثار اپنی آبیاری خود کر لیتے ہیں۔

☆ ☆ ☆

رمضان کریم کی ایمان افروز ساعتیں اور اہل ایمان کی دلفریب روایتیں اپنے عروج پر تھیں۔ عشرہ اول لطف کے ساتھ گزر گیا تھا مگر عشرہ دوم میں تشنہ جبین کی تشنگی سوا نیزے پر تھی سال بھر اپنی مرضی سے نپا تلا کھانے والی کو جب حکم خداوندی کے تحت کچھ مخصوص وقت کے لیے کھانے سے اجتناب کیا کرنا پڑا تھا' نقاہت دوگنی ہو گئی تھی۔ دن بھر خود پر ترس کھاتی رہتی تھی گرچہ وہ کھانے کی رسیا نہیں تھی مگر گھر کی اکلوتی روزے دار ہونے کی حیثیت سے خود کو مظلوم ہستی ضرور سمجھتی تھی۔ عزیز احمد کو رمضان میں جانے کون کون سی بیماریاں لاحق ہو جاتی تھیں وہ کئی برس سے اس کار خیر سے محروم تھے۔

افطار کرتے ہوئے وہ مسلسل لایعنی سوچوں میں مبتلا تھی جانے کیوں بزمی انجم کے لیکچر کی ایسے ہی طلب ہو رہی تھی جیسے روزے میں پانی کی۔ اس کی خشک مزاجی سے عاجز بزمی انجم تو کورس کمپلیٹ ہوتے ہی ایسے غائب ہوئے تھے کہ کوئی اتا پتا تک نہ چھوڑا تھا پتا نہیں کس دھن میں اس نے بزمی انجم سے ان کی ذاتی اکیڈمی کا نام پوچھ لیا تھا' اس سے زیادہ تو وہ ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتی تھی۔

بزمی انجم کیا یاد آئے اس کے ذہن میں "پہل" کی گونج ہونے لگی۔ بزمی انجم کا عید سبق عملی پیش قدمی کے گرد ہی تو گھومتا تھا ان کے تمام اسباق کا متن پہلا قدم ہی ہوتا تھا۔

روزے کی تشنگی تھی کہ تنہائی سے فرار یا پھر بزمی انجم کے لیکچرز کی اثر انگیزی' اس کی انگلیوں نے بلا ارادہ ہی موبائل نمبر ملایا تھا۔

گو ہر کی چنچل آواز نے اس کے گھر پر کئی سالوں سے

مسلط سنانے کا زور توڑا تھا۔ اس کا گلا کسی لاؤڈ اسپیکر سے کم نہیں تھا۔ تشنہ جبین تلخ گو تھی مگر مدھم سروں کی مالک تھی گوہر کو اس کی فریکوئنسی کی بنا پر ہی وہ زیادہ پسند نہیں کرتی تھی مگر آج کیفیات میں عجب حزن تھا کہ گوہر کی فلک شگافی کانوں کو بھلی معلوم ہو رہی تھی اور پھر گوہر کی اس کی ایک فون کال پر گھر آمد اس کے دل کو طمانیت بھی دے رہی تھی ظاہر اس نے گوہر کو فون کال محض ٹائم پاس کے لیے کی تھی اور افطار ایک ساتھ کرنے کی دعوت بھی صرف اخلاقاً "دی تھی مگر گوہر کا افطار کے وقت اس کے گھر آدھمکنا اس کی توقع کے خلاف ضرور تھا مگر ناگوار ہرگز نہ تھا' ایسی ہی لایعنی اور غیر ضروری باتوں میں افطار کا لطف دوبالا ہو گیا تھا۔

پیش قدمی کامیاب رہی تھی سو آج اس نے اخلاقاً "نہیں پورے خلوص و اہتمام کے ساتھ رالی' ثانیہ' دیا اور گوہر کو افطار پر مدعو کیا تھا۔ وہ ہنس مکھ زندہ دل سہیلیاں مہمانوں کی طرح عین وقت پر آنے کے بجائے دوپہر میں ہی چلی آئی تھیں۔ تشنہ جبین کو زبردستی پہلی بار کچن کا منہ بھی انہوں نے ہی دکھایا تھا۔ ایک ساتھ افطار کے لوازمات تیار کرتے وہ کتنی بشاش تھیں روزے کی تلخی یا سختی تو خواب و خیال کی سی بات لگتی تھی۔

دیا اور ثانیہ کے ایک ساتھ بیسن گھولنے کے لیے برتن میں ڈالے ہاتھ اور دونوں کی انگلیوں کا ایک دوسرے میں الجھاؤ دیکھ کر تشنہ جبین کا قہقہہ کتنا جان دار تھا! وہ خود حیران تھی کہ روزے میں منہ تک نہ کھولنے والی میں اتنی انرجی کہاں سے آگئی تھی؟

آج کی اس دوستانہ محفل سے اس نے جانا کہ روزے میں دن بھر کاہلوں کی طرح پڑے رہنے کے بجائے ادائیگی فرائض اللہ اور معاملات عباداللہ انجام دینا زیادہ توانائی بخش عمل ہے روزہ سخت نہیں فرض صیام کو بوجھ سمجھنا روزے کی سختی میں اضافہ کرتا ہے۔ عجب تھا کہ شوخ سنگت میں پکوڑے تلتے' دہی بڑے پر چاٹ چھڑکتے' فروٹ چاٹ کے لیے پھل کاٹتے اور سکنجبین بناتے اس نے شریعت کی معرفت حاصل کرلی تھی۔

"عید کی تیاری کرلی تشنہ؟ کیا پہنو گی عید کے روز۔" دیا کا سوال سن کر بڑی انجم کی یاد ایک بار پھر در آئی تھی۔ یہ ان کا مخصوص سوال تھا جو ہر سبق عید میں وہ دہرایا کرتے تھے تب بھی تشنہ جبین کا جواب انکاری تھا تو ہاں آج بھی اس نے نہیں کی تھی' فرق صرف یہ تھا کہ بڑی انجم کے استفسار پر وہ نخوت سے عید فضولیات کی گردان کرتی رہتی تھی آج سہیلیوں کے اپنے اپنے جوڑوں اور جیولری کے بابت جان کر وہ پھیکے پن سے بولی تھی۔

"میں نے آج تک عید کے لیے کوئی اہتمام نہیں کیا ان فیکٹ ہماری فیملی میں ایسی کوئی روایت ہے ہی نہیں۔ میں صرف موسم کے لحاظ سے ڈریسز بنوالیتی ہوں۔ ایونٹس کی ویلیو فیملی میں دیکھی نہیں' سوائنڈ میں ہے بھی نہیں تم لوگ عید پر کیا کیا ہنگامہ کرتی ہو یہ سب میرے لیے نیا ہے۔"

تشنہ جبین فطرتاً "بیزار نہیں تھی۔ عزیز احمد کی خشک طبیعت اور ایکٹویٹیز نے گھر کے ماحول کو بھی ہوسٹل کے کمرے جیسا بنادیا تھا وہاں بھی وہ ایک روم میٹ کے ساتھ رہتی تھی تو گھر میں بھی صرف عزیز احمد کا مصروف وجود دکھائی دیتا تھا۔ تہوار دن اور تاریخ نہیں ہوتے افراد ہوتے ہیں جہاں سینے سے لگا کر رونے اور کندھا ملا کے ہنسنے کے لیے افراد میسر نہ ہوں وہاں عید' شب برات کی حیثیت ثانوی رہ جاتی ہے۔

"نماز عید اور بعد نماز عید ہر جانے انجانے' اپنے پرائے سے گلے ملنے کی معاشرتی روایت نہ ہوتی تو عید اور کسی بھی فیملی فنکشن میں کیا فرق رہ جاتا ہمارے عید کسی منڈیر کی ملکیت نہیں۔"

بڑی انجم کا خیال کیا آیا تھا کہ دماغ میں لیکچرز کی ریل چل پڑی تھی۔ وہ اپنی کیفیت پر ایک بار پھر ہنس دی تھی۔ اس کی سہیلیاں اس کے پرت در پرت تاثرات اور مزاج کی شگفتگی کو دیکھ کر حیران بھی تھیں اور خوش بھی۔

تیسرے عشرے کا افتتاح اس نے ماضی کے

برعکس مختلف انداز سے کیا تھا پہلے رمضان سوابق کے آخری عشرے بنا روزے کے ہی گزرتے تھے' تشنہ جبین معمولی سرور پر بھی روزہ چھوڑ دینے والوں میں

سے تھی مگر یہ رمضان اس نے نہ صرف سہولت سے گزارا تھا بلکہ آج وہ بازار میں عید کی شاپنگ کرنے چلی آئی تھی۔ باقی چاروں کا تو ہر دن ہی بازار چھانتے گزرتا تھا مگر آج وہ تشنہ کو بھی ساتھ لے آئی تھیں جو شاپنگ کے معاملے میں قطعاً "اناڑی" تھی مگر کھلاڑیوں کی محبت میں اس نے کافی ضروری اور غیر ضروری خریداری کی تھی۔ وہ تھکن سے چور تھی مگر پرجوش تھی۔ نئی چیزوں کی کشش تھی یا احساسات کا بدلاؤ وہ روز عید کی منتظر تھی۔

☆ ☆ ☆

"عید مبارک۔"

وہ یہ لفظ پڑھ نہیں تول رہی تھی' اس نے ہزار بار عید کارڈز پر یہ دو لفظ لکھے دیکھے تھے مگر ان کا مطلب کیا ہے۔ وہ آج جانا تھا' شعوری زندگی میں پہلی بار اس نے عزیز احمد کے ساتھ جا کر عید کارڈز خریدے تھے۔ اس کی زندگی کا حاصل وہ لمحات تھے جب وہ اپنے بابا کے ساتھ عید کی چھوٹی چھوٹی خوشیاں کشید کرنے نکلی تھی۔ عزیز احمد لاکھ مصروف سہی مگر اس کے ایک بار کہنے پر اس کے ساتھ چل دیے تھے۔ شاید روزن کھلے تو روشنی ہر ایک کا مقدر بن جاتی ہے۔ خود ساختہ تنہائیوں کے بلند قلعے ریت کی کچی دیوار ثابت ہوئے جب زندگی نے جینے کی ٹھان لی۔ مختلف اسٹائلز' عبارت' مناظر سے مزین عید کارڈ خریدتے تشنہ جبین اس بچے کی مانند لگ رہی تھی جس نے پہلی بار چلنا سیکھا ہو۔

عزیز احمد کے لیے سفید کرتا شلوار اور منقش ٹوپی خریدتے ہوئے اسے ایک لمحے کو احساس ہوا کہ بابا جان کون سا عید کی نماز پڑھتے ہیں مگر دوسرے لمحے اس نے یہ سوچ کر سر جھٹک دیا کہ وہ تو عید شاپنگ بھی پہلے کب کرتے تھے یقیناً" بوسیدہ روایت زمین بوس ہونے کو تھی۔

گفٹ پیکس اور بکے خریدتے ہوئے اس کے لبوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی۔ گوہر' دیا' رابی اور ثانیہ

تو اس کی گروپ ممبر اور حال ہی میں عزیز دوستیں بن چکی تھیں۔ ان کے لیے مختلف کارڈز اور ہر ایک کے مزاج کے مطابق گفٹ ارسال کرتے وہ اچھی طرح جانتی تھی کہ باقی دو کارڈز کس کے لیے تھے؟

☆ ☆ ☆

اہل ایمان کے لیے صبح عید یقیناً" گزشتہ سے پیوستہ سی تھی مگر روئے زمین کے ایک آشیانہ میں عید کی کرنیں پورے جوش کے ساتھ رونما ہوئی تھیں۔

تشنہ جبین کی پنک لانگ شرٹ وو وائٹ پلازو اور چیک اسٹائل دوپٹے کے ساتھ اناڑی ہاتھوں سے گوندھی چٹیا نے تشنہ جبین کی آنکھوں میں خواب اور چہرے پر لالی سجادی تھی۔ وہ جینے پر آئی تھی تو گلاب کے پھول کی طرح کھل گئی تھی۔

عزیز احمد کو نماز کے لیے تیار کرتے ہوئے وہ بار بار ان کے سینے سے لگ جاتی تھی جواباً" وہ بھی پوری شفقت سے سر کو سہلاتے تھے۔ عید سبق نے انہیں پڑھایا تھا کہ رونق و بہار کے لیے افراد کا ہجوم نہیں فرد واحد کا خلوص و جذبہ کافی ہے۔

تشنہ کے رنگ ڈھنگ بدلے تھے تو ملازمین بھی چاق و چوبند ہو گئے تھے عید کی مناسبت سے کئی پکوان اور مشروبات دسترخوان کی زینت بن چکے تھے۔ اب انتظار تھا تو اسے اپنی پیش قدمی کے جواب کا۔

شام عید اس کے آشیانے میں کھلکھلا رہی تھی۔ بے ہنگم آوازیں اور بے تکان باتیں۔ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی تھی گوہر تو تھی ہی چھت پھاڑ آواز کی مالک' دیا کی بات بات پر قہقہے بکھیرنے کی عادت بھی کم ہنگامہ خیز نہ تھی۔ اوپر سے ثانیہ کو ایک ساتھ ہی کھانے اور بولنے کا مرض لاحق تھا۔ منہ میں کباب ڈالے جب وہ بولنے لگتی تو باقی بات کھانس کے مکمل کرتی اور رابی کا تو پورے سال ہی گلا بیٹھا رہتا تھا'

"تنتمجتا" وہ اپنی بات سمجھانے کے لیے اگلے کے اوپر ہی چڑھ جایا کرتی تھی۔ اب بھی گوہر کی دن بھر کی روداد سنانے پر وہ اس کے منہ پر ہاتھ رکھے تشنہ جبین کے کان پر چڑھی اپنے گھر میں پکے عید پکوان کی تفصیلات بتا رہی تھی جو کہ تشنہ جبین کے لیے چاہتے نہ چاہتے ہضم کرنا ضروری تھا۔ آخر کو وہ میزبان جو تھی اور اس کے بھیجے عید کارڈز اور گفٹ پا کر سبھی وہ عید شام کو منانے اس کے گھر چلی آئی تھیں۔ ان جانی پہچانی آوازوں میں ہٹ سونگ کو گنگناتی یہ آواز کس کی تھی وہ ایمن حفیظ تھی جو کہ تشنہ جبین کی کلاس فیلو تھی مگر ابتدائے سال سے ہی دونوں میں کسی نہ کسی بات کو لیے تلخ کلامی ہوتی رہتی تھی۔ ایک ماہ پہلے تو دور دور کی جملے بازی نے سنگین جھگڑے کی نوعیت اختیار کر لی تھی جب تشنہ جبین نے کینٹین میں پہلے نمبر لینے کی کوشش میں ایمن حفیظ کے اس سے ٹکرانے پر اچھا خاصا ہنگامہ کھڑا کر دیا تھا جس کے نتیجے میں دونوں میں ہونے والی لفظی لڑائی بھی مکمل طور پر بند تھی مگر آج عید کے دن اس کا تشنہ جبین کے گھر موجود ہونا دونوں کی اعلا ظرفی کا نتیجہ تھا۔

تشنہ جبین نے دیگر دوستوں کے ساتھ ایک کارڈ معہ گفٹ ایمن حفیظ کو بھی بھیج دیا تھا جسے قبول کر کے ایمن بھی دوستی کی داغ بیل ڈالنے اس کے گھر موجود تھی۔

"عید سبق" نے جہاں تشنہ جبین کے دوستوں کو جمع کیا تھا وہاں دشمنوں کو بھی خارج کر دیا تھا۔ انجمن بجی تھی تو بزمی انجم کا تذکرہ بھی زبان زد عام تھا بزمی انجم صرف تشنہ جبین کے ٹیوٹر تھے باقی دوستیں ان سے ناواقف تھیں مگر تشنہ جبین کے لبوں سے اس کے ذکر نے انہیں ایک ان دیکھے شخص سے جان پہچان کرا دی تھی۔

کر موقوف ہے پیش قدمی پہ رونق بزم
خزاں کی گود میں گلشن کھلا وعید کا دن ہے

بزمی انجم کی دھواں دھار انٹری ہوئی تھی۔ ان کے مخصوص لیکچرانہ اسٹائل میں تشنہ جبین کی کھلکھلاہٹ بے ساختہ تھی اور بزمی انجم کے لیے نئی بھی۔

"آیئے سر جی! آپ کا ہی انتظار تھا۔"

تشنہ جبین کا چھٹا عید کارڈ بھی اپنی منزل پر جا کر اپنے مہمان کو ساتھ لے آیا تھا۔ بزمی انجم کی اکیڈمی کے پتے پر عید کارڈ بھیجنا گویا اندھیرے میں تیر چلانا تھا مگر خوبی تقدیر تیر نشانے پر لگ گیا تھا۔

"دیکھنے آیا تھا کہ تشنہ جبین عید کے روز ٹائم کیسے ویسٹ کرتی ہیں؟ اگر آپ نے اسے ویسٹ آف ٹائم کہا تھا تو آئی تھنک ایسی ویسٹیج بری نہیں۔"

بزمی انجم کے چہرے پر خلوص بھری مسرت صاف دیکھی جا سکتی تھی گوہر اور دیا کے کچپ میں بھرے ہاتھ، رابی کی ناک پر لگی کیک کی کریم، ایمن حفیظ کی صوفے پر نیم دراز ٹی وی دیکھنے کی ادا اور خود تشنہ جبین کی ثانیہ کے ہاتھ سے ریموٹ چھیننے کی حرکت دیکھتے ہوئے بزمی انجم نے شگفتہ طنز کیا تھا۔

"مگر آپ چیپٹر آف عید پڑھانے کے کتنے چارجز لیتے ہیں؟"

دیا کا غیر متوقع سوال اور باقی سب کی فلک شگاف ہنسی نے ماحول کو گل رنگ کر دیا تھا۔ عزیز احمد جو بزمی انجم کے ساتھ ہی بزم عید میں آ شریک ہوئے تھے، روایت کے مطابق سب میں عیدی تقسیم کرنے لگے تھے۔ انہیں دیکھ کر ہی دیا کے ذہن میں یہ سوال اٹھا تھا۔

"صرف عید گریٹنگ سے سجا ایک عید کارڈ۔"

بزمی انجم کا جواب اور تشنہ جبین کی مسکان دونوں بے مثال تھے۔

"بات میری نصیحت اور تشنہ جبین کے عمل کی نہیں ہے۔ بات ہے عید کے دن کی برکت کی۔ اللہ کی طرف سے عطا کردہ تہوار میں ہر عمل کی تاثیر دوگنا ہو جاتی ہے۔ نصیحت کا اثر چار گنا ہوتا ہے تو پہل کا رد عمل آٹھ گنا۔

عید اجتماعی خوشی کا نام ہے۔ عید سبق یہی ہے۔ ...خوشیاں بانٹو خوشیاں پاؤ۔

☆

صائمہ اکرم چوہدری

سیاہ حاشیہ

سیاہ حاشیہ پار مت کرو۔ ''پچھتاؤ گی۔ ایک نادیدہ آواز روکتی رہی لیکن وہ لڑکی نہ رکی۔ سیاہ حاشیہ عبور کر گئی اور تب اسے احساس ہوا کہ اپنے لیے جہنم خرید چکی ہے۔

✡ ✡ ✡

عدینہ کاٹھ کباڑ میں اپنی پرانی ڈائریاں تلاش کر رہی ہے تو اسے ایک کتبہ ملتا ہے۔ جس پر اس کی والدہ صالحہ رفیق کی تاریخ پیدائش اور تاریخ وفات درج ہوتی ہے۔ وہ بری طرح الجھ جاتی ہے۔ اس کی والدہ تو زندہ ہیں پھر یہ کتبہ کس نے اور کیوں بنوایا ہے۔ تب ہی اس کی والدہ صالحہ آجاتی ہیں اور کہتی ہیں کہ ڈائریاں تو انہوں نے ردی والے کو دے دی ہیں۔ عدینہ کو بہت دکھ ہوتا ہے پھر اسے کتبہ یاد آتا ہے تو وہ سوچتی ہے کہ عبداللہ سے اس کے متعلق پوچھے گی۔

عبداللہ پابند صوم و صلوۃ وہ مسجد کا موذن بھی ہے اور اس نے عربی میں ایم فل کر رکھا ہے عدینہ کی اس کے ساتھ منگنی ہو چکی ہے۔ عدینہ ہاسٹل میں رہتی ہے اور میڈیکل کی تعلیم حاصل کر رہی ہے۔
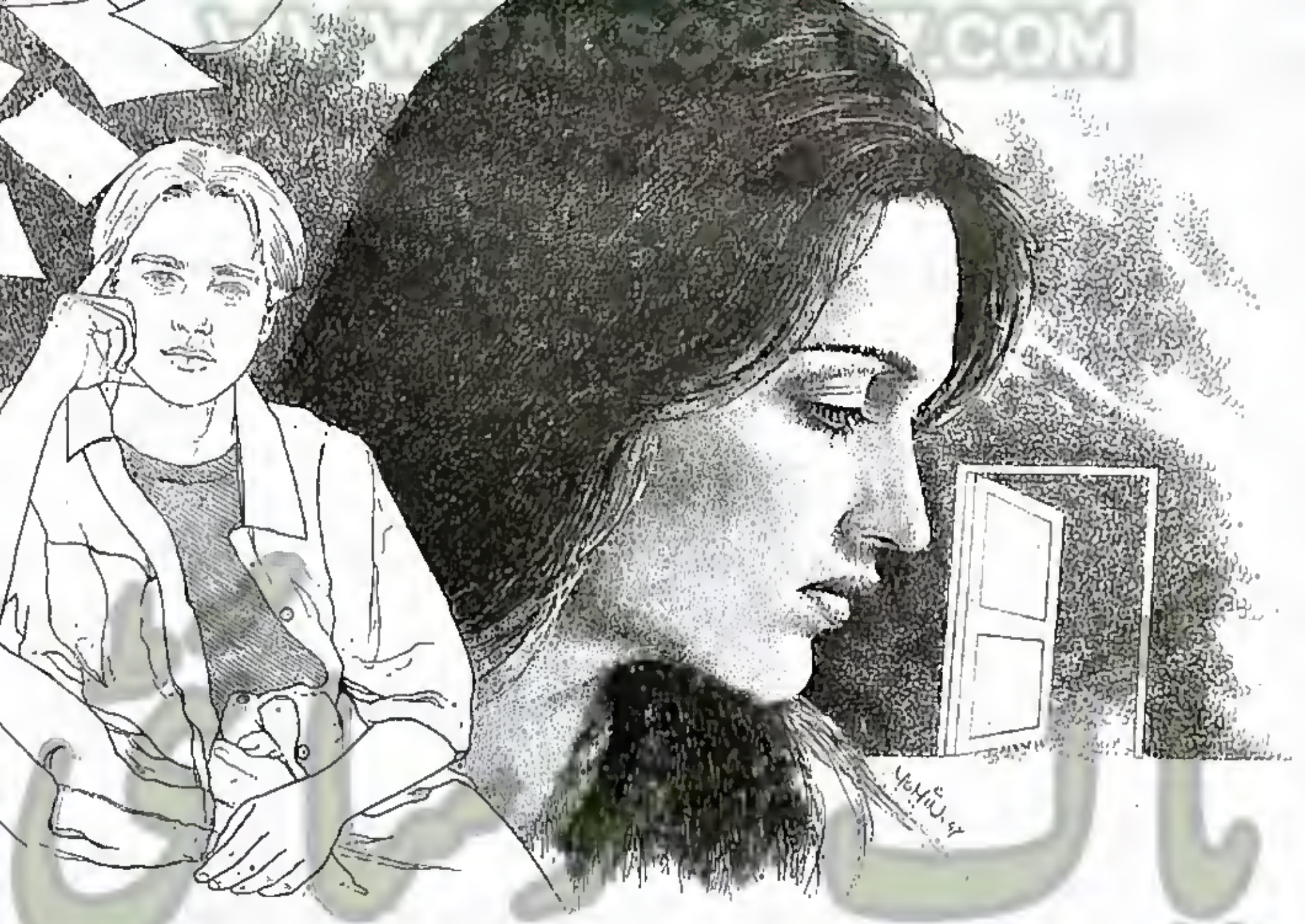
ناولٹ

عدینہ کے والد مولوی رفیق کا انتقال ہو چکا ہے۔ وہ اپنی ماں سے زیادہ دادی سے قریب ہے مونا اس کی کزن ہے۔ وہ حویلیاں شہر سے قرآن حفظ کرنے ان کے گھر آئی ہے۔

عدینہ عبداللہ سے بہت محبت کرتی ہے۔ عبداللہ بھی اسے چاہتا ہے لیکن شرعی اصولوں کے تحت زندگی گزارنے والی صالحہ آپا نے منگنی ہونے کے باوجود انہیں آپس میں بات چیت کی اجازت نہیں دی۔

شانزے ماڈل بننا چاہتی ہے۔ ریمپ پر واک کرتے ہوئے اس کا پاؤں مڑ جاتا ہے اور وہ گر جاتی ہے۔

ڈاکٹر بینش نیلی کوٹھی میں اپنے بیٹے ارحم کے ساتھ رہتی ہیں۔ ان کے شوہر کرنل ڈاکٹر حماد کا انتقال ہو چکا ہے۔

نیلی کوٹھی کے دوسرے حصے میں ان کے تایا ڈاکٹر جلال اپنی بیوی اور پوتی اوریدا کے ساتھ رہتے ہیں۔ ان کی دو شادی شدہ بیٹیاں ہیں اور اکلوتا بیٹا تیمور لندن میں مقیم ہے۔ بیوی کی وفات کے بعد تیمور نے اوریدا کو پاکستان اپنے باپ کے پاس بھجوا دیا ہے۔ بیٹا ماہیران کے پاس لندن میں ہے۔

اوریدا اور ارحم کی بہت دوستی ہے۔ جو ڈاکٹر بینش کو بالکل پسند نہیں۔ ڈاکٹر بینش تیمور کے نام سے بھی نفرت کرتی ہیں۔

عبداللہ عدینہ کو اپنا سیل نمبر بھجواتا ہے۔ صالحہ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ شدید غصہ ہوتی ہیں اور نمبر پھاڑ کر پھینک دیتی ہیں۔

سرمد اپنے دوست کے پروڈکشن ہاؤس میں جاتا ہے تو وہاں شانزے کو دیکھتا ہے۔ شانزے اس کی منتیں کر رہی ہے کہ وہ ایک چانس اسے دے کر دیکھے۔

شانزے سخت مایوسی کا شکار ہے۔ رباب اس کی روم میٹ اسے تسلی دیتی ہے تو وہ بتاتی ہے کہ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے صرف ایک پھوپھی ہیں جن کے گھر میں اسے کوئی پسند نہیں کرتا۔ اس کی ماں اسے پھینک کر چلی گئی تھی اور باپ کو کسی مذہبی جنونی نے قتل کر دیا۔ شانزے کا خاندان مسلمان ہے لیکن وہ کسی مذہب کو نہیں مانتی۔ ہاسٹل میں رہنے کے لیے

اس نے کالج میں داخلہ لے رکھا ہے۔ وہ شوبز میں اپنا نام بنانا چاہتی ہے۔
آپا صالحہ نے عدینہ کی عبداللہ سے منگنی توڑ دی ہے۔ عبداللہ عدینہ سے ایک بار بات کرنا چاہتا ہے۔ عدینہ چھت پر جاتی ہے تو عبداللہ وہاں آجاتا ہے۔ آپا دیکھ لیتی ہیں۔ وہ عدینہ کو برا بھلا کہتی ہیں اور اللہ کے عذاب سے ڈراتی ہیں۔
اوریدا ارصم کے ساتھ پیپر دینے جاتی ہے۔ ارصم باہر اس کا انتظار کرتا ہے۔ وہ اوریدا کو واپس لے کر آتا ہے تو ڈاکٹر بینش اسے بہت ڈانٹتی ہیں کیونکہ وہ ان کی گاڑی لے کر جاتا ہے۔ اوریدا اپنے باپ تیمور کو یہ بات بتاتی ہے تو وہ اس کو نئی گاڑی خرید کر دے دیتے ہیں' آغاجی کو یہ بات بری لگتی ہے۔
ٹی وی پر ایک مذہبی پروگرام دیکھتے ہوئے صالحہ آپا شدید جذباتی ہو کر رونے لگتی ہیں۔ عدینہ کو اسٹور روم کی صفائی کے دوران ایک تصویر ملتی ہے، جو کسی مرد کی ہے۔
ارصم اوریدا کو گاڑی چلانا سکھاتا ہے۔ اوریدا کے امتحان میں کم نمبر آتے ہیں تو وہ پریشان ہو جاتی ہے۔
مونا عدینہ کو بتاتی ہے کہ آپا نے اس کی منگنی اس لیے توڑی کہ وہ چاہتی تھیں کہ عبداللہ عدینہ سے فوراً" شادی کرلے۔ عبداللہ نے فوراً" شادی سے انکار کر دیا تھا۔
عبداللہ تبلیغی دورے پر جاتا ہے تو اس کا جہاز کریش ہو جاتا ہے۔ اور اس کے مرنے کی خبر آجاتی ہے۔
عدینہ پر عبداللہ کی موت کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ وہ اپنی ماں سے بری طرح بدظن ہو جاتی ہے۔
شانزے جب بھی کوئی غلط کام کرنا چاہتی ہے کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے۔ رباب اسے سمجھاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے غلط راستوں سے بچانا چاہتا ہے۔
ارسل' شانزے کو زخمی ہونے پر تسلی دیتا ہے' وہ بتاتا ہے کہ ایڈ میں کام کے لیے اس نے سفارش کی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ شانزے اسے اپنا بھائی سمجھے۔
ارحم بہت اچھے نمبروں سے ایف ایس سی کرلیتا ہے۔ ڈاکٹر بینش اس خوشی میں ڈنر دیتی ہیں۔
عدینہ فیصلہ سنا دیتی ہے کہ اسے ڈاکٹر نہیں بننا۔ یہ سنتے ہی آپا صالحہ شدید پریشان ہو جاتی ہیں۔

چوتھی قسط

آپا صالحہ کو دو دن سے سخت بخار تھا' بے بے اور مونا کے ہاتھ پیر پھولے ہوئے تھے۔ عدینہ نے بھی ایک دو دفعہ جھانک کر دیکھا تھا' لیکن اس کے بعد بے حسی کی چادر پوری ڈھٹائی کے ساتھ اوڑھ لی' ویسے بھی آج کل اس کے اوپر کسی چیز کا اثر کم ہی ہوتا تھا۔ وہ اس انتہا پر تھی جہاں انسان اپنے خونی رشتوں سے بھی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ وہ صرف سانس لیتا ہے' کھاتا ہے' پیتا ہے' لیکن سوچنا چھوڑ دیتا ہے۔

"دبس بھی کرو صالحہ' تم نے تو عدینہ کی بات کو دل پر ہی لگا لیا ہے۔" بے بے نے اس دن انہیں کھچڑی کھلاتے ہوئے نرمی سے ٹوکا۔ آپا صالحہ کے چہرے پر زردی گھلی ہوئی تھی' بخار نے انہیں نچوڑ کر رکھ دیا تھا۔ ان کی آنکھوں میں دکھ' غم' بے بسی کیا کچھ نہیں تھا۔

"بے بے! جس شخص کی عمر بھر کی پونجی ہی لٹ جائے' وہ اس چیز کو کیسے دل پر نہ لگائے۔" انہوں نے زبردستی مسکراتے ہوئے اپنی ساس کا شفیق چہرہ دیکھا' ان کی بیماری نے بے بے کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ ان کے جھریوں زدہ بوڑھے چہرے پر اب تفکر کی کئی اور لکیروں کا اضافہ ہو گیا تھا۔

"اتنا پریشان تو تم اس وقت بھی نہیں ہوئی تھیں' جب اللہ نے یکے بعد دیگرے کئی بچے دے کر تم سے واپس لے لیے تھے۔" بے بے نے انہیں دلاسا دینے کی کوشش کی۔ ایک مبہم سی مسکراہٹ آپا صالحہ کے لبوں پر نمودار ہوئی' وہ اذیت ناک وقت وہ کیسے بھول سکتی تھیں' جب ہر لمحہ احساس ہوتا تھا کہ اللہ ان سے

خفا ہے۔ اس لیے اولاد جیسی نعمت دے کر واپس لے لیتا ہے۔

"کاش عدینہ کو بھی لے لیتا۔" ان کے سرد انداز پر بے بے ششدر رہ گئیں، کیسی باتیں کر رہی تھی آج ان کی بہو۔

"کم از کم یہ دکھ تو نہ دیکھنا پڑتا۔" آپا صالحہ کا لہجہ غم سے چور تھا۔

"اللہ نہ کرے پتر، کیسی ناشکری والی باتیں کرتی ہو۔" بے بے کا معصوم سا دل دہل گیا۔ "میں عدینہ کو سمجھانے کی کوشش کروں گی۔" آپا صالحہ ان کی بات پر ایسے پھیکے سے انداز سے مسکرائیں جیسے کوئی بڑا کسی بچے کی معصوم بات پر مسکراتا ہے۔

"کوئی فائدہ نہیں ہے بے بے۔" وہ بھی عدینہ کی رگ رگ سے واقف تھیں۔ انہیں معلوم تھا کہ وہ ضد میں بالکل ان پر گئی ہے۔ اب اگر وہ فیصلہ کر چکی ہے تو اپنے فیصلے سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹے گی۔

"کیوں فائدہ نہیں بھلا؟" ان کے لہجے میں حیرانگی در آئی بھلا عدینہ ان کی بات کیسے ٹال سکتی تھی۔

"جب اولاد کی آنکھوں سے بغاوت اور لہجے میں سرکشی اتر آئے تو والدین کو اپنی عزت بچا کر ایک سائیڈ پر ہو جانا چاہیے، نادان اولاد جب تک ٹھوکر کھا کر اپنے ہی قدموں میں نہیں آن گرتی، اسے ہوش نہیں آتا۔" آپا صالحہ کے لہجے میں ایک ان کہا دکھ جھلک رہا تھا۔

"عدینہ ایسی نہیں ہے پتر۔" بے بے کا خوش فہم دل اس حقیقت کو ماننے سے انکاری تھا۔

"میں بھی ایسی نہیں تھی بے بے۔" آپا صالحہ کی آنکھوں سے آنسو چھلکے۔ جو گالوں سے ہوتے ہوئے ٹھوڑی تک آن پہنچے تھے۔

"جھلی نا ہو تو، رو کیوں رہی ہے۔" بے بے انہیں روتا دیکھ کر گھبرا سی گئیں۔ مونا نے بھی اندر آتے ہوئے یہ منظر دکھی دل سے دیکھا۔ وہ بھی آج کل آپا صالحہ کی محبت میں عدینہ سے خفا تھی۔ اس نے غصے سے عدینہ کی ساری سلیپنگ پلز اٹھا کر اسٹور کی پرچھتی پر پھینک دی تھیں۔

"میں بتا رہی ہوں بے بے! اگر عدینہ ڈاکٹر نہ بنی تو میں ساری زندگی اس سے بات نہیں کروں گی۔" آپا صالحہ کا انداز قطعی تھا، بے بے ہراساں دکھائی دے رہی تھیں۔ اتنا تو وہ جانتی تھیں کہ ان کی بہو اپنے لفظوں کی پاس داری کرنا خوب جانتی ہے، لیکن ماں بیٹی کی انا کی جنگ میں پتا نہیں کس کے جذبات مجروح ہونے والے تھے۔ اس کا اندازہ نہ تو بے بے کو تھا اور

نہ ہی مونا کو۔

"بے بے یہ آپا کا دلیہ ہے' ان کو کھلا دیجئے گا۔" مونا پیالہ میز پر رکھ کر الٹے پاؤں لوٹ گئی۔ اور عدینہ کے کمرے میں پہنچ کر وہ دھپ کر کے غصے سے اس کے بالکل سامنے والے پلنگ پر بیٹھ گئی۔

"ویسے آپ شکل سے اتنی ظالم اور بے رحم لگتی تو نہیں ہیں۔" مونا کو ایک دم ہی اس پر غصہ آیا' وہ جو بڑی فرصت سے بیٹھی دانتوں سے اپنے دائیں ہاتھ کے ناخن چبا رہی تھی' مونا کو کراہیت کا احساس ہوا۔

"ظالموں کے چہروں پر ٹیگ تھوڑی لگے ہوتے ہیں۔" عدینہ کا لہجہ مدھم' مگر تلخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"آپ نے آپا صالحہ کا بہت دل دکھایا ہے۔" مونا نے لگی لپٹی کے بغیر اسے کہا' عدینہ کے سپاٹ چہرے پر ایک تغیر سا رونما ہوا۔

"اور انہوں نے تو میرے دل کا اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر گلا گھونٹا ہے۔" ایک زخمی سی مسکراہٹ عدینہ کے لبوں پر آکر ٹھہر گئی۔

"اگر آپ نے ان کی بات نہ مانی تو وہ ساری زندگی آپ سے بات نہیں کریں گی۔" مونا نے اسے ڈرا دیا۔

"تو کیا ہوا؟" اس نے لاپروائی سے کندھے اچکا کر کہا۔ "وہ مجھ سے پہلے بھی کہاں بات کرتی تھیں' جو مجھے اب فرق پڑے گا۔" عدینہ کے تلخ الفاظ سے زیادہ اس کے استہزائیہ انداز نے مونا کو سخت صدمے سے دوچار کیا۔

"کیوں کر رہی ہیں آپ ایسا۔۔۔" وہ جھنجلا اٹھی جبکہ عدینہ نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا اور اپنے ناخن چبانے کا شغل برقرار رکھا۔

"اف۔۔۔ یہ ناخن چبانا تو بند کریں۔" وہ تپ اٹھی۔

"تم لوگ صبح و شام میرا دل جلانا بند کردو' مہربانی ہوگی۔" عدینہ کا سلگتا انداز مونا کے ضبط کا پیمانہ چھلکا گیا۔

"ورنہ کیا کرلیں گی آپ۔۔۔؟" مونا کا کڑوا لہجہ' عدینہ کو مشتعل سا کر گیا' اس کی آنکھوں میں غصے کے شعلے بھڑکے' ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ سامنے کھڑی مونا کو جلا کر بھسم کرنا چاہتی ہو۔

"تو ٹھیک ہے دیکھ لو۔۔۔" عدینہ کے لہجے کی غراہٹ نے مونا کو بوکھلا سا دیا۔ عدینہ نے اسٹڈی میز سے دو تین بھاری بھرکم میڈیکل کی کتابیں اٹھائیں اور لمبے لمبے ڈگ بھرتی ہوئی صحن کی طرف نکل آئی۔

"کہاں جارہی ہیں آپ؟" مونا نے خوف زدہ انداز سے اس کا بازو پکڑا۔

"شٹ اپ۔۔۔" وہ قہر برساتی آنکھوں میں دنیا جہاں کا تنفر سمیٹے کبھی مونا اور کبھی آپا صالحہ کو گھور رہی تھی' جو وضو کر کے نقاہت زدہ انداز سے واش روم سے نکلی تھیں' جبکہ بے بے تار پر سے روٹیاں لپیٹنے والا دھلا ہوا رومال اتارتے ہوئے ٹھٹک گئیں۔

صحن میں بے بے کا تندور شعلے اگل رہا تھا۔ پاس ہی گندھا ہوا آٹا اور ہاٹ پاٹ پڑا تھا۔ عدینہ سرکش سے انداز سے تندور کی طرف بڑھی۔ ایک آگ اس تندور میں اور ایک عدینہ کی آنکھوں میں دہک رہی تھی۔ آپا صالحہ کو اپنا سارا وجود جلتا ہوا محسوس ہوا۔

"عدینہ باجی کیا ہوگیا ہے آپ کو۔۔۔؟" مونا نے پریشان انداز سے اس کا بازو پکڑ کر روکنے کی کوشش کی' لیکن عدینہ کے اندر کوئی باغی روح گھسی ہوئی تھی جو اس وقت کچھ بھی سننے کو تیار نہیں تھی۔

"پیچھے ہٹو مونا۔۔۔" عدینہ نے زبردستی اپنا بازو چھڑایا' اسی وقت جامن کے درخت کے پیچھے چھپی بلی اچھل کر سامنے آگئی۔ مونا اور عدینہ دونوں کا دھیان بٹا۔ بلی نے چھلانگ ماری اور صحن میں بنے مرغیوں کے ڈربے کے باہر گھومتا آپا صالحہ کا سب سے پسندیدہ چوزہ منہ میں دبایا اور سرعت سے چھت کی طرف بھاگ گئی۔

"ہائے ہائے کم بخت' معصوم چوزے کو لے گئی۔" بے بے نے دہائی دی۔ آپا صالحہ کی نظریں تو عدینہ کے آتشیں وجود پر جمی ہوئی تھیں۔ اس کی آنکھوں اور چہرے سے وحشت ٹپک رہی تھی۔ اس نے ہونٹ سختی سے بھینچے ہوئے تھے۔

"عدینہ باجی ایسا مت کریں۔" مونا نے چیخ کر اسے روکنا چاہا، لیکن اس لمحے وہ ہو گیا جو کبھی بے بے اور آپا صالحہ کی گمان کی آخری سرحدوں پر بھی نہیں تھا۔

عدینہ نے ہاتھ میں پکڑی میڈیکل کی کتابیں پوری قوت کے ساتھ جلتے ہوئے تندور میں پھینک دیں۔ آپا صالحہ کو ایسا لگا جیسے وہ جون کے آگ برساتے سورج کے عین اوپر آن گری ہوں۔ تقدیر نے بالکل اسی طرح سے آپا صالحہ پر ایک کڑا وار کیا تھا جیسے کچھ دیر پہلے بلی اپنا شکار سب کے درمیان سے جھپٹ کر لے گئی تھی۔ ان کے جسم کا ایک ایک جوڑ دہائی دے رہا تھا۔

عدینہ کی بھاری بھرکم میڈیکل کی کتابیں نہیں جل رہی تھیں، بلکہ آپا صالحہ کے زندگی کے گنے چنے خواب ان کی آنکھوں کے سامنے جل کر راکھ ہو رہے تھے۔ وہ اس ہارے ہوئے جواری کی طرح کھڑی تھیں جو اپنی زندگی کا آخری سرمایہ اپنے ہاتھوں سے لٹا چکا ہو۔ ایک الاؤ ان کے سامنے تھا اور ایک جہنم ان کے وجود کے اندر روشن ہو گیا تھا جہاں پتا نہیں کتنے سال انہوں نے اکیلے ہی جھلسنا تھا۔

آپا صالحہ اس وقت بے بسی کی اس انتہا پر تھیں جہاں دل بس ایک چیز کی تمنا کرتا ہے اور وہ ہے موت۔ ان کے دل نے بھی یہی خواہش کی تھی۔

☼ ☼ ☼

"واؤ امیزنگ..." اوریدا نے بڑی مہارت سے اپنی گھنی پلکوں پر بلیو رنگ کے آئی لائنر کی لائن کھینچی اور اب توصیفی نگاہوں سے اپنی بڑی بڑی بادامی آنکھوں کو دیکھنے لگی، جنہیں مسکارے، آئی شیڈز اور لائنر نے خوب دلکش بنا دیا تھا۔

رائل بلیو سوٹ میں اس کی شہابی رنگت دمک رہی تھی۔ آج ارصم کے ٹاپ کرنے کی خوشی میں ڈاکٹر بینش کے لان میں پارٹی کا اہتمام کیا گیا تھا اور اوریدا اس فنکشن میں سب سے زیادہ خوب صورت لگنا چاہتی تھی۔ صبح سے اس کی تیاریاں ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھیں، حتیٰ کہ ملازمہ نے اسے طیبہ پھپھو اور ان کے بیٹے سعد کے آنے کی بھی اطلاع دی تھی، لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہیں رینگی، وہ اس وقت اپنے پاؤں کے ناخنوں پر کلیئر والی نیل پالش لگا رہی تھی۔

"بی بی جی! بیگم صاحبہ پوچھ رہی ہیں، کتنی دیر ہے؟" ملازمہ نے کمرے میں جھانکا جبکہ اوریدا اپنے سلور کلر کے نازک سے ہائی ہیل سینڈل کے اسٹرپ سے الجھی ہوئی تھی۔

"بس آ رہی ہوں۔" وہ اسٹرپ بند کر کے جیسے ہی کھڑی ہوئی ملازمہ کی آنکھوں سے ستائش کے رنگ بے اختیار جھلکے۔

"اوریدا بی بی ایک بات کہوں۔" ملازمہ ہلکا سا جھجک کر بولی تو اوریدا نے بالوں میں برش پھیرتے ہوئے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

"بہت پیاری لگ رہی ہیں آپ..." ملازمہ کے توصیفی انداز پر اوریدا مسکرائی وہ سامنے ڈریسنگ کے شیشے میں اپنا عکس دیکھ چکی تھی اور اب اسے کسی تصدیق یا تردید کی ضرورت نہیں تھی۔

"اچھا اچھا زیادہ مسکہ مت لگاؤ..." اس نے چینل فائیو پرفیوم کا بے دریغ استعمال کرتے ہوئے ملازمہ کو کہا اور اپنا نازک سا کلچ اٹھایا۔ لمبے سیاہ سلکی بالوں میں ایک دفعہ پھر برش پھیر کر وہ کمرے سے نکل آئی۔ اس کے قدم لاؤنج کی سیڑھیوں کی طرف اٹھ رہے تھے۔

"کہاں ہو تم؟" اس کے سیل فون پر ارصم کا میسج آیا۔ وہ بے ساختہ مسکرا دی۔

"جسٹ کمنگ..." جوابی ٹیکسٹ لکھ کر اس نے سیل فون کلچ میں ڈالا۔

سامنے ٹی وی لاؤنج میں بڑی اماں کے ساتھ بیٹھی طیبہ پھپھو اس کی طرف دیکھ کر بے اختیار چونکیں۔ ان کے چہرے کا رنگ بڑی سرعت سے تبدیل ہوا۔ تبدیلی تو بڑی اماں کے چہرے پر بھی آئی تھی لیکن انہوں نے فوراً ہی خود کو سنبھال لیا تھا۔

"ڈیزی باجی..." اوریدا نے حیرانی سے طیبہ پھپھو

کے چہرے پر زلزلے کے آثار دیکھے۔
''اماں...'' انہوں نے ہراساں نگاہوں سے بڑی اماں کو دیکھا جن کی بوڑھی آنکھوں سے ایک نمی کی لہر بہتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
''طیبہ! چپ رہو۔'' بڑی اماں نے متوحش انداز سے اپنے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر خاموش ہونے کا پراسرار سا اشارہ کیا۔
''یہ ڈیزی باجی کون ہیں طیبہ پھپھو...'' اوریدا کی آنکھوں میں حیرانی در آئی۔
''ایک پرستان کی پری تھی' جو راستہ بھٹک کر کہیں اور چلی گئی۔'' وہ اس وقت بے بسی اور دکھ کی جیتی جاگتی تصویر لگ رہی تھیں۔
''تو کیا وہ واپس نہیں آئیں؟'' اوریدا الجھ سی گئی اور بلاارادہ اپنی موٹی انگلیاں مروڑنے لگی۔
''زندگی کے کچھ راستے ایسی بھول بھلیوں پر مشتمل ہوتے ہیں' جہاں کوئی خضر راہ چراغ لیے کسی کا منتظر نہیں ہوتا۔ بعض دفعہ رات کے بھولے جب صبح کو پلٹتے ہیں تو اپنے ساتھ صدیوں کے فاصلے بھی سمیٹ لاتے ہیں۔ ان کے ہاتھ دستک دینے کے فن میں کتنی ہی مہارت رکھتے ہوں' کچھ مسافروں کے لیے کچھ در کبھی نہیں کھلتے۔'' طیبہ پھپھو افسردہ انداز سے کافی مشکل فلسفہ بول گئی تھیں جو اوریدا کو بالکل سمجھ نہیں آیا۔
''طیبہ مت کیا کرو ایسی باتیں' میرا دل خراب ہوتا ہے۔'' بڑی اماں بھرآئے ہوئے لہجے میں بس اتنا ہی کہہ سکیں۔
''طیبہ پھپھو' بہت پیاری لگ رہی ہیں آپ...'' اوریدا نے نرمی سے طیبہ کی کلائی تھام کر کہا اور یہ بات سچ تھی طیبہ پھپھو کی گریس فل شخصیت اسے ہمیشہ اٹریکٹ کرتی تھی' اوپر سے انہیں پہننے اوڑھنے کا سلیقہ تھا' وہ سرخ و سفید رنگت' تیکھے نقوش کے ساتھ دراز قد تھیں' جو بھی پہن لیتیں' ان پر جچ جاتا' بڑی اماں کی ساری اولاد ان پر تھی اور بڑی اماں کے آباؤ اجداد خالصتاً ''کشمیری'' تھے۔

''تم خود بھی تو ماشاء اللہ بہت خوب صورت لگ رہی ہو' اللہ نظر بد سے بچائے۔'' طیبہ پھپھو نے محبت سے اس کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ کچھ بھی تھا انہیں اپنے بھائی کے دونوں بچوں اوریدا اور ماہیر سے بے تحاشا محبت تھی' لیکن وہ نیلی کو تھی آنے سے ہر ممکن کتراتی تھیں' اس کا اندازہ اوریدا کو بہت جلد ہو گیا تھا۔
''تم دونوں ایک دوسرے کی تعریفیں واپس آ کر کر لینا' وہاں جلال صاحب کا بلڈ پریشر ہائی ہو رہا ہو گا۔'' بڑی اماں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اٹھیں۔
''سچ پوچھیں اماں' میرا تو بینش کی شکل دیکھنے کو بھی دل نہیں کرتا۔ پتا نہیں آپ کیسے برداشت کرتی ہیں۔'' طیبہ پھپھو کے تلخ انداز پر اوریدا نے الجھ کر ان کا چہرہ دیکھا' جہاں نری بے زاری ہی بے زاری تھی۔
''تو کس کافر کا دل کرتا ہے اس سے ملنے کو...'' بڑی اماں جل کر بولیں' تو اوریدا کو ہنسی آ گئی۔
''میرا تو اس فنکشن میں ہی آنے کو دل نہیں کر رہا تھا' صرف آپ کے بار بار کہنے کی وجہ سے آئی ہوں۔'' طیبہ پھپھو کا لہجہ کوفت سے لبریز تھا۔
''میں تو شکر کر رہی ہوں تم آ گئی ہو' ورنہ تمہارے ابا تو اگلے دو ماہ تک مجھے طعنے دیتے رہتے۔'' بڑی اماں نے برا سا منہ بنایا۔
''آپ کے بار بار اصرار کرنے پر آئی ہوں ورنہ آپ کو پتا ہے میری بینش سے ساری زندگی نہیں بنی۔'' طیبہ پھپھو ان کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے بڑے بے تکلف انداز سے بول رہی تھیں۔ ان کی باتیں اوریدا کو سمجھ تو آ رہی تھیں' لیکن وہ اس کے پس منظر سے ناآشنا تھی۔
''تمہارے ابا کے علاوہ اس کی بنتی کس کے ساتھ ہے؟'' بڑی اماں کی پیشانی پر بہت سی سلوٹیں نمودار ہوئیں۔ وہ تینوں باتیں کرتے ہوئے اپنے پورشن سے نکل آئی تھیں۔
سامنے ارحم کی طرف کے لان میں ہر طرف روشنیاں' برقی قمقمے اور لائٹنگ کا بے دریغ استعمال

تھا۔ اوپن ایریا کی ارینج منٹ کے لیے آنٹی نے بہت زبردست پروفیشنل ہائر کیے تھے۔ اس لیے تو ہر چیز بے مثال لگ رہی تھی۔ سامنے گولائی میں بنے ہوئے اسٹیج پر ایک میوزیکل گروپ پرفارمنس دے رہا تھا۔

آج صبح ہونے والی بارش کی وجہ سے موسم خاصا خوش گوار ہو گیا تھا۔ اس وقت کافی سارے مہمان آچکے تھے۔ اوریدا نے متلاشی نگاہوں سے ارصم کو دیکھا۔ جو یقیناً" آج اپنے دوستوں کے ساتھ خاصا مصروف تھا۔

"اماں کھانا کھاتے ہی اٹھ جایئے گا' میں بینش کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کر سکتی۔" طیبہ پھپھو نے بے زار لہجے میں بڑی اماں کے کان میں سرگوشی کی۔ بڑی اماں نے سرہلا کر انہیں مطمئن کیا۔

"بہت افسوس کی بات ہے بڑی اماں' آپ لوگ اب آرہے ہیں۔" ارصم کسی کونے سے اچانک ہی نکل کر سامنے آیا۔ نیوی بلیو ٹو پیس سوٹ میں وہ خاصا ہینڈسم اور اسمارٹ لگ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر بے ساختہ سی خوشی جھلک رہی تھی۔

"بھئی یہ اوریدا کا ہار سنگار ہی ختم ہونے میں نہیں آرہا تھا۔" بڑی اماں نے حسب عادت سارا الزام اوریدا کے سر ڈال دیا' وہ ہکا بکا رہ گئی۔

ارصم نے بڑی اماں کے دائیں جانب کھڑی اوریدا کو ستائشی نگاہوں سے دیکھا' اس کی آنکھوں میں ہلکی سی چمک ابھری اور اگلے ہی لمحے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ وہ اب اوریدا کو نظر انداز کر کے طیبہ آنٹی کی طرف بڑھا۔

"ارے واہ طیبہ آنٹی! آپ نے تو آج سرپرائز دے دیا مجھے۔" ارصم کو واقعی انہیں دیکھ کر خوش گوار حیرت ہوئی۔ اسے ہرگز امید نہیں تھی کہ وہ یہ فنکشن اٹینڈ کرنے آئیں گی۔

"تمہاری بڑی اماں کے بڑے سخت آرڈر تھے۔ ورنہ تمہیں پتا ہے میں ایسی مکس گیدرنگز میں جانے سے اجتناب ہی برتتی ہوں۔" طیبہ پھپھو نے اپنے آف وائٹ سلکی اسکارف کو لپیٹتے ہوئے صاف گوئی سے کہا۔ ان کے سسرالی خاندان میں پردے کا بہت خاص خیال رکھا جاتا تھا اور طیبہ ان ہی کے رنگ میں ڈھل چکی تھیں' جبکہ ان کے اپنے میکے کا ماحول خاصا لبرل تھا۔

"یا اللہ خیر' یہ میری آنکھیں کیا دیکھ رہی ہیں۔" بینش کے طنزیہ انداز پر طیبہ کے اعصاب تن سے گئے' انہوں نے گہرے سلک کی ساڑھی میں ملبوس اپنی سانولی سلونی سی کزن کو دیکھا' جو کہیں سے بھی ان کے خاندان کا حصہ نہیں لگتی تھیں۔

"آج تو بڑے بڑے لوگ ہمارے ہاں آئے ہیں' لگتا ہے دہلیز پر تیل بہانا پڑے گا۔" بینش کے طنزیہ انداز پر بہت جلد ہی طیبہ نے خود کو سنبھالا۔

"دنیا بدل گئی بینش! لیکن تمہاری طنز کرنے کی عادت نہیں بدلی۔" طیبہ پھپھو نے بھی زہر خند لہجے میں جوابی وار کیا۔

"ہم تو شروع دن سے ویسے ہی ہیں' ہمیں موسموں کی طرح بدلنا نہیں آتا۔" ان کے چہرے پر بظاہر مسکراہٹ تھی' لیکن لہجہ سلگ رہا تھا۔

"بائی داوے' بیٹے کی کامیابی مبارک ہو۔" طیبہ نے مبارک باد دینے میں پہل کی' جبکہ بڑی اماں تھک کر قریبی کرسی پر بیٹھ چکی تھیں۔

"تھینکس...." انہوں نے نزاکت بھرے انداز سے اپنی گردن کو خم دیا۔ "بچوں کو نہیں لائیں؟" بینش نے بھی رسم دنیاداری نبھانے کی کوشش کی۔

"سرمد آیا ہے' لیکن اشعر کچھ بزی تھا۔" طیبہ نے بھی بادل نخواستہ جواب دیا۔

"آؤ اوریدا' میں تمہیں اپنی کلاس فیلوز سے ملواتا ہوں۔" ارصم نے اکتائے ہوئے انداز سے کھڑی اوریدا کو مخاطب کیا۔ بینش نے چونک کر اسے دیکھا جو اس وقت شعلہ جوالا بنی کھڑی تھی۔ بینش کے اعصاب تن سے گئے۔ وہ ایک دم ہی عدم تحفظ کا شکار ہوئیں۔ ارصم اور اوریدا ایک ساتھ کھڑے ایک مکمل اور پرفیکٹ میچ لگ رہا تھا۔ بینش کو خفقان سا ہونے لگا' جبکہ ان کی بے قابو نگاہیں' اوریدا کو بدحواس کر رہی

تھیں۔
"ہاں ہاں چلو...." وہ گھبرا کر بولی۔
"جلدی واپس آؤ میں نے تمہیں مسز گردیزی سے ملوانا ہے۔" بینش کے لہجے کی کاٹ پر طیبہ نے الجھ کر ان کے تناؤ زدہ چہرے کو دیکھا' وہ جتنی ناپسندیدہ نگاہوں سے اوریدا کو دیکھ رہی تھیں' طیبہ کو اپنے اندر ہول سے اٹھتے ہوئے محسوس ہوئے۔
"اللہ خیر ہی کرے' یہ بینش' اوریدا کو کیسی نفرت بھری نگاہوں سے دیکھتی ہے۔" طیبہ نے بڑی اماں کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھتے ہوئے پریشانی سے کہا۔
"اس کا بس نہیں چلتا' اگلی فلائٹ میں بیٹھا کر اسے یہاں سے روانہ کردے۔" بڑی اماں نے صاف گوئی سے جواب دیا۔
"وہ تو بچی ہے' اس سے بھلا کیا عداوت رکھنا۔" طیبہ کو اپنی اکلوتی کزن پر ٹھیک ٹھاک غصہ آیا۔ بڑی اماں اس سے پہلے کہ کوئی جواب دیتیں ان کی ایک رشتے دار خاتون وہیں چلی آئیں۔
"یہ تیمور کی بیٹی ہے نا۔" وہ خاتون پرشوق نگاہوں سے اوریدا کو دیکھتے ہوئے بولیں' بڑی اماں نے اثبات میں سرہلایا۔
"ہو بہو' اپنی پھپھو پر ہے۔ ایک لمحے کو تو مجھے لگا جیسے...." اس خاتون کے بولنے سے پہلے ہی طیبہ نے تیزی سے ان کی بات کاٹی۔
"آنٹی' آپ بینش کا پوچھ رہی تھیں نا' وہ سامنے والی ٹیبل پر گرے ساڑھی میں ہیں۔" طیبہ کا ناگوار انداز انہیں بہت کچھ سمجھا گیا تھا' وہ پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بینش کی طرف بڑھ گئیں۔
اوریدا' ارصم کے ساتھ گھومتے ہوئے بہت سی نگاہوں کا مرکز بن رہی تھی' بینش کے دل پر بجلیاں گر رہی تھیں' وہ آنے بہانے سے ارصم کو بلا چکی تھیں' لیکن وہ انہیں ٹال کر ایک دفعہ پھر اوریدا کی طرف آجاتا۔
"میں کیسی لگ رہی ہوں ارصم....؟" اس نے ڈھیٹ بن کر خود ہی پوچھ لیا' ارصم نے تنقیدی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا' اس کی نگاہوں میں شوخی اور لبوں پر ایک شرارتی سی مسکراہٹ تھی۔
"آج "حسین" کم اور "سنگین" زیادہ لگ رہی ہو...." ارصم کا غیر سنجیدہ انداز بھی اسے پریشان کر گیا۔
"کیا یہ ڈریس اچھا نہیں لگ رہا....؟"
"بھئی جو چیز اوریدا تیمور پہن لے' وہ کیسے بری ہوسکتی ہے؟" وہ معنی خیز انداز میں اس کا دل دھڑکا گیا تھا۔
"ویسے روز اسی طرح منہ ہاتھ دھو لیا کرو تو یقین مانو بہت اچھی لگو۔" وہ شوخ لہجے میں اس کی دھڑکنوں کا کڑا امتحان لے رہا تھا۔ اس کے ساتھ باتیں کرتے کرتے وہ اپنے کئی دوستوں سے اسے ملوا چکا تھا۔ چلتے چلتے اوریدا ایک دم ہی ٹھہر گئی۔
"کیا ہوا...." ارصم نے سوالیہ نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔ جو کسی مشکل کا شکار لگ رہی تھی۔
"میری ہیل گیلی گھاس میں دھنس کر رہ گئی ہے۔" اس نے اپنی مجبوری بتائی تو وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔ دونوں لان کے اس حصے کی طرف چلے آئے تھے جہاں کی گھاس خاصی نم آلود تھی۔
"تم بھی تو لگتا تھا جیسے آج ریمپ پر ماڈلنگ کر رہی ہو۔ ادھر دو اپنا ہاتھ...." ارصم کے دوستانہ انداز پر اس نے ہلکا سا جھجک کر نازک سا ہاتھ اس کے مضبوط ہاتھ میں دیا' ایک لمحے کو اوریدا کو لگا جیسے ماہ و سال کی گردشیں تھم کر رہ گئی ہوں' ارصم نے ہلکا سا زور لگا کر اسے اپنی طرف کھینچا اور اسی لمحے کسی کیمرے کی فلش لائٹ ان دونوں کے چہروں پر چمکی۔ ارصم نے گھبرا کر اس کا ہاتھ چھوڑ دیا' اوریدا خود ہراساں سی ہوگئی۔ لان کی ایک طرف سے زرش اور اس کی سہیلیوں کا ٹولہ نمودار ہوا۔
یہ ان ہی کی شرارت تھی کیوں کہ وہ دونوں اب ہنس کر باقاعدہ ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔
"قسم سے رومیو' جولیٹ لگ رہے تھے۔" ارصم کی کلاس فیلو ثانیہ نے کمنٹ پاس کیا۔
"یہ اس سال میرے کیمرے کی بیسٹ پکچر

ہوگی۔" زرش کا شرارتی انداز اوریدا کو سلگا سا گیا۔ اسے یہ حرکت بالکل اچھی نہیں لگی تھی' لیکن ارصم خود بھی ان کے ساتھ انجوائے کررہا تھا اس لیے اسے مجبوراً" اپنے غصے کو پینا پڑا۔

"اچھا... اچھا دکھاؤ مجھے..." ارصم بے تاب انداز میں زرش کے کیمرے پر جھکا۔ اوریدا کو حد درجہ بے چینی سی لاحق ہوئی۔ زرش پنک کلر کی میکسی میں خاصی دلکش لگ رہی تھی۔

"واؤ... اٹس امیزنگ یار..." ارصم کو واقعی وہ تصویر بہت اچھی لگی تھی۔ "اوریدا تم بھی دیکھونا..."

"سوری مجھے کوئی انٹرسٹ نہیں۔" اس کا مزاج برہم ہوچکا تھا جبکہ ارصم لاپروائی سے اپنی فرینڈز کے ساتھ خوش گوار موڈ میں سیلفی بنارہا تھا جسے دیکھ دیکھ کر اس کا اور بھی خون کھول رہا تھا۔ وہ سب لوگ دل کھول کر انجوائے کررہے تھے۔

"ارصم! میں بڑی اماں کے پاس جارہی ہوں۔" اس نے سنجیدہ سے انداز سے اسے اطلاع دی اور فوراً" دوسری طرف چل دی۔

"میں ابھی فری ہوکر آتا ہوں۔" ارصم نے پیچھے سے اسے بلند آواز میں کہا تھا' لیکن اوریدا نے پلٹ کر نہیں دیکھا۔ اسے معلوم تھا آج کے فنکشن میں ارصم کے لیے صرف ایک ہی چیف گیسٹ نہیں ہے۔ اس کے وہ سارے کالج فیلوز یہاں موجود تھے' جن کے ساتھ اس نے بہت اچھا وقت گزارا تھا۔ ان کے درمیان اوریدا کو اپنا آپ بڑا فالتو سا محسوس ہوتا تھا۔

وہ اب ذرا ہٹ کر لان کی خشک سائیڈ پر چلنے لگی۔ پیپل کے درخت پر بے شمار برقی قمقمے لگے ہوئے تھے اور فضا میں دھیما دھیما سا میوزک بج رہا تھا۔ ڈنر میں آنٹی بینش نے کافی لوگوں کو انوائٹ کیا ہوا تھا اس وقت ان کا وسیع و عریض لان مہمانوں سے بھرچکا تھا۔

وہ ذرا کم روشنیوں والی طرف پر آگئی' اس کا سارا موڈ خراب ہوچکا تھا۔ لان کے بالکل ایک کونے میں کنوپی کے پاس کھڑے ہوکر اس نے اپنی آنکھوں میں آنے والے بے ساختہ آنسوؤں کو صاف کیا۔ ارصم کی کسی اور جانب توجہ اسے اسی طرح سے ہرٹ کرتی تھی۔

"مجھے اس فنکشن میں آنا ہی نہیں چاہیے تھا۔" وہ ارصم کی طرف سے بدگمان ہوئی۔ اور دل ہی دل میں اپنے پورشن جانے کا ارادہ کرکے اٹھی۔ ایک درخت کی اوٹ میں کھڑی آنٹی بینش اور ان کی دوست کی گفتگو نے اسے بے اختیار رکنے پر مجبور کردیا۔

"یہ ارصم' رائل بلیو سوٹ میں کس حسین سی لڑکی کے ساتھ گھوم رہا تھا؟" وہ خاتون اشتیاق بھرے انداز سے گویا ہوئیں۔ "یقین مانو' اس پر نظر نہیں ٹھہر رہی تھی' بہت معصوم اور اچھوتی سی لگ رہی تھی وہ لڑکی۔"

"اب ایسی بھی خوب صورت نہیں ہے وہ..." ڈاکٹر بینش تڑخ کر بولی تھیں۔

"کیا تمہاری کزن طیبہ کی بیٹی ہے وہ...؟" اس خاتون کا تجسس کم ہونے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔

"نہیں... تیمور کی بیٹی ہے۔" بینش نے بادل نخواستہ جواب دیا۔

"مائی گاڈ... یہ تیمور کی بیٹی ہے؟" وہ حد درجہ بے یقین انداز سے گویا ہوئیں۔ "ویسے اس کی ماں بھی کم خوب صورت نہیں تھی' لیکن بیٹی تو اس پر ہے ہی نہیں۔"

"اپنے ددھیال پر گئی ہے' طیبہ اور تیمور کو نہیں دیکھا' اس عمر میں بھی آفت ڈھاتے ہیں۔" بینش کا لہجہ تلخی میں ڈوبا ہوا تھا۔

"بینش! اب تم کم از کم تیمور کا نام تو مت لیا کرو۔" ان کی دوست برا مانتے ہوئے بولیں۔ "اس نے اچھا تھوڑی کیا تھا تمہارے ساتھ۔"

"میں کیا' خاندان کا کوئی بھی بندہ اس کا نام نہیں لیتا۔" وہ تحقیر آمیز انداز میں مزید گویا ہوئیں۔ "زبردستی اس نے اپنی بیٹی کو پاکستان بھجوا رکھا ہے حالانکہ کوئی بھی اسے منہ نہیں لگاتا۔"

"لیکن تمہارے ارصم کے ساتھ تو خوب بے

تکلفی لگ رہی ہے اس کی۔" بینش کی بیسٹ فرینڈ صوفیہ نے صاف گوئی سے کہا۔

"اب ماں سے جینز میں اور کچھ لیا ہو یا نہیں، ادائیں، اور دوسروں کو لبھانے کے سارے انداز تو ضرور لے لیے ہیں اس نے گندے خون کا کوئی نہ کوئی اثر تو آنا ہی تھا ناں۔" بینش کا زہر میں ڈوبا ہوا لہجہ اوریدا کو پاتال کی گہرائیوں میں گرا گیا۔

"پھر بھی یار، تم ارصم کو اس سے دور ہی رکھو۔" صوفیہ نے انہیں خلوص دل سے مشورہ دیا۔

"اسی لیے تو صوفیہ، میں ارصم کا ایڈمیشن لاہور کروا رہی ہوں۔" ان کی بات پر اوریدا کو کرنٹ لگا۔ وہ تو گمان بھی نہیں کر سکتی تھی کہ آنٹی بینش اس سے قدر خوف زدہ ہوں گی۔ "نہ وہ یہاں ہوگا اور نہ میرا دل جلے گا۔"

"ایسا نہ ہو، وہ بھی میڈیکل کا میرٹ بنا کر اس کے پیچھے پہنچ جائے۔" ان کی دوست صوفیہ نے انہیں ڈرایا۔

"اس معاملے میں، میں بے فکر ہوں۔" آنٹی بینش کھلکھلا کر ہنسیں۔ "تم سوچ نہیں سکتی ہو صوفیہ! تیمور کی بیٹی کتنی ڈفر ہے، شکل تو باپ کی لے لی، لیکن عقل میں اپنی ماں پر چلی گئی، ویسی ہی نکمی اور جاہل۔" وہ استہزائیہ انداز سے اوریدا کی سماعتوں پر کئی بم گرا چکی تھیں۔ اس سے زیادہ سننے کی اوریدا میں تاب نہیں تھی، وہ بوجھل قدموں اور الجھن بھرے انداز سے دائیں بائیں متلاشی نگاہوں سے بڑی اماں کو ڈھونڈ رہی تھی۔

"ارے بیٹا، آپ کہاں اکیلے گھوم رہی ہیں۔" آغا جی کی نظر اچانک اس پر پڑی تو مخاطب بھی کر بیٹھے۔ اوریدا نے گھبرا کر ان کے دائیں طرف کھڑے بڑے ابا کو دیکھا جو لاپروائی سے سگار پی رہے تھے اور پاس ہی ان کا کوئی ہم عمر دوست گرے پینٹ کوٹ میں دلچسپ نظروں سے اوریدا کو دیکھ رہا تھا۔

"السلام علیکم انکل۔" اوریدا نے بوکھلائے ہوئے انداز میں انہیں سلام کیا۔ بڑے ابا بڑے اطمینان سے سگار پینے میں مگن تھے۔

"ڈاکٹر جلال، آپ نے کبھی ذکر ہی نہیں کیا کہ تیمور کی بیٹی آپ کے پاس رہتی ہے۔" ڈاکٹر سفیان حیران ہوئے۔

"تیمور کی بیٹی کا میرے پاس رہنا میرے لیے نہیں تیمور کے لیے خاص ہو سکتا ہے۔ اس لیے کبھی ذکر ہی نہیں ہوا۔" بڑے ابا کا طنزیہ انداز اوریدا کا دل دکھا گیا۔ وہ سر جھکا کر خفت زدہ انداز سے کھڑی ہو گئی۔

"اچھا بیٹا تو آپ نے فرسٹ ایئر میں ایڈمیشن لینا ہے گڈ۔" ڈاکٹر سفیان کا انداز خاصا دوستانہ تھا، وہ کہیں سے بھی بڑے ابا کے دوست نہیں لگ رہے تھے۔

"مبارک ہو جلال، تمہارے خاندان میں ایک اور ڈاکٹر کا اضافہ ہونے والا ہے، اس کا مطلب ہے تم مجھ سے جیت جاؤ گے۔" ڈاکٹر سفیان، شاید آغا جی اور بڑے ابا کے قریبی دوست تھے اس لیے بے تکلفی سے ہر چیز پر تبصرہ کر رہے تھے۔

"ڈونٹ وری سفیان! میرے خاندان میں ارصم ہی اب آخری بچہ ہے، جو میڈیکل میں آئے گا، باقی کسی میں گٹس نہیں۔" بڑے ابا نے بھی آج شاید اوریدا کا دل جلانے کا تہیہ کر رکھا تھا۔ اوریدا کے حلق میں آنسوؤں کا گولا سا پھنسا۔

"لیکن یہ بچی تو لائق لگ رہی ہے مجھے۔" ڈاکٹر سفیان نے اوریدا کو دیکھا جس کے چہرے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔ وہ بڑے ابا کی موجودگی میں اکثر ایسے ہی بدحواس ہو جاتی تھی۔

"تمہارے اندازے اکثر ہی غلط ثابت ہوتے ہیں سفیان۔" بڑے ابا نے سگار کا دھواں فضا میں بکھیرا اور ساتھ ہی اوریدا کو لگا اس کا دل بھی کئی حصوں میں تقسیم ہو کر بکھر گیا ہو، پہلی دفعہ اسے بڑے ابا اور بینش آنٹی ایک ساتھ بے تحاشا برے لگے تھے، ورنہ وہ بڑے ابا کو تو پھر بھی کہیں نہ کہیں مارجن دے جاتی تھی۔

"ایکسکیوز می۔" اس سے زیادہ وہاں ٹھہرنا اوریدا کے لیے ممکن نہیں تھا۔

وہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی اپنے پورشن کی جانب جارہی تھی جب اس نے ارصم کو زرش کے ساتھ کھڑے ہنستے ہوئے دیکھا۔ اس کا وجود حلق تک کڑوا ہوگیا تھا۔ ایک دم ہی اس کا فنکشن سے دل اچاٹ ہوگیا۔ وہ اب ایک لمحے کے لیے بھی یہاں رکنا نہیں چاہتی تھی۔

"ہائے اوریدا' کیسی ہو؟" طیبہ پھپھو کے بیٹے سرمد نے اس کی طرف دیکھ کر دور ہی سے ہاتھ ہلایا۔ وہ فوراً ہی اس کے پاس پہنچا۔

"تمہیں کیا ہوا۔؟" اس نے پریشانی سے اس کے گالوں پر پھیلے کاجل کی لکیروں کو دیکھا۔

"کچھ نہیں۔" اوریدا نے بمشکل آنسوؤں کے گولے کو نگلا۔

"پھر رو کیوں رہی ہو۔؟" سرمد نے پریشان انداز سے اس کا بازو پکڑا' اوریدا نے بھی ضبط کا دامن ہاتھ سے چھوڑ دیا۔

"کہا ناں' کچھ نہیں ہوا مجھے' بازو چھوڑیں میرا' خوامخواہ ہی فری مت ہوا کریں۔" اوریدا نے ایک دم ہی جھٹک کر اپنا بازو چھڑایا اور اپنے پورشن کی طرف بڑھ گئی۔ سرمد سخت حیرت' بے یقینی اور صدمے بھرے انداز سے اسے دیکھتا رہ گیا' یہ لڑکی جس سے اسے پہلی نظر دیکھنے میں ہی محبت ہوگئی تھی اور وہ کافی عرصے سے اپنی خاموش محبت کو دل میں چھپائے بیٹھا تھا۔ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر جاچکی تھی۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کیلنڈر پر اٹھارہ جولائی کے گرد گول دائرہ کیوں لگا رکھا ہے۔؟" رباب شاور لے کر واش روم سے نکلی تو دیوار پر لگے کیلنڈر کے گرد سرخ رنگ کا بال پوائنٹ سے لگا دائرہ دیکھ کر چونک اٹھی کیونکہ آج اٹھارہ جولائی ہی تھی۔

"ویسے ہی۔" شانزے نے لاپروائی سے اسے ٹالنے کی کوشش کی۔ ویسے بھی وہ اپنا پچھلے سال کا فوٹو شوٹ دیکھنے میں مگن تھی' جس میں فوٹو گرافر نے اسے ہر زاویے سے نمایاں کرنے کی کوشش کی تھی۔

"بھئی کوئی وجہ تو ہوگی ناں۔" رباب کو تسلی نہیں ہورہی تھی۔

"اس دن میرے فادر کی برسی ہوتی ہے۔" اس کے سرسری انداز پر رباب کو اچھا خاصا دھچکا لگا۔

"اوہ مائی گاڈ۔! آج تمہارے بابا کی برسی ہے' تمہیں ان کے لیے قرآن پاک پڑھ کر بخشنا چاہیے' اور تم بیٹھ کر اپنا فضول سا فوٹو شوٹ دیکھ رہی ہو۔"

"میں تو بخش دوں' لیکن تمہارا اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا۔" وہ اب اپنا ایک ہوش ربا سا پوز دیکھ رہی تھی۔

"یہ تمہارا اسلام کیا ہوتا ہے' میں نے خود تمہیں کبھی کبھار نماز پڑھتے دیکھا ہے۔ کیا تم مسلم نہیں ہو۔" رباب جھنجھلا کر سر پر لپیٹے تولیے کو اتار کر بالوں کو جھٹکنے لگی' کچھ ننھی ننھی بوندیں شانزے کے چہرے پر بھی آن گریں۔

"یار پلیز! یہ بالوں کو جھٹکنے دور جاکر مارو میں ڈسٹرب ہورہی ہوں۔" شانزے کے منہ بنانے پر رباب تھوڑا سا پیچھے ہٹ کر کھڑی ہوگئی' لیکن اس کی سوئی وہیں اٹکی ہوئی تھی۔

"تم اپنے فادر کی بخشش کے لیے دعا کرو ناں۔" رباب نے سنجیدگی سے اسے نصیحت کی۔

"پتا نہیں ان کی بخشش کی دعا کرنا جائز ہے کہ نہیں۔" شانزے نے سنجیدہ انداز سے اسے مزید حیران کیا۔ "میری پھپھو بتاتی ہیں انہوں نے شاید اسلام چھوڑ دیا تھا' پتا نہیں مرتے وقت وہ کس مذہب کے پیروکار تھے۔"

"انہوں نے ایسا کیوں کیا۔؟" رباب پریشانی سے تولیہ کرسی پر پھینک کر اس کے پاس آن بیٹھی۔

"یہ کوئی کنفرم نیوز نہیں ہے' ان کے ایک دو دوستوں نے ان کے مرنے کے بعد بتایا تھا شاید۔" شانزے نے ہاتھ میں پکڑا البم بند کردیا۔

"تو ان کا جنازہ۔؟" رباب نے جھجک کر پوچھا۔

"آئی ڈونٹ نو' میں نے کسی سے بھی اتنی تفصیل

سے نہیں پوچھا' بلکہ سچ بات تو یہ ہے کہ کوئی بھی میرے فادر کے متعلق بات کرنا پسند نہیں کرتا گھر میں۔" شانزے نے صاف گوئی سے اصل بات بتائی تو رباب کا دل تاسف میں مبتلا ہوا۔

"اب پلیز اس ٹاپک پر کوئی اور سوال مت کرنا۔" شانزے کی بات پر وہ ایک دم ہی خفت کا شکار ہوئی۔

"اچھا تم اس بات کو چھوڑو' یہ بتاؤ ڈرماٹولوجسٹ کے پاس گئی تھیں دوبارہ؟" رباب نے بات ہی بدل ڈالی تھی۔

"ہاں گئی تھی' وہ کہتے ہیں میرا چہرہ ٹھیک ہونے میں ابھی مزید کچھ دن اور لگیں گے۔" وہ غیر شعوری طور پر دیوار پر لگے شیشے کے سامنے آن کھڑی ہوئی۔

"ایکسیڈنٹ بھی تو تمہارا بہت برا ہوا تھا۔" رباب نے اسے یاد دلایا۔

"وہ تو کوئی منحوس ہی دن تھا' اس کی نحوست ابھی تک ختم نہیں ہو رہی۔" شانزے نے ناک چڑھا کر کشن اپنی گود میں رکھا۔

"بری بات ہے شانزے! کوئی دن بھی منحوس نہیں ہوتا' یہ سب تو ہمات ہیں جس میں ہمارا معاشرہ بری طرح سے مبتلا ہے۔"

"پلیز اب کوئی مذہبی لیکچر مت دینا۔" شانزے نے ہاتھ اٹھا کر اسے وارننگ دی تو وہ بے اختیار ہنس دی۔

"تو پھر ایک اور خبر سن لو' تمہارے ایم ایس کے ایگزام بھی ہونے والے ہیں شانزے۔" رباب نے منہ بناتے ہوئے اسے اطلاع دی

"میرا ان کتابوں میں سر کھپانے کا اب بالکل کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس نے اپنے عزائم سے اسے آگاہ کیا۔

"اگر فیل ہو گئیں تو ہوسٹل والے تمہیں نکال دیں گے۔" رباب نے اسے ڈرایا۔

"میں تو خود سوچ رہی ہوں' یہ ہوسٹل چھوڑ کر کوئی فلیٹ کرائے پر لے لوں۔" شانزے نے مزید اسے حیران کیا۔ "یہ بے جا پابندیوں والی لائف بالکل اچھی نہیں لگتی مجھے' کل کو شوبز میں بھی جانا ہے' پھر مخواہ سے پرابلم بنے گا' شوٹنگز کا کوئی ٹائم تھوڑا ہوتا ہے۔"

"تم اکیلی کیسے رہو گی کسی فلیٹ میں۔؟" رباب ایک دم پریشان ہوئی' شانزے اسے لمحہ لمحہ حیران کر رہی تھی۔

"اکیلی کیوں۔؟" اس نے منہ بسورا۔ "تمہیں اپنے ساتھ لے کر جاؤں گی" اس کی اگلی بات پر رباب ہکا بکا انداز سے اسے دیکھنے لگی' جو کہیں سے بھی مذاق کے موڈ میں نہیں لگ رہی تھی۔

☆ ☆ ☆

آسمان کے کناروں پر ہلکی ہلکی سی سرخی پھیل رہی تھی' ویسی ہی سرخی جو غروب آفتاب کے وقت آہستہ آہستہ پھیلنا شروع ہو جاتی ہے۔ پرندوں کے غول کے غول اپنے اپنے گھروں کی طرف واپسی کے لیے گامزن تھے۔

عدینہ نے افسردہ انداز سے اپنے گھر کی چھت سے مدرسے کے خالی برآمدے کو دیکھا' اس وقت عبداللہ کی مخصوص چارپائی خالی تھی۔ اس کے دل کا مسافر واپسی کا رستہ بھول کر نئی منزلوں کی طرف رواں دواں ہو چکا تھا۔

عدینہ کو بہت عرصہ پہلے کہیں لکھی ہوئی ندا فاضلی کی نظم اچانک ہی یاد آئی۔

تمہاری قبر میں فاتحہ پڑھنے نہیں آیا۔
مجھے معلوم تھا' تم مر نہیں سکتے۔
تمہاری موت کی کچی خبر جس نے اڑائی تھی۔
وہ جھوٹا تھا۔
وہ تم کب تھے؟
کوئی سوکھا ہوا پتا' ہوا سے مل کر ٹوٹا تھا۔
میری آنکھیں' تمہارے منظروں میں قید ہیں ابھی تک۔
میں جو بھی دیکھتا ہوں' سوچتا ہوں' وہ ہی ہے۔
جو تمہاری نیک نامی اور بدنامی کی دنیا تھی۔
کہیں' کچھ بھی نہیں بدلا۔

تمہارے ہاتھ میری انگلیوں میں سانس لیتے ہیں۔
میں لکھنے کے لیے' جب بھی قلم اٹھاتا ہوں۔
تمہیں بیٹھا ہوا میں' اپنی ہی کرسی پر پاتا ہوں۔
بدن میں میرے جتنا بھی لہو ہے۔
وہ تمہاری لغزشوں' ناکامیوں کے ساتھ بہتا ہے۔
میری آواز میں چھپ کر' تمہارا ذہن رہتا ہے۔
میری بیماریوں میں تم' میری لاچاریوں میں تم۔
تمہاری قبر پر جس نے تمہارا نام لکھا ہے' جھوٹا ہے۔
تمہاری قبر میں' میں دفن ہوں۔
تم مجھ میں زندہ ہو۔
ملے فرصت کبھی تو' فاتحہ پڑھنے چلے آنا۔

عدینہ کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہنے لگے۔ کرب کا ایک جہان اس کے چہرے پر آباد تھا۔ مونا جو چھت سے کپڑے اتارنے آئی تھی اس نے ڈوبتے سورج کے منظر کے ساتھ اسے دیکھا' جو خود بھی لحہ لحہ پگھل رہی تھی۔ مونا جو کتابیں جلانے کے بعد اس سے خفا تھی' وہ اس کے آنسوؤں سے نظریں چرا کر کپڑے سمیٹنے لگی۔ عدینہ نے اس کے قدموں کی آہٹ پر پلٹ کر دیکھا اور جلدی سے اپنے آنسو خشک کیے۔

"انسان کا دل کتنا بھی دکھا ہوا ہو' لیکن اپنے دکھی ہونے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اپنے پیاروں کے چہروں سے بھی مسکراہٹیں چھین لی جائیں۔" مونا کپڑوں کی گھڑی اٹھائے اس کے پاس رکی اور ایک ناراض نگاہ اس پر ڈال کر چلی گئی۔

عدینہ کے دل پر کسی نے کلہاڑا ہی تو چلایا تھا۔ وہ کئی لمحے اپنی جگہ سے ہل نہیں سکی۔ جب رات کی تاریکی چاروں طرف پھیل گئی تو وہ بھی پاؤں گھسیٹتی ہوئی نیچے چل پڑی۔ اس کا دل چاہ رہا تھا کہ وہ افق کے کہیں پار دور وسعتوں میں کھو جائے اور کبھی لوٹ کر نہ آئے۔

صحن میں رکھی چارپائی پر بے بے اور مونا ایک ہی پلیٹ میں سالن ڈالے رات کا کھانا کھانے میں مصروف تھیں' ایسا پہلی دفعہ ہوا تھا کہ کسی نے بھی اسے اپنے ساتھ شامل ہونے کی دعوت نہیں دی تھی۔

عدینہ کا دل رنجیدگی میں گھر گیا۔ آج بہت دنوں کے بعد اس کے اندر بھوک کا احساس بیدار ہوا تھا' اس نے کن انکھیوں سے بے بے کی پلیٹ کی طرف دیکھا' اس کے پسندیدہ آلو' انڈے شوربے کے ساتھ بنے ہوئے تھے۔ عدینہ کی بھوک کی شدت میں ایک دم ہی اضافہ ہوا۔

وہ خود ہی ڈھیٹ بن کر تندور کے پاس گئی اور پلیٹ میں سالن ڈالنے کے لیے ڈوئی اٹھائی' اچانک اس کی نظر تندور کی دوسری جانب پڑی لکڑیوں کے پاس ادھ جلی اپنی کتابوں پر پڑی' شاید بے بے نے انہیں جلتی آگ سے نکالنے کی کوشش کی تھی۔ عدینہ کو کچھ غلط ہونے کا احساس ہوا۔ اس نے گھبرا کر کچھ فاصلے پر بیٹھی بے بے کی طرف دیکھا۔ جن کے پورے بازو پر دوپٹہ پھاڑ کر پٹی باندھی گئی تھی۔

"بے بے! بازو کو کیا ہوا ہے۔؟" وہ پلیٹ چھوڑ کر بے ساختہ ان کی طرف آئی اور خوف زدہ نگاہوں سے بے بے کا جھلسا ہوا ہاتھ دیکھا' جس پر مونا نے شاید ٹوتھ پیسٹ لیپ کیا ہوا تھا۔ بے بے نے شکوہ کناں نگاہوں سے اسے دیکھا' وہ اپنی جگہ کٹ کر رہ گئی۔

"ادھر دکھائیں مجھے۔ مونا بھاگ کر میرا میڈیکل باکس لاؤ۔" عدینہ نے جیسے ہی بے بے کے ہاتھ کو چھوا' انہیں جھٹکا لگا' انہوں نے ناراضی سے اپنا ہاتھ عدینہ سے چھڑایا' اور ناراضگی سے منہ پھیر لیا' عدینہ کا دل تاسف کے گہرے احساس سے بھر گیا۔

"بہت زیادہ جل گیا ہے بے بے! میں اس پر مرہم لگا دیتی ہوں۔" عدینہ نے خفت زدہ لہجے میں اٹک کر کہا۔

"پہلے اندر جا کر اپنی ماں کے دل پر کوئی مرہم لگا اس نمانی کی زندگی کا اکلوتا خواب ہی تو نے جلا کر سوا (راکھ) کر ڈالا' پتا نہیں تجھے پیدا کر کے اس نے کون سا گناہ کیا تھا۔" بے بے زندگی میں پہلی دفعہ اس سے خفا ہوئی تھیں ان کے لہجے اور نظروں میں اس قدر سرد مہری

تھی کہ ایک لمحے کو عدینہ بھی بوکھلا سی گئی۔ اس نے کب بے بے کا یہ روپ دیکھا تھا۔

"مونا! میرے ساتھ نکڑ والے حکیم صاحب کے گھر چلو۔" بے بے مشکل سے اٹھیں اور چارپائی کا سہارا لے کر کھڑی ہوئیں۔

"جی بے بے! میں اندر سے اپنا گاؤن لے آؤں۔" مونا بھی اسے صاف نظر انداز کر کے اندر بڑھ گئی۔ عدینہ کو ایسا لگا جیسے ایک دم ہی ان سب نے اسے اپنی زندگیوں سے نفی کر دیا ہے' کچھ دیر پہلے لگنے والی بھوک کا احساس بالکل ہی ختم ہو گیا۔ وہ رنجیدہ سے انداز سے اسی چارپائی پر لیٹ گئی' جس پر کچھ دیر پہلے مونا اور بے بے بیٹھی ہوئی کھانا کھا رہی تھیں۔ اب اسے کئی گھنٹے بے مقصد سی سوچوں میں الجھ کر گھر والوں کے رویوں پر کڑھنا تھا اور خود کو حق بجانب سمجھنے کے لیے ہزار تاویلیں گھڑنا تھیں۔

☼ ☼ ☼

"تم نے کل میرے فنکشن میں کیا حرکت کی۔؟" اگلے ہی دن ارصم حسب توقع اس کے کمرے میں آن دھمکا تھا۔ خفگی اس کے چہرے کے ایک ایک نقش سے عیاں تھی۔ اوریدا اسے نظر انداز کیے کالج کے پراسپیکٹس میں لگے فارم کو پڑھنے میں لگی رہی۔

"اوریدا! میں تم سے کہہ رہا ہوں۔" اس نے جھنجلا کر اس کے ہاتھ سے پراسپیکٹس چھینا اور صوفے پر پھینک دیا' وہ اس وقت خاصے غصے میں تھا' ورنہ عموماً وہ ایسی حرکتیں نہیں کرتا تھا۔

"یہ کیا بدتمیزی ہے۔؟" اوریدا اس کی حرکت پر سلگ اٹھی۔

"بدتمیزی یہ نہیں' وہ تھی جو تم کل عین فنکشن درمیان میں چھوڑ کر گئی تھی۔"

"تو تم کون سا منانے آ گئے تھے۔؟" اوریدا بھی جل کر بولی' اسے تو ویسے بھی رات کا بہت غصہ تھا' ساری رات اس نے جلتے' کڑھتے اور روتے ہوئے گزاری تھی۔

"منانے....." وہ اس لفظ پر چونکا۔ "تم وہاں سے خفا ہو کر آئی تھیں۔"

"نہیں..... میں بہت خوش تھی۔ اس لیے کھانا کھائے بغیر سب کچھ چھوڑ کر آ گئی تھی۔" اوریدا نے غصے سے سر جھٹک کر جواب دیا۔

"تم نے کھانا بھی نہیں کھایا تھا؟" ارصم کو دھچکا سا لگا۔ اس کی یہ حیرانگی اوریدا کے دل میں کئی بھانبڑ ایک ساتھ جلا گئی تھی۔ یعنی کہ اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ اوریدا تیمور کھانا کھائے بغیر جا چکی ہیں۔ اپنی بے وقعتی کے احساس سے اوریدا کی آنکھیں بھر آئیں۔

"خبردار..... رونا نہیں۔" وہ اس کا ارادہ بھانپ چکا تھا۔ اس لیے فوراً اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر دھمکی دی۔

"میرے آنسو اتنے فالتو نہیں ہیں جو میں ایروں غیروں پر لٹاتی پھروں....." اوریدا نے پہلی دفعہ آنسوؤں کو بمشکل گلے سے اندر کی جانب دھکیلا۔

"میں ایرا غیرا ہوں....." وہ اب دونوں بازو سینے پر باندھ کر اسے غور سے دیکھتے ہوئے بات کا سرا تلاش کرنے کی کوشش کر رہا تھا' ذہن میں وہ ساری چیزیں فلم کی صورت میں چل رہی تھیں' لیکن اپنی غلطی اسے کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔

"تم نہیں..... میں ایکس وائے زیڈ ہوں۔ اپنی امپورٹنس کا احساس مجھے رات بہت اچھی طرح سے ہو چکا ہے۔" اوریدا نے وہ بات اگل ہی دی تھی جس کا سرا وہ ابھی تک نہیں پکڑ سکا تھا۔

"تم میرے لیے ایکس وائے زیڈ نہیں ہو اوریدا....." ارصم نے اس کے ماتھے پہ انگلی ٹکا کر ہلکے پھلکے انداز میں کہا۔ اتنا تو اسے بھی اندازہ تھا کہ وہ رات واقعی اپنے دوستوں میں مصروف ہو کر اسے زیادہ ٹائم نہیں دے پایا تھا' لیکن وہ اس درجہ ناراض ہو گی' اس کا تو گمان تک نہیں تھا۔

"اپنا ہاتھ پیچھے کرو۔" اوریدا نے جتنے برے طریقے سے اس کا ہاتھ جھٹکا تھا۔ اس سے ارصم کو اس کی خفگی کی شدت کا اندازہ ہوا۔

”کیا ہو گیا ہے اوریدا۔۔۔“ ارصم کو جھٹکا سا لگا۔

”تم پلیز جاؤ اور اپنے دوستوں کو ٹائم دو‘ جو تمہارے لیے زیادہ امپورٹنٹ ہیں۔“ وہ دوبارہ پراسپیکٹس اٹھا کر بیٹھ گئی۔

”میں مانتا ہوں اوریدا‘ میں رات بزی تھا۔“ وہ نرم انداز سے گویا ہوا۔ ”لیکن ٹرسٹ می یار۔۔۔ مجھے اس بات کا یقین تھا کہ تم میری پوزیشن کو انڈراسٹینڈ کرو گی‘ ہم تو کزن ہیں‘ چوبیس گھنٹے ایک ہی گھر میں رہتے ہیں‘ ذرا سوچو‘ اگر میں انہیں ٹائم نہ دیتا تو انہیں کتنا برا لگتا۔“ وہ آہستگی سے اسے سمجھا رہا تھا جو آج کچھ بھی سمجھنے کے موڈ میں نہیں لگ رہی تھی۔ اس کی بات پر وہ بھڑک اٹھی۔

”تمہیں میری پوزیشن کا اندازہ ہے۔ وہاں تمہارے علاوہ میرا اپنا کون تھا۔ میں صرف تمہارے لیے وہاں آئی تھی۔“ اوریدا جذباتی ہوئی‘ لیکن اس دفعہ خیریت رہی کہ اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں آئے۔

”آئی ایم سوری یار۔۔۔“ ارصم نے ہمیشہ کی طرح اسے منانے میں پہل کی‘ لیکن اس دفعہ تو اوریدا دل ہی دل میں کچھ اور ہی ٹھانے بیٹھی ہوئی تھی۔

”میں جھوٹ نہیں بولوں گا‘ مجھے سرید بھائی نے بتایا تھا کہ تم اپنے پورشن کی طرف چلی گئی ہو‘ وہ تمہارے لیے بہت ٹینس تھے۔“ ارصم نے اسے وضاحت دی‘ لیکن اسے اندازہ نہیں تھا کہ آج اپنی صفائی میں بولے جانے والے سارے فقرے اس کے اپنے ہی گلے پڑ رہے ہیں۔

”تم پھر بھی مجھے پوچھنے نہیں آئے۔“ اس دفعہ اوریدا کی آنکھیں لبالب آنسوؤں سے بھر گئیں۔

”آئی ایم ایکسٹریملی سوری یار! میں نے سوچا‘ تم کسی کام سے گئی ہو گی اور واپس آجاؤ گی۔“

”بس بس رہنے دیں۔۔۔ مجھے پتا ہے رات اس بلی آنکھوں والی زرش سے کہیں دھیان ہٹا ہی نہیں ہو گا۔“ اوریدا کے پاس پوری چارج شیٹ تیار تھی۔

”استغفر اللہ۔۔۔ تم کیسی باتیں کرنے لگی ہو اوریدا!؟“ ارصم جھنجلا اٹھا۔ ”میں سوری کر چکا ہوں‘ پلیز اب تو اپنا موڈ سیٹ کرو۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ وہ اپنا فارم بھرنے لگی۔ ارصم نے الجھن بھرے انداز سے اسے دیکھا۔ وہ کبھی بھی اتنی دیر خفا نہیں رہتی تھی اور منانے پر فوراً“ مان جاتی تھی۔

”ادھر دو‘ میں تمہارا ایڈمیشن فارم فل کر دیتا ہوں۔“ ارصم نے کچھ لمحے سوچ کر دوستانہ انداز میں کہا۔

”نہیں۔۔۔ مجھے اپنے کام خود کرنے کی عادت اب ڈال لینی چاہیے۔“ وہ سر جھکائے طنزیہ انداز میں بولی تو ارصم کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔

”تمہارے ساتھ پرابلم کیا ہے اوریدا!؟“ وہ اب خفا نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

”تم اپنا ٹائم مجھ پر ویسٹ مت کرو اور زرش کے ساتھ لاہور ایڈمیشن لینے کی پلاننگ کرو۔“ اس کا انداز بالکل سپاٹ تھا۔ ”تمہارے جانے کے بعد بھی تو مجھے اپنے سارے کام خود کرنے ہیں‘ بہتر ہے میں ابھی سے عادت ڈال لوں۔“ اس نے بے زاری سے اپنا سر جھٹکا اور پھر فارم پر جھک گئی۔

”تم سے کس نے کہا کہ میں لاہور ایڈمیشن لے رہا ہوں۔“ وہ سادہ سے انداز میں بولا۔

”آنٹی بینش ہی رات اپنی کسی فرینڈ کو بتا رہی تھیں۔“ غصے سے اوریدا کی ناک بالکل سرخ ہو چکی تھی۔

”تمہیں اس بات کا غصہ ہے کہ میں لاہور کیوں جا رہا ہوں۔“ وہ اس کی ناراضی کی ایک اور وجہ ڈھونڈ چکا تھا اوریدا کا چہرہ ایک لمحے کو متغیر ہوا۔

”مجھے اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ بالکل ہی انجان بن گئی۔

”اٹس او کے۔۔۔“ وہ جھٹکے سے اٹھا اور کمرے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

”کہاں جا رہے ہو؟“ اوریدا کے منہ سے پھسلا۔

”جب تمہیں میرے کہیں جانے یا نہ جانے سے

کوئی فرق نہیں پڑتا تو میں یہاں بیٹھ کر کیا کروں۔" وہ مڑے بنا گہری سنجیدگی سے بولا۔

"جب تمہیں پتا ہے، مجھے فرق پڑتا ہے تو کیوں جاتے ہو؟" وہ ایک دم پھٹ پڑی اور دونوں ہاتھ چہرے پر رکھ کو بے اختیار رو پڑی، ارصم کو کرنٹ سا لگا، وہ فوراً اس کے پاس پہنچا اور اس کا بازو پکڑ کر سادگی سے بولا۔ "تم ایک بار کہہ دو، میں بالکل نہیں جاؤں گا۔"

اس کی بات پر اوریدا رونا بھول گئی اور اب ہونقوں کی طرح منہ کھولے اپنے سامنے کھڑے ارصم کو دیکھ رہی تھی، جو پر اعتماد انداز سے اسی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"تو ٹھیک ہے مت جاؤ۔" اوریدا نے بھی دیر نہیں کی اور جھٹ سے کہہ کر واش روم کی طرف بڑھ گئی۔ جس کام کو وہ دنیا کا مشکل ترین کام سمجھ رہی تھی۔ وہ ایک منٹ میں ہو چکا تھا۔ اصل مشکل تو ارصم کو بھگتنا تھی، کیونکہ اس کی والدہ ڈاکٹر بینش اسے لاہور بھجوانے کا حتمی فیصلہ کر چکی تھیں۔

☆ ☆ ☆

بینش نے بے انتہا شل ہوتے اعصاب کو پرسکون کرنے کے لیے ایک ساتھ دو اینٹی ڈپریسنگ ادویات کا استعمال کیا۔ جیسے ہی انہوں نے نرم تکیے پر سر رکھ کر آنکھیں موندیں، ارصم کے ساتھ ہونے والے تازہ معرکے کی ساری باتیں ایک فلم کی صورت میں ان کے ذہن میں چلنے لگیں۔ بے تحاشا اذیت کے احساس تلے ایک نئی بے چینی نے ان کا حصار کیا۔ وہ بے اختیار اٹھ کر بیٹھ گئیں۔

"آخر وہ پڑھنے کے لیے لاہور کیوں نہیں جانا چاہتا؟" ایک اضطراب ان کے رگ و پے میں دوڑ گیا۔

"مجھے آغا جی سے بات کرنا چاہیے۔" امید کا ایک نیا چراغ ان کے اندر روشن ہوا، وہ ننگے پاؤں ہی اپنے بیڈ روم سے نکلیں۔

"آغا جی! اس بے وقوف کو سمجھائیں، کیوں اپنا کیریئر داؤ پر لگا رہا ہے۔" بینش ایک دم ہی لاؤنج میں داخل ہوئیں۔ سامنے بیٹھے آغا جی تو انہیں نظر آ گئے تھے۔ لیکن بائیں جانب بیٹھا وہ بے وقوف نظر نہیں آیا تھا جس کی شکایت لگانے وہ یہاں پہنچی تھیں۔

"کیسے... ارصم کو...."

آغا جی نے حیرانی سے اپنے سامنے براجمان ارصم کو دیکھا جو بڑے ذوق و شوق سے ریسلنگ دیکھنے میں مگن تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس نے دانستہ بینش کی بات نہ سنی ہو یا اس وقت وہ سننا ہی نہ چاہتا ہو۔

"کیا سمجھاؤں؟" انہوں نے آنکھ کے مبہم اشارے سے اپنی اکلوتی بیٹی سے دریافت کیا تو وہ بے زاری سے سر جھٹک کر رہ گئیں۔

"کہتا ہے کنگ ایڈورڈ کے بجائے یہاں پنڈی میں آرمی میڈیکل کالج یا فوجی فاؤنڈیشن یونی ورسٹی میں ایڈمیشن لوں گا۔" بینش کا لہجہ تو سرد تھا ہی لیکن نگاہیں اس سے بھی زیادہ برفیلی تھیں۔ ارصم نے بے چینی سے پہلو بدلا، ایک دفعہ پھر عدالت سج گئی تھی۔

"ظاہر ہے ایک فوجی باپ کا بیٹا، ان ہی اداروں کو ہی ترجیح دے گا نا۔" آغا جی نے معاملے کی سنگینی کو سمجھے بغیر لاپروائی سے لقمہ دیا۔ بینش تو پیر کے ناخن سے لے کر سر کے آخری بال تک سلگ اٹھیں۔ ان کا سارا سکون ایک لمحے میں غارت ہوا۔

"آپ کو پتا ہے نا کنگ ایڈورڈ پاکستان کے میڈیکل کالجز کی فہرست میں ٹاپ ٹین میں ہے۔" بینش نے بے زاری سے ان کو سمجھانے کی کوشش کی۔

"یہ دونوں ادارے بھی کسی سے کم نہیں ہیں بیٹا۔" آغا جی نے ایک نظر میں ہی اپنے نواسے کی بے چینی کو بھانپ لیا تھا اور یہ کیسے ممکن تھا کہ وہ اس کا ساتھ نہ دیتے، ویسے بھی انہیں بینش کی خواہش خاصی بے تکی سی لگ رہی تھی۔

"لیکن آغا جی.... کچھ عرصہ پہلے تک تو اسے بھی لاہور جانے پر کوئی اعتراض نہیں تھا، اب بیٹھے بیٹھائے کون سی آفت آ گئی ہے۔" بینش مشتعل انداز سے گویا ہوئیں۔

"ماما... انسان کی پسند ناپسند بدلنے میں بھلا دیر کتنی

لگتی ہے۔" وہ بڑے پرسکون انداز سے ٹی وی بند کرکے بینش کے سامنے آن کھڑا ہوا۔ "آپ کیوں اتنا اوورری ایکٹ کررہی ہیں۔" وہ اب معصوم انداز سے ان سے پوچھ رہا تھا۔ بینش کے تو گویا تلوؤں سے لگی اور سر پر بجھی تھی۔

"میں اپنے سارے سوشل سرکل میں بتا چکی ہوں کہ تم وہاں ایڈمیشن لوگے۔" انہوں نے سردمہری سے کہا۔

"اٹس ناٹ آ بگ ڈیل ماما (یہ کوئی بہت بڑی بات نہیں ہے۔)" ارصم نے ان کے اس اعتراض کو چٹکیوں میں اڑایا۔ "آپ سب کو کہہ سکتی ہیں کہ ہمارا بعد میں ارادہ بدل گیا تھا۔ بات ختم ہوجائے گی۔" لیکن ڈاکٹر بینش اتنی آسانی سے بات ختم کرنے والوں میں کہاں تھیں۔

"تمہیں کنگ ایڈورڈ پر اعتراض کیوں ہے؟" چند لمحوں کے توقف کے بعد انہوں نے خشک لہجے میں پوچھا۔

"میں نے کب کہا' مجھے کالج پر اعتراض ہے' مجھے بس کسی بھی قیمت پر لاہور نہیں جانا۔" ارصم کے چہرے پر واضح بےزاری تھی۔

"تو ٹھیک ہے' کراچی میں آغا خان میڈیکل کالج میں ایڈمیشن لے لو۔" ڈاکٹر بینش نے اپنے سابقہ سرد لہجے میں ایک اور آپشن دیا۔ ان کے والد ڈاکٹر حماد نے الجھ کر اپنی ضدی بیٹی کا چہرہ دیکھا' ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ کسی بھی طرح بازو سے پکڑ کر ارصم کو پنڈی یا اسلام آباد سے نکالنا چاہتی ہوں۔

"میں آپ کو اور آغا جی کو اکیلے چھوڑ کر نہیں جانا چاہتا۔" کمرے کی خاموشی میں ارصم کی آواز بےتاثر تھی۔

"تو ٹھیک ہے' میں اور آغا جی بھی تمہارے ساتھ ہی کچھ عرصے کے لیے شفٹ ہوجاتے ہیں۔" ڈاکٹر بینش بگڑے ہوئے تیوروں کے ساتھ بولیں جسے سنتے ہی ارصم کے ساتھ ساتھ آغا جی کو بھی کرنٹ سا لگا۔

"بھئی' میں اپنا بنا بنایا ہوا سیٹ اپ چھوڑ کر کیسے جاسکتا ہوں؟" ارصم کے بولنے سے پہلے ہی آغا جی نے ناگوار لہجے میں اعتراض اٹھایا۔ "میرا اور جلال بھائی کا ٹھیک ٹھاک چلتا ہوا اپنا اسپتال ہے' میں تو ایسا سوچ بھی نہیں سکتا۔" آغا جی کے صاف انکار پر بینش کو اپنے اعصاب چٹختے ہوئے محسوس ہوئے۔

"آغا جی! میں بھی تو سب کچھ چھوڑ کر ہی جاؤں گی۔" بینش جھنجلا سی گئیں۔

"ضروری تھوڑی ہے جو بےوقوفی تم کرو' وہ سارے لوگ بھی کرنے کو تیار ہوجائیں۔" آغا جی برا مان گئے تھے۔ بینش کے تو لگتا تھا آج ستارے گردش میں تھے۔ باپ اور بیٹے کی باتوں سے ان کا فشار خون مسلسل بلند ہورہا تھا۔ ایک اضطراب ان کے رگ وپے میں اترتا جارہا تھا۔

"ماما! آخر آپ مجھے اس گھر سے کیوں بھجوانا چاہتی ہیں۔ کیا ڈر ہے آپ کو؟" ارصم نے ان کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر انہیں حواس باختہ کیا۔ وہ کئی لمحے تو بےیقینی سے ارصم کا سپاٹ چہرہ دیکھتی رہیں پھر احساس توہین سے ان کے جبڑے بھینچ سے گئے۔

"بھاڑ میں جاؤ تم..." وہ مشتعل انداز سے گویا ہوئیں۔ ارصم نے ہراساں نگاہوں سے آغا جی کی طرف دیکھا۔ جنہیں خود بھی بینش کی طرف سے ایسے سخت ردعمل کی توقع نہیں تھی۔

"میری طرف سے تم لالوکھیت میں ایڈمیشن لو یا چھجوں کی ملیاں میں .... میرا تم سے کوئی واسطہ نہیں۔" وہ جارحانہ انداز سے ٹی وی لاؤنج سے واک آؤٹ کرگئیں۔

ارصم نے متوحش نظروں سے اپنے نانا کو دیکھا جو کسی بھی سچویشن میں اس کے لیے آخری امید ہوتے تھے۔ ان کی نظروں میں ارصم کے لیے خاموش سا دلاسا تو تھا۔ لیکن وہ اپنی بیٹی کے اس شدید ردعمل پر خود بھی گھبرائے ہوئے تھے۔ ارصم کو پتا چل گیا تھا۔ اس وقت آغا جی بھی اس کی کوئی خاص مدد نہیں کرسکتے۔

"میں بڑے ابا سے بات کرتا ہوں۔" ارصم کو عین موقعے پر اس شخص کا نام سوجھ ہی گیا' جس کے سامنے

بینش بھی پر نہیں مار سکتیں۔ آغا جی کے سامنے تو وہ بحث' مباحثے اور باقاعدہ ڈیبیٹ کرنے لگتی تھیں' لیکن بڑے ابا کے سامنے ان کی بولتی بند ہو جاتی تھی' ورنہ اتنے سالوں کا ان کا بنایا ہوا فرماں بردار لڑکی کا بت پاش پاش ہو جاتا۔ جسے انہوں نے باقاعدہ محنت کر کے خود اپنے ہاتھوں سے تراشا تھا۔

☼ ☼ ☼

بیسویں صدی کی آخری دہائی کا ذکر ہے۔

جب پاکستان میں سیل فون اکا دکا لوگوں کے پاس تھے اور کمپیوٹرز میں بھی ونڈوز نائنٹی فائیو کا دور دورہ تھا۔

بہاؤ الدین زکریا یونی ورسٹی ملتان کے گرلز ہوسٹل "مریم ہال" کے کمرہ نمبر ایک سو سترہ میں رات کے دو بجے لیمپ کی روشنی میں کھڑکی کے پاس سنگ مرمر کی بنی میز کے قریب رکھی کرسی پر بیٹھی بختاور ایک دلچسپ ناول میں اس طرح سے گم تھی کہ اسے وقت کے گزرنے کا احساس ہی نہیں ہو رہا تھا۔

"واش روم میں جا رہی ہوں۔۔۔ دروازہ کھلا رکھنا' ورنہ مجھے ڈر لگے گا۔" اس کی اکلوتی روم میٹ نیلم اپنی شال کی بکل مار کر کوریڈور کے اینڈ میں بنے ہوئے واش روم کی طرف دوڑی۔ رات کے سناٹے میں فرسٹ فلور پر اس کے قدموں کی چاپ' ہوسٹل میں موجود اکا دکا لڑکیوں کے دل دہلا گئی۔

پورے ہوسٹل میں ہو کا عالم تھا۔ لونگ ویک اینڈ ہونے کی وجہ سے زیادہ تر طالبات اپنے گھروں کو جا چکی تھیں۔ اسی وجہ سے ایک بھید بھری خاموشی نے پورے ماحول کو اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ اس سناٹے میں کہیں نہیں کمرے کی کھڑکی کے باہر جھینگروں کے بولنے کی آوازیں آ رہی تھیں۔۔۔ دور کہیں کوئی آوارہ کتا بھونکا تو اسٹڈی چیئر پر بیٹھی بختاور کا دل بے ہنگم انداز میں دھڑکا۔ اسے رات کے اندھیرے میں کتوں کے بھونکنے کی آوازوں سے بہت وحشت ہوتی تھی۔

"بہت سردی ہے بختاور' یہ ہیٹر کیوں بند کر دیا؟"

نیلم سجاد سردی کی شدت سے بچنے کے لیے بھاگتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی اور آتے ہی اس نے ٹیوب لائٹ روشن کر دی۔ بختاور نے منہ بناتے ہوئے اپنا ٹیبل لیمپ بند کیا۔

نیلم نے میرون جرسی کے اوپر گہرے نیلے رنگ کی شال اوڑھ رکھی تھی۔ پاؤں میں سوکس اور سر پر اونی ٹوپا پہننے کے باوجود وہ سردی سے ٹھٹھر رہی تھی۔ ویسے بھی دسمبر کا اینڈ چل رہا تھا' جب پورا پنجاب ہی دھند کی گہری لپیٹ میں تھا۔

"میں نے سوچا' وارڈن کہیں خفیہ دورے پر نہ نکل آئے' اس لیے ہیٹر بند کر دیا۔" بختاور نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ان کے ہوسٹل میں الیکٹرک ہیٹر رکھنے پر پابندی تھی' لیکن بہت سی لڑکیوں نے موسم کی شدت سے بچنے کے لیے اپنے کمروں میں ہیٹر چھپا کر رکھے ہوئے تھے اور رات کو ان کا استعمال بھی خوب ہوتا تھا' لیکن اس کے ساتھ ساتھ پکڑے جانے کا دھڑکا بھی لگا رہتا۔

"باہر کہرے کی ٹھنڈ اور رگوں کو جما دینے والی سردی ہے۔ ایسے غضب کے موسم میں وارڈن کا دماغ خراب ہے' جو آدھی رات کو کمروں کی تلاشی لیتی پھرے گی' تم بھی بختاور! بعض دفعہ کمال ہی کر دیتی ہو۔" نیلم نے بے زار سے انداز سے دوبارہ چارپائی کے نیچے سے ہیٹر نکال کر آن کیا اور خود بڑے مزے سے اپنے ہاتھ اس پر سینکنے لگی۔ ایک یخ ہوا کا جھونکا کھلے دروازے کی ہلکی سی درز سے اندر داخل ہوا تو بختاور پر کپکپی طاری ہو گئی۔

"نیلم! دروازہ تو اچھی طرح سے بند کر کے آتیں۔۔۔" گرم کمبل اوڑھے کرسی میں دھنسی ہوئی بختاور نے **خشمگین** نظروں سے اسے گھورا۔ وہ اس وقت اس پوزیشن میں نہیں تھی کہ اٹھ کر یہ فریضہ خود سرانجام دے سکتی۔ وہ کمبل اچھی طرح سے لپیٹے کرسی میں دھنسی ہوئی تھی۔

"دروازہ بند کرنے میں کون سا ہل جوتنے پڑتے ہیں۔" ہیٹر کے پاس بیٹھی نیلم بادل نخواستہ اٹھی اور

دروازہ بند کر کے چٹخنی لگا دی۔ اپنے بستر کی طرف بڑھتے ہوئے اس کی نظر بختاور کے ہاتھ میں پکڑی کتاب پر پڑی، وہ چونک اٹھی۔ بختاور کتابوں کے معاملے میں انتہا کی جنونی تھی۔ اس نے سینٹرل لائبریری کا کارڈ بنوا رکھا تھا اور ہر تیسرے دن کتابوں کا تھیلا بھر کر لے آتی، پتا نہیں لائبریرین اسے رولز کے خلاف اتنی بکس ایک ساتھ کیسے ایشو کردیتا تھا۔ یہ معمہ وہ ابھی تک حل نہیں کرپائی تھی۔ ہر قسم کی کتاب، میگزین، ڈائجسٹ بختاور کے ہاتھوں میں پایا جاسکتا تھا۔ اب تو اس کی روم میٹ کو بھی اس چیز کی عادت ہوگئی تھی۔

"سیاہ حاشیہ...." "یہ کیا نام ہوا بھلا؟" نیلم اس کے پاس آن کھڑی ہوئی۔

"اس میں حیرانی کی کیا بات ہے؟" بختاور نے مسکراتے ہوئے میز پر رکھے اپنے اونی دستانے اٹھائے اور ہاتھوں میں پہننے لگی۔

"سیاہ رنگ تو مایوسی اور تیرگی کی علامت ہوتا ہے۔" نیلم نے الجھ کے اپنی روم میٹ کا چہرہ دیکھا۔

"تو میں نے کب کہا، ایسا نہیں ہے؟" بختاور نے مسکرا کر مزید اضافہ کیا تو نیلم نے سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

"تمہیں پتا ہے، سیاہ رنگ بہت سے رنگوں کو اپنے اندر ایسے جذب کرلیتا ہے کہ ان کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت نہیں رہتی۔ اسی طرح اکثر گناہ رات کی تاریکی میں ہی پنپتے ہیں۔ سیاہ رات گناہ گار لوگوں کو اپنی بانہوں میں لے کر غفلت کردینے والی مدہوشی میں مبتلا کردیتی ہے۔ ایسے عالم میں انسان وہ کام بھی کر جاتا ہے جو شاید وہ دن کے اجالوں میں کرنے کا سوچ بھی نہ سکے۔" بختاور نے سنجیدگی سے اپنی روم میٹ کا الجھا ہوا چہرہ دیکھا۔

وہ بالکل اس کے پاس آن کھڑی ہوئی اور کتاب کے معنی خیز ٹائٹل کو دیکھنے لگی۔ رات کی تیرگی میں ایک وسیع و عریض صحرا خاصا پراسرار لگ رہا تھا۔ اس صحرا کے عین بیچ میں ایک بالکل باریک سی ہلکے سرمئی رنگ کی ایک لائن تھی۔ جو بہت غور سے دیکھنے پر ہی نظر آتی تھی۔ اس صحرا میں جگہ جگہ خاردار جھاڑیاں تھیں جو رات کے اندھیرے میں وحشت ناک تاثر دے رہی تھیں۔

"ہاں اسی لیے تو شب تاریک کی برائی سے پناہ مانگنے کا حکم دیا گیا ہے۔" نیلم نے ہاتھ رگڑ کر سردی کی شدت کو کم کیا۔

"اور حاشیہ.... کس چیز کی علامت ہے؟" ایک اور سوال نیلم کے ذہن میں ابھرا۔

"حد بندی کی...." بختاور نے بھی کرسی چھوڑ دی تھی۔ ویسے بھی رات کے ڈھائی بج رہے تھے۔ دونوں سہیلیوں کی عادت تھی۔ رات گئے تک بے معنی باتوں پر بحث کرنے کی۔ اکثر اوقات تو انہیں پتا بھی نہ چلتا اور فجر کی اذانیں ہونے لگتیں۔

"حد بندی.... کیا مطلب؟" نیلم الجھ گئی۔

"جب بھی کوئی چیز اپنی حدوں سے نکلتی ہے تو وہ اکثر صورتوں میں انسان کے لیے نقصان کا باعث بنتی ہے۔" بختاور نے لیمپ کا بٹن بند کردیا۔ پورے کمرے میں تاریکی کا بسیرا ہوگیا تھا۔ "اس لیے انسان کو اللہ کی بنائی ہوئی حدود سے نہیں نکلنا چاہیے۔" اس نے مزید اضافہ کیا۔

"اچھا تو اس کتاب سیاہ حاشیہ کی کیا تعلیم ہے جو تم پڑھ رہی تھیں۔" نیلم نے تجسس بھرے انداز سے پوچھا۔

"یہ ایک دلچسپ ناول ہے، جس میں تمثیلی انداز میں ابن آدم کے جنت سے نکالے جانے والے واقعے کو بیان کیا گیا ہے۔"

"واؤ انٹرسٹنگ...." نیلم کو بھی اس ناول میں دلچسپی پیدا ہوئی، ورنہ عموماً وہ بختاور سے کسی بھی چیز کا خلاصہ سن کر گزارہ کرلیتی تھی۔ موٹی موٹی کتابیں پڑھنا، اس کے بس کی بات نہیں تھی۔ بختاور اس کی دلچسپی کو بھانپتے ہوئے سنجیدہ انداز میں گویا ہوئی۔

"گناہ اور ثواب کے درمیان ایک باریک سا سیاہ حاشیہ ہوتا ہے جسے صرف ایک مومن کی آنکھ ہی دیکھ سکتی ہے۔ جب انسان تکبر اور گھمنڈ میں مبتلا ہو کر

گناہوں کی تاریکی میں پہلا قدم رکھتا ہے تو شیطان اس حد بندی کے پاس ایک دل فریب ساد ھوکا رکھ دیتا ہے جس کی کشش میں ابن آدم ساری حدوں کو توڑتے ہوئے اس کے تعاقب میں نکلتا ہے اور نتیجے کے طور پر ہر دفعہ اپنی جنت سے نکالا جاتا ہے۔"

"ہاں اب بات میری سمجھ میں آگئی۔" نیلم نے سرد موسم کی شدت میں اضافہ کیا۔

"تو چلو شاباش... اب سو جاؤ۔" بختاور نے اپنے کمبل میں منہ چھپاتے ہوئے سستی سے کہا' لیکن نیلم کی نیند اڑ چکی تھی اور اسے اچھی طرح سے علم تھا کہ بختاور کو نیند کی گہری وادیوں میں سے ایک ہی نام واپس لا سکتا ہے اور ایسی کمینگی اکثر وہ اس وقت کرتی جب بختاور کی نیند اڑانا مقصود ہوتی۔

"بختاور..." نیلم کا لہجہ پراسرار ہوا۔

"ہوں..." بختاور نے ہلکا سا ہنکارا بھرا' کیونکہ اس کے دماغ پر آہستہ آہستہ نیند کا مدہوش کر دینے والا غلبہ طاری ہو رہا تھا۔

"تمہیں پتا ہے' ہاشم رضا اپنے شہر ربوہ سے ملتان واپس آچکا ہے۔" نیلم کے لہجے میں کچھ تھا۔ بختاور کی نیند بھک کر کے اڑی اور وہ فوراً" کمبل منہ سے ہٹا کر بیٹھ چکی تھی۔

"تمہیں کس نے بتایا؟" بختاور نے بے تابی سے پوچھا۔ رات کی تاریکی میں بھی نیلم اندازہ لگا سکتی تھی کہ اس وقت بختاور کے چہرے پر دھنک کے ساتوں رنگ بکھر چکے ہوں گے۔ رات کی تاریکی بھلا ہر چیز کیسے چھپا سکتی ہے۔ کم از کم بختاور کے چہرے پر پھیلنے والے محبت کے رنگ تو سات پردوں میں بھی عیاں ہو سکتے تھے۔

☼ ☼ ☼

عدینہ پر اس رات عجیب سی بے چینی لاحق تھی۔ ساون کی بارشوں سے پہلے ہونے والا عجیب سا حبس ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ ایسے لگتا تھا جیسے ہوا سانس روک کر کھڑی ہو۔ کولر کی ہوا بھی آج پسینہ خشک کرنے سے انکاری تھی۔ ساون کے موسم کی ہلکی سی نمی ہر چیز پر طاری تھی اور عدینہ کو ایسا موسم زہر لگتا تھا۔ اوپر سے آپا صالحہ بجلی کا بل زیادہ آنے کے خوف سے اے سی بھی کھل کر نہیں چلانے دیتی تھیں۔

"کیا مصیبت ہے..." عدینہ نے کوفت زدہ انداز سے اپنے دوپٹے کے ساتھ منہ اور گردن پر آنے والا پسینہ صاف کیا۔

"بھاڑ میں جائے بجلی کا بل..." وہ اٹھی ایئر کولر بند کر کے اس نے اے سی کا ریموٹ اٹھایا اور اے سی آن کر کے جلدی سے کھڑکیاں اور کمرے کے دروازے بند کیے۔ کمرے میں بہت تیزی سے پھیلنے والی خنکی نے اندر کا ماحول بہت سرعت سے تبدیل کیا تھا۔ عدینہ نے کھل کر سانس لیا۔ ایک دم ہی اسے پیاس کی شدت محسوس ہوئی۔ سائیڈ میز پر رکھی پانی کی بوتل کب کی ختم ہو چکی تھی۔ عدینہ خالی بوتل اٹھا کر باہر نکل آئی۔ اس کے قدم باورچی خانے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ باورچی خانے کے بالکل ساتھ آپا صالحہ کا کمرہ تھا۔

گرمی کی شدت کی وجہ سے ان کے کمرے کی کھڑکیاں اور دروازہ کھلا ہوا تھا۔ عدینہ کو یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ آپا صالحہ نے کمرے کا واحد پنکھا بھی بند کر رکھا تھا۔ عدینہ ٹھٹک کر رک گئی۔ پسینے میں بھیگی ہوئی آپا صالحہ تہجد کے نفل پڑھ رہی تھیں۔

"لگتا ہے آپا کا بھی دماغ چل گیا ہے۔ اتنی گرمی میں پنکھا بند کیے نوافل پڑھ رہی ہیں۔" وہ سوچتی ہوئی کچن کی طرف بڑھ گئی۔ فریج سے پانی کی بوتل نکال کر پہلے دو گلاس پانی کے پیے اور پھر باقی رات کے لیے بوتل ہاتھ میں پکڑے وہ جیسے ہی پلٹی' آپا صالحہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اونچی آواز میں رو رہی تھیں۔ رات کے سناٹے میں ان کے رونے کی آواز سے ماحول میں عجیب سی کیفیت طاری تھی۔ عدینہ کے دل کو کچھ ہوا۔

"اے اللہ میں نے اپنے نفس پر بہت ظلم کیا تھا۔ تیرے علاوہ کوئی میرے گناہ نہیں بخش سکتا۔ اے اللہ مجھ پر رحم فرما' مجھے بخش دے۔ یقیناً" تو بخشنے والا اور

رحم کرنے والا ہے۔" وہ گڑگڑا کر دعا مانگ رہی تھیں۔

"اے اللہ میری دانستہ اور غیر دانستہ طور پر کی گئی غلطیوں کو درگزر کردے.... اے اللہ قیامت والے دن نامہ اعمال دائیں ہاتھ میں پکڑانا۔" آپا صالحہ کی دعاؤں کی فہرست خاصی لمبی تھی' عدینہ اکتا کر اپنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"آپا کی دعاؤں میں بھی لگتا ہے کوئی اثر نہیں' ورنہ ہر روز ان کے ساتھ بھی ایک نیا حادثہ نہ ہوتا۔" عدینہ نے تکیے پر سر رکھا اور لیٹ گئی' اسے پتا ہی نہیں چلا' کب اس کی آنکھ لگی تھی فجر کی اذان کی آواز سے اس کی آنکھ کھلی تھی۔

"عبداللہ...." اس کے دل نے اسے دھوکا دیا۔ وہ فوراً" چپل پہن کر باہر نکل آئی۔ سامنے مونا لوٹا پکڑے بے بے کو وضو کروا رہی تھی۔ عدینہ کو شرمندگی کا احساس ہوا۔ اسے پتا ہی نہیں چلا' کب مونا نے اس کی ساری ذمے داریاں ایک ایک کرکے سنبھال لی تھیں۔

"آج اذان کس نے دی ہے؟" عدینہ نے وضو کرکے مونا کو مخاطب کیا جو تولیے کے ساتھ منہ صاف کر رہی تھی۔

"ابوبکر نے...." مونا نے اپنے فرسٹ کزن کا نام لیا۔ جسے سنتے ہی عدینہ کا دل مایوسی اور افسردگی سے بھر گیا۔ اس دن وہ فجر کی نماز پڑھ کر سوئی نہیں تھی۔ جمعہ کا دن تھا۔ آج بہت عرصے کے بعد عدینہ نے بڑے اہتمام اور فرصت سے شاور لیا اور اپنا نیا جوڑا پہن کر رحل قرآن پاک اٹھایا۔ جو عبداللہ کی والدہ نے اسے ایف ایس سی میں ٹاپ کرنے پر عبداللہ کے تحفہ کی حیثیت سے دیا تھا۔ وہ قرآن پاک اٹھا کر آپا صالحہ کے مدرسے کے طور پر مختص کیے ہال میں چلی آئی' وہاں پہلے سے....

تیس چالیس بچیوں نے بڑی حیرت سے اسے اندر آتے دیکھا۔ اس سے پہلے وہ صرف ختم القرآن کی کسی محفل میں ہی خصوصی طور پر آیا کرتی تھی۔ آپا صالحہ نے بھی سپاٹ نظروں سے اسے دیکھا اور ایک بچی کی تجوید درست کروانے لگیں۔

عدینہ آہستگی سے چلتی ہوئی آپا کی سب سے سینئر حافظہ.... معلمہ باجی مریم کے پاس آن بیٹھی۔ جو اس وقت کسی بچی سے حفظ شدہ پارہ سننے میں مصروف تھیں۔ انہوں نے چونک کر عدینہ کو دیکھا اور تھوڑا سا پرے ہٹ کر اسے آرام اور اطمینان سے بیٹھنے کے لیے جگہ فراہم کی۔

"السلام علیکم مریم باجی...." عدینہ نے جیسے ہی انہیں فارغ دیکھا تو جھٹ سے سلام کیا۔

"وعلیکم السلام کیسے آنا ہوا عدینہ....؟" مریم باجی نے حیرانی سے آپا صالحہ اور مونا کے حیران چہرے دیکھے۔

"میں قرآن پاک حفظ کرنا چاہتی ہوں۔" عدینہ کے منہ سے نکلنے والے الفاظ پر آپا صالحہ نے فوراً" ہی اپنا سر جھکا لیا' جیسے وہ اپنے چہرے کے تاثرات سب سے چھپانا چاہتی ہوں۔

"لیکن تمہاری میڈیکل کی تعلیم؟" مریم باجی حیران ہوئیں۔

"سب سے اہم دینی تعلیم ہے اور دنیا کا کوئی بندہ دنیاوی تعلیم کی وجہ سے اسے حاصل کرنے سے مجھے منع نہیں کرسکتا۔" عدینہ کے لہجے میں موجود ناگواری کو محسوس کرکے مریم باجی سنبھل کر بیٹھ گئیں۔

"یہ تو بہت بڑی سعادت کی بات ہے عدینہ.... میں تمہیں اس سے روک تو نہیں رہی۔" انہوں نے نرم انداز سے اسے جواب دیا۔ "چلو اللہ کا نام لے کر شروع کرو' اللہ تمہیں مزید ہمت دے۔" انہوں نے پہلے سبق کا آغاز کیا۔ اس دن کے بعد عدینہ کو سونے کے لیے کسی بھی قسم کی سلیپنگ پلز کا سہارا لینا نہیں پڑا۔

☼ ☼ ☼

"فزکس' کیمسٹری' بائیولوجی...." بڑے ابا فہرست میں لکھی ان کتابوں کے نام پڑھ کر اٹک گئے۔ انہوں نے فوراً" چشمہ لگا کر دوبارہ لسٹ پر نظر دوڑائی اور پھر

الجھن بھرے انداز سے اپنی بیگم کو دیکھا جو اس وقت اکتائے ہوئے انداز میں کھڑی تھیں۔

"واپسی پر ڈرائیور سے کہیے گا' فرسٹ ایر کی یہ تمام کتابیں لیتا آئے۔" انہوں نے مصروف انداز سے کہا اور لاؤنج کے صوفے پر رکھے اخبارات سمیٹنے لگیں۔

"یہ کس کی بکس ہیں۔" بڑے ابا نے حیرانی سے اپنی بیگم کا اکتایا ہوا چہرہ دیکھا۔

"ظاہر ہے اوریدا کی ہی ہو سکتی ہیں' اب میں تو داخلہ لینے سے رہی۔"

ان کے بے زار انداز پر وہ بے ساختہ ٹھٹکے۔

"اب کیا وہ پری میڈیکل میں ایڈمیشن لے رہی ہے؟" ان کا استہزائیہ انداز بڑی اماں کو تپا گیا۔

"کیوں... اس کا پری میڈیکل پڑھنا منع ہے کیا؟" بڑی اماں کا جب بی پی ہائی ہوتا تو وہ کسی کا بھی لحاظ نہیں کرتی تھیں اور ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی تو ڈاکٹر جلال نے انہیں فشار خون کی بلند سطح سے آگاہ کیا تھا۔ اس لیے وہ بھی ان کا تلخ لہجہ سننے پر مجبور تھے۔

"میں نے ایسا کب کہا۔" بڑے ابا متحمل انداز سے گویا ہوئے۔

"انداز تو آپ کا ایسا ہی تھا۔" بڑی اماں نے منہ بناتے ہوئے لاؤنج کے پنکھے کی اسپیڈ تیز کی۔

"یہ احمقانہ مشورہ یقیناً" اس کے بے وقوف باپ نے دیا ہو گا۔" انہوں نے طنزیہ انداز سے کہتے ہوئے لسٹ اپنی جیب میں رکھی۔

"اس کا بے وقوف باپ آپ کا بھی کچھ لگتا ہے۔ پتا نہیں کیوں ہمیشہ ہی آپ کو یاد دلانا پڑتا ہے۔" ان کی بیگم کے ماتھے کا گہرا بل ان کے اندرونی جذبات کی بھرپور عکاسی کر رہا تھا۔

"بہرحال اپنی پوتی کو ایک دفعہ پھر سمجھالیں' کہیں باپ کی جذباتی باتوں میں آکر ایف ایس سی میں ہی چار سال نہ لگا دے' اس لیے اب بھی موقع ہے اپنی پسند کے آرٹس کے سبجیکٹس رکھ لے۔" ڈاکٹر جلال جاتے جاتے اپنے مخصوص اکھڑے لہجے میں مشورہ دینا نہیں بھولے تھے۔ اوریدا کی بدقسمتی تھی کہ اس نے یہ مشورہ خود اپنے ہوش و حواس میں سن لیا تھا۔

"سن لیا نا' تمہارے دادا کیا ارشاد فرما گئے ہیں۔" بڑی اماں کا لہجہ خاصا تلخ اور طنزیہ تھا۔ "اب اپنے باپ کو ان کے سامنے شرمندہ مت کروا دینا۔" انہوں نے رہی سہی کسر بھی پوری کر دی تھی۔ اوریدا نے یوں مجرمانہ انداز سے سر جھکا دیا' جیسے پری میڈیکل پڑھنے کا بہت بڑا جرم کر لیا ہو۔

"اس دفعہ ڈٹ کر محنت کرنا' اپنے ابا کا نہ سہی... اس بینش کا منہ تو ضرور ہی بند کروا دینا۔" انہوں نے جھنجلا کر اوریدا کی طرف دیکھا جو اپنے ناخنوں پر لگی نیلے رنگ کی نیل پالش کو دوسرے ہاتھ کے ناخنوں سے کھرچ رہی تھی در حقیقت وہ نظریں نیچی کیے بمشکل بڑے ابا کی باتوں کو ہضم کرنے میں ہلکان ہو رہی تھی اس کی خاموشی بڑی اماں کو الجھن میں مبتلا کر گئی۔

"سن لیا نا... میں نے کیا کہا ہے؟" بڑی اماں نے اس کی ٹھوڑی کے نیچے انگلی رکھ کر چہرہ اوپر کیا۔ اوریدا کی آنکھوں میں ایکا ایکی آنسو ابھرے۔ "اب تمہیں کیا ہوا؟" بڑی اماں کا دل موم کی طرح پگھلا۔

"یہ بڑے ابا میرے لیے ہمیشہ اتنے انسلٹنگ دے میں ہی کیوں بات کرتے ہیں۔" وہ بجھے بجھے سے انداز سے گویا ہوئی' بڑی اماں کو اس پر ایک دم ہی پیار آیا۔

"یہ سب اس بینش کی لگائی ہوئی آگ ہے' جس میں اتنے سالوں سے ہم جل رہے ہیں۔" بڑی اماں کی آواز سہمی ہوئی سرگوشی کی طرح اوریدا کی سماعتوں تک پہنچی۔ اوریدا نے حیرانی سے بڑی اماں کا ضبط سے لال ہوتا چہرہ دیکھا جو ان کے اندر ہونے والی اکھاڑ پچھاڑ کی غمازی کر رہا تھا۔ ان کے بوڑھے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ وہ آج بہت ٹوٹی ہوئی لگ رہی تھیں۔

"بیگم صاحبہ! منشی پوچھ رہا ہے' ختم کی دیگیں کس مدرسے میں بھجوانی ہیں۔" بوا رحمت بوجھل قدموں سے لاؤنج میں داخل ہوئیں۔

"جہاں مرضی بھجوا دو بوا' میرا دل آج ٹھکانے نہیں

ہے۔" اوریدا نے پریشانی سے بڑی اماں کا چہرہ دیکھا' رندھا گلا' ڈبڈباتی ہوئی چھلک پڑنے کو بے تاب آنکھیں۔ کمرے کی بوجھل فضا میں ان کی سسکی گونجی۔

"بڑی اماں۔۔۔ آپ کو کیا ہوا ہے؟" اوریدا نے نرمی سے ان کے بوڑھے ہاتھوں کو پکڑ کر اپنی محبت کی حرارت بخشی۔

"کچھ نہیں بیٹا۔۔۔" ان کی بھرائی ہوئی آواز اوریدا کو گہرے دکھ سے ہم کنار کر گئی۔

"بوا! اسٹور روم کی صفائی کروادی۔" انہوں نے ایک دم ہی خود کو سنبھالا۔

"جی بڑی بیگم صاحبہ۔۔۔"

"چلو پھر پرانے صندوقوں سے لحاف نکلوا کر انہیں دھوپ لگوائیں۔" بڑی اماں نے خود کو مصروف رکھنے کے لیے ایک مشغلہ تلاش کر ہی لیا تھا۔ اس سے پہلے کہ وہ اٹھتیں' لاؤنج میں داخل ہوتے سرمد نے بڑے پرجوش انداز سے سب کو سلام کیا۔ اوریدا کی طرف دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں کئی جگنو ایک ساتھ اتر آئے۔ بڑی اماں نے چونک کر اپنے بڑے نواسے کا چہرہ دیکھا۔ بلیک جینز پر پنک ٹی شرٹ پہنے وہ خاصا فریش لگ رہا تھا۔ اوریدا کی آمد کے بعد سے وہ باقاعدگی سے نیلی کوٹھی کے چکر کاٹنے لگا تھا۔

"طیبہ نہیں آئی تمہارے ساتھ۔۔۔" بڑی اماں نے متلاشی نگاہوں سے اس کے پیچھے جھانکا۔ آج کے دن ان کی بیٹی نیلی کوٹھی کا ایک چکر ضرور لگاتی تھیں۔ دونوں ماں بیٹی ماضی کے ایک دکھ کا کئی گھنٹے بیٹھ کر سوگ مناتیں اور پھر طیبہ' جلال صاحب کی آمد سے پہلے ہی حویلی لوٹ جاتیں۔ دونوں باپ بیٹی کا تعلق عجیب سا تھا۔ بڑے ابا جتنی شدت سے طیبہ کے منتظر رہتے' وہ اتنا ہی ان سے اکتائی پھرتی تھیں۔

"ان ہی کا تو بتانے آیا ہوں بڑی اماں۔" سرمد نے اوریدا کے بالکل سامنے رکھے صوفے پر بیٹھتے ہوئے لاپروائی سے جواب دیا۔

"خیریت تو ہے نا؟" بڑی اماں کا ننھا منا سا دل سہم سا گیا۔

"جی اماں۔۔۔ خیریت ہی ہے' بس رات سے امی کی طبیعت ٹھیک نہیں' ہلکا ہلکا بخار چل رہا ہے۔ اس لیے نہیں آسکیں۔" سرمد کی اطلاع پر وہ بے چین ہوئیں۔

"تو ٹھیک ہے' تم مجھے آج حویلی لے چلو۔" انہوں نے "آنا" فانا" ہی پروگرام بنایا۔ سرمد کے ساتھ ساتھ اوریدا نے بھی حیرانگی سے انہیں دیکھا' وہ کہیں بھی جانے سے حتی الامکان کتراتی تھیں۔

"وہ تو میں آپ کو لے جاؤں گا بڑی اماں' لیکن اگر آپ امی کی بیماری کے خیال سے کہہ رہی ہیں تو تشویش کی کوئی بات نہیں' ویسے ہی موسمی بخار ہے انہیں۔" وہ بہت نرم نگاہوں سے بڑی اماں اور اوریدا کو دیکھ رہا تھا۔

"طیبہ خیال بھی تو نہیں رکھتی اپنا۔ کسی اچھے ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا تھا اسے۔" بڑی اماں کو اپنی اس بیٹی سے بے تحاشا محبت تھی۔ اس کا اندازہ ان کی پریشانی سے بخوبی لگایا جاسکتا تھا۔

"بڑی اماں وہ خود اتنی اچھی ڈاکٹر ہیں اور ایک ڈاکٹر کو کیسے میں دوسرے کے پاس جانے کا مشورہ دے سکتا ہوں۔" سرمد کی بات پر اوریدا کو خوش گوار حیرت کا جھٹکا لگا۔ "طیبہ پھپھو ڈاکٹر ہیں؟ کسی نے بتایا ہی نہیں؟" اس کے منہ سے بے اختیار پھسلا تو سرمد کے چہرے پر پھیلنے والی مسکراہٹ بڑی فطری تھی۔

"کیوں۔۔۔ تمہیں کسی نے نہیں بتایا کیا؟" وہ الٹا اسی سے پوچھ رہا تھا۔

"اس گھر میں تو بس ایک ہی عورت کو ڈاکٹر سمجھا جاتا ہے اور اس کی راج دھانی کے نیچے کسی اور کا چراغ کیسے جل سکتا ہے بھلا؟" بڑی اماں جل کر بولیں تو اوریدا کے ساتھ ساتھ سرمد کو بھی بے ساختہ ہنسی آگئی۔ وہ دونوں ہی ان کا اشارہ ایک لمحے میں سمجھے تھے۔ اتنے تلخ لہجے میں وہ صرف اپنے دیور کی بیٹی بینش کا ہی ذکر کر سکتی تھیں۔

"سرمد! تم اوریدا کے پاس بیٹھو' میں ذرا بوا کے ساتھ چائے پانی کا بندوبست کرکے آتی ہوں۔" بڑی

اماں کا موڈ کافی حد تک تبدیل ہو چکا تھا۔ وہ گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر بمشکل اٹھیں سرمد نے آگے بڑھ کر انہیں اٹھنے میں مدد کی اور اگلے ہی دو منٹوں میں وہ کچن میں تھیں۔

"کیا تمہیں واقعی ہی نہیں پتا کہ میری ای نے بھی میڈیکل پڑھا ہے؟" سرمد ابھی بھی بے یقین نظروں سے اوریدا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

"نہیں۔۔۔" اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

"کیا ماموں تیمور نے بھی کبھی نہیں بتایا؟" سرمد کے سوال پر اوریدا پر اسی لمحے یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ بابا بڑی اماں اور بڑے ابا کے علاوہ کسی کا بھی خود سے ذکر نہیں کرتے تھے' البتہ اس کے سوالوں کے جواب میں مختصراً" کوئی نہ کوئی بات سرسری سے لہجے میں ضرور کہہ دیتے تھے۔

"تم ہماری حویلی میں کیوں نہیں آتی ہو اوریدا؟" سرمد نے اس کے چہرے پر ایک گہری نظر ڈالتے ہوئے ہلکا سا جھجک کر سوال کیا۔

"کبھی کسی نے انوائیٹ ہی نہیں کیا۔" اس نے ناک چڑھا کر صاف گوئی سے کہا تو سرمد بے اختیار ہنس پڑا۔ "تو چلو میں اب انوائیٹ کر رہا ہوں تمہیں' بولو کب آؤ گی؟" اس کے سوالیہ انداز پر اوریدا نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

"جس دن بڑی اماں کہیں گی' میں بھی چل پڑوں گی۔"

"وہ دن تو پھر کبھی نہیں آئے گا۔" وہ مایوس ہوا۔ "بڑی اماں تو چار پانچ سال کے بعد ہی کھڑے کھڑے چکر لگاتی ہیں۔"

"تو طیبہ پھپھو بھی تو صرف چند گھنٹوں کے لیے ہی آتی ہیں۔" اوریدا نے فوراً" ہی یاد دلایا۔ اس سے پہلے کہ سرمد اس کی بات پر کوئی تبصرہ کرتا' لاؤنج کا دروازہ کھلا اور سنجیدہ سے انداز سے ارصم اندر داخل ہوا' وہ سرمد کو دیکھ کر ہلکا سا حیران ہوا اور اگلے ہی لمحے اس سے پرجوش انداز سے گلے ملنے لگا۔ سرمد اس سے بڑا تھا' لیکن دونوں کی خوب دوستی تھی۔ سرمد نے گلے ملتے ہوئے چونک کر اوریدا کے چہرے پر پھیلی بے ساختہ خوشی کو محسوس کیا' وہ ہلکی سی الجھن کا شکار ہوا۔

"میرا فوجی فاؤنڈیشن میں ایڈمیشن ہو گیا ہے۔" اس نے سرسری لہجے میں اوریدا کو وہ اطلاع دی جس کے لیے وہ اتنے دنوں سے شدت سے منتظر تھی۔

"ریلی۔۔۔" وہ پرجوش انداز سے بے اختیار کھڑی ہو گئی۔ "میں بڑی اماں کو بتا کر آتی ہوں۔" اوریدا سے خوشی سنبھالے نہیں جا رہی تھی۔ اس نے فوراً" ہی کچن کی طرف دوڑ لگائی۔ وہاں بڑی اماں کھڑی دو ملازموں کو ہدایات دے رہی تھیں۔

"بڑی اماں۔۔۔ ارصم کا پنڈی میں ایڈمیشن ہو گیا۔" اس کا جوش و خروش دیدنی تھا۔ بڑی اماں ٹھٹک سی گئیں۔ "لیکن بینش تو اس دن لاہور کا پہاڑا پڑھ رہی تھی' وہ اپنے فیصلے سے کیسے ہٹ گئی؟"

بڑی اماں کے لہجے میں حیرت کے بجائے تشویش جھلک رہی تھی اور شام ہونے تک اوریدا کو بھی پتا چل گیا تھا کہ انہوں نے ارصم کو اس شرط پر وہاں ایڈمیشن لینے کی اجازت دی تھی کہ وہ گھر کی بجائے ہوسٹل میں رہے گا۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے ہوسٹل میں رہنے کا سن کر اوریدا کے ارمانوں پر ڈھیروں ڈھیر مایوسی کی اوس گر گئی۔ اسے آنٹی بینش سے ایک دم ہی چڑ سی محسوس ہوئی۔

✡ ✡ ✡

بختاور بیگ کی کمپیوٹر سائنسز ڈیپارٹمنٹ کے ہاشم رضا کے ساتھ پہلی ملاقات بہت عجیب سے واقعے کے ساتھ ہوئی تھی۔ وہ اور نیلم دونوں بوٹینیکل گارڈن کی طرف جا رہی تھیں' جب انہوں نے ایگری کلچر ڈیپارٹمنٹ کے کچھ لڑکوں کو ایک معذور کتے کے ساتھ اٹھکھیلیاں کرتے دیکھا' کتا خاصا لاغر اور کمزور سا تھا۔ اس کی رال بہہ رہی تھی اور موڑ پر بیٹھے یونی ورسٹی شٹل (بس) کا انتظار کرتے لڑکوں کو شرارت سوجھی۔ ایک بدتمیز سے لڑکے نے چھوٹا سا پتھر گھما کر اس کتے کو دے مارا' وہ خوف زدہ انداز سے دوڑا' اس کا

ایک پاؤں زخمی تھا' وہ لنگڑا کر جب بھاگنے کی کوشش کرتا تو باقی لڑکے اس کی بے بسی پر قہقہہ لگاتے اور انجوائے کرتے۔

کچھ فاصلے پر کھڑی بختاور اور نیلم کا دل دکھ کے گہرے احساس سے بھر گیا۔ اسی وقت یونی ورسٹی شٹل نمودار ہوئی اور سارے لڑکے اس کی طرف بھاگتے بھاگتے ہوئے ایک لڑکے نے پھر شرارت سے ایک نوکیلا پتھر اسی کتے کی طرف اچھالا تھا جو ٹھیک اس کے زخمی پاؤں پر جا لگا۔ کتا تکلیف کے گہرے احساس سے دہرا ہو کر زمین پر بیٹھ گیا۔

"گھٹیا انسان۔" بختاور نے بلند آواز میں اس لڑکے کو کوسا' جو شٹل کے پچھلے دروازے سے اندر داخل ہو چکا تھا۔

"وہ نو۔ یور لٹل سول۔" ہاشم کی بس سے اترتے ہی فٹ پاتھ پر بیٹھے اس میلے کچیلے کتے پر نظر پڑی۔ وہ فوراً ہی اس کی تکلیف کا اندازہ کر چکا تھا۔

ہاشم نے سفید شرٹ کے ساتھ بلیک پینٹ پہن رکھی تھی' وہ خاصا دراز قد تھا۔ وہ پریشان انداز سے سڑک کے دائیں جانب بیٹھے زخمی کتے کی طرف بڑھا' وہ تھوڑا سا ڈر کر پیچھے ہٹا۔ ہاشم نے اسے محبت سے پچکارا' اور محبت کی زبان تو دنیا کا ہر انسان اور ہر جانور سمجھ سکتا ہے۔ ہاشم نے جلدی سے اسے آہستگی سے اٹھایا۔ وہ شاید اسے ویٹرنری اسپتال لے کر جانا چاہتا تھا۔ جہاں اس کے زخم کی مرہم پٹی ہو سکے۔

اس کے ہاتھ میں کتابوں کا ایک بھاری بھر کم تھیلا تھا' جسے سنبھالنا اس کے لیے دشوار ہو رہا تھا۔ اس نے دائیں بائیں مدد طلب نگاہوں سے دیکھا۔ دور ایک لڑکوں کا گروپ اسے کراہت آمیز انداز سے دیکھ رہا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھیں کہ اتنا ہینڈسم اور اسمارٹ بندہ اس طرح کے جانور کو بھی اٹھا سکتا ہے۔

"کیا ہم آپ کی ہیلپ کر سکتے ہیں۔؟" بختاور اس کی مشکل آسان کرنے کے لیے آگے بڑھی۔

"پلیز میری یہ بکس اپنے پاس رکھ لیں' میں کل آپ سے کولیکٹ کر لوں گا۔" ہاشم کے دوستانہ انداز پر بختاور نے۔ جھجکتے ہوئے اس سے تھیلا پکڑ لیا اور اسے پکڑتے ہی وزنی ہونے کا احساس ہوا۔

"آپ کہاں سے کولیکٹ کریں گے۔؟ نیلم نے پریشانی سے اس مہربان لڑکے کی طرف دیکھا' جو سڑک پر کھڑا کسی گاڑی والے کو ہاتھ ہلا کر رکنے کا اشارہ کر رہا تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں موجود میلے کچیلے جانور کی وجہ سے کوئی بھی اسے لفٹ دینے کو تیار نہیں تھا۔

"کیمسٹری ڈیپارٹمنٹ میں ہوتی ہیں ناں آپ لوگ۔؟ اس کے سادہ سے انداز پر دونوں نے حیرانگی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ انہیں گمان بھی نہیں تھا کہ وہ انہیں جانتا ہوگا۔

"میں سامنے کمپیوٹر سائنسز ڈیپارٹمنٹ میں ہوتا ہوں۔" اس نے مسکرا کر ان کی الجھن کو دور کیا۔ "اکثر آپ دونوں کو مریم ہال سے نکل کر ادھر جاتے دیکھا ہے۔" اس کا ڈیپارٹمنٹ مریم ہال (ہوسٹل) کے بالکل قریب تھا۔

"آپ کس ہال میں ہوتے ہیں۔؟ نیلم نے محض معلومات میں اضافے کے لیے دریافت کیا۔

"ابوبکر میں۔" وہ ایک ٹیکسی والے کو روک چکا تھا جو کچھ لڑکیوں کو ساز و سامان سمیت ہوسٹل چھوڑنے آیا ہوا تھا۔

"او کے صبح ان شاء اللہ آپ سے ڈیپارٹمنٹ میں ملاقات ہوگی۔" وہ ٹیکسی میں بیٹھ کر اس کتے کو اپنی گود میں بیٹھا چکا تھا۔ بختاور اور نیلم اس کے جذبہ ہمدردی سے خاصی متاثر ہو چکی تھی۔ انہوں نے گارڈن جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اب بھاری بھر کم کتابوں کا تھیلا اٹھائے بمشکل ہوسٹل میں اپنے کمرے تک پہنچیں۔ نیلم نے اندر داخل ہوتے ہی تھیلا چارپائی پر پھینکا' اور بیدردی سے پھینکنے کی وجہ سے بوسیدہ تھیلا پھٹا اور کتابیں بستر پر پھیل گئیں۔ ان کتابوں کو دیکھتے ہی بختاور کے حلق سے مسرت انگیز چیخ نکلی۔

"واؤ کیا زبردست انگلش لٹریچر کی کلیکشن ہے۔" وہ فوراً ہی پرشوق انداز میں کتابیں اٹھا اٹھا کر

دیکھنے لگی جبکہ نیلم نے برا سامنہ بنایا۔
"لگتا ہے کوئی پورا کا پورا فٹ پاتھ اٹھا کر لے آیا ہے۔" وہ ساری سیکنڈ ہینڈ خریدی گئی کتابیں تھیں۔
"اب صبح اس سے مانگنے مت بیٹھ جانا۔" نیلم نے اس کا بے تاب انداز دیکھ کر فوراً" وارننگ دی" بختاور جو دل ہی دل میں تہیہ کیے بیٹھی تھی' اس کے درست اندازے پر کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ اگلے ہی دن وہ دونوں لیب سے فارغ ہو کر اس کی تلاش میں پہنچ چکی تھیں۔ فوراً" ہی انہیں اپنی غلطی کا احساس ہوا کہ وہ دونوں ہی اس کے نام سے ناواقف تھیں۔
"آپ تھوڑا سا حلیہ بتائیں گی تو شاید ہم کچھ ہیلپ کردیں۔" اس ڈیپارٹمنٹ کے باہر بنے ہوئے لان میں دھوپ سینکتی دو لڑکیوں نے دوستانہ انداز سے ان کی مدد کرنے کی حامی بھرلی۔
"دراز قد ہیں' اسمارٹ سے' آئی تھنک فائنل ایئر کے اسٹوڈنٹ ہیں۔" نیلم کے بتائے ہوئے حلیے پر دونوں نے مایوسی سے سرہلایا۔
"ہاں فیئر سا کمپلیکشن ہے اور ہونٹوں کے پاس بھورا سا تل ہے۔" بختاور کے ذہن میں اچانک ہی ایک اور نشانی نمودار ہوئی۔
"ہاشم رضا کی بات تو نہیں کر رہیں آپ۔؟ جو ابوبکر ہال میں رہتے ہیں۔" ایک لڑکی نے بالکل درست اندازہ لگایا۔
"نام کا پتا نہیں۔" دونوں ہی ایک دم شرمندہ ہوئیں۔ "ہاں ابوبکر ہال میں ضرور رہتے ہیں۔"
"ارے۔ وہ ہیں۔" نیلم کی اپنے ڈیپارٹمنٹ سے نکلتے ہاشم پر اچانک ہی نظر پڑ گئی۔ وہ آج بادامی سے کلر کی پینٹ کے ساتھ ڈارک براؤن شرٹ پہنے ہوئے تھا۔
"اچھا۔" وہ دونوں لڑکیاں بے اختیار ہنسیں۔ "ان کو تو ہم مدر ٹریسا کا بھانجا کہتے ہیں۔ ہمارے ہی کلاس فیلو ہیں ہاشم رضا۔"
"ہائے ہاشم بھائی۔" ایک لڑکی نے ان کو دیکھ کر ہاتھ ہلایا تو وہ خوشگوار سی حیرت کا شکار ہوا۔

"یہ خواتین آپ کو تلاش کر رہی تھیں' لیکن ان کو آپ کا نام نہیں پتا تھا۔" ایک لڑکی نے ہنس کر بتایا۔
"پھر تو آپ لوگوں نے بہت تفصیل سے تعارف کروادیا ہو گا میرا۔" اس کے لبوں پر دوستانہ مسکراہٹ ابھری۔
"ابھی کہاں' ویسے بھی آپ کا تعارف اور رفاہی کاموں کی تفصیل اتنے مختصر وقت میں تو نہیں بتائی جاسکتی تھی۔" وہی لڑکی بے تکلفی سے بولی تو بختاور اور نیلم کو بہت جلد ہی اندازہ ہو گیا تھا کہ وہ اپنے ڈیپارٹمنٹ کا خاصا مشہور و معروف بندہ تھا۔ اس کے کلاس فیلوز شرارت میں اسے کبھی عبدالستار ایدھی اور کبھی مدر ٹریسا کا بھانجا کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ بے غرض ہو کر انسانیت کی خدمت کرنے پر یقین رکھتا تھا۔ اسی وجہ سے اکثر ہی مصروف رہتا' لیکن اس ملاقات کے بعد بختاور اور نیلم بھی اکثر اس کا ہاتھ بٹانے کے لیے پہنچ جاتیں' کبھی وہ بلڈ بینک کے لیے خون اکٹھا کر رہا ہوتا تو کبھی کسی مریض کے لیے فنڈ ریزنگ' ان ہی تمام ایکٹیوٹیز کے دوران ہاشم اور بختاور کب ایک دوسرے کے قریب آئے' انہیں پتا ہی نہیں چلا۔ دونوں کے دل کا تار کا ایک ساتھ فٹ ہو گیا تھا۔
"آپ مجھے کسی اور ہی سیارے کی مخلوق لگتے ہیں۔" ایک دن بختاور کے منہ سے نکلنے والے ان الفاظ پر وہ قہقہہ لگا کر ہنسا۔
"میں بچپن سے ایسا تھا' اور اکثر مجھے اپنا جیب خرچ یا لنچ بکس کسی بھکاری کو دینے پر امی ابو سے بہت ڈانٹ پڑتی تھی۔" وہ ایک دن بڑے مزے سے بختاور کو بتا رہا تھا۔
"امی تو اکثر سر پیٹ لیتی تھیں کہ ایسا ابنارمل بچہ ان کے خاندان میں کیسے پیدا ہو گیا۔" وہ ہنستے ہنستے اپنے بچپن کے کئی واقعات سنا جاتا تھا۔ بختاور خاموشی سے زیر لب مسکراتی ہوئی اسے سنتی چلی جاتی۔ اس کا دل کرتا تھا کہ پوری دنیا میں بس ہاشم رضا بولتا رہے اور وہ سر جھکائے اسے سنتی رہے۔ اسے اس بے غرض اور بے ضرر سے انسان سے نہ جانے کب اور کیسے محبت

ہو گئی تھی۔ جو انسانیت کی خدمت کا عزم لے کر پیدا ہوا تھا۔

"میرا دل کرتا ہے ایک بہت بڑا گھر بناؤں' جہاں بے سہارا' یتیم بچوں کو رکھوں۔" وہ اکثر باتیں کرتے ہوئے اسے ہوسٹل چھوڑنے چلا آتا۔

"پھر تم ورلڈ بینک میں جاب ڈھونڈوں یا الہ دین کا چراغ ڈھونڈو' کیونکہ تمہاری خواہشیں ایسے پوری نہیں ہو سکتیں۔" بختاور اسے مفت مشورے دیتی جسے وہ چہرے پر نرم مسکراہٹ سجائے سنتا رہتا۔

"میں ایک بہت اچھا ایجوکیشنل انسٹی ٹیوٹ بناؤں گا' جہاں غریب بچوں کو بالکل فری تعلیم دی جائے گی۔" ہر روز اس کے پاس ایک نیا عزم ہوتا۔

"ہاں ہاں جب تمہارا یتیم خانہ کامیابی سے چلنے لگے تو تم اسکولز کی پوری ایک چین بنانا۔" بختاور شرارت سے لقمہ دیتی۔

"تم دیکھنا بختاور بیگ' میں دنیا کو بدل دوں گا۔" وہ اس کے کسی بھی مذاق کو خاطر میں لائے بغیر بولتا جاتا۔

دونوں گھنٹوں دنیا جہان کے واقعات کو ڈسکس کرتے لیکن بھول کر بھی ان کی گفتگو کا دائرہ ذاتیات کی جانب نہیں مڑتا تھا اور پھر ایک دن ہاشم رضا اچانک ہی کہیں غائب ہو گیا' بختاور اور نیلم دونوں اس کے ڈیپارٹمنٹ کے ہزاروں چکر لگا چکی تھیں' لیکن اس کو تو لگتا تھا یا تو زمین کھا گئی یا آسمان نگل گیا۔

اس دور میں سیل فون صرف چند ایک بزنس مین لوگوں کے پاس ہوا کرتا تھا اور اسٹوڈنٹس اس نام کی کسی چیز سے کوسوں دور تھے۔ بختاور پریشانی کے عالم میں کئی دفعہ ٹیلی فون بوتھ سے ابوبکر ہال کے پی ٹی سی ایل نمبر ملاتی اور ریسپشن سے یہی پتا چلتا کہ ہاشم رضا ہوسٹل میں موجود نہیں۔

وہ ایسا دور تھا جب کچھ سبجیکٹس کی مارننگ کی اور چند ایک کے اسٹوڈنٹس زیادہ ہونے کی وجہ سے ایوننگ کلاسز بھی ہوا کرتی تھیں۔ ایگزام کا اینول سسٹم تھا اس لیے طلبا و طالبات پڑھائی کے ساتھ ساتھ خوب انجوائے بھی کرتے۔

ہوسٹل میں لڑکیوں کا مغرب کی اذان کے وقت واپس لوٹنا لازمی تھا اور رابطے کے طور پر ریسپشن ہال میں صرف ایک پی ٹی سی ایل فون موجود تھا' جس کے اردگرد لڑکیاں مکھیوں کی طرح بھنبھناتی رہتیں اور وہ فون بھی رات گیارہ بجے ہوسٹل وارڈن اٹھا کر لے جاتی یا اس کا تار نکال دیا جاتا۔

ہوسٹل میں ایک فون بوتھ تھا' جس پر کارڈ کے ذریعے کال کی جاسکتی تھی لیکن اس پر بے تحاشا رش ہونے کی وجہ سے باری کافی دیر سے آتی تھی۔ اس لیے لڑکیوں کے پاس آپس میں رابطے کے لیے کافی وقت ہوتا یا پھر وہ ٹی وی ہال میں بیٹھ کر ڈرامے دیکھا کرتیں۔

"بختاور کیا ہو گیا ہے تمہیں۔؟" وہ اس دن ہوسٹل کی سیڑھیوں پر بیٹھی آسمان پر موجود تنہا چاند کو افسردگی سے دیکھ رہی تھی۔ جب میس ہال سے نکل کر نیلم بھی اس کے پاس آن بیٹھی۔

"تم کہتی تھیں ناں ہاشم رضا' آسمان کا روشن ستارہ ہے' دیکھو وہ ستارہ کہیں ڈوب گیا ہے۔" نیلم نے اس کی بات پر چونک کر دیکھا' آسمان پر واقعی تاروں کی بھرمار تھی' لیکن وہ سارے کے سارے مدھم اور بجھے بجھے سے تھے' سب سے روشن ستارہ کہیں گم ہو چکا تھا اور بختاور کو ایسا لگ رہا تھا کہ وہ روشن ستارہ واقعی ہاشم تھا جو آسمان کی وسعتوں میں کہیں غائب ہو چکا تھا۔

✡ ✡ ✡

عدینہ کی بے چین روح کو قرآن پاک حفظ کرنے سے خاصا قرار مل رہا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے کوئی بھٹکی ہوئی روح اپنے مدار میں داخل ہو چکی ہو۔ آپا صالحہ ابھی تک اس سے خفا تھیں اور انہوں نے اس سے بات چیت بالکل بند کر رکھی تھی۔ ہاں بے بے اور مونا کے ساتھ اس کے تعلقات بحال ہو چکے تھے۔

"کیا واقعی آپ نے ڈاکٹر بننے کا ارادہ دل سے نکال دیا ہے۔؟" مونا کو نہ جانے کیوں یقین نہیں آرہا تھا اس لیے وہ دو ماہ کے بعد پھر اس سوال کو دہرا رہی تھی۔ اسے معلوم تھا کہ آپا صالحہ کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی کا بھی یہی سب سے بڑا خواب تھا۔

"پتا نہیں میں نے سب کچھ اللہ پر چھوڑ دیا ہے۔" اس نے سادگی سے کہا۔ "اللہ بہترین فیصلے کرنے والا ہے۔"

"اب تو آپ کا نام بھی کالج سے کٹ چکا ہوگا۔" مونا کا بس نہیں چل رہا تھا کس طرح سے ہاتھ پکڑ کر اسے دوبارہ اسی کالج میں چھوڑ آئے۔

"تم ٹھیک کہہ رہی ہو' میرے کلاس فیلوز تو بہت آگے نکل چکے ہوں گے۔" وہ پھیکے سے انداز سے مسکرائی۔

"آپ کو اپنے اس فیصلے پر افسوس نہیں ہوتا۔؟"

مونا نے ہلکا سا جھجک کر اس سے پوچھا تو عدینہ بے ساختہ انداز میں گویا ہوئی۔ "ہرگز نہیں۔"

"لیکن آپا صالحہ کا دکھ تو کسی طرح بھی کم ہونے میں نہیں آرہا۔" مونا کو سب کے غم ایک ساتھ ستاتے تھے۔ عدینہ نے اس کی بات پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ خاموشی سے چلتے ہوئے چھت کی اس طرف آگئی تھی۔ جہاں عبداللہ کا گھر صاف دکھائی دیتا تھا۔ نیچے جھانکتے ہی اسے جھٹکا سا لگا۔ ایک پک اپ میں عبداللہ کی والدہ کا سامان رکھا جا رہا تھا۔ عدینہ کو ایسا لگا جیسے کوئی اس کا دل آرے سے کاٹ رہا ہو' اس نے متوحش نظروں سے مونا کو دیکھا' مونا نے جس طرح سے اس سے نظریں چرائی تھیں اس سے صاف ظاہر تھا کہ وہ یہ بات جانتی تھی۔

"عبداللہ کی والدہ کہاں جا رہی ہیں۔؟" اس کے چہرے پر زلزلے کی سی کیفیت تھی۔

"راولپنڈی' اپنے بھائیوں کے پاس۔" مونا کی آہستگی سی دی گئی اطلاع پر عدینہ کے چہرے پر صدمے کا تاثر نمایاں ہوا۔ اس کا دل بند ہونے والا تھا۔

"لیکن کیوں۔؟" عدینہ اس سوال کا جواب جانتی تھی' لیکن بعض دفعہ انسان جانتے بوجھتے بھی اس آس پر کوئی سوال پوچھتا ہے' شاید اس کا وہ جواب نہ ہو جو اس نے سوچ رکھا ہے۔ وہ منڈیر سے مکمل طور پر جھکی ہوئی بے یقین نگاہوں سے گلی میں رکھے سامان کو دیکھ

رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کوئی اس کے دل کے تار ہاتھوں سے پکڑ کر بے دردی سے ادھیڑ رہا ہو۔

آج عبداللہ سے وابستہ وہ آخری رشتہ بھی اس سے دور جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے بے آواز آنسو بہنے لگے' یہ منظر اس کے لیے اس قدر تکلیف اور اذیت کا باعث بنے گا' مونا تو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔

''عدینہ باجی نیچے چلتے ہیں۔'' یہ واحد کام تھا جو اس وقت وہ کر سکتی تھی۔ عدینہ کی ضبط کی طنابیں چھوٹ گئی تھیں' وہ چھت کے فرش پر بیٹھی اب پھوٹ پھوٹ کر رو رہی تھی۔ اگلے دو دن اس نے پھر باقاعدہ سوگ میں گزارے تھے۔

اس سے اگلے دن عجیب سا واقعہ ہوا۔ سفید رنگ کے ململ کے کرتے کے ساتھ سفید رنگ کی ہی کاٹن کی شلوار پہنے ایک ضعیف مرد اور سرخ و سپید رنگت کی بوڑھی سی عورت ایک چھوٹے سے بیگ کے ساتھ ان کے گھر میں داخل ہوئے۔ اس خاتون کے چہرے کے نقوش آپا صالحہ کے چہرے سے خاصے ملتے جلتے تھے۔ عدینہ حیران سے انداز سے بیٹھ گئی۔ صحن میں اون کے گولے کے ساتھ الجھی آپا صالحہ کے چہرے پر بے ساختہ خوشی جھلکی۔ وہ بے اختیار کھڑی ہو گئیں۔

''ابا جی آپ۔'' آپا صالحہ کے ہاتھ سے اون کا گولا چھوٹا اور صحن میں پھسلتا چلا گیا۔ عدینہ نے زندگی میں پہلی دفعہ ان کو بے ساختہ ہنستے ہوئے اور خوش و خرم انداز سے کسی کو ملتے ہوئے حیرانگی سے دیکھا۔ بے بے کے جھریوں زدہ چہرے پر بھی شناسائی کے رنگ ابھرے۔ آپا صالحہ نہال انداز سے اس بوڑھی خاتون کا چہرہ مسلسل چوم رہی تھیں۔ ان کے چہرے پر پہلی چمک اور لہجے کی بشاشت عود کر آئی تھی۔

''بے بے یہ کون لوگ ہیں۔؟'' عدینہ نے ہوش سنبھالنے کے بعد پہلی دفعہ انہیں دیکھا تھا' ہمیشہ یہی سننے میں آتا تھا کہ آپا صالحہ کے بوڑھے والدین آزاد کشمیر کے کسی گاؤں میں رہتے ہیں' جہاں وہ عدینہ کے بچپن میں ہی کہیں ایک دفعہ انہیں ملنے گئی تھیں' لیکن انہوں نے کبھی بھی بھول کر بھی ان کے ہاں نہیں جھانکا تھا۔ عدینہ کو لگتا تھا آپا نے یونہی لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے ایک کہانی گھڑ رکھی ہے۔ ورنہ وہ کبھی تو انہیں ملنے آتے۔

''جھلی نہ ہو تو تیرے نانا اور نانی ہیں۔'' بے بے کی بات پر عدینہ کا منہ حیرت سے کھلا اور بند ہونا ہی بھول گیا۔ وہ سخت حیرت اور بے یقینی سے ان دونوں کو دیکھ رہی تھی' جن کے ہر انداز سے ٹپکتی اپنائیت' آنکھوں سے چھلکتی بے غرض محبت اس چیز کی گواہ تھی کہ آپا صالحہ ان ہی کی اولاد تھیں۔ بوڑھی خاتون بار بار آپا صالحہ کا ماتھا چوم رہی تھیں۔

''یہ مولوی رفیق کی پہلی بیوی کی اولاد ہے یا تمہاری بیٹی ہے؟'' بزرگ خاتون کے منہ سے نکلنے والے الفاظ عدینہ کی سماعتوں پر بم بن کر برسے۔ وہ ششدر انداز سے آپا صالحہ کا بوکھلایا ہوا چہرہ دیکھنے لگی جو عدینہ کے سامنے اس سوال پر بالکل ہی حواس باختہ ہو گئی تھیں۔ عدینہ کی آنکھوں میں بدگمانی' دکھ' اور شکوہ صاف پڑھا جا رہا تھا۔ اسے ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے کسی نے اسے مضبوط شکنجے میں جکڑ لیا ہو اور اس کی سانس حلق میں ہی پھنس کر رہ گئی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

نبیلہ عزیز

رقصِ بسمل

مادرا مرتضیٰ' عافیہ بیگم کی اکلوتی بیٹی ہے۔ فارہ کے ساتھ یونیورسٹی میں پڑھتی ہے۔ عافیہ بیگم اس کا اپنی سہیلیوں سے زیادہ ملنا جلنا پسند نہیں کرتیں۔ اس کے علاوہ بھی اس پر بہت ساری پابندیاں لگاتی ہیں جبکہ مادرا خود اعتماد اور اچھی لڑکی ہے۔ عافیہ بیگم اکثر اس سے ناراض رہتی ہیں۔ البتہ بی گل اس کی حمایتی ہیں۔

فارہ اپنی ثمینہ خالہ کے بیٹے آفاق یزدانی سے منسوب ہے۔ دو سال پہلے یہ نسبت آفاق کی پسند سے ٹھہرائی گئی تھی مگر اب وہ فارہ سے قطعی لاتعلق ہے۔

منزہ' ثمینہ اور نیرہ کے بھائی رضا حیدر کے دو بچے ہیں۔ تیمور حیدر اور عزت حیدر۔ تیمور حیدر بزنس مین ہے اور بے حد شان دار پرسنالٹی کا مالک ہے۔ ولید رحمٰن اس کا بیسٹ فرینڈ ہے۔ اس سے حیثیت میں کم ہے مگر دونوں کے درمیان اسٹیٹس حائل نہیں ہے۔ نیرہ کے بیٹے سے فارہ کی بہن حمنہ بیاہی ہوئی ہے۔

عزت اپنی آنکھوں سے یونیورسٹی میں بم دھماکا ہوتے دیکھ کر اپنے حواس کھو دیتی ہے۔ ولید اسے دیکھ کر اس کی جانب لپکتا ہے اور اسے سنبھال کر تیمور کو فون کرتا ہے۔ تیمور اسے اسپتال لے جاتا ہے۔ عزت کے ساتھ یہ حادثاتی ملاقات ولید اور عزت کو ایک خوشگوار حصار میں باندھ دیتی ہے۔ تاہم عزت کھل کر اس کا اظہار کر دیتی ہے۔ ولید ٹال مٹول سے کام لے رہا تھا۔

آفاق فون کر کے فارہ سے شادی کرنے سے انکار کر دیتا ہے۔ فارہ روتی ہے۔ اشتیاق یزدانی' آفاق سے حد درجے خفا ہو کر اس سے بات چیت بند کر دیتے ہیں۔ آفاق مجبور ہو کر شادی پر راضی ہو جاتا ہے۔ فارہ دل سے خوش نہیں ہو پاتی۔ رضا حیدر' تیمور کو فارہ کی شادی کے سلسلے میں فیصل آباد بھیجتے ہیں۔ فارہ اپنی تاریخ میں مادرا کو بصد اصرار مدعو کرتی ہے۔

بائیسویں قسط

موبائل کی آواز پہ "تقریباً" سب ہی نے تیمور کی طرف دیکھا تھا۔
"باباجان کا فون ہے۔" تیمور نے نمبر دیکھتے ہوئے بتایا۔
"اٹینڈ کرو۔" آفاق نے "فوراً" مشورہ دیا۔
"ہوں۔" اس کی آواز بے حد سنجیدہ تھی۔
"عزت کہاں ہے۔؟" انہوں نے چھوٹتے ہی استفسار کیا تھا۔
اور تیمور نے بے ساختہ گردن موڑ کر سامنے صوفے پہ سرخ سوٹ میں ملبوس سر جھکائے بیٹھی عزت کی طرف دیکھا تھا۔ جواب ان کی نہیں رہی تھی۔ بلکہ پرائی ہو گئی تھی۔ اور رضا حیدر بے خبری میں استحقاق جما رہے تھے۔
"اس کی کسی فرینڈ کا برتھ ڈے ہے۔ وہ ساشا کے ساتھ اس کے گھر گئی ہے۔ شام تک آجائے گی۔"
"ڈونٹ وری۔" تیمور نے بڑے سکون سے بروقت بہانا پیش کیا تھا۔
"آج کے بعد میری اجازت کے بغیر وہ کہیں بھی نہیں جائے گی۔ اسے بتا دینا۔"
رضا حیدر نے کہہ کر یک دم کھٹاک سے فون بند کر دیا اور تیمور موبائل کو دیکھ کر رہ گیا۔
(اب کیا فائدہ باباجان ؟ حالانکہ اس وقت آپ کو اس کے پاس ہونا چاہیے تھا) ۔
"تیمور !" آفاق نے اسے گلاس ونڈو کے پاس کھڑے دیکھ کر مخاطب کیا۔
"ہوں۔!" اس نے بے دھیانی سے کہا۔
"خیریت۔؟" آفاق اٹھ کر قریب آگیا۔
"ہاں۔! باباجان عزت کا پوچھ رہے تھے۔" اس نے آہستگی سے سر جھکا کر کہا۔
"اٹس اوکے۔! تم اندر آؤ۔ عزت اور ولید کے ساتھ تصویریں بھی بنوانی ہیں۔ وکیل صاحب کہہ رہے ہیں کہ یہ زیادہ ضروری ہے۔" آفاق نے اس کے کندھے پہ ہاتھ رکھ کے تھپکا تھا۔ کیوں کہ تیمور' رضا حیدر کے فون کے بعد بے ساختہ ہی چپ اور کچھ اداس ہو گیا تھا۔
"آخر ماں باپ کے بغیر اتنا بڑا اقدام اٹھایا تھا اس نے۔ اور وہ بھی زندگی میں پہلی بار۔ پھر اس طرح تو ہونا ہی تھا۔
"آؤ یار۔ جب سب کچھ کر ہی لیا ہے تو پھر سوچوں میں ڈوبنے کا فائدہ۔؟"
"اب خود بھی مضبوط ہو۔ اور ان دونوں کو بھی رہنے دو۔ کیوں کہ اس سارے کام کے ذمہ دار تم ہو۔ سارا بوجھ تمہارے کندھوں پہ ہے۔ تم اپنے مقام پہ قائم رہے تو یہ جنگ بھی تمہاری اور اس جنگ کی جیت بھی تمہاری ہی ہو گی۔" آفاق نے اس کی ہمت بندھانے کے لیے اس کے کندھے پہ ہلکی سی تھپکی دی تھی اور تیمور نے طنزیہ انداز سے مسکراتے ہوئے سر جھکا دیا تھا۔
"ایسی بات نہیں ہے یار۔! میں ہمت نہیں ہار رہا۔ نہ ہی کوئی پچھتاوا ہے۔ میں تو بس زندگی کے اس اہم موڑ پہ آکر اس لیے چپ ہوں کہ ہمارے ماں باپ ہی ہمارے ساتھ نہیں ہیں۔" تیمور نے اپنی چپ اور اپنی اداسی کی وجہ بتائی تھی۔
"ہاں۔! یہ تو تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ میں تمہاری فیلنگز سمجھ سکتا ہوں' لیکن اس وقت تمہیں ہمت اور حوصلے سے کام لے کر آگے بڑھنا ہے۔ یوں ٹھہر جانے کا موقع نہیں ہے یہ۔"
آفاق نے بہت اچھے طریقے سے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔ اور تیمور مسکرا دیا تھا۔
"مجھے پتا ہے۔ یہ ٹھہر جانے کا موقع نہیں ہے۔ مجھے تو ابھی بہت آگے بڑھنا ہے۔ میرا سفر اور میری منزل میرے انتظار میں ہے۔" تیمور نے کہتے ہوئے غیر محسوس سے انداز میں ماورا کی طرف دیکھا تھا جو ولید کی کسی بات پہ ہنس رہی تھی اور تیمور نے پہلی بار اسے یوں کھل کے ہنستے دیکھا تھا ورنہ ہمیشہ وہ مسکرانے پہ ہی اکتفا کرتی تھی۔

"تیمور بھائی! آئیے ناں۔" قارہ نے اسے دیکھتے ہوئے دیکھ لیا تھا اور تیمور بے ساختہ چونک گیا تھا۔
"آ۔۔۔" پھر وہ دونوں ایک ساتھ چلتے اندر آگئے تھے۔
"یہ لیجیے۔ آپ کا نیگ۔" ولید نے پانچ ہزار روپے نکال کر ساشا کی طرف بڑھائے اور ساشا کی حیرت اور بے یقینی سے آنکھیں کھل گئی تھیں۔

"یہ کیا ہے۔؟" اس نے پوچھا۔
"نیگ۔" ولید بڑے سکون سے بولا۔
"کس کا۔؟" ساشا کو یقین نہیں آرہا تھا۔
"آپ کا۔ اور کس کا بھلا۔؟"
"رئیلی۔؟" ساشا نے پھر اشتیاق آمیز لہجے میں کہا۔
"اگر آپ کو اب بھی یقین نہیں آرہا تو میں یہ پیسے واپس اپنی جیب میں رکھ لیتا ہوں۔" اس نے بڑے اطمینان سے کہتے ہوئے پیسے دوبارہ اپنی جیب میں رکھنے چاہے تھے کہ ساشا یکدم جھپٹ پڑی تھی۔
"ارے نہیں نہیں! اب واپس رکھنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے یقین آچکا ہے کہ آپ مجھے نیگ دے رہے ہیں۔ اور یہ پیسے اب میرے ہی ہیں۔" اس نے بجلی کی سی تیزی سے پیسے اس کے ہاتھ سے جھپٹ کر اپنی مٹھی میں دبوچ لیے تھے۔
اور اس کی اس حرکت پہ ان کی چھوٹی سی محفل کشت زعفران بن گئی تھی' یہاں تک کہ عزت بھی بہت بے ساختہ ہنسی تھی۔
"ماشاء اللہ۔!" زبیدہ خاتون نے دل ہی دل میں اس کی بلائیں لے ڈالی تھیں۔
"اور یہ جگہ جہاں آپ تشریف فرما ہیں وہ اب میری ہے۔ لہٰذا آپ اپنے لیے کہیں اور نظر ثانی کرلیں تو بہتر ہوگا۔" ولید نے اب اسے عزت کے بائیں پہلو سے اٹھنے کا اشارہ دیا تھا۔
"ہیں۔؟" ساشا نے ایک دم ہونق بن کے دیکھا۔
"ہاں۔!" ولید نے اس سے زیادہ آنکھیں پھیلائی تھیں۔
"اب بہتر ہے کہ آپ شرافت سے اٹھ ہی جائیں۔" ماورا مسکرا کے بولی تھی اور سب کو مسکراتے دیکھ کر ساشا خاموشی سے کھڑی ہوگئی تھی' آخر مٹھی بھی تو اس نے گرم کی تھی اس لیے جگہ بھی اسی نے دینی تھی' اور ولید سر کھجا کے رہ گیا تھا۔
"ولید بھائی! آئیے ناں! ادھر بیٹھیے۔" قارہ نے اس کی پچویشن سمجھتے ہوئے اسے باقاعدہ آفر کی تھی۔
"اچھا۔! آپ کہتی ہیں تو بیٹھ جاتا ہوں۔" ولید بڑے معصوم سے انداز سے کہتا اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا تھا اور درمیانی ٹیبل کی دوسری سائیڈ سے گھوم کر عزت کے بائیں پہلو کی طرف آگیا' اور اس کے بیٹھتے ہی عزت بے اختیار اپنی جگہ پہ سمٹ سی گئی تھی۔ یہ اس کا ایک فطری عمل تھا جس پہ ولید اپنی مسکراہٹ ہونٹوں میں ہی دبا گیا تھا۔

"ہائے!" اس نے بیٹھتے ہی بے حد دھیمی آواز میں کہا جبکہ عزت نے چہرے کا رخ دوسری طرف موڑ لیا تھا۔
"تیمور صاحب! آپ بھی آجائیے۔" ولید نے جھجک کا چولا اتارنے کی پہلی سعی کی۔
"ہاں یار۔ تصویریں تو ہونی چاہیے ناں۔!" آفاق نے بھی لقمہ دیا۔
"نہیں پہلے آپ لوگ بنوالو۔" تیمور نے ٹالنے کی کوشش کی مگر کب تک آخر؟ بالآخر اس کی باری بھی آہی گئی تھی۔

''اب کیا ارادہ ہے۔؟''ولید نے توپوں کا رخ دوبارہ اس کی طرف موڑ دیا تھا۔ اور مجبوراً'' تیمور کو اٹھ کر اس کے برابر آنا پڑا تھا۔

''ماورا! پلیز آپ بھی آئیے ناں۔ آپ نے تو ایک بھی تصویر نہیں بنوائی۔'' عزت نے اچانک ماورا پہ حملہ داغ دیا تھا اور وہ اتنے سارے لوگوں میں یک دم سٹپٹا سی گئی تھی' حالانکہ وہ نروس ہونے والی ہرگز نہیں تھی۔

''لیکن۔!''اس نے کوئی بہانا کرنے کی کوشش کی۔

''لیکن۔ ویکن کی کوئی گنجائش نہیں نکلتی ڈیئر سسٹر! اور کچھ نہ سہی تو میری طرف سے ایک بہن ہونے کے ناتے ہی آجاؤ۔'' ولید نے واقعی اس کے بولنے کی اور اس کے انکار کی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی تھی اور ماورا کے ساتھ ساتھ تیمور بھی اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔

اور ماورا۔''بہن'' لفظ کی تاثیر سے بندھی کھنچی چلی آئی تھی۔

اور وہ چاروں ایک ساتھ صوفے پہ بیٹھے جیسے سج گئے تھے۔

ولید کے ساتھ تیمور اور عزت کے ساتھ ماورا بیٹھی ہوئی تھی۔

''اے پرفیکٹ پکچر۔'' فارہ نے تصویر بناتے ہوئے بے ساختہ کہا تھا اور تیمور نے بے ساختہ ماورا کی سمت دیکھا تھا اور اس کا یہ دیکھنا بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے کیمرے کی آنکھ میں محفوظ ہو گیا تھا۔

پھر تین چار تصویریں بنوانے کے بعد وہ وہاں سے اٹھ گئی تھی اور رفتہ رفتہ محفل بھی برخاست ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

تیمور حیدر کو ہمیشہ سنجیدہ دیکھا تھا۔ مگر اداس کبھی نہیں دیکھا تھا۔

اسی لیے شاید وہ گھر آکر بھی اس کی اداسی کے زیر اثر تھی کہ وہ خود بھی چپ چپ سی تھی۔ اس نے بی گل اور عافیہ بیگم سے دعا سلام کرنے کے علاوہ اور کوئی بات ہی نہیں کی تھی۔ اور کپڑے تبدیل کرنے کے بعد باہر ٹیرس میں نکل آئی تھی۔

''آپ اپنی مرضی سے سب کچھ کرنے کے بعد بھی خوش نہیں۔؟'' ماورا نے ڈرائیو کرتے تیمور کی اداسی کو کریدا۔

''کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے۔ انسان اپنی مرضی سے سب کچھ کر کے بھی خوش نہیں ہو پاتا۔'' وہ کہتے ہوئے بھی بہت افسردہ سا لگ رہا تھا۔

''وجہ ؟'' وہ پتا نہیں کیوں اس کی افسردگی اور اداسی کو محسوس کر کے جان بوجھ کر اس سے بات کا سلسلہ بڑھا رہی تھی۔

''کیونکہ اپنی غلطی کا یا کسی کمی کا احساس اس کے لاشعور میں چھپا بیٹھا ہوتا ہے۔ اور وہی احساس اسے خوش نہیں ہونے دیتا۔'' تیمور سچ ہی تو کہہ رہا تھا۔ ماورا کے اندر کا ایک خیال اس کے دل تک گیا تھا اور وہ چند سیکنڈ کے لیے چپ ہو گئی تھی۔

''کیا وہ بھی ایسی ہی فیلنگز سے دوچار ہونے والی تھی۔؟ کیا وہ بھی خوشی اور اداسی کے بیچ کے خلا میں ڈولنے والی تھی؟

تو پھر وہ خوشی کیسی اور جیت کیسی؟ اف اللہ۔ یہ کیسی الجھن ہے؟ آج میں زندگی کے جس موڑ پہ ہوں۔ مجھے پتا ہے کہ آج سے میرے اور میرے بابا کے راستے الگ ہو چکے ہیں اور ماں باپ سے راستے الگ ہونا کوئی چھوٹی یا معمولی بات نہیں ہوتی۔

تیمور اسے اپنے اندر کی فیلنگز سے آگاہ کر رہا تھا اور وہ چپ چاپ سنتی جا رہی تھی۔
"آپ کیوں چپ ہیں۔؟" تیمور نے اپنی افسردگی سے دامن چھڑاتے ہوئے اس سے استفسار کیا۔
"نن نہیں۔ کچھ نہیں۔" اس نے فوراً" نفی میں سر ہلایا تھا۔
"کچھ تو ہے ؟" تیمور نے گردن موڑ کر اس کے چہرے کی سمت بغور کھوجتی نظروں سے دیکھا۔
"شاید۔ آپ کی اداسی دیکھ کر اداسی ہو رہی ہے۔" ماورا نے کوئی بھی لگی لپٹی رکھنے یا ہیر پھیر سے کام لینے کے بجائے صاف کہہ دیا تھا۔
اور تیمور کو اپنی سماعتوں پہ یقین نہیں آیا تھا' بلکہ شک گزرا تھا۔
"آپ میری اداسی پہ اداس ہیں۔؟" دوبارہ سے پوچھا گیا تھا۔
"انسان ہوں۔ فیلنگز کا اثر ہو بھی سکتا ہے۔" ماورا نے پلکیں جھکالی تھیں۔
"اگر آپ پہ میری اداسی کا اثر ہو سکتا ہے' تو دعا کرتا ہوں اللہ مجھے ہمیشہ اداس ہی رکھے۔ میری اداسی پہ آپ کی اداسی' مجھے خوشی دے گی۔" تیمور نے بڑی ترنگ سے دعا کی تھی اور ماورا کا دل مزید چپ سادھ کے رہ گیا تھا۔
"ماورا بچہ۔ رات ہو چکی ہے۔ تم شام سے یہاں کھڑی ہو۔ کیا بات ہے؟" بی گل نماز پڑھنے کے بعد وہیں ٹیرس پہ اس کے پاس چلی آئی تھیں اور ماورا اپنے دھیان کی محویت سے چونک گئی تھی۔
"کچھ نہیں۔" وہ نفی میں سر ہلا کر بیٹھی۔
"رضا حیدر کی بیٹی کا نکاح ہو گیا ؟" ماورا ان کو بتا کر گئی تھی کہ آج عزت کا نکاح ہے۔
"جی ہو گیا۔" اب وہ ٹیرس کی ریلنگ سے کمر ٹکائے کھڑی تھی۔
"اب کیا ہو گا۔؟" انہوں نے تشویش سے پوچھا۔
"اب آپ کی بیٹی کا نکاح ہو گا۔" اس نے جیسے گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا تھا۔
"میں ؟" اس کی بات پہ بی گل کا کلیجہ اچھل کر حلق میں آگیا تھا۔ اچھا خاصا دھچکا لگا تھا انہیں۔
"ظاہر ہے ایک نہ ایک دن ہونا تو ہے ہی۔ چند دن میں ہی سہی۔ آپ ادرامی اس چیز کے لیے ذہنی طور پر پہلے سے تیار رہیں۔ ورنہ یہ نہ ہو کہ پھر کسی کو اسپتال لے کر جانا پڑے۔" ماورا نے جیسے بڑی تلخی سے کہا تھا۔
"تو نہ کرو یہ سب۔ چھوڑ دو۔ کیوں اپنی زندگی خود اجیرن کرنے پہ تلی ہوئی ہو ؟"
"منزل کے قریب جا کر واپس کوئی نہیں پلٹتا بی گل۔ اب میرا پلٹنا بھی بہت مشکل ہے۔" ماورا پھر اپنے مزاج کی سختی پہ اتر آئی تھی۔
بی گل بھی خفگی سے بولی تھیں۔
"موج تو رضا حیدر کرنے والا ہے۔" ماورا کے لہجے میں زہر گھل گیا تھا۔
"جو ضد نہیں چھوڑتے۔ وہ موج ہی کرتے ہیں۔ اور مجھے پتا ہے اس سارے قصے میں نقصان تیمور حیدر کا ہی ہو گا' کیونکہ وہ تم دونوں سے بے خبر ہے۔" وہ تاسف سے بولیں۔
"وہ رضا حیدر کا بیٹا ہے بی گل۔!" ماورا فرسٹریشن سے یک دم چیخ اٹھی۔
"رضا حیدر تو نہیں ہے ناں۔؟"
"میرے لیے رضا حیدر ہی ہے۔" ان کے جواب برجستہ تھے۔
"تو پھر رضا حیدر کے لیے پریشان کیوں ہو؟ اداس کیوں ہو؟ بتاؤ مجھے؟" بی گل کا سوال بھی کچھ کم نہیں تھا ماورا جیسے یکدم کرنٹ کھا کے رہ گئی تھی۔
"میں ؟ میں پریشان ہوں ؟" اس نے عجیب بوکھلاہٹ سے پوچھا تھا۔

"ہاں! تم پریشان ہو۔ تمہارے چہرے پہ لکھا ہے کہ تم رضا حیدر کے بیٹے کے لیے پریشان ہو۔ اثر کر گیا ہے تم پہ" بی گل اس کی روز کی ٹینشن اور کشمکش سے تنگ آ کر پھٹ ہی پڑی تھیں۔
"اثر کر گیا ہے۔؟" وہ حیرت زدہ سی زیر لب بڑبڑا کے رہ گئی تھی۔
"ہاں! اثر کر گیا ہے۔ عورت، مرد پہ بڑی جلدی اثر کرتی ہے۔ وہ دنوں میں نہیں منٹوں میں پاگل ہو جاتا ہے۔ جبکہ مرد عورت پہ بڑی دیر سے اثر کرتا ہے۔ اور اتنا گہرا اثر کرتا ہے کہ عورت پاگل نہیں ہوتی۔ بے بس ہو جاتی ہے۔ اور بے بس ہو کر مرتی ہے۔ اور مجھے نظر آ رہا ہے۔ تم بے بس ہو رہی ہو۔" بی گل نے اگلی پچھلی کسر پوری کر کے رکھ دی تھی اور پلٹ کر واپس اندر چلی گئی تھیں جبکہ ماورا وہیں ششدر سی کھڑی کی کھڑی رہ گئی تھی۔
"وہ۔۔۔ وہ۔۔۔ مجھ پہ اثر کر گیا ہے۔؟ م۔ میں۔ میں۔۔۔ بے بس ہو رہی ہوں۔؟"
اس نے خود کلامی کے سے انداز سے کہتے ہوئے اپنے چہرے پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے اپنے چہرے کے نقوش کو چھوا تھا۔

"یہ کیسے ہو سکتا ہے بھلا۔؟ وہ ہلکے ہلکے نفی میں سر ہلاتی اس حقیقت سے انکاری ہونے کی کوشش کر رہی تھی۔
"تمہارے چہرے پر لکھا ہے کہ تم رضا حیدر کے بیٹے کے لیے پریشان ہو۔" بی گل کے الفاظ پھر سے اس کی سماعتوں میں گونجے تھے اور ماورا بے اختیار اندر کی سمت لپکی تھی اور سیدھا واش روم کی طرف رخ کیا تھا۔
"کہاں لکھا ہے کہ میں رضا حیدر کے بیٹے کے لیے پریشان ہوں۔؟ کہاں۔؟ کون کہتا ہے کہ میں بے بس ہو رہی ہوں۔۔۔؟ اور۔۔۔ اور کیا ثبوت ہے کہ وہ مجھ پہ اثر کر گیا ہے۔؟" آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر وہ اپنے ہی چہرے کو آنکھیں پھیلا پھیلا کر غور سے دیکھنے کی اور کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی۔
"بتاؤ مجھے۔؟ میں۔ میں اپنا چہرہ نوچ لوں گی۔" وہ آئینے کے سامنے کھڑی خود پہ ہی دھاڑا اٹھی تھی اور عافیہ بیگم اس کی ایسی چیخ نما آواز سن کر یکدم بھاگتی ہوئی آئی تھیں۔
"کیا ہوا۔ تم ٹھیک ہو ناں۔؟" عافیہ بیگم نے انتہائی وحشت کے عالم میں کھڑی ماورا کو آ کر کندھوں سے تھام لیا تھا۔

"امی۔ امی۔ وہ۔ وہ۔ بی گل کہہ رہی ہیں کہ، وہ مجھ پہ اثر کر گیا ہے۔ م۔ میں بے بس ہو رہی ہوں۔ پریشان ہو رہی ہوں۔ اس کے لیے۔ دیکھیں ناں امی۔ میرے چہرے کو دیکھیں۔ کیا ایسا کچھ نظر آ رہا ہے آپ کو۔؟ تو۔ تو پھر بی گل ایسا کیوں کہہ رہی ہیں۔؟"
ماورا نے الٹا ان کے بازو پکڑ کر جھنجھوڑ ڈالے تھے اور عافیہ بیگم اس کی بات اور اس کے انداز پہ یک دم کرنٹ کھا کے دو قدم پیچھے ہٹی تھیں اور ان کے کانوں میں سائیں سائیں ہونے لگی تھی۔
انہوں نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ماورا کے چہرے کی سمت دیکھا تھا، لیکن انہیں وہ چہرہ ماورا کا چہرہ لگا ہی نہیں تھا۔ وہ چہرہ تو کسی اور کا چہرہ نظر آ رہا تھا۔ بس ماورا کے چند مندمل سے نقوش دکھائی دے رہے تھے۔
"امی! بتائیں نا؟" وہ روہانسی ہو کر بولی تھی اور عافیہ بیگم کا دماغ گھوم گیا تھا۔
"چٹاخ!" انہوں نے انتہائی زناٹے دار تھپڑ اس کے چہرے پہ دے مارا تھا۔
"یہ چہرہ۔۔۔ یہ لہجہ۔۔۔ اور یہ باتیں۔ میری بیٹی ماورا مرتضیٰ کی ہرگز نہیں ہیں۔" انہوں نے بھی یکدم چیخ کر کہا تھا اور ماورا جیسے عرش سے فرش پہ آ گری تھی اور پوری ہستی چکنا چور ہو گئی تھی۔

☼ ☼ ☼

"کہاں تھیں تم؟" عزت گھر میں داخل ہوئی ہی تھی کہ رضا حیدر کی کرخت آواز نے قدم جکڑ لیے تھے۔ اس

کا دل جیسے کنپٹیوں میں دھڑکنے لگا تھا۔ ان کا سوال ہی ایسا تھا کہ وہ چور سی بن گئی تھی "ملیشا کے ساتھ۔ ماریہ کی برتھ ڈے پارٹی میں۔" وہ ذرا ٹھہر ٹھہر کر بولی تھی کیونکہ اپنے آپ کو سنبھالنا بہت مشکل ہو رہا تھا اس سے۔

"اتنی بار فون کیا میں نے، مگر کال ریسیو نہیں ہوئی۔" وہ پوری تفتیش سے۔ کر رہے تھے۔

"رات سے ہی موبائل سائلنٹ پہ تھا۔ اس لیے کسی کی بھی کال کا پتا نہیں چلا۔ تیمور بھائی کی بھی مسڈ کالز تھیں، میں نے کچھ دیر پہلے ہی چیک کیا ہے۔"

عزت، تیمور کی پڑھائی ہوئی پٹی پڑھ رہی تھی۔

"خیر جو بھی ہے، مگر آج کے بعد میری اجازت کے بغیر تم گھر سے ایک قدم بھی باہر نہیں نکالوگی۔" انہوں نے جو وارننگ تیمور کو دی تھی وہی اب عزت کو بھی دے ڈالی تھی۔

"اور یونیورسٹی؟" عزت خود پہ لگنے والی پابندی کی حد جاننا چاہتی تھی۔

"یونیورسٹی تمہیں ڈرائیور پک اینڈ ڈراپ کرے گا۔ ٹائم پہ جاؤ گی اور ٹائم پہ واپس آؤ گی۔"

انہوں نے تو جیسے سارے فیصلے پہلے سے ہی کر رکھے تھے عزت اک گہری سانس خارج کرتے ہوئے اپنے اندر تمام ہمتیں مجتمع کرتی چند قدم کا فاصلہ مٹا کر عین ان کے سامنے آکھڑی ہوئی تھی۔ اور بڑی ہمت اور بڑی جرات سے ان کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں تھام لیے تھے۔

"آپ تو کہتے تھے کہ ساری دنیا ایک طرف اور آپ کی لاڈلی بیٹی ایک طرف۔ آپ تو اپنی لاڈلی بیٹی کے لاڈ اٹھاتے نہیں تھکتے تھے۔ اس کی آنکھ میں آنسو نہیں دیکھ سکتے تھے۔ پھر اسی لاڈلی بیٹی کے ساتھ ایسا سلوک کیوں؟ کیوں بابا؟ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں؟ کیوں آخر؟ اس قیام مرزا اور مونس مرزا کی وجہ سے؟ ہے ناں؟ کیا وہ آپ کو مجھ سے زیادہ عزیز ہیں؟ کیا وہ زیادہ اہم ہیں آپ کے لیے۔؟ آپ کی لاڈلی بیٹی کچھ بھی نہیں ہے آپ کے لیے؟ بتائیں مجھے۔"

عزت نے روہانسے لہجے میں کہتے ہوئے ان کے اندر کی محبت کو جگانے کی کوشش کی تھی جو چند دنوں میں ہی گہری نیند سو گئی تھی۔

اور اس کے اس لاڈلے اور چہیتے انداز پہ رضا حیدر کے مزاج میں مزید زہر کی سی تلخی آگئی تھی۔

"جس انسان کی زبان نہ رہے۔ سمجھو۔ اس کے لیے بیٹی، بیٹی نہیں رہتی اور بیٹا۔ بیٹا نہیں رہتا۔ مرجاتے ہیں۔" انہوں نے انتہائی نفرت اور کرختگی سے کہتے ہوئے عزت کے ہاتھ اپنے ہاتھوں سے جھٹک دیے تھے۔

"مگر بابا!" عزت یک دم چیخی، لیکن وہ اس کی کوئی بھی بات سنے بغیر وہاں سے چلے گئے تھے۔

"عزت۔ کیوں کر رہے ہو تم دونوں بہن بھائی ایسا؟" رابعہ بیگم ان کو وہاں سے جاتے دیکھ کر فوراً اس کے قریب آئی تھیں۔

"مما۔ کیا کیا ہے ہم نے؟ بابا ہماری بات ہی نہیں سن رہے۔ انہیں ہم سے دشمنی ہو گئی ہے۔ وہ تو ہمیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کر رہے۔" عزت مزید روہانسی ہوئی تھی۔

"تو نہ کرو ناں وہ سب۔ جو وہ نہیں چاہتے۔" رابعہ بیگم کو شوہر کے مزاج کا بخوبی پتا تھا۔ اس لیے بار بار انہیں سمجھانے کی کوشش کر رہی تھیں کہ وہ ہی باز آجائیں۔

"اور جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ پتا ہے آپ کو۔؟" عزت کو اپنی ماں کی بزدلی پہ دکھ ہوا تھا، کیوں کہ آج ان کے لیے جو جنگ ان کی ماں کو لڑنی چاہیے تھی۔ وہ جنگ۔ وہ خود لڑ رہے تھے۔

"شادی ہی تو کرنا چاہتے ہیں تمہاری۔؟" رابعہ بیگم نے بڑی آسانی سے کہہ دیا تھا اور عزت یک دم بدک گئی تھی۔

"مما۔! یہ آپ کہہ رہی ہیں۔ جب کہ آپ جانتی بھی ہیں کہ۔" عزت سے بات مکمل نہیں ہوئی تھی۔

"ہاں۔ میں کہہ رہی ہوں' کیونکہ مجھے پتا ہے کہ یہ گھر' گھر نہیں رہے گا۔ سب برباد ہو جائے گا۔ تم لوگوں کی ضد اور ہٹ دھرمی کی بھینٹ چڑھ جائے گا۔ تم نے اپنے بابا کا پیار دیکھا ہے۔ ان کی سفاکی اور ان کا قہر نہیں دیکھا۔" رابعہ بیگم بار بار انہیں سمجھا رہی تھیں۔ مگر کوئی سمجھتا تو تب نا!

"مار ڈالیں مجھے۔ قتل کر دیں۔ میں ان کے قہر کے لیے تیار ہوں' مگر مونس مرزا ہرگز نہیں۔" عزت بھی بالآخر ہمت کرتی ہوئی اپنے قدموں پہ ڈٹ گئی تھی۔

اور رابعہ بیگم وہیں بیٹھ کے رونے لگی تھیں' انہیں کسی طرف سے بھی کوئی بھی امید نظر نہیں آ رہی تھی۔

عزت ان کے سامنے سے ہٹ کے اوپر اپنے بیڈ روم میں آ گئی تھی۔

☆ ☆ ☆

یہ رات سب پہ ہی بہت بھاری گزری تھی۔

سب اپنے اندر اک جنگ میں الجھے ہوئے تھے۔ اور صبح ہوتے ہی پھر سے تیار ہو گئے تھے۔

"گڈ مارننگ۔!" تیمور ہمیشہ کی طرح نک سک سے تیار ڈائننگ روم میں داخل ہوا تھا مگر اس کے گڈ مارننگ کے جواب میں رضا حیدر نے جواباً کچھ بھی نہیں کہا تھا۔

"کیسی ہیں ماما۔؟" تیمور بریف کیس سائیڈ پہ رکھتے ہوئے بولا۔

"ٹھیک ہوں بیٹا۔! آج لیٹ کیوں ہو گئے۔؟" رابعہ بیگم نے ذرا نارمل طریقے سے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔

"بس شاید لیٹ سونے کی وجہ سے صبح آنکھ بھی لیٹ ہی کھلی ہے۔ آپ کیسے ہیں بابا۔؟"

تیمور نے بہت ہی نارمل سے انداز میں ماں کو جواب دینے کے بعد رضا حیدر کو دوبارہ سے متوجہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ جو اخبار پڑھنے میں گم نظر آ رہے تھے۔

"پہلے سے بہت بہتر ہوں مائی سن اور امید ہے کہ بہت جلد بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا۔" انہوں نے اخبار سمیٹ کر ٹیبل پہ رکھتے ہوئے بڑے طنزیہ اور کاٹ دار سے لہجے میں جواب دیا تھا۔ اور ان کا جواب جو مفہوم لیے ہوئے تھا وہ تیمور بھی اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔

"آفس کا چکر نہیں لگائیں گے کیا۔؟" وہ بات کو بڑھانا چاہتا تھا اسی لیے جان بوجھ کر پوچھ رہا تھا۔

"لگاؤں گا۔ ضرور لگاؤں گا۔ مجھے پتا ہے بہت کچھ سیٹ کرنے والا ہے۔ لیکن پہلے میں خود سیٹ ہو جاؤں پھر۔" رضا حیدر کے لہجے کا طنز اور کاٹ ہنوز تھے' تیمور چپ چاپ ناشتے کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔

☆ ☆ ☆

"عزت۔! میرے ساتھ چلو۔" وہ یونیورسٹی کی پارکنگ میں اپنی گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھ رہی تھی جب اسے کسی نے یک دم کلائی سے پکڑ کر اپنی سمت کھینچا تھا۔

اور عزت سر سے پاؤں تک کانپ گئی تھی۔

"ولید ؟" اس پہ نظر پڑتے ہی اس کا سانس بحال ہوا تھا۔

"چلو میرے ساتھ۔" اس نے پھر کلائی کھینچی۔

"پلیز ولید۔ کیا کر رہے ہو ؟ میرا ہاتھ چھوڑو۔" عزت کو ادھر ادھر آتے جاتے اسٹوڈنٹس کو دیکھ کر کافی شرم محسوس ہوئی تھی۔

"یہ میرا حق ہے۔" ولید تو ایک دم سے بدلا ہوا ولید نظر آ رہا تھا۔ بے قرار اور بے باک۔

"حق ہے، مگر حق جتانے کی کون سی جگہ ہے بھلا۔؟" عزت نے بے حد خفگی سے دیکھا تھا۔
"اوہ سوری۔! میں بھول گیا۔ حق جتانے کی اصل جگہ تو گھر ہے۔ اسی لیے تو لینے آیا ہوں۔" ولید نے بڑے شرارتی اور معنی خیز لہجے میں کہتے ہوئے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تھا۔
"گھر ؟ مگر کیوں ؟" عزت اس کے لہجے سے ہی بدک گئی تھی۔
"لوگ۔ اپنے گھر کیوں جاتے ہیں۔؟" ولید نے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔
"لیکن میں نہیں جاسکتی۔ بابا نے مجھے کہیں بھی جانے سے منع کیا ہے۔" عزت نے اچھی بچیوں کی طرح بتاتے ہوئے سر جھکالیا تھا۔
"کوئی بھی باپ اپنی بیٹی کو شوہر کے ساتھ جانے سے نہیں روکتا۔ انہوں نے کہیں بھی جانے سے منع کیا ہے۔ لیکن اپنے گھر جانے سے منع نہیں کیا۔ سمجھیں۔؟" ولید نے اس کی بات کو سیریس ہی نہیں لیا تھا۔
"ولید۔! مجھے ڈرائیور ڈراپ کر کے گیا ہے۔ اور پک بھی وہی کرنے آئے گا۔ اگر بابا کو پتا چل گیا تو بہت برا ہو گا۔" عزت فی الحال کوئی بھی ایسا ویسا قدم نہیں اٹھانا چاہتی تھی جو جلتی پہ تیل کا کام کرتا، مگر ولید ہنوز ضد پہ اڑا ہوا تھا۔
"بابا کو پتا نہیں چلے گا۔ ڈرائیور ڈراپ کر کے جائے گا تو میں آکر پک کر لیا کروں گا۔ اور واپسی پہ میں ڈراپ کر کے جاؤں گا تو ڈرائیور پک کر لیا کرے گا۔ بس بات ختم۔" اس نے بڑے مزے سے سارا سیٹ اپ تیار کر لیا تھا۔
"واٹ ؟ اور میری اسٹڈی ؟" اس نے تعجب سے آنکھیں پھیلائیں۔
"ارے چھوڑو یار! اب اسٹڈی میں کیا رکھا ہے؟ اب تجھے پڑھو۔ چلتا پھرتا اخبار ہوں آخر۔" کہتے کہتے وہ پھر سے پٹری بدل گیا تھا اور عزت کا چہرہ پھر سے سرخ پڑ گیا تھا۔ پہلے اس اخبار کا نام تھا "محبت نامہ" مگر آج اس کا نیا ایڈیشن شائع ہوا ہے "نکاح نامہ" ولید نے کھڑے کھڑے نام بھی ترتیب دے ڈالے تھے۔
"پلیز۔!" عزت جان چکی تھی کہ وہ آج فل فارم میں ہے۔
"او کے۔! اب شرافت سے کہہ رہا ہوں۔ میرے ساتھ گھر چلو۔ میری امی کے بچے اپنی بھابھی سے ملنا چاہتے ہیں۔" اس نے اپنے لب و لہجے کا ایک اور انداز بدلا تھا۔
"اگر نہ جاؤں تو۔؟" عزت جانے پہ آمادہ نہیں تھی۔
"تو میں اٹھا کر لے جاؤں گا۔ یا پھر بچوں کو گھر لے آؤں گا۔ وہ بھابھی سے ملنے آئے تو زیادہ برا ہو گا۔ تمہارے بابا ان کی خاطر تواضع نہیں کر سکیں گے۔" ولید اب بھی نان سیریس تھا۔
"تو میں کیا کروں اب۔؟" وہ بے بسی سے بولی۔
"چپ چاپ میرے پیچھے پیچھے آجاؤ۔" ولید کہہ کر بائیک کی چین گھماتا ہوا واپس پلٹا تھا اور عزت نے ہتھیار ڈالتے ہوئے قدم اس کے پیچھے ہی بڑھا دیے تھے۔
"ذرا کلوز ہو کر بیٹھو، کیونکہ میں آج بائیک کو فل اسپیڈ پہ چھوڑنے والا ہوں۔"
اس نے بائیک اسٹارٹ کرتے ہوئے اسے انفارم کیا تھا اور عزت بیٹھے بیٹھے یک دم گھبرا گئی تھی۔ اور ولید اس کی گھبراہٹ پہ بے ساختہ اک فلک شگاف قہقہہ لگا کر ہنسا تھا۔
"تمہیں کیا خبر کہ تمہاری ساس کا یہ بچہ کتنا شرارتی ہے۔؟" وہ بے حد شرارت سے بولا تو عزت بھی اپنی کھلکھلاہٹ کنٹرول نہیں کر سکی تھی اور ولید نے اس کے ساتھ یوں ہی مستی کرتے ہوئے بائیک روڈ پہ ڈال دی تھی۔

☆ ☆ ☆

تیمور اپنے آفس کے میٹنگ ہال میں ایک میٹنگ اٹینڈ کر رہا تھا جب اس کی پی اے اندر داخل ہوئی تھی۔
"سر! وہ مس ماورا مرتضیٰ آپ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتی ہیں۔" اس نے بڑے دھیمے لہجے میں آکر اطلاع دی تھی۔ اور تیمور اس اطلاع پہ ٹھٹک گیا تھا۔
"ان سے کہیں صرف پندرہ منٹ ویٹ کریں۔" تیمور میٹنگ ادھوری چھوڑ سکتا تھا۔
"سر! میں نے کہا ہے۔ وہ کہتی ہیں۔ میں پانچ منٹ بھی ویٹ نہیں کر سکتی۔ آپ کی میٹنگ سے زیادہ ان کی بات ضروری ہے۔" سحرش زمان حرف بہ حرف بتا رہی تھی اور تیمور کے ماتھے پہ پریشانی اور تفکر کے مارے سلوٹیں پڑ گئی تھیں۔
"اوکے! میں آرہا ہوں۔" وہ اس سے کہہ کر ہال میں موجود باقی افراد کی طرف پلٹا۔
"ایم سوری۔ مجھے یہ میٹنگ کچھ دیر کے لیے ملتوی کرنا پڑ رہی ہے۔ باقی ڈسکشن شام چار بجے ہوگی۔" وہ بہت تحمل سے کہتا اپنا کوٹ اور موبائل اٹھا کر ایکسکیوز کرتا ہوا وہاں سے باہر نکل آیا تھا۔
"کہاں ہیں وہ۔؟" اس نے ادھر ادھر متلاشی نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"آپ کے روم میں" سحرش زمان کو حیرت ہوئی تھی کہ تیمور حیدر نے آج پہلی بار اپنی میٹنگ ادھوری چھوڑ دی تھی، حالانکہ وہ سمجھ رہی تھی کہ تیمور ایسا نہیں کرے گا۔
"اوکے!" وہ سر ہلا کر کہتا اپنے روم کی طرف آگیا تھا اور دروازہ ناک کر کے اندر داخل ہوا تھا۔
"السلام علیکم!" سلام کرنے والا بھی تیمور ہی تھا، جبکہ ماورا کی طرف سے تو جواب بھی موصول نہیں ہوا تھا۔
"خیریت؟ اتنا ارجنٹ کیوں بلایا۔؟" تیمور ٹیبل کی دوسری طرف سے آکر اپنی کرسی پہ بیٹھ گیا تھا، لیکن ماورا کے چہرے پہ نظر پڑتے ہی نظریں ٹھٹک گئی تھیں۔!

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

جو کسی کا ہو بھی گیا تو کیا؟

میں یہ سوچتا ہوں کبھی کبھی
کہ میں کیوں کسی کا ہوا نہیں
کوئی بھول مجھ سے ہوئی تو ہے
وہ کہاں ہوئی، یہ پتا نہیں
مجھے یاد کچھ بھی ذرا نہیں
کوئی بھول مجھ سے گرا تو ہے
کوئی دل ضرور دکھا تو ہے
کوئی دھول میں نے اڑائی ہے
کوئی زخم مجھ سے لگا تو ہے
یہ زمیں نہیں یہ زماں نہیں
مری لغزشیں ہیں کہاں نہیں
میں جو اپنی روح میں نور تھا
کوئی ایسا مجھ میں غرور تھا
مجھے جس کی کوئی خبر نہ تھی
کوئی دعوا مجھ میں ضرور تھا
میں اگر کسی کا ہوا نہیں
کوئی آکے مجھ سے ملا نہیں
اگر اشک کوئی بہا نہیں
کوئی دل دکھا تو کہا نہیں
میں اگر کسی کا ہوا نہیں
تو پھر اس میں میرا ہی دوش ہے
ہے ضرور مجھ میں کوئی کمی
کسی اور کو میں کہوں تو کیا
نہیں جانتا ہوں میں خود کو کیا
کہ ہے مجھ میں کوئی چھپا ہوا
جسے ناز ہے جسے مان ہے
جسے خود پہ کوئی غرور ہے
میں اگر کسی کا نہ ہو سکا
تو ضرور مجھ سے ہوئی خطا
کسی اور کو میں کہوں تو کیا
میں کب اپنے آپ کا ہو سکا
میرے دوست! میرے حبیب تو

کبھی مجھ پہ اتنا کرم تو کر
میرے عیب اور قصور کو
ہے چھپا جو مجھ میں غرور کو
مرے قلب پہ، انہیں فاش کر
مری آن کو مرے مان کو
تو گرفت کر، کوئی دے سزا
کوئی بھول مجھ سے گرا اگر
کوئی زخم مجھ سے لگا اگر
کوئی دل مجھ سے دکھا اگر
کوئی اشک مجھ سے بہا اگر
تو کروں گا خود کو معاف کیا
تو کرے گا مجھ پہ اگر کرم
نہیں کر سکوں گا کبھی حذر
مرا دل رہے گا دکھا ہوا
مرا سر رہے گا جھکا ہوا
میں ہوں ایک لغزش بے گماں
یہ گماں ہے یا کوئی امتحاں
میرے دوست مرے حبیب تو
میرے دل کی ساری کسک کو تو
مرے جسم و جاں کی قلق کو تو
کوئی حرف دے، کوئی لفظ دے
کسی دل کو زخم لگا کے میں
جو کسی کا ہو بھی گیا تو کیا؟

ڈاکٹر طاہر مسعود

ہر گھر میں ایک ایسا کونا ہوتا ہے
جہاں کسی کو چھپ کر رونا ہوتا ہے

خویش، قبیلہ، عزت، حرمت، نام، نسب
اس اک عشق میں کیا کیا کھونا ہوتا ہے

اس کی شب بیداری، گریہ وزاری کیا
جس غافل کو دن بھر سونا ہوتا ہے

رات کسی صحرا میں ہو تو اچھا ہے
خنک ہوا اور نرم بچھونا ہوتا ہے

موسم اور تقدیر سے ڈرتے ہیں لیکن
بیج ہمیں ہر حال میں بونا ہوتا ہے

اُجرت کے لالچ میں ہم مزدوروں کو
چوروں کا اسباب بھی ڈھونا ہوتا ہے

انجم خیالی

خلش ہجر دائمی نہ گئی
تیرے رُخ سے یہ بے رُخی نہ گئی

پوچھتے ہیں کہ کیا ہوا دل کو
حسن والوں کی سادگی نہ گئی

سر سے سودا گیا محبت کا
دل سے پر اس کی بے کلی نہ گئی

اور سب کی حکایتیں کہہ دیں
بات اپنی کبھی کہی نہ گئی

ہم بھی گھر سے منیر تب نکلے
بات اپنوں کی جب سہی نہ گئی

منیر نیازی

اوگرو

اِنشاء کی سرگوشیاں

دریافت

ایک ٹھیکے دار جس نے کچھ سرنگوں کی کھدائی کا ٹھیکہ لیا تھا۔ کام کا معائنہ کرنے گیا۔ اس نے دیکھا کہ مزدوروں کو جہاں کھدائی کرنا چاہیے تھی وہ اس جگہ سے کافی ہٹ کر کھدائی کر رہے تھے۔ اس نے کار روکی اور سخت غصے میں پوچھا۔

"یہاں کیا ہو رہا ہے؟"

"سرنگ بیٹھ گئی ہے' اس کی کھدائی کر رہے ہیں۔" ایک مزدور نے اس کی طرف توجہ دیے بغیر کہا اور کھدائی جاری رکھی۔

"کیا فورمین کو اس سرنگ کے متعلق پتا ہے؟" ٹھیکیدار نے پوچھا۔ مزدوروں نے جواب دیا۔

"اگر پتا نہیں ہے تو ہم بتا دیں گے! مگر پہلے اسے کھود کر نکال تو لیں۔"

بات سمجھ کر.....

جنرل میک آرتھر جب کیڈٹ تھے تو انہیں آئن اسٹائن کی تھیوری یاد کرنے کے لیے کہا گیا۔ تھیوری بے حد مشکل تھی۔ میک آرتھر نے اسے لفظ بہ لفظ رٹ لیا۔ جب کرنل فیبو جر نے ان سے اسی تھیوری کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے آنکھیں بند کر کے پوری تھیوری لفظ بہ لفظ سنا دی۔ کرنل فیبو جر نے آنکھیں مچکا کر پوچھا۔

"کیا تم نے یہ تھیوری اچھی طرح سمجھ لی ہے؟" میک آرتھر کے لیے یہ بڑا نازک لمحہ تھا۔ مگر انہوں نے فوراً جواب دیا۔

"جی نہیں۔" پورے ہال میں سناٹا چھا گیا۔ کرنل فیبو جر نے دھیمے لہجے میں کہا۔

"خود میری سمجھ میں بھی یہ تھیوری نہیں آئی۔ کلاس برخاست۔"

جلدی نہیں ہے

گاؤں کی سیر کے دوران ایک شہری نے دیکھا کہ ایک دیہاتی نے بڑا سا برتن دیوار پر رکھا ہوا تھا جس میں مرغیوں کا دانہ تھا' وہ ایک مرغی کو ہاتھوں میں اٹھا کر برتن تک لاتا' وہ کچھ دیر دانہ چگتی' اس کے بعد دیہاتی اسے زمین پر چھوڑ کر دوسری مرغی کو اٹھا کر برتن تک لاتا' وہ بھی دانہ چگ لیتی تو دیہاتی اسی طرح ایک اور مرغی کو پیٹ بھرنے کا موقع دیتا' یہ منظر دیکھ کر ایک شہری سے رہا نہ گیا وہ بولا۔

"اگر آپ یہ برتن نیچے رکھ دیں تو سب مرغیاں ایک ساتھ دانہ چگ لیں گی' اس طرح کتنا وقت بچے گا۔"

"وقت کا تو کوئی مسئلہ ہی نہیں ہے۔" دیہاتی نے بے پروائی سے کہا۔

"مرغیوں کو کون سا کہیں جانے کی جلدی ہے۔"

مہرین فاخر۔ لاڑکانہ

مشورہ

ایک شرابی کی گاڑی پنکچر ہو گئی۔ اس نے ٹائر بدلنے کے لیے اسکرو نکال کر ایک جگہ رکھے تھے' اتفاق سے سب کے سب نالے میں گر گئے' سامنے ہی پاگل خانہ تھا' شرابی پاگل خانے میں گھس گیا اور ایک پاگل سے اسکرو مانگنے لگا' پاگل نے اس سے کہا۔

"آپ ایسا کیجیے باقی تین ٹائروں سے ایک ایک اسکرو نکال لیجیے اور چوتھے میں لگا دیجیے۔"

یہ سن کر شرابی کو بڑی حیرت ہوئی اور اس نے پوچھا۔

"ارے واہ! تم پاگل ہو' پھر اتنی اچھی ترکیب تمہیں کیسے سوجھی؟" اس پر پاگل نے جواب دیا۔
"میں پاگل ہوں' شرابی نہیں ہوں۔"
فریحہ شیخ..... گجرانوالہ

مگن

نئے نئے یونیورسٹی میں داخل ہونے اور پڑھائی کے شوقین بننے والے بیٹے سے باپ نے پوچھا۔ "رات تم کتنی دیر تک پڑھتے رہے؟"
"میں نے رات دو بجے تک اسٹڈی کی۔" بیٹے نے جواب دیا۔
"لیکن رات گیارہ بجے تو بجلی چلی گئی تھی۔" باپ نے حیرت سے کہا۔
"میں پڑھائی میں اتنا مگن تھا کہ مجھے بجلی کے آنے جانے کا پتا ہی نہیں چلا۔" لائق بیٹے نے جواب دیا۔

ریزگاری

معروف مصنف ڈاکٹر نیل بوٹم اپنا ایک واقعہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں کاروباری دورے پر تھا۔ میں کسی دوسرے شہر گیا اور ہوٹل میں ٹھہرا۔ ہوٹل کے ویٹر نے میرا سامان میرے کمرے میں پہنچایا۔ اسے ٹپ دینے کے لیے میں نے جیب میں ہاتھ ڈال کر ریزگاری نکالی تو وہ صرف تیس سینٹ تھی' جنہیں ٹپ میں دینا' میں نے مناسب نہیں سمجھا..... دوسری طرف میرے پاس بیس ڈالر سے چھوٹا کوئی نوٹ نہیں تھا۔ میں نے ہوٹل کے ویٹر کو ٹپ کے بجائے اپنی نئی کتاب کی ایک کاپی پیش کی۔ اس نے کتاب پر ایک نظر ڈالی اور کہا۔
"سر! آپ مجھے ریزگاری ہی دے دیں۔"

ایک روپیہ

ایک خاتون دوسری سے "کیا ہوا بہن' اتنی پریشان کیوں ہو؟"
دوسری خاتون نے جواب دیا "منے نے ایک روپیہ نگل لیا ہے۔"
پہلی خاتون فوراً" بولی۔ "نگلنے دو بہن' آج کل ویسے بھی ایک روپیہ میں آتا ہی کیا ہے؟"

استاد

"سنا ہے آج کل جرمن زبان سیکھ رہے ہو۔"
"ہاں"
"اور تمہیں اس کے لیے کوئی جرمن استاد مل گیا ہے؟"
"بے شک"
"پھر نتیجہ کیا رہا؟"
"نتیجہ! بس یوں سمجھئے کہ میرا استاد جو پہلے اردو کی الف' بے سے واقف نہیں تھا۔ اب فر فر اردو میں باتیں کرتا ہے۔"

اگر

ریلوے حادثے کی محکمانہ کارروائی ہو رہی تھی' جب چوکیدار کی باری آئی تو اس نے دس مرتبہ ایک ہی بات دہرائی اور کہا۔
"رات اندھیری تھی حضور! آگے لائن ٹوٹی ہوئی تھی۔ میں نے بار بار لالٹین ہلائی لیکن مال گاڑی کے ڈرائیور نے رتی بھر توجہ نہ دی۔"
جب اسٹیشن ماسٹر اور چوکیدار علیحدہ ہوئے تو اسٹیشن ماسٹر بولا۔ "شاباش! تم نے تو کمال کر دیا۔ انجینئر صاحب نے مختلف طریقوں سے پوچھا مگر تم نے ایک ہی بیان دیا۔ اب تم پر کوئی ذمہ داری عائد نہیں ہوئی۔"
"مہربانی ہے جناب! لیکن میں تو سارا وقت ڈرتا ہی رہا اگر انجینئر صاحب پوچھ بیٹھتے کہ لالٹین روشن بھی تھی کہ نہیں تو میں تو کہیں کا نہ رہتا۔"

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

مڑتی ہوئی گلیاں چھوڑی ہیں
کھلتی ہوئی کلیاں چھوڑی ہیں
جھولے کی وہ سکھیاں چھوڑی ہیں
ہر طاق گڑیاں چھوڑی ہیں
جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے
مت پوچھو کہ کیا کیا چھوڑا ہے

ایک لڑکی کا بابل کا گھر چھوڑ کر پیا دیس جانا ایسا ہی ہے جیسے پودا ایک زمین سے اکھاڑ کر دوسری زمین میں لگا دیا جائے۔ اگر موافق زمین اور ماحول ملے تو یہ پودا پھلتا پھولتا ہے ورنہ مرجھا جاتا ہے۔

غیر اور اجنبی لوگوں کی بات تو جانے دیں' کبھی کبھی سگی خالہ اور سگے چچا کے گھر میں بھی شادی ہو تو مختلف رویّوں اور ماحول کا سامنا کرنا پڑ سکتا ہے۔ تصور کریں ایک پڑھی لکھی 'نازک خیال نفیس طبع لڑکی کو رخصت ہو کر ایسے ماحول میں جانا پڑے جہاں ان پڑھ لوگ 'گالم گلوچ' لڑائی جھگڑا طعنے تشنے ہوں' اس طرح کے ماحول کو تبدیل کرنے اور یہاں خود کو منوانے کے لیے ایک عمر کی ریاضت درکار ہوتی ہے اور کبھی پوری عمر ہی رائیگاں ہی ٹھہرتی ہے۔ خود کو مٹا کر بھی کچھ نہیں ملتا۔ شعاع سالگرہ نمبر میں ہم اس حوالے سے نیا سلسلہ شروع کر رہے ہیں سوالات یہ ہیں۔

شادی سے پہلے

شادی کب ہوئی۔

1 ۔ شادی سے پہلے کیا مشاغل اور دلچسپیاں تھیں۔
2 ۔ اس رشتہ میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے پر سر جھکا دیا۔
3 ۔ ذہن میں جیون ساتھی کے حوالے سے پہلے سے کوئی تصور تھا؟ نیز وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ اپنے جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں۔
4 ۔ منگنی کتنا عرصہ رہی۔ شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ۔
5 ۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے۔
6 ۔ شادی کے لیے آپ کو اپنی تعلیم چھوڑنا پڑی یا کوئی اور قربانی دینا پڑی۔
7 ۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین کے معاملے پر کوئی بد مزگی ہوئی۔

شادی کے بعد

8 ۔ شادی کے بعد پہلی بار شوہر نے آپ کو دیکھ کر کیا کہا؟
9 ۔ شادی کے بعد زندگی میں کیا تبدیلیاں آئیں۔
10 ۔ شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا۔
11 ۔ کیا سسرال اور میکے کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف لگے۔
12 ۔ سسرال کے ماحول میں کیا تبدیلی محسوس کی؟
13 ۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کب تنقید کا سامنا کرنا پڑا۔ کوئی تعریفی یا تنقیدی جملہ۔
14 ۔ کیا آپ کے سسرال والوں نے آپ کو وہ مقام دیا جو آپ کا حق تھا۔ سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے۔
15 ۔ سسرال والوں سے وابستہ توقعات کس حد تک پوری ہوئیں۔
16 ۔ بچوں کی پیدائش عورت کی زندگی میں بہت بڑا امتحان بن کر آتی ہے۔ خصوصا" پہلا بچہ۔ ایک طرف خود میں آتی تبدیلی' دوسری طرف شوہر اور سسرال والے۔ آپ کو اس وقت کسی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔
17 ۔ آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے۔
18 ۔ آپ نے گھر کے ماحول کو بہتر بنانے کے لیے کوشش کی؟ آپ کی کوشش کس حد تک کامیاب ہوئی۔

شگفتہ جاہ

یادگار حوالے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابو ایوب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔
"جس نے رمضان کے روزے رکھے، اس کے بعد شوال کے چھ (نفلی) روزے رکھے تو یہ پورے زمانے کے روزے رکھنے کی مانند ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل:۔
ایک نیکی کا اجر کم از کم دس گنا ہے" کے مطابق ایک مہینے رمضان کے روزے دس مہینوں کے برابر ہیں۔ اور اس کے بعد شوال کے چھ روزے بھی رکھ لیے جائیں جنہیں شش عیدی روزے کہا جاتا ہے تو یہ دو مہینوں کے برابر ہو گئے۔ یوں گویا پورے سال کے روزوں کے اجر کا مستحق ہو گیا۔ دوسرے لفظوں میں اس نے پورے سال کے روزے رکھے۔ اور جس کا یہ مستقل معمول ہو جائے تو وہ ایسے ہے جیسے اس نے پوری زندگی روزوں کے ساتھ گزاری۔ یہ چھ روزے متواتر رکھ لیے جائیں یا ناغہ کر کے، دونوں طرح جائز ہیں۔ تاہم شوال کے مہینے میں رکھنے ضروری ہیں۔

اس طرح جن کے رمضان کے فرض روزے کسی شرعی عذر کی وجہ سے رہ گئے ہوں، ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ پہلے فرض روزوں کی قضا دیں۔ شوال کے چھ نفلی روزے اس کے بعد رکھیں۔

صحابیٔ رسولؐ کا بیماری میں صبر و تحمل،

حضرت عمران بن حصینؓ جلیل القدر صحابی ہیں۔
ایک ناسور پھوڑے کے اندر تیس سال مبتلا رہے اور چت لیٹے رہے۔ کروٹ نہیں لے سکتے تھے۔ یعنی تیس برس تک چت لیٹے کھانا بھی، پینا بھی، عبادت کرنا بھی اور قضائے حاجت بھی۔
آپ اندازہ کیجیے تیس برس ایک انسان ایک پہلو پر رہے، اس پر کتنی گراں تکلیف ہو گی! کتنی بڑی بیماری ہے؟ یہ تو بیماری کی ایک کیفیت تھی لیکن چہرہ اتنا ہشاش بشاش کہ کسی تندرست کو وہ چہرہ میسر نہیں۔ لوگوں کو حیرت ہوئی کہ بیماری اتنی شدید کہ برس گزر گئے کروٹ نہیں لے سکتے اور چہرہ دیکھو تو ایسا کھلا ہوا۔ لوگوں نے عرض کیا۔
"حضرت! یہ کیا بات ہے کہ بیماری اتنی شدید اور آپ کے چہرے پر اتنی بشاشت اور تازگی کہ کسی تندرست کو بھی نصیب نہیں؟"
فرمایا۔ "جب بیماری میرے اوپر آئی میں نے صبر کیا۔ میں نے کہا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے میرے لیے عطیہ ہے۔ اس نے میرے لیے یہی مصلحت سمجھی۔ میں بھی اس پر راضی ہوں۔ اس صبر کا پھل اللہ نے مجھے یہ دیا کہ میں اپنے بستر پر روزانہ ملائکہ سے مصافحہ کرتا ہوں۔"

حضرت علیؓ نے فرمایا،

- اس دنیا میں انسان ہر چیز کے پیچھے بھاگتا ہے مگر دو چیزیں خود انسان کا پیچھا کریں گی۔ ایک اس کا رزق اور دوسرا اس کی موت۔
- انسان گناہ کرنے سے جہنم میں نہیں جاتا بلکہ گناہ کرنے کے بعد مطمئن رہنے اور توبہ نہ کرنے کی وجہ سے جہنم میں جاتا ہے۔
- میں دنیا کو اپنی جوتی کی نوک پہ رکھتا ہوں۔

زنیرہ وسیم گاؤں سلیاں شریف

اللہ تعالیٰ کی مصلحت،

ایک شخص جنگل میں رہتا تھا۔ اور راضی برضا ہو کر ہر بات پر کہتا تھا کہ خیر اسی میں ہے۔ ایک کتا اس کے سامان کا پاسبان تھا۔ اور گدھا باربرداری کے لیے اس کے پاس موجود تھا۔ اس کے پاس ایک مرغ بھی تھا

جو صبح بانگ دے کر اس کو بیدار کیا کرتا تھا۔ ناگہاں ایک بھیڑیے نے اس کے گدھے کا پیٹ پھاڑ ڈالا۔ (اور وہ مر گیا) تو اس شخص نے کہا۔
"خیر اسی میں ہے۔"
مگر دوسرے دن اس کا کتا مر گیا۔ تب بھی اس نے یہی کہا۔ تیسرے دن اس کا مرغ مرا ہوا پایا گیا تب بھی اس کی پیشانی پر شکن نہ آئی۔ اس نے کہا۔
"خیر اسی میں ہے۔"
اس کے گھر والے اس نقصان پر بڑے غمگین تھے۔

ان لوگوں نے اس سے کہا۔
"تم ہر حادثے پر یہی کہتے ہو کہ خیر اسی میں ہے۔ اب بتاؤ کہ جو جانور ہمارے کام کے تھے سب مر گئے۔ یہ کیسی بھلائی ہوئی؟"
اس نے کہا۔ "شاید کوئی بھلائی ہو۔"
جب دوسرا دن ہوا تو ڈاکو اس شخص کے پڑوسیوں کو قتل کر کے ان کا مال لوٹ کر لے گئے۔ مرغ، گدھے اور کتے کی آواز نہ ہونے کی وجہ سے ڈاکوؤں کو معلوم نہیں ہوا کہ اس صحرا میں کوئی اور بھی آباد ہے۔ تب اس شخص نے گھر کے لوگوں سے کہا۔
"تم نے دیکھا کہ ہم کس طرح بچ گئے۔ حق تعالیٰ کے کام کی مصلحت اسی کو معلوم ہے۔"
(کیمیائے سعادت۔ امام محمد غزالیؒ)

اللہ کی رضا پر راضی،

ایک گروہ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ آپ خداوند تعالیٰ سے پوچھیں کہ وہ کیا چیز ہے جس سے تیری رضا حاصل ہو۔"
حضرت موسیٰ علیہ السلام پر وحی نازل ہوئی۔ (ان سے کہہ دو) "میرے حکم پر تم راضی رہو میں تم سے راضی رہوں گا۔"
(کیمیائے سعادت۔ امام محمد غزالیؒ)

ایک تسبیح کا ثواب،

روایت ہے کہ ایک دن حضرت سلیمانؑ تخت رواں پر سوار جا رہے تھے۔ پرندے جن و پری آپ کے جلو میں تھے۔ اتفاقاً بنی اسرائیل کے ایک عابد کے پاس سے آپ کا گزر ہوا۔ آپ نے فرمایا۔
"مومن کے نامۂ اعمال میں ایک تسبیح کا ثواب سلیمان کی اس بادشاہی سے بہتر ہے کیونکہ وہ تسبیح باقی رہے گی اور یہ مملکت باقی نہ رہے گی۔"

مہمان نوازی،

ایک دن امیر المومنین حضرت علیؓ رونے لگے۔ لوگوں نے دریافت کیا۔
"آپ کیوں رو رہے ہیں؟"
"آپؓ نے فرمایا۔ "اس لیے رو رہا ہوں کہ سات دن سے کوئی مہمان میرے گھر نہیں آیا ہے۔"
(کیمیائے سعادت۔ امام محمد غزالیؒ)

راضی بہ رضا،

حضرت ابن عطار رحمتہ اللہ کے دس صاحبزادے تھے اور سب صاحب مال تھے۔ ایک دفعہ یہ تمام بیٹے اپنے والدین کے ہمراہ سفر کر رہے تھے کہ رہزنوں نے حملہ کر دیا اور حضرت کے سامنے ہی نو صاحبزادوں کو ذبح کر ڈالا۔ حضرت ہر صاحبزادے کی شہادت پر آسمان کی طرف نظر اٹھاتے اور تبسم فرماتے جب ڈاکوؤں نے دسویں صاحبزادے کو ذبح کرنے کا ارادہ کیا تو ڈاکوؤں میں سے ایک ڈاکو نے حضرت عطار کو مخاطب کر کے کہا۔
"آپ کیسے مہرباں باپ ہیں۔ اپنے بیٹوں کے قتل پر ہنستے رہے اور ہمیں کچھ بھی نہ کہا۔"
آپ نے فرمایا۔
"جس کی مشیت سے یہ سب ہو رہا ہے وہ سب دیکھ رہا ہے اور یہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ اگر وہ اب بھی چاہے تو لڑکے کو بچا سکتا ہے۔"
ڈاکوؤں نے یہ الفاظ سنے تو ان پر ایک عجیب سی حالت طاری ہو گئی۔ وہ اپنے ارادے سے رک گئے اور حضرت سے کہا۔
"اے بزرگ! آپ نے یہ الفاظ پہلے کیوں نہ

کہے تاکہ آپ کے تمام بیٹے محفوظ رہتے۔"
حضرت نے فرمایا۔ "مالک کو یہی منظور تھا اور میں اس کی مشیئت سے خوش ہوں۔"
بشریٰ نوید باجوہ - اوکاڑہ

چند باتیں آپ کے لیے،

- جس نے مجھے ایک لفظ سکھا دیا اس نے مجھے غلام بنا لیا۔ (سقراط)
- تعلیم دو قسم کی ہے، ایک ہمیں کمانا اور دوسری زندگی بسر کرنا سکھاتی ہے۔ (ایڈلر)
- چھوٹے غم واویلا کرتے ہیں۔ بڑے غم ہمیشہ خاموش ہوتے ہیں۔ (کوپر)
- اللہ تعالیٰ خوشحالی بخشے تو اپنی آرزوؤں کو بھی وسیع نہ کرتے جاؤ۔
- وہ شخص نہایت ہی خوش قسمت ہے جسے مطالعے کا شوق ہے لیکن جو فحش کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے اس سے وہ اچھا ہے جس کو مطالعے کا شوق ہی نہیں۔ (میکالے)

گڑیا شاہ - کہروڑ پکا

اوصاف حمیدہ،

حکیم لقمانؑ کے بیٹے نے ان سے پوچھا۔ "اے بابا جان! کون سی اچھی خصلتیں اور کون سے اچھے امور ایسے ہیں جو انسان میں ہونے چاہئیں؟"
حضرت لقمانؑ نے فرمایا۔ "دین دار ہونا اور دین پر مکمل عمل پیرا ہونا سب سے اچھی بات ہے۔"
بیٹے نے کہا۔ "اگر انسان دو امور اختیار کرنا چاہے تو کون سے دو امور بہتر ہیں؟"
حضرت لقمانؑ نے فرمایا۔ "دین اور مال۔ یعنی انسان دین دار ہو اور کسب حلال کرے۔"
بیٹے نے کہا۔ "اگر تین چیزیں انسان اختیار کرنا چاہے تو کون سی تین چیزیں اچھی ہیں؟"
فرمایا۔ "دین، مال اور حیا۔"
بیٹے نے کہا۔ "اگر کوئی چار باتیں اختیار کرنا چاہے تو کون سی چار باتیں اختیار کرنا بہتر ہے؟"
حضرت لقمانؑ نے فرمایا۔ "دین، مال، حیا اور حسن اخلاق۔"
بیٹے نے کہا۔ "اگر کوئی شخص پانچ امور اختیار کرنا چاہے تو کون سے پانچ امور اختیار کرنا بہتر ہے۔"
حضرت لقمانؑ نے فرمایا۔ "دین، مال، حیا، حسن خلق اور سخاوت۔"
بیٹے نے کہا۔ "اگر انسان چھ امور اختیار کرنا چاہے تو کون سے چھ امور بہتر ہیں۔"
حضرت لقمانؑ نے فرمایا۔ "اے میرے پیارے بیٹے! جب کسی انسان میں یہ پانچ خصلتیں اور امور جمع ہو جائیں تو وہ انسان پاک صاف اور متقی ہونے کے ساتھ ساتھ رب تعالیٰ کا ولی اور دوست بن جاتا ہے۔ اور شیطان سے۔ بری اور محفوظ ہو جاتا ہے۔

گفتگو ہنر اس کا،

- رشتے ضرورتوں سے نہیں پہچانے جاتے۔ یہ نہ ضرورتوں سے بنتے ہیں اور نہ ضرورتوں کی تکمیل سے جڑے رہتے ہیں۔
- دنیا کوئی ایسی بری جگہ نہیں۔ ابھی پھول کھلنے بند نہیں ہوئے۔ صبح پورے دل سے ہوتی ہے اور روز سورج پورے یقین سے نکلتا ہے خزاں آتی ہے اور رکے بنا چلی جاتی ہے کہ بہار کو آنا ہے اور ٹھہرنا ہے۔
- بنانے والے نے لوگوں کو ہارمونیم کے تاروں جیسا بنایا ہے۔ آپ کو اتنا پتا ہونا چاہیے کہ کون سا تار چھیڑنا ہے۔ پھر وہی آواز نکلے گی اور ویسی ہی دھن بجے گی، جو آپ بجانا چاہیں گے۔

انجل - ڈہرکی

خالدہ جیلانی

کھلتا کسی پہ کیوں میرے دل کا معاملہ

مدیحہ نورین مہک ——— برنالی

میرے ساتھ ساتھ ہے وہ بڑی تن دہی سے لیکن
نہ دل آشنا ہے میرا، نہ مزاج داں ہے شاید

فرحت اشرف گھمن ——— یسو مال

ہمیں ناز ہے اپنی گمراہیوں پر
ندامت نہیں، شرمساری نہیں ہے
جو ہم سوچتے ہیں، وہی بولتے ہیں
کسی قسم کی راز داری نہیں ہے

راضیہ کنول ——— داؤد دین پناہ

یہ اور بات ہے، اسے مائل نہ کر سکیں
ہم اس پری کی چاہ تو کرتے ہیں کم سے کم

جمیلہ طارق ——— مانسہرہ

ہر شخص دیکھتا ہے، مگر بولتا نہیں
احساس کو زبان بناتا ہے کوئی کوئی

شمع آرزو اور لیس ——— حیدر آباد

تمہارے بعد ذرا دل نہیں لگا گھر میں
بکھر گئی ہیں جو چیزیں وہ آ کر رکھ دینا

شگفتہ کنول ———

ایک ہی بات ہے محبت میں
چاہے میں جیت جاؤں، چاہے وہ

سبط الرحمٰن ——— ماچھیوال گاؤں

وہ چہرہ ایک تصور بھی ہے، حقیقت بھی
دریچہ بند بھی ہوتا ہے، وا بھی ہوتا ہے

عمرانہ جمیل ——— میاں چنوں

جو باتیں اکیلے میں کرتے ہیں لوگ
وہ ہم سرِ عام کرتے رہے
محبت میں نقصان اٹھایا مگر
ہمیشہ یہی کام کرتے رہے

راحت جبیں ——— ٹنڈو الہ یار

جانے سرور و کیف میں کیا ہم سے ہو گیا
ساقی سا مہربان خفا ہم سے ہو گیا

نوزیہ ثمر بٹ ——— گجرات

ویران گھر میں قید ہے میرے بدن کا عکس
آئینہ رکھ گیا کوئی دیوار خواب پر

رضوانہ شکیل راؤ ——— لودھراں

دلوں کو زخم تو دو حرف نا ملائم سے
یہ تیر وہ ہے کہ جو لوٹ کر بھی آتا ہے
نظر یہ کس سے ملی نا گہاں کہ یاد آیا
اسی گلی میں کہیں میرا گھر بھی آتا ہے

اریبہ حنظلہ ——— کراچی

عالم ذات میں درویش بنا دیتا ہے
عشق انسان کو پاگل نہیں ہونے دیتا

حمیرہ نوشین ——— منڈی بہاؤ الدین

جو دل کے طاق میں تو نے چراغ رکھا تھا
نہ پوچھ میں نے اسے کس طرح ستارہ کیا

طیبہ سعدیہ عطاریہ ——— کھٹیالہ، سیالکوٹ

ایک ٹھنڈک تھی اس کی چھاؤں میں
ایک شجر تھا وہ سایہ دار بہت

نور عبدالسلام ——— نواب شاہ

آتا ہوں نظر دیکھنے والوں کو بہت خوش
شاید یہ نئی طرزِ فغاں دے کے گیا ہے وہ

حرا قریشی ——— ملتان

نہ رہا اس کو زمانے سے سروکار کوئی
گویا دنیا سے اٹھا جو تیری محفل سے اٹھا

مدیحہ نورین مہک ——— برنالی

اس کے لہجے میں برف تھی لیکن
چھو کے دیکھا تو ہاتھ جلنے لگے

کوثر خالد ——— فیصل آباد

آنسو ملے پر آنکھ کو رونے کی خو نہ دی
اے بادشاہِ غم! یہ عنایت عجیب تھی

خط آئے

رضیہ جمیل

خط بھجوانے کے لیے پتا
ماہنامہ شعاع - 37 - اردو بازار، کراچی۔
Email: info@khawateendigest.com
shuaamonthly@yahoo.com

آپ کے خط اور ان کے جوابات لیے حاضر ہیں
آپ کی عافیت ' سلامتی اور دائمی خوشیوں کے لیے دعائیں
اللہ تعالیٰ آپ کو' ہم کو' اور ہمارے پیارے وطن کو اپنے حفظ امان میں رکھے۔ آمین

پہلا خط صائمہ مشتاق اور شازیہ مشتاق نے حافظ آباد سے لکھا ہے

تبصرہ اس بار میں نے کرنا ہے اور تفصیلی ہی نہیں طویل بھی۔ وجہ سائرہ رضا اور ایمل رضا۔ سائرہ رضا کے ''خالی آسمان'' نے تو ہر صفحے پر' ہر موقع پر اور بہت سارے مکالموں پر رونگٹے کھڑے ہو گئے' دل جکڑا گیا اور کپکپی طاری ہو گئی۔ تارے جیسے بچے اور جوان میں بھی بچپن سے دیکھتی آ رہی ہوں اور ہمیشہ دل میں افسوس ابھرا۔ مگر سائرہ جیسے آپ نے تصویر دکھائی ہے شاید ایسا کوئی اور نہ کر پاتا۔

تارے اگر ناول کا ہیرو تھا تو بے جی بھی کم نہ تھیں اور آخری سین میں جو کچھ کر دکھایا۔ وہ ایک ماں کا اصل اور سچا روپ تھا۔ بہت سے مکالمے دل میں گھر کر گئے اور روح کو جھنجھوڑ گئے۔ اور یہ بھی بتا دوں کہ معصومہ پر ایک بار بھی ترس نہ آیا۔ ہاں تارے کے نہ ملنے کی خلش ہمیشہ باقی رہے گی۔ دل ابھی تک دکھ کے حصار میں ہے۔ سائرہ! ناول پڑھتے ہوئے محسوس ہو رہا تھا کہ لفظ آپ پر جیسے اتارے جا رہے ہوں اور آپ انہیں قلم بند کرتی جا رہی ہوں۔

ایمل رضا نیا نام جواب پرانا اور پختہ سے پختہ تر کی منزل کی جانب رواں دواں ہے۔ ناول کا نام ہی اتنا خوب صورت رکھ دیا اور پھر جو پڑھنا شروع کیا۔ واہ کیا بات ہے۔ منظر نگاری ایسی کہ تعریف کے لیے لفظ نہیں۔ اگرچہ کہنے والے کہیں گے کہ فلسفے کی بھرمار ہے (آج کل ہماری بہت سی قارئین کو اسی بات کی شکایت ہے۔ ''یارم'' سے بھی) مگر میں کہوں گی کہ جس چیز نے اس سارے منظر نامے کو تازگی' شگفتگی' رعنائی اور انوکھا پن دیا ہے وہ یہ ہی فلسفہ اور منظر نگاری ہی ہے۔

شہرام کے ماں بابا کی کہانی اور نوک جھونک نے بہت لطف دیا اور یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ میرین' ولائی حسنی سے محبت کرنے لگی ہے۔ مگر دیکھنا یہ ہے کہ شہرام اور ربیانکا کا کیا بنتا ہے اور یہ دیکھنے کے لیے ابھی پورے پچیس دن کا انتظار باقی ہے۔

حیا بخاری کی ''بہار دستک دے رہی ہے'' تو ہم نے اس کا استقبال بھی کیا۔ ہلکی پھلکی اچھی کہانی تھی۔ ''خالی آسمان'' اگر ناولز میں نمبر ون تھا تو ''عشق کا سکہ'' افسانوں میں بازی لے گیا۔ قراۃ العین! بہت اچھا اچھا لکھنے لگ گئی ہیں۔ معاشرے کی تلخ حقیقتوں اور سفاکیوں کو عیاں کرتا نادیہ احمد کا ''جھوٹ'' پڑھ کر دل افسردہ ہو گیا۔

باقی ''تحفہ'' اور ''ہار جاتی ہے'' بھی اچھے افسانے تھے۔ جی نہیں میں بالکل نہیں بھولی۔ ''سیاہ حاشیہ'' بہت دل چسپ ہوتا جا رہا ہے۔ سب سے اچھی بات اس قسط کی یہ ہی تھی۔ جی ہاں .... شانزے کو بھائی ملنا۔ بہت بہت بہت اچھا لگا۔ رباب کے شانزے کے لیے کہے گئے جملے کہ ''اللہ ہمیں اتنا عزیز رکھتا ہے کہ ہمیں بچانا چاہتا ہے'' بہت اچھے تھے۔ اللہ کرے تو اب شانزے اپنی ضد چھوڑ دے۔ کیونکہ اب یہ کام عدینہ سرانجام دینے پہ تلی ہوئی ہے۔

نگہت عبداللہ کافی عرصے بعد آئی ہیں خوش آمدید۔ ہلکے پھلکے موضوع پر لکھی گئی ہلکی پھلکی کہانی اچھی تھی۔ اچھا قارئین! پچھلے کچھ عرصے سے اور اب تو اسی ماہ یہ پڑھنے کو ملا ہے کہ قارئین کہتی ہیں 'نئی رائٹرز کو مت شائع کریں' ادارے کا معیار گر رہا ہے۔ پرانی ڈھونڈ کر لائیں۔ میری بہنو! یہ جو پرانی ہیں' یہ بھی تو کبھی نئی تھیں۔ تجربے' مشاہدے اور پریکٹس نے انہیں پرانا بنا دیا۔ اب اگر نئی رائٹرز کو نہیں آگے لایا جائے گا تو وہ کیسے پرانی ہوں گی۔ خود ہی سمجھ لیجئے اور جہاں تک پرانی رائٹرز کی بات ہے۔ ان کے لیے دعا کریں کہ جہاں رہیں خوش رہیں اور کامیابیاں سمیٹتی رہیں' ہم اتنے عرصے سے پکار رہے ہیں مگر جواب ندارد... تو چلو خیر... ویسے بھی کیا خوب کہا ہے شاعر نے۔

جانے والے کو نہ روکو کہ بھرم رہ جائے
تم نے روکا بھی تو کب اس کو ٹھہر جانا ہے

اور یہ سدرہ سحر عمران کہاں گم ہو گئی ہیں چٹھی نہ کوئی سندیس۔

ج: صائمہ! آپ نے اتنا اچھا تبصرہ کیا ہے' ہمیں یقین ہے کہ کہانی بھی اچھی لکھیں گی۔ آپ ہمیں کہانی لکھ کر بھجوائیں۔

سدرہ سحر عمران تک آپ کا پیغام ان سطور کے ذریعے پہنچا رہے ہیں۔

شعاع کی تعریف کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

حرا قریشی نے بلال کالونی ملتان سے لکھا ہے

اف خدایا! مار ڈالا' لوٹ لیا ظالم! غضب' اس ماہ یعنی جون کی قاتل تحریر "خالی آسماں" نے رفیق من سائرہ جی کی شگوفے چھوڑتی تحریر نے مار ڈالا۔ رفیق من سائرہ جی کی اس زبردست تخلیق نے اپنے اس غیر معمولی فن پارے کی بدولت کہاں کہاں نہیں لوٹا ہمیں! محتاط روی سے طالب' طارق' عابدہ' معصومہ کے معاملات' خیالات' پنچائیت۔ بے جی کے درد انگیز جذبے... کہانی کا ایک ایسا دل گیر نقشہ جسے بار بار دیکھا اور پڑھا جائے۔ بس وہ غضب کرتی گئیں اور ہم اس کے زیر اثر آتے گئے۔ ناول کا عنوان اگر "وڈے پاجی" ہوتا تو لطف دوچند ہو جاتا (ادنیٰ سی تجویز' لاگو کرنا ضروری نہیں) دریافت طلب امر یہ بھی تھا کہ طالب اور عابدہ جب طاہر کی فطرت سے بخوبی شناسا تھے تو اسے چھوڑ کر کیوں گئے؟ جانتے بوجھتے ظلم کیا ناں!

"سیاہ حاشیہ" ابتدا سے ہی صائمہ جی اپنے دائرہ اختیار میں قاری کو مقید کیے ہوئے ہیں۔ عبداللہ زندہ ہے؟ صائمہ جی کا بیانیہ اسلوب نہایت ہی مدلل انداز میں تحریر کے نشیب و فراز کو کامیابی سے ہمکنار کرتا دکھائی دے رہا ہے۔ "تعویذ حب" ایمل بلاشبہ بہترین لکھاریوں میں اچھا اضافہ ہیں' ایمل رضا ایک وسیع اور کشادہ سڑک پر خط مستقیم پر مقناطیسی کشش لیے ہمیں دائیں سے بائیں دیکھنے نہیں دے رہیں' اچھی خاصی پُر مغز لفاظی کو جانچتی نگاہوں سے پڑھا' کئی لفظوں کو ادا کرنے میں دقت پیش آئی' پر تحریر کا لطف اپنی جگہ قائم رہا۔

حیا کا ناول پڑھا۔ بے حد اچھا لگا۔ نگہت عبداللہ کو دیکھ کر غیر معمولی خوشی کا احساس ہوا۔ افسانوں میں پہلے نمبر پر "جھوٹ"' دوسرے نمبر پر "تحفہ"' تیسرے نمبر پر "ہار جاتی ہے" اور چوتھے پر عشق کا سکہ قابل ذکر رہا۔ اپنی اپنی جگہ سب کی کاوش ستائش کی مستحق اور داد طلب مقام رکھتی ہے۔ قارئین کے تبصرے پڑھتے تو محبت کا رنگ پھیکا لگنے لگا۔ میں پورے وثوق سے یہ بات کہہ سکتی ہوں کہ "شعاع" کا گراف اپنے معیار سے کسی طرح بھی نیچے نہیں آیا۔

ج: پیاری حرا! آپ کی طرز تحریر' الفاظ کا انتخاب اور گہری نظر' تبصرہ ہر لحاظ سے مکمل ہے' بہت شکریہ آپ نے خط لکھا' آپ کا خط نہ ملے تو ہمیں کمی کا سا احساس ہوتا ہے۔

دعائے سحر اور انا احسب نے فیصل آباد سے لکھا ہے

10 سال' ہاں شاید 10 سال کی تھی جب سے شعاع' خواتین' کرن باقاعدگی سے زیر مطالعہ ہیں۔ مما کا شوق اور میرا تجسس اور اب... شاید میری مجبوری۔ شاید پیدا ہوتے ہی کسی نے کاغذ چٹا دیا ہو... یا پھر قلم تھما دیا ہو۔ جبھی تو کاغذ' قلم' سیاہی کی خوشبو دیوانہ کر دیتی ہے مجھے اور لفظ... لفظوں سے تو یوں عشق ہے جیسے بچوں کو تتلی اور جگنو پکڑنے سے۔

آپی کی شادی سے پہلے اکثر حاضر ہوا کرتی تھیں دونوں۔ انا' دعا اکٹھے۔ پھر انا احسب اور دعا ہاشمی کب الگ ہوئیں پتا ہی نہ چلا۔ خط لکھنے کی وجہ سمیرا حمید کا ناول "یارم" ہے۔

ہر قسط ہر کردار' ہر سین' ہر سطر اور ہر لفظ سے عشق ہو گیا ہے مجھے 'صدیوں تک یاد رکھے جانے والا ناول۔ نگہت عبداللہ کا "بس اک نگاہ شوق" ویلڈن نگہت جی' سائرہ رضا "خالی آسمان" زبردست' فرح بخاری "تحفہ" "سوسُو جھوٹ اور عشق کا سکہ ویری نائس۔ مگر یہ ہار جاتی ہے آئینہ بچہ۔ اسٹوری آف دی منتھ ٹھہری۔ ایمل رضا ناول کے اختتام پر تبصرہ کروں گی۔ ادھار رہا۔

ج : دعا اور انا! پانچ چھ سال بعد آپ نے خط لکھا' بہت خوشی ہوئی۔ مصنفین تک آپ کی تعریف ان سطور کے ذریعے پہنچائی جا رہی ہے۔

طیبہ سعدیہ نے کھٹیالہ سیالکوٹ سے لکھا ہے

شعاع کا معیار پہلے سے بھی اچھا ہے۔ البتہ کبھی کبھی بہت بور کرنے والی اسٹوری ہوتی ہے۔ ہمارے گھر نہ ٹی وی ہے نہ کمپیوٹر' لے دے کے یہ رسالے ہی بچتے ہیں۔

اس ماہ کا شعاع فنٹاسٹک یعنی زبردست.... رقص بسمل کچھوے کی رفتار سے چل رہا ہے۔ مگر کیا کریں پسند جو ہے صبر تو کرنا پڑے گا نبیلہ جی بھی ہمارا صبر ہی آزمائی ہیں آخر کیوں....؟

مکمل ناولز میں خالی آسمان سائرہ رضا واہ کیا بات ہے سویٹ ہارٹ۔ بہت اچھی اچھی اور پیاری تحریر تھی بہت پسند آئی۔ بہار دستک حیا بخاری کا ناول بھی اچھا تھا۔ تعویذ حب' ایمل رضا کی تحریر اچھی ہے پوری طرح رائے اگلی قسط پڑھ کے ہی دی جا سکتی ہے ناں!

سیاہ حاشیہ ایک زبردست تحریر' صائمہ اکرم کی نائس جی نگہت عبداللہ کا ناولٹ بھی مزے کا تھا۔

ج : پیاری طیبہ! ہمیں اندازہ ہے کہ آپ کو پرچا حاصل کرنے کے لیے کتنی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے' یہ جان کر بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے گھر میں امی سمیت سب ہی شعاع کے دل دادہ ہیں۔ اپنی امی کو ہماری طرف سے شکریہ کہہ دیں۔

کوثر خالد نے جڑانوالہ سے لکھا ہے

ورحمتہ اللہ وبرکاتہ جنت حلالہ' دوزخ حرامہ'

آگہی کا کمال ہے سائیں
یہ جو دل میں ملال ہے سائیں
تجھ سے ناراض تو نہیں لیکن
دل کے شیشے میں بال ہے سائیں

قاری فرح ناز نے ہمیں یاد کیا۔ ہم نے جواب لکھا تبصرہ لکھا۔ مگر لگتا ہے اب ہمارے تبصرے کی آپ کو ضرورت نہیں رہی آپ کی خاموشی گراں لگ رہی ہے۔ لیکن یہ طے ہے کہ ہم کبھی کسی سے ناراض نہیں رہ سکتے۔ شعاع کی شاعری اعلیٰ پائے کی اور ہم ٹھہرے نیم شاعر۔ ایک خطوط کی خوشی دونوں طرف یکساں تھی۔ وہ بھی گئی۔ اب اور کیا لکھیں کہ آپ جانتی ہیں تبصرے میں صرف ستائش ہی ہوگی۔

ج : پیاری کوثر! ہم آپ سے ہرگز ہرگز ناراض نہیں ہیں۔ آپ کے منفرد انداز کے خط پڑھتے ہوئے تو ہمیں بہت لطف آتا ہے۔ لگتا ہے جیسے آپ سامنے بیٹھی باتیں کر رہی ہوں۔ آپ کے پچھلے خطوط شامل نہیں ہو سکے۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ تاخیر سے موصول ہوئے۔ آئندہ آپ تبصرہ بھجوائیں تو کوشش کریں ہمیں جلد موصول ہو جائے۔

فصیحہ مسعود نے تربیلا ڈیم سے لکھا ہے

سب سے پہلے "رقص بسمل" پڑھا اس کے لیے اک شکایت ہے صائمہ اکرم کا "سیاہ حاشیہ" اچھا جا رہا ہے' اچھی لگتی ہے اس کی اسٹوری' سائرہ رضا نے تو اس بار گویا محفل ہی لوٹ لی۔ اتنا اچھا ناول.... بے جی کا کردار بہت زیادہ پسند آیا۔ معصومہ کو تارے اچھا نہیں لگتا تھا لیکن اس معصوم کے ساتھ ایسا بھی نہیں کرنا چاہیے تھا۔ آخر تک پتا نہیں چلا کہ تارے گیا تو گیا کہاں۔ حیا بخاری کا

"بہار دستک" اور ایمل رضا کا "تعویذ حب" بھی بہت اچھا لگا۔ اگلی قسط کا انتظار ہے۔ نگہت عبداللہ کا ناولٹ "بس اک نگاہ شوق" بہت اچھا تھا۔ اب آخر میں اک گلہ ہے سب رائٹرز سے' آپ لوگ ہمیشہ بڑے شہروں پہ ہی کیوں لکھتے ہیں۔ آپ لوگ میرے تربیلا کے بارے میں کیوں نہیں لکھتی ہیں۔ (کیا ہوا جو ہم واپڈا والے ہیں) تربیلا کسی وادی سے کم نہیں ہے۔ ڈیم' جھیل' دریا اور بہت سی نہریں ہیں یہاں۔ ہرا بھرا سا تربیلا ہے۔ بجلی پانی کا کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ پرسکون ماحول اور فضا آلودگی سے بالکل پاک ہے۔ یہاں کے پہاڑوں' میدانوں پر بھی کوئی کچھ

لکھیے' آپ سب صرف معاشرتی علوم کی کتاب میں تربیلا ڈیم کا لفظ پڑھتے ہیں اور آگے بڑھ جاتے ہیں۔ میں پورے یقین سے کہتی ہوں' پورے پاکستان میں تربیلا سے زیادہ امن وامان والی جگہ اور پرسکون اور پاک صاف ماحول نہیں ہے اور یہ صرف میں نہیں کہتی بلکہ جو بھی یہاں آتا ہے یہی کہتا ہے۔ اک اور بات کہ کچھ عرصہ پہلے امایہ خان کا "بت شکن" شائع ہوا تھا۔ اس میں کہا گیا کہ GIkI تربیلا سے آگے وسیع وعریض رقبے پر پھیلا ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کافی وسیع ہے لیکن یہ غلط ہے کہ تربیلا سے آگے ہے۔ GIKI تو آدھا تربیلا میں ہے اور آدھا Topi میں۔ GIKI تربیلا کا حصہ ہی سمجھیں تو غلط نہیں ہوگا۔

ج: پیاری فصیحہ! بہت خوشی ہوئی تربیلا ڈیم کے بارے میں جان کر شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے شکریہ۔

صالحہ محبوب نے انڈس کالونی ڈی جی خان سے لکھا ہے

گزشتہ دو ماہ سے شعاع کے حالات اور معیار پر خاصی تشویش ہو رہی تھی۔ خصوصاً" جب اسے خواتین ڈائجسٹ کے مقابلے میں رکھا جاتا۔ مگر اس ماہ جون میں اچانک ایک دم سے اس کے معیار نے بلندیوں کو چھولیا۔ گزشتہ کے سارے ہی گلے شکوے مٹادیے۔

سب سے پہلے تو شعاع کے قسط وار ناولوں کا ذکر ہو جائے۔ دونوں نے خاصا مایوس کیا ہے۔ اس ماہ کی سب سے خاص کہانی سائرہ رضا کی "خالی آسمان" ہے۔ بہت ہی خوب سائرہ رضا! ہم تو آپ کو کراچی کا سمجھتے تھے۔ مگر آپ نے تو ہمارے پنجاب کے کلچر' سوچ اور روایات پر پی ایچ ڈی ہی کر ڈالی۔ یقیناً" آپ کا اصل گھر یہی ہوگا۔ کہانی کے شروع ہی سے ایک تجسس کی فضا قائم کی۔ ایک بے حد محبت کرنے والا جوڑا مگر عورت اندر سے بے کل۔ کہانی میں دلچسپی بے جی کی اس بات سے شروع ہوئی اسے بد دعا دی تو برباد تونے ہو جانا ہے۔" پھر تو جناب اس طرح کے لاجواب جملوں کی اننگز ہی شروع ہو گئی۔ کہانی میں مسکراہٹ اس وقت قاری کے لبوں پر آئی جب ابا کھوتا اور ابا بھیڑا کی گردان نے تین ماہ کا عرصہ لیا۔ عابدہ کا کردار ایک پہیلی کی مانند ہے۔ قاری فیصلہ کرنے سے قاصر ہے کہ وہ بہت اچھی بھرجائی ہے یا مطلبی۔ اپنے شوہر کے ساتھ جانے کا فیصلہ خود غرضی پر مشتمل ہے یا اس کی ضرورت۔ گاؤں کی پنچایت لوگوں کی رواداری' غصہ مگر ساتھ ساتھ شرمندگی۔ سائرہ کیا جائزہ لیا ہے سارے لوگوں کا اور کس خوب صورتی سے اسے قارئین کے سامنے لاکر رکھ دیا ہے۔ معصومہ کا کردار بھی بہت زیادہ ڈسکس نہیں کیا۔ قارئین کو خود سے ہی اس کی خود غرضی کا اندازہ ہو گیا۔ کہانی کا اختتام بے حد شان دار ہے۔ معافی بھی اور اقرار جرم بھی۔ ماں کی مامتا بلکہ دادی کی محبت بھی اور تارے کی بے گناہی کا اعتراف بھی۔ آپ کے آخری فقرے جو ماؤں کے لیے لکھے گئے ہیں "مائیں ولی اللہ نہیں ہوتیں مگر ولی اللہ پیدا کرتی ہیں۔ مائیں بددعائیں نہیں دیتیں" سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔

آپ کا رسالہ بھی اس ماسٹر پیس کی اشاعت کے لیے قابل تحسین ہے۔

ج: پیاری صالحہ! آپ نے صرف ایک کہانی پر تبصرہ کیا اور بہت اچھا تبصرہ کیا۔ سائرہ رضا کی کہانی واقعی بہت اچھی تھی اسے ادب کے کسی بھی اعلا معیار کے مقابل رکھا جا سکتا ہے۔ آپ اندازہ نہیں کرسکتیں اس کہانی کو پڑھتے ہوئے ہماری اپنی کیا کیفیت تھی۔ کتنی بار آنکھیں نم ہوئیں۔ سائرہ رضا نے ایسے کردار کو بہت خاص بنا دیا جسے ہم کبھی نفرت اور بیزاری سے اور کبھی ترحم بھری نظروں سے دیکھ کر گزر جاتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ انسان نفرت کے لیے نہیں محبت کے لیے تخلیق کیا گیا ہے۔ انسان سے نفرت نہیں کرنا چاہیے۔ خواہ وہ کیسا ہی ہو۔

ثمینہ ندیم نے ٹوبہ ٹیک سنگھ سے لکھا ہے

میرا شعاع سے رشتہ تقریباً" 20 سال پرانا ہے اور میں باقاعدہ قاری ہوں۔ جون 2015ء کا رسالہ ملنے کے بعد خود کو نہیں روک پائی۔ سائرہ رضا کے خالی آسمان نے قلم اٹھانے پر مجبور کردیا۔ تحریر پڑھتی جاتی تھی اور میرے آنسو بہتے جاتے تھے۔ کیونکہ میں بھی ایک ایسے بیٹے کی ماں ہوں جو جسمانی طور پر بارہ سال کا ہے۔ مگر ذہنی طور پر تین' چار سال کا۔ مجھے لگا کہ میں اتنا چاہنے کے باوجود اپنے بیٹے کو اس ماں کی طرح نہیں چاہ سکی۔ سائرہ رضا نے اس دکھ کو اپنا موضوع بنایا۔ واقعی "دو عقل والے کا فرض ہے' بے

عقلی کو ڈھانپ لے در گزر کردے" مگر ایسا ہوتا نہیں ہے۔ ایسے اسپیشل لوگوں کو اکثر معاشرے کی طرف سے تضحیک کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔

آج کے دور میں بھی آپ کا ادارہ اپنا کام احسن طریقے سے کر رہا ہے اور ہمارے لیے اور آنے والی نسل کے لیے بھی مشعل راہ ہے۔ میرا تعلق ایک دینی حلقے سے بھی ہے۔ ہم اکثر درس و نصیحت سے بھی وہ بات نہیں سمجھا سکتے جو ان تحریروں سے لوگ سیکھتے ہیں اور ان کہانیوں میں قرآن و حدیث کو ساتھ لے کر چلنا ہمیں انرجی دیتا ہے۔ خصوصاً" ذکر کروں گی نمرہ احمد اور عمیرہ احمد کا۔ نمرہ احمد نے میرے اردگرد کے بہت سے لوگوں کو قرآن سے جوڑ دیا ہے۔ جو ہمارا اصل ضابطہ حیات ہے۔ آخر میں تمام بہنوں سے التماس ہے کہ میرے بیٹے کو بھی اپنی دعاؤں میں یاد رکھیں اور اللہ تعالیٰ مجھے اس آزمائش پر پورا اترنے کی توفیق عطا فرمائے اور اللہ تعالیٰ اس ادارے کو بھی ہرا بھرا رکھے۔

ج : ثمینہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ خوشی ہوئی کہ آپ نے بیس سال کی خاموشی توڑی اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔

معذور بچے کی دیکھ بھال آسان کام نہیں۔ معذوری جسمانی ہو یا ذہنی دونوں ہی بہت اذیت ناک ہوتی ہیں۔ خصوصاً" ایک ماں کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش ہوتی ہے۔ ہم آپ کے دکھ کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ آج دنیا بھر میں انسان کو تباہ کرنے والے ہتھیاروں پر ریسرچ کا سلسلہ جاری ہے اور ایک سے بڑھ کر ایک تباہ کن ہتھیار ایجاد کیا جارہا ہے، اتنی توجہ انسان کے دکھوں بیماریوں کو دور کرنے 'ان کا علاج ڈھونڈنے پر دی جاتی تو دنیا یقیناً" زیادہ بہتر حالت میں ہوتی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں وہ آپ کی پریشانیوں کو آسانیوں میں بدل دے۔ قارئین تک بھی آپ کی درخواست پہنچا رہے ہیں۔

شعاع کے بارے میں آپ نے جن جذبات کا اظہار کیا ہے۔ وہ جان کر ہمیں ایک طمانیت' گہرے اطمینان کا احساس ہوا۔ ہمارے ذریعے سے اگر کسی کو صحیح راستے کی طرف اچھائی کی طرف رہنمائی ملتی ہے تو ہمارے لیے اس سے بڑی بات کیا ہوسکتی ہے۔

ارم بنت شوکت ڈی جی خان سے شرکت کررہی ہیں' لکھا ہے

جس چیز نے مجھے خط لکھنے پہ مجبور کیا ہے۔ وہ ہے۔ سحر ساجد کا ناولٹ "غریق رحمت" آپ لوگ سوچ رہے ہوں گے کہ یہ تو پرانی کہانی ہے۔ شاید پچھلے تین چار ماہ پہلے کی کہانی۔ تو جناب معاملہ کچھ یوں ہے کہ مابدولت تین پیارے پیارے بچوں کی "امی جان" ہیں اور "بی اے" کی اسٹوڈنٹ۔ اب پیپرز کے بعد فراغت سے رسالے پڑھے تو سب سے زیادہ "غریق رحمت" پسند آئی۔

جون کا رسالہ ہمیشہ کی طرح زبردست تھا۔ "ایک تھی مثال" کو نہ پاکر دکھ ہوا اور "رقص بسمل" کو پڑھ کر مزہ نہیں آیا کیونکہ "تین صفحے" پڑھ کر کسی کو بھی مزہ نہیں آتا۔

ج : پیاری ارم! پرچوں کے دوران آپ نے تمام پرچے سنبھال کر رکھے اور فارغ ہو کر پڑھے اور اپنی رائے کا اظہار کیا۔ ہم دل سے اس محبت کی قدر کرتے ہیں۔

نبیلہ عزیز ہماری بہت اچھی مصنفہ ہیں اس وقت کچھ پریشانیوں میں گھری ہوئی ہیں اس لیے ناول لکھ نہیں پارہی ہیں۔ قارئین دعا کریں۔ اللہ تعالیٰ ان کی پھوپھی کو شفائے کلی عطا فرمائے اور نبیلہ عزیز کی تمام پریشانیوں کو دور کردے۔ آمین

جویریہ حسن راولپنڈی سے لکھتی ہیں

سب سے متاثر کن تحریر سائرہ رضا کی تھی۔ سوچ کی ایسی پختگی اور زبان و بیان کی یہ عمدگی سائرہ رضا کا ہی خاصا ہے۔

کتنی خوب صورتی سے آپ نے اس اہم ترین پیغام کو پڑھنے والوں تک پہنچایا ہے۔ کہ اگر کسی انسان کے وجود میں خدا تعالیٰ کی طرف سے کوئی کمی ہے تو یہ اس کا قصور نہیں" بلکہ اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہے۔ عموماً" جب ایسے موضوعات پر لکھا جاتا ہے تو کہانی میں افسردگی کا عنصر نمایاں ہو جاتا ہے لیکن سائرہ نے ہلکے پھلکے انداز میں لکھا اور یوں کہیں بھی ہم بوجھل نہ ہوئے۔ سائرہ جیسے الفاظ تو میرے پاس نہیں جو ان کی تعریف کے لیے استعمال کرسکوں۔ مگر یہ ضرور کہنا چاہوں گی کہ آپ "پرائڈ آف پرفارمنس" کی حق دار ہیں۔

ایمل رضا نے اچھی کوشش کی ہے۔ ویسے کیا یہ ضروری ہے کہ مشکل اور نئے الفاظ استعمال کیے جائیں؟ تحریر میں کہانی اور جاندار مکالموں سے زیادہ خوب صورت لوکیشنز پر توجہ دی جائے؟ میرا نہیں خیال کہ ایسا کرنا ضروری ہے۔ اور پھر یہ 'اگلی قسط آئندہ ماہ تو ایک وبائی مرض کی حیثیت اختیار کر گئی ہے۔ ہر دوسری کہانی جس میں مبتلا ہے۔ کیا ان کہانیوں نے یہ مقولہ نہیں سنا۔ "مقدار نہیں معیار"

"سیاہ حاشیہ" بھی اچھی تحریر لگتی ہے۔ پلیز بے جا طوالت کا شکار مت ہونے دیجئے گا۔ ویسے یہ اوریدا اتنی روندھو کیوں ہے۔ بیرون ملک سے آئی ہے پھر بھی اتنی شرمیلی اور ڈری سہمی۔ اونہوں!

فرح بخاری کا افسانہ بہترین تھا۔ سادہ انداز تحریر مگر مضمون پر مکمل گرفت حاصل ہو تو ایک بھرپور تحریر وجود میں آتی ہے۔ "تین شہزادیوں کا انتخاب" کی کیا بات تھی۔ بار بار پڑھا۔ "باتوں سے خوشبو آئے" کا آخری مراسلہ جس کا عنوان تھا "خوشی دینے میں ہے۔" اسے پڑھ کر میری آنکھوں میں آنسو آگئے۔

ج : جویریہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی تنقید و تعریف متعلقہ مصنفین تک پہنچا رہے ہیں۔ ہمیں خوشی ہے کہ آپ اپنی بہن سے شرط جیت گئیں۔ 18 جون کو آپ کی سالگرہ ہے۔ ہماری طرف سے سالگرہ کی مبارک باد اور دعائیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش و خرم اور کامیاب زندگی عطا کرے۔ آمین۔

اور یہ آپ سے کس نے کہا کہ آپ کی لکھائی خراب ہے۔ آپ کی لکھائی تو بہت صاف اور پختہ ہے۔

فوزیہ ثمروٹ اور ام ہانیہ عمران نے گجرات سے شرکت کی ہے' لکھا ہے

ناول میں رقص بسمل کو پڑھا اتنے کم صفحات کیوں یہ بھی رہنے دیتے تھے۔ ہم اکٹھی دو اقساط پڑھتے اور ایک

تھی مثال۔ وہ تو غائب تھی۔ رخسانہ آپ تو میری فیورٹ سویٹ ہارٹ ہیں بس آپ نے پوری تحریر میں صرف مثال بیچاری کو تختہ مشق بنا رکھا ہے۔ "تعویز حب" کو پڑھا، اچھی لگی مگر الفاظ مشکل تھے۔ اس لیے تحریر کچھ عجیب تھی۔ کیا رائٹر نے فارسی زبان استعمال کی ہے؟ شکر دوسری قسط آخری ہوگی۔ پتا نہیں کیوں یہ لفظ آئندہ اور انتظار اچھے نہیں لگتے۔

سائرہ رضا کا ناول خالی آسمان اس ماہ کی بیسٹ تحریر۔ سائرہ جی اتنے حساس موضوع پہ آپ نے لکھا۔ حقیقت کے قریب تر لکھا آپ نے 'میرا گھر دولہ دربار کے پاس ہی ہے۔ آپ نے جو تارے کے بارے میں لکھا ہے۔ یقین کریں 'میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے بے جی ماں تھیں۔ تارا ان کی عرضی۔ جیسے جیسے کہانی پڑھتی گئی آنسوؤں کی لڑی لگ گئی۔ معصومہ نام اور فطرت کی سائرہ جی نے اتنا مشاہدہ کیسے کیا۔ تارے جیسے لوگ جو ہوتے تو انسان ہی ہیں مگر 'بے زبان۔ خوشی 'غم 'غصہ 'عرض تارے کی ہر بات سچ لگ رہی تھی۔ بہار دستک دے رہی ہے۔ اسید اور اس کی ماں کا کردار اچھا تھا۔ شکر ہے رائٹر جی نے اس تحریر میں تو انصاف کیا۔

سیاہ حاشیہ اس بار بھی قسط ماضی سے پردہ اٹھے بغیر ختم ہو گئی۔ اور یہ اوریدا کیوں ہر بار ملکہ جذبات شمیم آرا بنی ہوتی ہے ہر بات پہ اس کی آنکھوں کی برسات شروع ہو جاتی ہے اور یہ ڈاکٹر بینش تیمور سے کس خوشی میں نفرت کرتی ہیں یہ تو ذرا واضح کردیں ناں۔

بس اک نگاہ شوق بہت اچھی تحریر۔ اچھے کرداروں کے ساتھ نگہت عبداللہ نے جب بھی لکھا ہمیشہ اچھا اور قاری کے ذہنوں میں نقش رہ جانے والا ہی لکھا۔ فوزیہ ثمر کو جو آپ نے جواب دیا۔ بے ساختہ قہقہہ لگایا اور دل آپ کی ذہانت کا قائل ہو گیا۔ مطلب معذرت کا طوق آپ نے ایک بار پھر ہماری ناتواں گردن پہ لٹکا دیا ناں۔

ج : پیاری فوزیہ! سمیرا حمید کو آپ کے سوالات بھجوا دیے ہیں۔ شعاع پر آپ کا تبصرہ ہمیشہ کی طرح بہت جامع اور خوب صورت ہے۔ کڑاہی کو کھٹا بنانے کے لیے آپ ٹماٹر اور لیموں کا رس زیادہ ڈالیں۔

ملائکہ کوثر بسم اللہ پور سے تشریف لائی ہیں' لکھا ہے

"پہلی شعاع" کے موتیوں جیسے الفاظ پڑھ کر دل دکھ سے بوجھل ہوا۔ بے اختیار ناصر کاظمی یاد آئے "پی جا ایام کی تلخی کو بھی ہنس کر ناصر"۔ حمد و نعت اور پیاری نبی کی پیاری باتیں پڑھ کر دل و جاں معطر و شاد ہوئے۔ "دستک دستک" کے سارے صفحات میں گڑبڑ تھی سخت مشکل پیش آئی۔ "روبرو" سمیرا حمید کا شکریہ۔ بنا پوچھے میرے

بہت سے سوالوں کے جواب مل گئے دوسرے قارئین کو جواب پڑھ کر یہ کیا نبیلہ عزیز جی! "رقص بسمل" کی قسط پہلے سے زیادہ منی سی تھی۔ رخسانہ نگار جی! کس خوشی میں منظرنامے سے غائب ہوئیں۔ وہ ہماری "ایک تھی مثال" کو اغوا کر کے۔ نگہت عبداللہ کی "بس اک نگاہ شوق" ہمیشہ کی طرح زبردست کہانی تھی جو نگہت جی کے قلم کا خاص وصف ہے۔ حیا بخاری کی "بہار دستک دے رہی ہے" بڑا ہی پرفیکٹ ناول تھا۔ ثمرہ (بیٹی) کو "عشق کا سکہ قرۃ العین ہار جاتی ہے" آئینہ بچہ کی اسٹوریاں بہت پسند آئیں۔ فرح بخاری کا تحفہ میرے دل کو بے حد بھایا۔ ثمرہ (بیٹی) کو ناولٹ' ناول سے زیادہ چھوٹی کہانیاں اٹریکٹ کرتی ہیں پسند اپنی اپنی.... مزاج اپنا اپنا "دیمک زدہ محبت" والی صائمہ اکرم کا "سیاہ حاشیہ" بڑا زبردست ناول بننے جا رہا ہے۔

"خوب صورت بینیے" "میں رمضان میں "صحت مند کیسے رہا جائے" کے ٹوٹکے پڑھ کر ثمرہ کے بہت سے مسائل سولو ہوئے جو روزوں کے حوالے سے اسے درپیش تھے۔

ثمرہ آپ سے کہہ رہی ہے "ہے زندگی کتنی حسین" راشدہ رفعت کے مطابق وہی ٹیپکل سی اسٹوری' جوانی محبوبہ کی یاد میں گزار دی اور بڈھے وارے جب حج کرنے کا وقت تھا زوجہ کی محبت یاد آگئی۔ وہی معافیاں تلافیاں' بس کہہ دیا کہ زندگی کوئی نہیں حسین۔

میں اپنے گاؤں کی بابت آپ کو بتانا چاہتی ہوں اور کہانیاں بھی لکھتی ہوں تھوڑی بہت فرصت نکال کر اگر آپ کی پرمیشن ہو تو گاؤں کا احوال اور کہانی بھیج دوں۔ اب بھی بڑی مصروفیت ہے' رمضان کی آمد آمد ہے مرحبا رمضان۔ تیاریاں' صفائیاں عروج پر بس! ساتھ ہی رضائیاں گدے ادھڑے پڑے ہیں۔ انہیں بھی نئے کور چڑھا کر رمضان کے شروع ہونے سے پہلے سمیٹنا ہے۔ ثمرہ میری اکلوتی بیٹی ہے اس لیے اس کا خط میں ذکر آیا بار بار۔ اگر آپ کو اچھا نہیں لگا تو معذرت۔

ج: پیاری ملائکہ! آپ نے مصروفیات سے وقت نکال کر خط لکھا' بہت شکریہ۔ رمضان کی آمد سے پہلے ہر گھر میں ہی رمضان کے استقبال کی تیاریاں شروع ہو جاتی ہیں اور رمضان کی آمد کے بعد تو جیسے گھر کا ماحول ہی بدل جاتا ہے' یہ خوب صورت روایتیں ہماری معاشرت کا حصہ ہیں۔

ثمرہ کو ہماری طرف سے پیار دیجیے گا۔ آپ کی بیٹی ہمیں بھی پیاری ہے۔ ہمیں اس کا ذکر کیوں برا لگے گا۔

کہانیاں اور اپنے گاؤں کا احوال ضرور لکھیں۔ پوچھنے کی ضرورت نہیں۔

رخسار شفیق نے 189 ر۔ب فیصل آباد سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

میری امی اکیس سال سے شعاع کے ساتھ منسلک ہیں۔ شادی کے بعد ان کی جٹھانیاں بھی ان کی دیکھا دیکھی شعاع پڑھنے لگیں۔ پھر ان کے بچے بھی اب شعاع کے ساتھ منسلک ہیں اور ہم بھی۔ میرے دونوں بڑے بھائی اور میں شعاع بہت شوق سے پڑھتے ہیں۔ یکم تاریخ کو شعاع ہمارے گھر آجاتا ہے۔ یکم کو چھوٹے بھائی کو پیسے پکڑاتے وقت تنبیہہ کرتی ہوں۔ (نہ لے کر آئے تو خیر نہیں) جب شعاع گھر آگیا تو پھر لڑائی۔ تینوں بہن بھائیوں میں پہلے کس نے پڑھنا ہے؟ پہلے میں پڑھتی ہوں' بعد میں دوسرے پڑھتے ہیں۔ امی کہتی ہیں۔ انسان کو اتنا بھی پاگل نہیں ہونا چاہیے۔

ناولٹ "سیاہ حاشیہ" صائمہ اکرم کا بہترین جا رہا ہے۔ "رقص بسمل" نبیلہ جی پلیز تھوڑا زیادہ لکھیں "بہار دستک دے رہی ہے" حیا بخاری بہت اچھا رہا۔ ناولٹ "بس اک نگاہ شوق" نگہت عبداللہ کا پرفیکٹ رہا۔ افسانے سارے زبردست رہے۔

ج: پیاری رخسار! شعاع اکیس سال سے آپ کے گھر کا حصہ ہے اور آپ نے شعاع کے لیے خط لکھا۔ ساتھ ساتھ خواتین کا تبصرہ بھی شامل کر دیا اس کا مطلب ہے کہ شعاع کے ساتھ ساتھ آپ خواتین بھی باقاعدگی سے پڑھتی ہیں۔

ہماری طرف سے اپنی امی کا شکریہ ادا کر دیں' انہوں نے آپ کے گھر میں شعاع کو متعارف کرایا ہے اور اپنے بھائیوں کا بھی جو آپ کو ہر ماہ شعاع لا کر دیتے ہیں عائزہ خان اور دانش تیمور کے انٹرویو کی فرمائش شاہین رشید تک پہنچا رہے ہیں۔

سدرہ بتول نے ملتان سے شرکت کی ہے' لکھتی ہیں

شرکت کی وجہ سائرہ رضا کا ناول ہے۔ ان کے الفاظ اتنے کمال کے ہوتے ہیں کہ پڑھتے ہی بے ساختہ زبان سے

"واہ" نکلتا ہے۔ ان کا موضوع سب سے الگ ہوتا ہے۔
"خالی آسمان" کے لیے تعریف کے لفظ نہیں' لیکن اس مرتبہ مثال کہاں غائب تھی؟

ج : پیاری سدرہ! آپ کو سالگرہ کی مبارک باد۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوشیوں بھری طویل زندگی عطا کرے آمین۔
پچھلے ماہ رخسانہ نگار کچھ ناگزیر مصروفیات کی وجہ سے "ایک تھی مثال" کی قسط نہ لکھ سکیں۔ اس ماہ قسط شامل ہے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

بنت حوا..... چوک سرور شہید

السلام علیکم! سرخ رنگوں سے سجی ماڈل اچھی لگ رہی تھی۔ "ایک تھی مثال" پھر غائب "رقص بسمل" سو سو..... مگر "سیاہ حاشیہ" میں عبداللہ نہیں مرا اور ریدا ڈاکٹر بنے گی..... صالحہ رفیق ایک الجھا ہوا کردار ہے۔ یہ عدینہ کی سگی ماں نہیں لگتی۔ "تعویذ حب" بہت اچھا ناول ہے۔ مجھے تو ایمل رضا' فائنتہ رابعہ' سمیرا حمید اور سعدیہ عزیز ایسی لگتی ہیں جیسے پیدا ہی افسانے لکھنے کے لیے ہوئی ہیں..... مگر ایمل رضا اور سمیرا صاحبہ نے تو ناولوں میں بھی کمال کیا۔ صائمہ اکرم اب تو سب کی فیورٹ رائٹر بن گئی ہیں۔

ج : مدثرہ! ہمیں خوشی ہے کہ آپ نے اپنا نام لکھا' آپ کا تبصرہ ہم نے پڑھ لیا' لیکن یہ تبصرہ نہیں بلکہ ہم اسے ایک کتاب کا خلاصہ کہہ سکتے ہیں آپ نے ایک بہت اچھی کتاب سے متعارف کرایا۔ اچھا ہوتا کہ آپ بتا دیتیں کہ یہ کتاب کہاں سے مل سکتی ہے اور پبلشر کون ہے۔ افسانہ ابھی پڑھا نہیں۔
شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہ دل سے شکریہ۔

مریم اور شوال کہروڑ پکا الفتح چوک سے شریک محفل ہیں' لکھا ہے

ہم تیسری کلاس سے ہی شعاع کے قاری ہیں۔ ہمیں عمیرہ احمد اور نمرہ احمد بہت پسند ہیں۔ فرحت اشتیاق' ماہا ملک' نگہت سیما' صائمہ چوہدری کے ناولز بھی شوق سے پڑھتے ہیں۔ صائمہ چوہدری کا سیاہ حاشیہ بہت اچھا جا رہا ہے۔ رقص بسمل بھی اچھا جا رہا ہے۔ لیکن "ایک تھی مثال" کی تو کیا ہی بات ہے۔ عمیرہ اور نمرہ کے ناولز کی بہت کمی محسوس ہوتی ہے پلیز اس کمی کو پورا کریں۔

ج : مریم اور شوال! ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو اچھے نمبروں سے کامیابی عطا فرمائے آمین۔

عمیرہ احمد اور نمرہ احمد کے ناول خواتین ڈائجسٹ میں چل رہے ہیں اور دونوں ہی بہت اچھا لکھ رہی ہیں' لگتا ہے آپ خواتین نہیں پڑھتیں۔
شعاع آپ کو پسند ہے یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔

رُوبرُو

سمیرا حمید

سونیا غوری نے ہارون آباد سے پوچھا ہے کہ "رائٹر جب کوئی تحریر لکھتا ہے تو تھوڑا بہت وہ لکھتا ہے جو وہ ہوتا ہے یا جو وہ خود کرنا چاہتا ہے۔ کیا عالیان کی طرح ذہین، ویرا کی طرح بہادر اور سائی کی طرح راز رکھنے والی ہیں؟"

"اگر ایک سچی تحریر کی بات کی جائے تو لکھاری کو خود کو ایک طرف رکھنا ہی ہوگا ورنہ وہ تخلیق خالص نہیں ہوگی۔ وہ کیا کرنا چاہتا ہے اور کیا کروانا چاہتا ہے، اسے یہ چیز اپنے کرداروں پر نہیں تھوپنی چاہیے۔ ذہانت کی گواہی میرا کام اور میری شخصیت دے تو بہتر ہے میں خود سے اس بارے میں کچھ نہیں کہنا چاہتی۔ میں ویرا کی طرح کسی بڑے انسان کو اٹھا کر پھینک نہیں سکتی تھی لیکن ایسا کرنے کی کوشش ضرور کر سکتی ہوں۔ میں کمزوری کو پسند کرتی ہوں نا ہی کمزوری ظاہر کرنے کو راز رکھنے کے معاملے میں میں سائی سے بھی کہیں آگے ہوں۔"

اقصیٰ مریم، اسوہ مریم ملتانی نے کیوٹی اے سے پوچھا ہے کہ "ویرا کو تنہا کیوں چھوڑا۔ بعض مقامات پر لگا کہ سائی اس سے محبت کرتا ہے کیا دونوں کا ایک ہو جانا ممکن نہ تھا۔ کیا آپ کی زندگی میں کوئی شاہوں کا شاہ کارل جیسا کردار آیا جسے اعزاز دینے کے لیے یہ کردار تخلیق کر دیا؟"

"سائی کے ساتھ ویرا کی دلی وابستگی نہیں تھی۔ سائی ایک ہندو لڑکی کو پسند کرتا تھا۔ میری زندگی میں تو نہیں لیکن میرے دوستوں کا کہنا ہے کہ میں ان کی زندگی میں کارل بن کر آئی ہوں۔"

عائشہ جمیل لیک سٹی لاہور سے پوچھ رہی ہیں "آپ جیسا لکھتی ہیں ویسا ہی سوچتی ہیں یا آپ کی سوچ اور آپ کی تحریر میں تضاد ہوتا ہے۔ میں اور میرا خط آپ کو کیسا لگا؟"

"آپ کے سوال کا مختصراً" جواب یہ ہے کہ "میں سو بار پہاڑ پر چڑھا اور گر گیا اور جب میں نے پھر سے چڑھائی شروع کی تو پہاڑ کو اپنے سامنے جھکا ہوا پایا" اگر سارے والدین صرف اولاد کا ہی سوچتے رہیں گے تو انسانیت کا کون سوچے گا۔ "اڑو کہ اڑنے کا حق صرف پروالوں کے پاس ہی نہیں۔" یہ ساری میری ذاتی سوچیں ہیں جن پہ میں یقین رکھتی ہوں اور انہیں اپنی تحریروں میں لکھا۔ آپ کا خط اور آپ کا انداز تحریر خوبصورت ہے۔"

طاہرہ ملک، رضوانہ ملک جلال پور پیروالا سے آپ کا پہلا ناول کون سا ہے؟ کہانی پڑھتے ہوئے ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ جیسے ہم بھی مانچسٹر میں ہیں کیا آپ نے بھی ایسا ہی محسوس کیا؟"

"طاہرہ اینڈ کیا ہوگا اس کے لیے آپ نے کہانی کو اختتام سے پڑھنا شروع کیا، یہ سطریں میرے لیے مسکراہٹ کا باعث بنیں۔ رضوانہ تھم کے لیے شکریہ۔ میرا پہلا ناول "سودا" تھا جو کرن میں شائع ہوا تھا۔ کہانی لکھتے ہوئے میں خود کو اس ماحول میں موجود رکھنے کی کوشش کرتی ہوں۔ میرے لیے ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔"

مریم بنت ارشاد رحیم یار خان سے۔ آپ نے اتنا بہترین علم کہاں سے حاصل کیا۔ آپ کو لکھنے کا خیال کیسے آیا، کسی نے موٹی ویٹ کیا۔ کبھی کسی تحریر کو پڑھ کر خیال آیا کہ کاش میں بھی ایسا لکھ سکتی؟

"میں پھر کہوں گی کہ میرے پاس کچھ خاص یا زیادہ علم نہیں ہے۔ جو تھوڑا بہت ہے، وہ میرے مشاہدے اور غور و فکر کی وجہ سے ہے۔"

"لکھنے کے لیے میرا محرک وہ فراغت رہی جو گاہے بگاہے میسر آتی رہی۔ میں نے فراغت میں کیے جانے والے بہت سے کاموں میں سے ایک لکھنے کا کام بھی کیا۔ کبھی کوئی مضمون، مکالمہ، بچوں کی کہانی وغیرہ۔ لیکن میں اس لکھنے میں سنجیدہ ہرگز نہیں تھی۔ اگر وہ اس وقت شائع ہو جایا کرتیں تو بھی مجھے رائٹر نہیں بننا تھا۔ لیکن ہوتا وہی ہے جو خدا چاہتا ہے۔ اب خود کو خود ہی تحریک دلاتی ہوں۔ مجھے کسی بھی تحریر کو پڑھ کر یہ خیال نہیں آیا۔ البتہ ایک دو غیر ملکی ناولز ایسے ہیں جن کے پلاٹ پر میں اس انداز سے دنگ رہ گئی کہ مجھے خیال آیا کہ کاش یہ پلاٹ میرے پاس

ہوتے اور کچھ میرے اپنے پلاٹ ایسے ہیں کہ میں کہتی ہوں کاش یہ بھی لکھے جائیں۔"

فوزیہ سلطان تونسہ شریف سے پوچھتی ہیں۔ آپ کی زندگی میں کوئی ایسا لمحہ جب آپ کو لگا ہو کہ اس معاملے میں آپ بالکل بے بس ہیں؟ کیا آپ کبھی تونسہ شریف آئیں گی؟ آپ مانچسٹر یونی ورسٹی کے ایک ایک ہال کا نام کیسے جانتی ہیں؟

"جی میری آنکھیں سیاہ ہی ہیں۔ بالکل ایسا بہت بار لگا کہ میں بے بس ہوں اور اس معاملے میں' میں کچھ نہیں کر سکتی۔ میں اس دنیا کا چپہ چپہ دیکھ لینا چاہتی ہوں تو تونسہ شریف کیوں نہیں۔ ان شاء اللہ ضرور۔ مانچسٹر یونی ورسٹی بہت بڑی یونی ورسٹی ہے اور یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ میں اس کے بارے میں سب جان جاتی۔ جتنا ناول کے لیے ضروری تھا' ہاں اتنا میں نے جاننے کی کوشش کی۔"

خنساء اقبال' عائشہ فاروق گوجرانوالہ سے پوچھتی ہیں کہ عالیان تو امرحہ کا ہوا۔ کارل کا پتا ہی دے دیں۔ عالیان اور کارل کا اتنا پیارا رشتہ کیسے لکھا آپ نے؟

"خط میں بکھرے آپ کے الفاظ بھی موتی ہیں اور آپ کا انداز بھی خوب صورت ہے۔ کارل کا پتا اب واقعی مجھے ایجاد کرنا ہی ہوگا۔ عالیان اور کارل دوست ہیں اور دوستی کا رشتہ سب بے حد پیارا ہوتا ہے۔ کارل کی فطرت کی وجہ سے دونوں کا رشتہ ذرا عام معمول سے ہٹا ہوا تھا۔ اسی لیے آپ کو زیادہ اچھا لگا۔"

فوزیہ صادق کسووال سے۔ "محبت سے گندھے ذخیرہ' الفاظ کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی ہیں؟"

"مایوسی ہر حال میں گناہ ہے اور امید زندگی پر ہمیشہ قائم رہنے کے لیے فرض ہے۔ آپ کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے فوزیہ۔ مجھے لفظوں کی تراکیب بنانا اچھا لگتا ہے اور پھر ان میں تصورات کو رقم کرنا بھی۔۔۔ میں جب لکھتی ہوں تو بار بار اس بات پر ضرور غور کرتی ہوں کہ اس سطر کو یا ان الفاظ کو اور کس کس انداز میں لکھا جا سکتا ہے اور پھر کوشش کرتی ہوں کہ بہترین انداز کو اپنا لوں۔"

صبا طارق تربیلا غازی سے۔۔۔ "آخر کب تک لوگوں کی اچھائیاں خاندانوں کے پلڑے میں تلتی رہیں گی؟ کیا ہم بدل نہیں سکتے۔ ہمارا یہ معاشرتی سیٹ اپ کیا ہمیشہ ایسا ہی رہے گا؟ وعدہ کیجیے جلد ہی ایک نئے ناول کے ساتھ ملیں گی؟"

"صبا! آپ کا ہاتھ سے بنایا کارڈ اور اس پر لکھی نظم بہت خوب صورت ہے۔ دراصل کسی بھی نظام یا سوچ کا ایک دم سے بدل جانا ممکن نہیں ہوتا۔ تبدیلی کتنی بھی ضروری کیوں نہ ہو اور اس کے لیے کتنی بھی تیز کوشش کیوں نہ کی جائے' وہ آنے اور قائم ہونے میں وقت لیتی ہے۔ معاشرتی ڈھانچے کی تبدیلی تو ویسے ہی صدیوں پر چلی جاتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ سب ہی لوگوں کی اچھائیاں خاندانوں کے پلڑوں میں تلتی ہیں۔ مشرقی اقدار اپنے اندر دور بینی رکھتی ہیں۔ ایک نسل کے لیے کیے جانے والے فیصلے دراصل آئندہ نسلوں کے مستقبل طے کرتے ہیں۔ اس لیے ان معاملات کو خاص انداز میں دیکھا بھالا جاتا ہے۔ اگلے ناول کے لیے میں بھی دعا گو ہوں کہ وہ لکھا جائے۔"

سارہ انجم بہاولپور۔ "میں بھی چھوٹی موٹی کارل ہوں۔ آپ خود بھی تو کارل نہیں۔ اگر آپ کو انتخاب کرنا ہو کہ چھوٹے بچے خاص طور پر لڑکیاں' ٹی وی دیکھیں یا رسالے پڑھیں تو آپ کس چیز کا انتخاب کریں گی اور کیوں؟"

"سارہ! آپ ضرور لکھیں۔ انسان کی زندگی کتنی بھی لمبی کیوں نہ ہو' وہ اتنی لمبی ہرگز نہیں ہوتی کہ اسے سوچوں میں ہی گزار دیا جائے۔ زندگی کا ہر لمحہ بے جان ہوتا ہے۔ اس لمحے کو جان دار ہمارا عمل بناتا ہے۔ میں کارل ہوں یا نہیں' اس کا جواب شاید میں کارل کا ناول لکھنے کے بعد دے سکوں۔ چھوٹے بچے خاص کر لڑکیاں ٹی وی بھی دیکھیں اور کتابیں اور رسالے بھی پڑھیں۔ میں یہ نہیں کہوں گی کہ ٹی وی کو زندگیوں سے نکال دیں' میں یہ کہوں گی کہ اس کے استعمال کی حد طے کر لیں۔ ایک تصویر ہزار الفاظ کے برابر ہے۔ اسی طرح پانچ منٹ کی ایک ڈاکومنٹری ایک ضخیم آرٹیکل کے برابر ہے۔ اب ہم اپنی زندگیوں سے ٹیکنالوجی کو نہیں نکال سکتے۔ ہر طرح کی ٹیکنالوجی کے ساتھ فائدے اور نقصان منسلک ہیں۔ معاملہ کوئی بھی ہو حکمت کا استعمال ضرور کریں' کیونکہ یہ ممکن ہی نہیں کہ عقل و دانش کسی مسئلے کو سلجھا نہ سکے۔"

صبا منظور' عائشہ ضیاء' کرن ضیاء' تربیلا فیض دیپال پور۔۔۔ "عالیان کو اتنا تھوڑا لاہور کیوں دکھایا؟ اپنی کوئی ایسی عادت بتائیں جو آپ کو ناپسند ہو؟"

"عالیان کے پاس وقت کم تھا۔ اس لیے لاہور تھوڑا دکھایا۔ میری بہت سی بری عادات میں سے ایک یہ ہے کہ

اکثر میں اپنے لیے کسی خاص کام کے لیے کچھ اصول وضع کرتی ہوں اور پھر ان پر ٹھیک طرح سے عمل نہیں کر پاتی یعنی سختی ہے۔"

طلعت ثناء سیال شریف سے.... "جو حالات آپ نے امرحہ کے یونی ورسٹی جانے سے پہلے اور نکاح سے پہلے لکھے، وہ تصوراتی ہیں یا آپ نے یہ سب دیکھا ہے۔ امرحہ کا نام کہیں سنا تھا یا خود لکھا؟"

"آپ کے خط کا خیر مقدم کیا گیا ہے۔ آپ نے ایسا سوچا بھی کیسے کہ خط کا مذاق اڑایا جائے۔ جو دعائیں آپ نے دی ہیں، وہ نایاب بھی ہیں اور خاص بھی... امرحہ کے گھریلو واقعات میں نے خود سے لکھے ہیں، لیکن ان کا محرک ہمارا ماحول ہے۔ امرحہ کا نام میں نے پڑھا تھا۔"

تہمینہ رؤف بنوں سے.... "آپ کے گھر والے یارم پڑھتے تھے۔ اگر پڑھتے تھے تو تعریف یا تنقید کی۔ آپ نے کہا تھا آپ شوق کے لیے نہیں لکھتیں، کیا آپ لکھنا چھوڑ دیں گی؟

"آپ کے پاس لفظوں کی قلت شاید ہو، لیکن محبت کی نہیں تھی۔ اس لیے آپ نے خط لکھا۔ میرے گھر والے یارم نام سے بھی واقف نہیں تھے۔ بعد ازاں وہ "یارم" نام سے واقف ہو گئے اور اتنا ہی کافی رہا۔ انہوں نے پڑھا ہی نہیں تو تعریف اور تنقید کا جواز ہی پیدا نہیں ہوا۔ میں نے کہا تھا کہ میرا لکھنا قدرتی ہے۔ اللہ کو یہ ہی منظور تھا کہ میں لکھوں تو میں لکھ رہی ہوں اللہ کے حکم سے ہی چھوڑ دوں گی۔ اس کے علاوہ کوئی ایسی وجہ یا رکاوٹ مجھے نظر نہیں آتی کہ میں لکھنا چھوڑ دوں گی۔"

صوفیہ کاشف ابوظہبی سے پوچھتی ہیں کیا کبھی انگلش میں لکھنے کی خواہش کی۔ زندگی کی طرف ایسی ہیلتھی اپروچ کے پیچھے کون ہے۔ آپ اپنے کرداروں کے ساتھ کتنی ایمان دار ہیں اور کیا آپ صرف لکھنے پر فوکس رکھیں گی۔ میں حقیقتاً" آپ کے والدین کو سلیوٹ کرنا چاہوں گی جنہوں نے آپ میں ایسے انٹلیکٹ کی گروتھ کی۔ انہوں نے ایسا کیسے کیا؟"

"فرشتے کی ایک انگلش قصبے میں آمد کی کہانی لکھی اور درمیان میں ہی چھوڑ دی تھی۔ اللہ نے چاہا تو مکمل ضرور لکھوں گی۔ زندگی کی طرف ایسی اپروچ کے لیے بہت سے عوامل کار فرما رہے ہیں، وہ اتنے زیادہ اور مختلف ہیں کہ میرے لیے انہیں بیان کرنا مشکل ہے۔ لیکن اپنی کسی کہانی میں، میں ضرور بیان کروں گی۔ کسی نے میرے اندر لکھنے کی تحریک نہیں جگائی، یہ سب مختلف قدرتی عوامل سے ہوا۔ میرے والدین کی ایک خوبی میرے لیے بہت خاص رہی کہ انہوں نے کبھی کسی کے لیے برا نہیں سوچا اور نہ ہی چاہا، وہ حسد اور تکبر سے دور بھاگتے رہے اور خود نمائی کو خود پر حرام کیے رکھا۔ باقی اللہ کی ہدایات بہت اہم ہوتی ہے کہ وہ ہم پر سوچ کے در وا کرتا ہے۔ انسان کی تربیت میں جتنی قدرت کار فرما ہوتی ہے اتنا کوئی انسان کبھی نہیں ہو سکتا۔ ضرورت صرف یہ ہوتی ہے کہ ہم اپنے شعور و عقل کو جگائے رکھیں۔ جی میری ساری توجہ لکھنے پر ہی ہے اور جب تک اللہ نے چاہا۔ کرداروں کے ساتھ میں انصاف کرتی رہی ہوں اور مزید کرنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔"

عزہ علی پشاور... "یارم میں آپ نے ایک دوبار داستان گو کا ذکر کیا ہے وہ کون ہے؟"

"داستان گو داستان سنانے والے کو کہتے ہیں اور یارم داستان میں نے آپ کو سنائی ہے تو داستان گو میں ہی ہوئی نا۔"

آمنہ خان فرام مانسہرہ..."آپ کی زندگی میں کوئی ایسا رشتہ جو جان سے پیارا ہو؟"

"مجھے میرے سارے ہی خونی رشتے بے حد عزیز ہیں۔"

صبا عیشل فرام بھاگوال فیصل آباد.... "جب آپ نے یہ ناول لکھنا شروع کیا تھا تو کیا سوچا تھا کہ یہ ناول آپ کی پہچان بن جائے گا۔

"میں نے یہ سب نہیں سوچا تھا، نہ ہی اب سوچتی ہوں۔"

دینا ارتضیٰ سرگودھا... "کیا یارم میں کچھ واقعات سچے بھی تھے۔ کیا لکھنے کی خواہش ہے؟"

"واقعات تو نہیں کہہ سکتے، کچھ چیزیں تقریباً" سچی تھیں۔ امتحانات سے متعلق کچھ یونیورسل باتیں... شاہ ویز کے دوست کا صبح ہڑبڑا کر اٹھنا۔ ایسی ہی اسٹوڈنٹس کی حرکتیں وغیرہ... وقت سے آگے اور پیچھے جا کر لکھنے کی خواہش ہے۔"

مہاروشن خان کراچی کا سوال ہے۔ "آپ نے فارسی کا استعمال کیا۔ کیا آپ نے فارسی سیکھی ہے؟ یارم سے پہلے کی اور یارم کے بعد کی سمیرا میں کیا فرق ہے کیا لوگوں کے

روپے میں کوئی فرق لگا؟"

"میں نے اسی فارسی کا استعمال کیا جو اردو کا حصہ ہے۔ مجھے فارسی نہیں آتی۔ چند لوگوں کی عجیب وغریب حرکتوں نے حیران کیا' پھر جب مجھے معلوم ہوا کہ یہ ان کا شیوہ ہے تو میری حیرانی بھی جاتی رہی۔"

دعا نعمان پشاور..... "آپ کو کس طرح کی کتابیں پسند ہیں اور یہ کہاں سے ملیں گی؟" کس طرح کی کتابیں پڑھنے کی خواہش ہے۔ مجھے کس طرح کی کتابیں پڑھنے کا مشورہ دیں گی؟"

"آپ بیتی پڑھنا مجھے بے حد پسند ہے۔ چارلی چپلن' جیکی چن اور ٹالسٹائی کی آپ بیتیاں پڑھنے کی چیز ہے۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم سے متعلق کتابیں میرے لیے بہت خاص ہیں' بگھیوں اور گھوڑوں کے زمانے کی کہانیاں بھی۔ مجھے تاریخ سے دلچسپی ہے' لیکن اگر اسے کہانی یا فلم کی صورت میں بیان کیا جائے۔ میں فارمولا ناولز یا کتابیں نہیں پڑھ سکتی اور ایسی کتابیں بھی جن میں مصنف نے اپنے پلاٹ کے ساتھ انصاف نہ کیا ہو' بے شک کتاب کتنی بھی مشہور ہو یا اسے کتنا بھی مستند مانا جائے۔ ملکی' غیر ملکی ہر طرح کے ادب کو پڑھیں۔ فکشن کے ساتھ نان فکشن بھی پڑھیں۔ وقت' زمانے اور اقوام کو کتابوں کے ذریعے جانیں۔ میں پہلی دوسری جنگ عظیم کے وقت میں لکھی گئی ساری کہانیاں پڑھ لینا چاہتی ہوں۔ بنگال' قدیم مصر' اور چین کا ادب بھی۔ چینی متھ اور کلاسک میرے لیے ایک بڑی کشش کا باعث ہیں۔ لاہور کی دونوں بڑی لائبریریوں سے میں کتابیں حاصل کرتی ہوں۔ جو کتابیں لائبریری میں موجود ہوتی ہیں ضروری نہیں وہ بک اسٹور سے بھی ملیں۔ لاتعداد کتابیں ایسی ہیں جو لائبریری کے علاوہ کہیں سے بھی حاصل نہیں کی جاسکتیں۔ اپنے شہر کی لائبریری سے ضرور استفادہ کریں۔"

ایلیکس اور مریم احمد جرمنی سے پوچھتی ہیں۔ "کہ کیا یارم لکھنے میں میری کسی نے مدد کی؟"

"کہانی کار کی زیادہ سے زیادہ مدد یہ کی جاسکتی ہے کہ اسے مشورہ دیا جاسکتا ہے یا کچھ الفاظ و بیان میں مددگار ہوا جاسکتا ہے' ورنہ کہانی کار اپنی جنگ کا اکیلا جنگجو ہوتا ہے.... تو میں بھی اکیلی تھی۔"

عاصمہ ارشد لاہور اور مہرو وسیم فیصل آباد..... "آپ کو فیوچر ناولز کو لیڈ کرنے کا طریقہ کیسے سوجھا؟ کیا کہانیاں آپ پر وارد ہوئی ہیں؟"

یارم سے پہلے میں کچھ پلاٹ پر کام کرچکی تھی۔ پھر میں نے ان پر کام چھوڑ دیا۔ لیکن کہانی اور کردار تقریباً" واضح ہوگئے تھے۔ یارم لکھتے ہوئے مجھے خیال آیا کہ کیوں نہ میں ان کرداروں کو یارم میں شامل کردوں اور متعارف کروادوں۔ یہ پہلے سے میری طرف سے طے شدہ نہیں تھا' لیکن جو حقیقی تخلیق کار ہے اس کی طرف سے یقیناً" تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ کہانیاں مجھ پر وارد ہوتی ہیں' یہ ہر تخلیق کار پر ہوتی ہیں۔ اس کے ساتھ میں صرف اتنا ضرور کہوں گی کہ وارد ہونے کے اس عمل کے ساتھ جان توڑ ارتکاز قائم رکھنا شرط اول ہوتا ہے۔ شعور کی جہتوں کو جگائے رکھنا اور لگن کے سلسلے میں کوتاہی نہ کرنا حرف اول ہونا بھی۔"

شمائلہ افضل نے ہر کردار کے بارے میں الگ الگ اپنی رائے کا تفصیلاً" اظہار کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ عورتوں کو اپنے پیروں پر کھڑا ہونا چاہیے کہ ان کی رائے کو اہمیت دی جائے' کم از کم ان کی زندگی کے فیصلے ان سے پوچھ کر کیے جانے چاہئیں۔ شیریں ملک کا لاہور سے کہنا ہے کہ میں کبھی امرحہ بن کر' کبھی کارل اور کبھی عالیان بن کر اس کہانی میں سانس لیتی تھی۔ آپ نے یہ سب مجھ سے چھین لیا۔ آپ پر اللہ کا خاص کرم ہے۔ بتول جعفری خوشاب کا کہنا ہے کہ جذبات میں سب سے خوب صورت جذبہ عشق سے مزین داستان سمیرا حمید کے دل پر الہام کی صورت اتاری گئی۔ عظمیٰ خان نے جام پور سے اپنی رائے کے ساتھ پوچھا ہے کہ اپنی تحریر خود آپ کو کیسی لگی۔ مسز ارم کامران کامونکی نے اپنے طویل خط کے بعد درخواست کی ہے یارم پر کبھی ڈرامہ نہ بنوایئے گا۔ خشار صدف فیصل آباد نے یارم کے لیے اپنی محبت کا بہت خوب صورتی سے اظہار کیا ہے۔ کرن نعمان کراچی نے اپنے رائے کا تفصیلاً" اظہار کیا۔

"شمائلہ عورتوں کے کام کرنے کے سلسلے میں آپ کی رائے سے اتفاق کرتی ہوں کہ انہیں بہت مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ شیریں ملک اور بتول جعفری آپ کی رائے بہت اہم ہے میرے لیے۔ عظمیٰ ایک قاری کی حیثیت سے ابھی میں نے یارم نہیں پڑھا۔ شاید چند سالوں بعد پڑھوں اور پھر ہی فیصلہ کرسکوں گی کہ یہ مجھے کیسا لگا۔ مسز ارم! یارم پر ویسے بھی ڈرامہ نہیں بن سکتا' کیونکہ میرا

نہیں خیال پاکستان میں کوئی چینل اتنے ہیوی بجٹ کا ڈرامہ بنا سکے گا۔ میرا قطعی کوئی ارادہ نہیں ہے اس پر ڈرامہ بنوانے کا۔ خشار آپ کے خط سے یارم اور میرے لیے آپ کی جو محبت عیاں ہے' وہ نایاب ہے۔ کرن آپ نے جو مرکزی خیال مجھے لکھ کر بھیجا ہے میں ضرور اس پر غور کروں گی۔"

تنزیلا افضل نے ڈنگا سے پوچھا ہے۔ "پہلی تحریر کب لکھی' تھیم اور لکھنے کا محرک کیا تھا۔ اگر آپ کو تمام وسائل میسر ہوں تو کہاں بروئے کار لائیں گی۔ فیملی نے کتنا سپورٹ کیا؟"

"پہلی کہانی شیطان پر لکھی تھی اور لکھنے کا محرک وہ مواد تھا جو میں نے شیطان سے متعلق پڑھا تھا۔ اس کہانی کو بعد ازاں میں نے پھاڑ کر پھینک دیا تھا۔ مجھے تمام وسائل ملیں تو انہیں میں دنیا میں چند تبدیلیوں کے لیے بروئے کار لانا چاہوں گی۔ میں جو بھی کرتی ہوں' خود سے ہی کرتی ہوں' گھر والوں کو اس کی خبر تب ہی ہوتی ہے جب یا دھواں اٹھتا ہے یا پھوار برستی ہے' تو آپ سمجھ گئی ہوں گی کہ جب اپنے کاموں کی ہی میں ہوا نہیں لگنے دیتی تو سپورٹ کرنے نہ کرنے کی بات ہی خارج از امکان ہو گئی تھی۔ اب انہیں باقاعدہ میرے لکھنے کا معلوم ہو چکا ہے تو میرے کام کا احترام کرتے ہیں۔"

بیشا علی اور سدرہ مرتضیٰ کا سوال ہے کہ۔۔۔ "آپ رائٹنگ ورلڈ میں کس سے متاثر ہیں۔"

"اس سوال کے جواب میں مجھے ان سب کتابوں کا ہی ذکر کرنا چاہیے جن سے میں متاثر ہوں' کیونکہ میں رائٹرز کے بارے میں نہیں کتابوں کے بارے میں بات کرتی ہوں' لیکن سب کتابوں کا بیان ممکن نہیں ہے۔ ذاتی طور پر میں مستنصر حسین تارڑ کے اسلوب اور واقعہ نگاری سے متاثر ہوں۔ بانو قدسیہ سے جو کبھی کسی فارمولے پر نہیں چلیں اور انہیں کرداروں کی نفسیات بیان کرتے ہوئے تردد نہیں جھیلنا پڑتا۔ سید محمد اشرف کا قاری کی سوچ سے بہت آگے جا کر لکھنا اور اسے منوا بھی لینا بہت چونکا دینے والا رہا ہے۔ اشفاق احمد نے تحریر میں چند نئے انداز اپنائے جن کی میں مداح ہو گئی۔ مہا سیتا دیوی نے نچلی ذات والوں پر ایسے لکھا جیسے وہ ان ہی کا حصہ رہی ہیں۔ رسول حمزہ نے نثر میں ایسے اسلوب اور اتنے انداز اپنائے کہ مجھے لگا کہ انہوں نے شاید ساری زندگی ایک ہی کتاب پر ہر لمحہ کام کیا اور اسے شاہکار بنا دیا۔ رابرٹ لوئیس کی مارخانم اور بولیو کارتا زار کی صرف ایک ہی تحریر نے ہی مجھے اپنا گرویدہ کر لیا اور میں خیال و بیان کے اچھوتے پن پر دنگ رہ گئی۔"

اخت تقوی مہراب پور۔۔۔ "مجھے بھی لکھنے کا شوق ہے' مجھے گائیڈ کریں۔"

"آپ اپنا شوق ضرور پورا کریں۔ زیادہ مطالعہ کریں' لکھنے کی زیادہ مشق کریں' آس پاس کا مشاہدہ کریں۔ اپنے ماحول کو جانچیں' انسانوں' رویوں اور احساسات کی گہرائی میں اتریں اور ایک اور بات پر بھی غور کریں کہ قدرت آپ کو کس طرف لے جانا چاہتی ہے۔ قدرت کی رہنما سرگوشیوں پر ارتکاز قائم کریں۔"

سید قرۃ العین راولپنڈی کا کہنا ہے کہ خوش نصیب ہیں آپ کہ میں یارم پر تبصرہ کر رہی ہوں۔ اس ناول کے ایک ایک لفظ سے مجھے عشق ہے۔ شہلا علی کا کہنا ہے کہ کراچی بھی لے آئیں عالیان' امرحہ اور کارل کو۔ بنت علی نے مبارک باد دی ہے ناول کی کامیابی پر۔ اتنی مشکل اردو کیوں لکھتی ہیں آپ؟ عائم فاطمہ شیخوپورہ کا کہنا ہے۔ صائمہ شیخ لاہور کی رائے ہے کہ آپ نے اس زمانے میں اتنی ثقیل اردو تشبیہات اور استعاروں کا خوب صورتی سے استعمال کیا ہے۔ سارہ عبدالہادی بس یہ ہی خواہش ہے کہ ہم بھی مانچسٹر یونی ورسٹی میں پڑھیں' لیکن ہمارے ساتھ پرانکس نہ ہوں۔ رامین اسد کا کہنا ہے کہ یارم آپ کی پہچان بنا' لیکن میرے مطابق آپ کا ہر افسانہ' ہر ناول آپ کی پہچان ہے۔ زینب عابد عباسی کا کہنا ہے کہ میرا آپ کے ذہن میں کارل اور اس کی حرکتیں کیسے آئیں۔ لیلیٰ عابد کا گوجرانوالہ سے کہنا ہے کہ کارل نہ سہی اس کی کوئی کاپی ہی انہیں مل جائے تو وہ اسے پکڑ کر اپنے گھر لے آئیں۔ حنا' رابعہ' سارہ نے لیہ سے اپنی رائے کا اظہار کیا ہے۔ ایمان دانش نے یارم ٹو کی درخواست کی ہے۔ رابعہ ساجد کو اختتام اچھا لگا۔ نبیہ نور' حنا افضل گوجرانوالہ کا کہنا ہے کہ مجھے سنو فالنگ سے عشق ہے' مگر جب امرحہ برف پر چلتی ہے تو زمانے رک جاتے ہیں۔ ام طلحہ حویلیاں نے یارم کے لفظوں پر اپنی پسندیدگی ظاہر کی ہے۔

کم و بیش ہر خط میں مجھے "وقت آپ کو زندہ رکھے" کی وعا دی گئی ہے۔ اس دعا اور ہر دعا' آپ کے ہر خط' ہر لفظ اور محبت کا شکریہ۔ آپ سے ملاقات ہوتی رہے گی۔

☆

واصفہ سہیل

آتے جاتے نامیں

شہزادہ

اداکار عمران عباس جو آج کل ایک مشہور چینل پر ڈراما سیریل "الوداع" میں کام کررہے ہیں' ان کی دوسری بولی وڈ فلم "جاں نثار" کی شوٹنگ مکمل ہوگئی ہے (جی ہاں پہلی فلم میں تو...اب دیکھیں دوسری فلم میں کیا ہے؟ بھئی تیر مارتے ہیں) مشہور فلم امراؤ جان سے شہرت پانے والے فلمساز مظفر علی نے ان کی اس فلم کی ہدایات دی ہیں' عمران عباس اس فلم میں شہزادے کا کردار کررہے ہیں (ویسے لگتے تو عمران عباس شہزادے ہی ہیں جب ہی...) فلم میں 1877ء کے لکھنؤ کی عکاسی کی گئی ہے۔ اب دیکھیں یہ فلم امراؤ جان کی طرح ہٹ ہوتی ہے یا پھر کریچرز 3ڈی کی طرح پٹ جاتی ہے۔

حوالہ

جاوید شیخ بحیثیت باپ کیسے ہیں' کے بارے میں ان کے بیٹے شہزاد شیخ کہتے ہیں کہ "وہ ایک بہترین اور خوش مزاج باپ ہیں۔ انہیں ہمارے لیے کھانا پکانا بہت پسند ہے۔ اور ان کی معلومات ہر چیز کے بارے میں بہت وسیع ہے (اس میں تو کوئی شک نہیں ہے کہ...) میں ان کے ساتھ ہر موضوع پر گھنٹوں بات کرسکتا ہوں' وہ سیاست' کھانا پکانا' سیاحت سمیت ہر موضوع پر بات کرسکتے ہیں۔ ہم دونوں گھر پر ایک دوسرے سے صرف ایک چیز کے بارے میں گفتگو نہیں کرتے اور وہ اداکاری ہے (جو کام آتا نہ ہو اس پر گفتگو کرنا واقعی بہت مشکل ہے) وہ گھر پر اسٹار نہیں ہوتے (اور باہر؟) گھر پر جاوید شیخ ایک باپ کی طرح گھریلو معاملات دیکھتے ہیں۔"

آغاز

یہ سارا خاندان ہی باصلاحیت ہے۔ تو پھر ان کی بہو کیسے پیچھے رہتی۔ ہم بات کر رہے ہیں معروف گلوکار و موسیقار عدنان سمیع خان کی جو موسیقی کی دنیا میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں' ان کی سابقہ اہلیہ زیبا بختیار

اداکاری اور پروڈکشن کے حوالے سے پہچانی جاتی ہیں۔ عدنان اور زیبا بختیار کا بیٹا اذان سمیع ہدایت کاری کے میدان میں اپنے جوہر دکھا رہے ہیں تو پھر ان کی بہو صوفیہ جو اذان سمیع کی بیوی ہے کیوں پیچھے رہتی' صوفیہ نے فیشن ڈیزائننگ کا باقاعدہ آغاز کر دیا ہے۔ صوفیہ نے چھوٹے بچوں کے کپڑے متعارف کروائے ہیں۔ اس سلسلے میں مقامی ہوٹل میں ایک باقاعدہ تقریب کا انعقاد کیا گیا جس میں زیبا بختیار اور اذان سمیع نے بھی شرکت کی اور صوفیہ کی صلاحیتوں کو سراہا۔ (گھر کی مرغی اور اتنی اہمیت۔۔۔؟)

کردار

بھارتی فلموں میں کام کرنا ایک الگ بات ہے' اور آفر آنا ایک الگ بات ہے جو فنکار بھارتی فلموں میں کام نہیں کرتے وہ بھی یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ ہمیں فلاں ڈائریکٹر نے آفر کی ہے یا فلاں پروڈیوسر نے' اداکارہ **فضیلہ** قاضی بھی اس کا شکار نظر آتی ہیں کہتی ہیں کہ "مجھے بھی ڈائریکٹر ساون کمار کی طرف سے فلموں میں کام کی آفر کی گئی تھی' لیکن میں نے اس وقت فلموں میں کام کرنا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف قرار دیا تھا' لیکن اب بچے بڑے ہو گئے ہیں اور مجھے کوئی اچھا اور معیاری کردار ملا تو میں انکار نہیں کروں گی (بالی ووڈ میں یا لولی وڈ میں؟) لیکن یہ ضرور ہے کہ کوئی مسالے دار کردار کرنے سے میں آج بھی انکاری ہوں (**فضیلہ**! کیا آپ آئینہ نہیں دیکھتی ہیں یا آپ نے اپنی عمر رفتہ کا حساب رکھنا چھوڑ دیا ہے جو آپ مسالے دار کردار کے بارے میں سوچ رہی ہیں)۔

خاص و عام

مہوش حیات نے اپنے ایک ٹی وی انٹرویو میں کہا کہ آئٹم نمبر کی شمولیت سے اگر فلم کی کمرشل ویلیو بڑھ رہی ہو' تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے "خصوصاً" اگر یہ ڈانس پر مبنی ہو اور اس سے کوئی خاص فحاشی نہ پھیل رہی ہو (مہوش! یہ خاص سے آپ کی کیا مراد ہے؟ فحاشی تو فحاشی ہوتی ہے یہ خاص اور عام نہیں ہوتی۔۔۔)

تو میرے لیے اسے کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہو گا۔ مہوش حیات کا انڈسٹری کی ماڈرن ڈانسرز میں شمار کیا جاتا ہے' جبکہ مہوش کا کہنا ہے کہ انہوں نے ٹی وی پر لوگوں کو دیکھ دیکھ کر ڈانس کرنا سیکھا ہے۔ (جی! اور وہ لوگ پاکستانی تو ہرگز نہ ہوں گے) اب مہوش ایک ڈانس اکیڈمی بنانا چاہتی ہیں جہاں نوجوان باقاعدہ یہ فن سیکھیں۔

ادھر ادھر سے

☆ بھارت میں اتنے بڑے اور پھیلے ہوئے ملک کے گوشے گوشے میں چلانے کے لیے جو فلم بنائی جاتی ہے' اس کو بنانے والے اسی سادہ اور سہل زبان کو اختیار کرنے پر مجبور ہیں اسے جو بھی نام دیں' سچ تو یہ ہے کہ عام بول چال ہو رہی ہو تو ہندوستان کی بولی کوئی اور نہیں اردو ہے۔

(رضا علی عابدی۔ جنگ)

☆ میرا تجربہ ہے جس انسان میں حس ظرافت نہیں' جس شخصیت میں جمالیاتی ذوق نہیں اور جس شخص میں رومان نہیں وہ شخص کچھ بھی ہو جائے' وہ اچھا انسان نہیں ہو سکتا۔

(جاوید چوہدری۔ زیرو پوائنٹ)

امت الصبور

تاریخ کے جھروکوں سے

سچا خواب

سلطان نورالدین زنگی عادل بادشاہ، متقی اور پرہیزگار تھے۔ رات کا بہت سا حصہ تہجد اور وظائف میں گزرتا تھا۔ 557 ہجری میں ایک شب تہجد کے بعد سوئے تو حضور اقدس علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خواب میں زیارت ہوئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دو نیلی آنکھوں والے آدمیوں کی طرف اشارہ فرما کر سلطان سے ارشاد فرمایا کہ۔ ”ان دونوں سے میری حفاظت کرو۔“

سلطان کی گھبراہٹ سے آنکھ کھلی، فوراً اٹھ کر وضو کیا اور نوافل پڑھ کر دوبارہ لیٹے تو معاً آنکھ لگی اور یہ ہی خواب بعینہ دوبارہ نظر آیا۔ پھر جاگے اور وضو کر کے نوافل پڑھے۔ پھر لیٹے اور معاً آنکھ لگنے پر تیسری بار پھر یہ ہی خواب نظر آیا تو اٹھ کر کہنے لگے۔

”اب نیند کی کوئی گنجائش نہیں۔“

فوراً رات ہی کو اپنے وزیر کو جو صالح نیک آدمی تھے۔ جمال الدین نام بتایا جاتا ہے اور اس نام میں اختلاف بھی ہے۔ بلایا اور سارا قصہ سنایا۔

وزیر نے کہا۔ ”اب دیر نہیں کی جاسکتی۔ فوراً مدینہ طیبہ چلیے اور اس خواب کا تذکرہ کسی سے نہ کیجیے۔“

بادشاہ نے فوراً رات ہی کو تیاری کی اور بیس نفر مخصوص خدام کو ساتھ لے کر تیز رو اونٹنیوں پر بہت سامان اور مال و متاع لدوا کر مدینہ طیبہ کو روانہ ہو گئے اور دن رات چل کر سولھویں دن مصر سے مدینہ طیبہ پہنچے۔ مدینہ طیبہ سے باہر غسل کیا اور نہایت ادب و احترام سے مسجد شریف میں تشریف لے گئے اور روضہ جنت میں دو رکعت نفل پڑھے اور نہایت متفکر بیٹھے سوچتے رہے کہ کیا کریں۔

وزیر نے اعلان کیا بادشاہ زیارت کے لیے تشریف لائے ہیں اور اہل مدینہ پر بخشش و اموال بھی تقسیم ہوں گے اور بہت بڑی دعوت کا انتظام کیا۔ جس میں سارے اہل مدینہ کو مدعو کیا۔ بادشاہ عطا کے وقت ہر چہرے کو نہایت غور سے دیکھتے۔ سب اہل مدینہ یکے بعد دیگرے آکر عطائیں لے کر چلے گئے، مگر وہ جو دو شخص خواب میں دیکھے تھے نظر نہ آئے۔

بادشاہ نے پوچھا کہ۔۔۔ ”کوئی اور باقی رہ گیا ہو تو اس کو بھی بلا لیا جائے۔“ معلوم ہوا کہ کوئی باقی نہیں رہا، بہت غور و خوص اور بار بار پوچھنے پر لوگوں نے کہا۔ ”کہ دو نیک مرد متقی، پرہیزگار مغربی بزرگ ہیں۔ وہ کسی کی کوئی چیز نہیں لیتے، خود بہت کچھ اہل مدینہ پر صدقات و خیرات کرتے رہتے ہیں۔ سب سے یکسو رہتے ہیں، گوشہ نشین آدمی ہیں۔“

بادشاہ نے انہیں بلوایا تو وہ حاضر ہو گئے۔ بادشاہ نے ان سے پوچھا۔ ”تم کون ہو؟“

کہنے لگے۔ ”مغرب کے رہنے والے ہیں، حج کے لیے حاضر ہوئے تھے۔ حج سے فراغت پر زیارت کے لیے حاضر ہوئے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پڑوس میں رہنے کی تمنا ہوئی، تو یہاں قیام کر لیا۔“

بادشاہ نے کہا۔ ”صحیح صحیح بتا دو۔“

انہوں نے جو پہلے کہا تھا، اسی پر اصرار کیا۔ بادشاہ نے ان کی قیام گاہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ روضہ اقدس کے قریب ہی ایک رباط میں قیام ہے۔ بادشاہ نے ان کو تو وہیں روکے رکھنے کا حکم دیا اور خود ان کی قیام گاہ پر گیا۔ وہاں جا کر تجسس کیا۔ وہاں مال و متاع تو خوب ملا اور

کتابیں وغیرہ رکھی ہوئی ملیں، لیکن کوئی ایسی چیز نہیں ملی جس سے خواب کے مضمون کی تائید ہوئی۔ بادشاہ بہت پریشان اور متفکر تھا۔ اہل مدینہ بہت کثرت سے سفارش کے لیے حاضر ہو رہے تھے کہ نیک بزرگ دن بھر روزہ رکھتے ہیں۔ ہر نماز روضہ شریف میں پڑھتے ہیں۔ روزانہ بقیع کی زیارت کرتے ہیں۔ ہر شنبہ کو قبا جاتے ہیں۔ کسی سائل کو رد نہیں کرتے۔ اس قحط کے سال میں اہل مدینہ کے ساتھ انتہائی ہمدردی اور غمگساری انہوں نے کی ہے۔ بادشاہ حالات سن کر تعجب کرتے تھے اور ادھر ادھر متفکر پھر رہے تھے۔ دفعتاً خیال آیا تو ان کے مصلے کو جو ایک بورے پر بچھا ہوا تھا' اٹھایا۔ اس کے نیچے ایک پتھر بچھا ہوا تھا۔ اس کو اٹھایا تو اس کے نیچے سے ایک سرنگ نکلی۔ جو بہت گہری کھودی گئی تھی اور بہت دور تک چلی گئی۔ حتیٰ کہ قبر اطہر تک جا پہنچی تھی۔ یہ دیکھ کر سب دنگ رہ گئے۔ بادشاہ نے غصے سے کانپتے ہوئے ان کو پیٹنا شروع کر دیا کہ صحیح واقعہ بتاؤ۔

انہوں نے بتایا کہ.... "وہ دونوں نصرانی ہیں۔ عیسائی بادشاہوں نے بہت سا مال ان کو دیا ہے اور بہت زیادہ دینے کا وعدہ کیا ہے۔ وہ حاجیوں کی صورت بنا کر آئے ہیں۔ تاکہ قبر اطہر سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جسد اطہر کو لے جائیں۔ وہ دونوں رات کو اس جگہ کو کھودا کرتے اور جو مٹی نکلتی' اس کو چمڑے کی دو مشکیں ان کے پاس مغربی شکل کی تھیں۔ ان میں بھر کر رات ہی کو بقیع میں ڈال دیا کرتے تھے۔"

بادشاہ اس بات پر کہ اللہ جل شانہ اور اس کے پاک رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدمت کے لیے انہیں منتخب کیا۔ بہت روئے اور دونوں کو قتل کرایا اور حجرہ شریف کے گرد اتنی خندق کھدوائی کہ پانی تک پہنچ گئی اور اس میں راگ یا سیسہ پگھلا کر بھروا دیا کہ جسد اطہر تک کسی کی رسائی نہ ہو سکے۔

فاتح عالم

سکندر اعظم ہندوستان میں تھا۔ اس کے سردار اور سپاہی اس کی مسلسل مہم جوئی سے عاجز آچکے تھے اور وطن واپس جانا چاہتے تھے۔ سکندر نے پنجاب میں تین سال قیام کیا۔ پھر بہار پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ اس منصوبے نے سپاہیوں کے وطن واپس جانے کی رہی سہی امیدوں پر بھی پانی پھیر دیا۔

سکندر اعظم کو اس صورت حال سے تشویش ہوئی۔ اس نے فوجیوں میں منادی کرادی۔

"فرزند آفتاب سکندر کے حکم سے اعلان کیا جاتا ہے کہ مستقبل کی فوجی مہمات کی بنا پر وطن واپسی کا امکان نہیں ہے۔ فوج کے جو سردار اور سپاہی اپنے اہل خاندان اور دوستوں کو خط لکھنا چاہیں' وہ آج شام تک اپنے خطوط ملفوف کر کے محکمہ ابلاغ کے افسر کو دے دیں تاکہ ایک تیز رو جہاز کے ذریعے انہیں ایتھنز روانہ کر دیا جائے۔"

شام تک افسر ابلاغ کو ایک ہزار لفافے موصول ہوئے۔ دوسرے روز ان ایک ہزار مکتوب نگاروں کو میدان میں کھڑا کر دیا گیا۔ وہاں ایک ہزار پھانسی کے پھندے تیار تھے۔ ہر مکتوب نگار کو اس کا خط بلند آواز میں سنانے کے بعد پھانسی دے دی گئی۔ ان خطوط میں سکندر سے بیزاری اور اسے قتل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا گیا تھا۔

مہندی کے ڈیزائن

ادارہ

عید کے پکوان

خالدہ جیلانی

جھٹ پٹ دم والے انڈے

ضروری اشیاء :

انڈے	12عدد
پیاز	3عدد
لال مرچ پاؤڈر	3چائے کے چمچے
ٹماٹر (باریک چوپ کرلیں)	8عدد
ہلدی پاؤڈر	1/2چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن پیسٹ	1/2چائے کا چمچہ
ہری مرچ	8-6عدد
ہرا دھنیا	گارنش کے لیے
تیل	2کپ

ترکیب :

ایک بڑی دیگچی میں تیل گرم کریں اور اس میں پیاز ڈال کر لائٹ براؤن کر کے ٹماٹر شامل کر دیں۔ نمک' لہسن' لال مرچ پاؤڈر' ہلدی پاؤڈر ڈال کر مسالا بھون لیں' پھر ایک پیالی میں انڈے توڑ لیں ایسے کہ بالکل ثابت رہیں اس کی زردی نہ ٹوٹنے پائے پھر احتیاط سے انڈے کو مسالے کے اوپر ایک طرف رکھتی جائیں جب سب انڈے ڈال دیں تو ڈھانپ دیں پھر کچھ دیر بعد اس کو الٹ پلٹ دیں پھر ہری مرچ' ہرا دھنیا' ڈال کر پانچ منٹ تک دم پر رکھ دیں۔

مزے دار جھٹ پٹ دم والے انڈے تیار ہیں روٹی کے ساتھ نوش فرمائیں۔

میٹھے پکوڑے

اجزا :

انڈہ	ایک عدد
سوجی	آدھا کپ
تیل یا گھی تلنے کے لیے	حسب ضرورت
آٹا یا میدہ	آدھا کپ
چینی	تین سے چار کھانے کے چمچ
دودھ	حسب ضرورت

ترکیب :

انڈے کو پیالے میں نکال کر اچھی طرح پھینٹ لیں۔ اب اس میں چینی ملا دیں اور دوبارہ اتنا پھینٹیں کہ وہ دونوں یکجان ہو جائیں۔

پھر اس آمیزے میں سوجی' آٹا یا میدہ ڈال کر اچھی طرح ملا لیں۔ اگر آمیزہ زیادہ سخت محسوس ہو رہا ہو تو اس میں تھوڑا سا دودھ ڈال کر نرم کر لیں' دودھ ڈالتے وقت دھیان رکھیں کہ اس کی مقدار زیادہ نہ ہو جائے پھر کوکنگ آئل یا گھی کڑاہی میں گرم کریں۔ جب تیل گرم ہو جائے تو چمچ کی مدد سے اس آمیزے کو گرم تیل میں ڈال کر پکوڑے کی طرح تلتی جائیں۔

چائنیز اسپرنگ رول

ضروری اشیا :

مرغی کا قیمہ	1/2کلو
انڈے	6عدد
سیاہ مرچ پاؤڈر	1کھانے کا چمچہ
سویا سوس	1کھانے کا چمچہ
میدہ	1کھانے کا چمچہ
دودھ	1/4کپ
ہری پیاز (ہرا حصہ کاٹ لیں)	2عدد
پارسلے یا ہرا دھنیا	2کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ
تیل	حسب ضرورت

ترکیب :

سوس پین میں 3کھانے کے چمچے تیل ڈال کر قیمہ فرائی کر لیں۔ پانی خشک ہو جائے تو اس میں سیاہ مرچ

پاؤڈر، سویا سوس، میدہ، ہری پیاز، ہرا دھنیا اور نمک ڈال کر دو تین منٹ فرائی کر کے اتار لیں۔
ایک باؤل میں انڈوں کو تھوڑا سا نمک اور دودھ ڈال کر اتنا پھینٹیں کہ اس کے جھاگ بن جائیں۔
فرائنگ پین میں 1 کھانے کا چمچہ تیل ڈال کر پھیلا دیں۔ اس میں انڈے کا آمیزہ ایک بڑا چمچہ بھر کر ڈال اور پھیلا دیں جب ایک طرف سے پک جائے تو دوسری طرف پلٹ دیں۔ سنہرا ہونے پر نکال لیں۔ انڈے کے تمام آمیزے کے اسی طرح پین کیک بنالیں۔
ایک بڑی پلیٹ میں ایک پین کیک رکھ کر اس کے اوپر قیمہ رکھ کر رول بنائیں۔
تمام پین کیک کے اسی طرح رول تیار کر لیں۔
مزے دار چائنیز اسپرنگ رول سرونگ ڈش میں نکال کر کیچپ کے ساتھ سرو کریں۔

چاٹ بھرے آلو دودھ گریوی

ضروری اشیاء:

آلو (ابال کر چھیل لیں)	4 عدد
چنا چاٹ (تیار شدہ)	1/2 کپ
ٹماٹر (پسے ہوئے)	2 کھانے کے چمچے
دہی	2 کھانے کے چمچے
املی پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
لال مرچ پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
لہسن ادرک پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
تیل	4 کھانے کے چمچے
ہینگ	1/4 چائے کا چمچہ
ٹماٹر	گارنش کے لیے
پودینہ	گارنش کے لیے

ترکیب:
فرائی پین میں تیل گرم کر کے اس میں لہسن ادرک ڈال کر کڑکڑائیں۔
پیاز، ٹماٹو پیوری، دہی، املی پیسٹ، لال مرچ پاؤڈر، نمک، ہینگ ڈال کر پکائیں پانی خشک ہو جائے تو سرونگ ڈش میں نکال لیں۔
آلو میں چھری کی مدد سے سوراخ کر لیں اس میں تیار شدہ چاٹ بھر دیں، آلو گریوی میں رکھ کر اوپر سے ٹماٹر اور پودینے سے گارنش کر کے پیش کریں۔

اسٹیم کوفتے پیاز پیسٹ میں

ضروری اشیاء:

اسٹیم کیے ہوئے کوفتے	15-12 عدد
پیاز پیسٹ	4 کھانے کے چمچے
لہسن، ادرک پیسٹ	1 چائے کا چمچہ
ٹماٹر پیسٹ	3 کھانے کے چمچے
دہی	3 کھانے کے چمچے
تیل	حسب ضرورت
گرم مسالا پاؤڈر	1 چائے کا چمچہ
دار چینی پاؤڈر	1/2 چائے کا چمچہ

ترکیب:
پیاز پیسٹ، لہسن ادرک پیسٹ، ٹماٹر پیسٹ، دہی، گرم مسالا پاؤڈر اور دار چینی پاؤڈر کو ایک ساتھ ملا لیں۔ اس کے بعد اسٹیم کیے ہوئے کوفتوں کو اس آمیزے میں ملا کر رکھ لیں۔
تقریباً 20 منٹ کے بعد توے پر تیل ڈال کر گرم کریں، آمیزہ ہلکی آنچ پر پکائیں اور وقفے وقفے سے چمچہ چلاتی رہیں۔ پانی کے خشک ہو جانے تک پکائیں۔ اس کے بعد آنچ تیز کر دیں اور مزید 3-2 منٹ پکائیں۔
مزے دار اسٹیم کوفتے پیاز پیسٹ میں تیار ہیں۔ اپنے مہمانوں کی تواضع کے لیے گرم گرم پیش کریں۔

دودھ والی رنگین سویاں

ضروری اشیاء:

دودھ	1 لیٹر
رنگین سویاں (ابال لیں)	چار کھانے کے چمچے
کریم	1 کپ
کنڈینسڈ ملک	1/2 کپ
کھویا	1/2 کپ
چینی	1 کپ

بادام (کٹے ہوئے)	8-10 عدد
پستے (کٹے ہوئے)	10-12 عدد

ترکیب:

1 دیگچی میں دودھ ڈال کر اتنا پکائیں کہ دودھ کی مقدار آدھی رہ جائے اس میں چینی کھویا اور کنڈینسڈ ملک (اگر نہ ہو تو چار چمچے خشک دودھ) ملا دیں۔

2 ہلکی آنچ پر اتنا پکائیں کہ تمام چیزیں یکجان ہو جائیں۔ ابلی ہوئی سویاں ڈال کر مزید دو منٹ تک پکائیں۔

3 چولہے سے اتار کر ٹھنڈا کر لیں کریم مکس کر کے سرونگ ڈش میں نکالیں اور بادام پستے سے گارنش کر کے پیش کریں۔

سنگاپورین رائس

ضروری اشیا:

چکن	ایک پاؤ (بون لیس اسٹرپس کاٹ لیں)
اسپگھٹی	آدھا پیکٹ (ابال کر چھان لیں)
گاجر	2 عدد (لمبائی میں باریک کاٹ لیں)
شملہ مرچ	2 عدد
بند گوبھی (چوپ کی ہوئی)	1/2 کپ
ہری پیاز (چوپ کر لیں)	4 عدد
چلی گارلک سوس	1/2 کپ
سویا سوس	4 کھانے کے چمچے
چلی سوس	2 کھانے کے چمچے
سیاہ مرچ پاؤڈر	1/2 کھانے کا چمچہ
سرکہ	1 کھانے کا چمچہ
مایونیز	3 کھانے کے چمچے
لہسن ادرک پیسٹ	1 کھانے کا چمچہ
چاول (ابلے ہوئے)	1 کپ
تیل	4 کھانے کے چمچے
نمک	حسب ذائقہ

پیالے میں چکن 1 کھانے کا چمچہ سویا سوس 1 کھانے کا چمچہ چلی سوس، ادرک لہسن پیسٹ 4 کھانے کے چمچے چلی گارلک سوس، سیاہ مرچ پاؤڈر اور سرکہ ڈال کر اچھی طرح ملا کر 25-30 منٹ کے لیے رکھ دیں۔

سوس پین میں دو کھانے کے چمچے تیل گرم کر کے اس میں چکن ڈال کر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو پلیٹ میں نکال لیں۔

اسی سوس پین میں باقی تیل گرم کر کے گاجر، شملہ مرچ، بند گوبھی اور ہری پیاز ڈال کر 1 منٹ تک فرائی کریں۔ اس میں چلی سوس، سویا سوس 2 کھانے کے چمچے اور چلی گارلک سوس ڈال کر پکا لیں اور چاول ڈال کر مکس کر کے چولہے سے اتار لیں۔

پیالے میں مایونیز اور دو کھانے کے چمچے چلی گارلک ساس ڈال کر مکس کریں۔ ایک چھوٹے باؤل میں چکن کی تہہ لگائیں۔ اس پر چاولوں کی تہہ لگا کر اسپگھٹی کی تہہ لگائیں اور چمچے سے پریس کریں۔

سرونگ پلیٹ میں نکال کر اسپگھٹی، فرائیڈ چکن اور مایونیز کے ساتھ گرم گرم پیش کریں۔

مینگو کسٹرڈ ٹرائفل

ضروری اشیاء:

کسٹرڈ (اسٹرابیری فلیور)	4 کھانے کے چمچے
دودھ	1 لیٹر
چینی	1/2 کپ
آم	2 عدد
کلر فل ہنٹیز	حسب ضرورت

تپیلے میں دودھ ڈال کر گرم کر لیں۔ جب دودھ میں ابال آجائے اس میں چینی ڈال دیں۔

چینی گھل جائے تو تھوڑے سے نیم گرم دودھ میں کسٹرڈ گھول کر اس میں ڈال دیں۔

اس میں برابر چمچہ چلاتی رہیں کہ کسٹرڈ گاڑھا ہو جائے۔

آم کو چھیل کر اس کے ٹکڑے کاٹ لیں۔

سرونگ ڈش میں کسٹرڈ نکال کر فریج میں رکھ کر سیٹ کر لیں۔

اس کے بعد اس پر آم اور کلر فل ہنٹیز ڈال کر دوبارہ فریج میں رکھ کر ٹھنڈا کر لیں۔ مزے دار مینگو کسٹرڈ ٹرائفل تیار ہے۔

اکرام الحق (؟)

خوب صورت بنیے

عید کے دن خوب صورت نظر آئیں

گرمی یا حبس ہو تو چہرہ پسینہ پسینہ ہی ہوتا رہتا ہے اور میک اپ کتنی ہی محنت سے کیوں نہ کیا گیا ہو۔ کچھ ہی دیر میں عجیب سا منظر پیش کرنے لگتا ہے۔

اس بار عید چونکہ گرمی میں آرہی ہے اس لیے ہم آپ کو میک اپ کا ایسا طریقہ بتا رہے ہیں جس کی مدد سے آپ تروتازہ اور دلکش نظر آسکتی ہیں اور نفاست سے میک اپ کرکے اپنی دلکشی اور خوب صورتی میں اضافہ کرسکتی ہیں۔

گرمی کے موسم میں میک اپ کے لیے سب سے پہلے بیس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے' اس موسم میں بھاری بیس بنانے کی غلطی ہرگز نہ کریں' ہلکی بیس بنائیں تاکہ جلد کی اصلی خوب صورتی اور چمک ماند نہ پڑے۔ ممکن ہو تو واٹر پروف میک اپ استعمال کریں اور پاؤڈر میک اپ کو ترجیح دیں۔

موسم گرما میں ہلکے کلر زیادہ خوب صورت لگتے ہیں' لہٰذا آئی شیڈز بلش آن اور لپ اسٹک کے ہلکے رنگوں کا انتخاب کریں۔ واٹر پروف آئی لائنر اور مسکارا استعمال کریں۔ ہم آپ کی آسانی کے لیے مرحلہ وار میک اپ کا طریقہ لکھ رہے ہیں۔

1۔ میک اپ شروع کرنے سے پہلے بال سمیٹ کر ہیئر بینڈ لگالیں تاکہ بال چہرے پر نہ آئیں۔ جلد کی رنگت سے مطابقت رکھتی ہوئی فاؤنڈیشن بیس چہرے پر لگائیں۔ پیشانی اور آنکھوں کے اطراف پر خصوصی توجہ دیں۔

2۔ اسفنج کی مدد سے ٹو ان ون کیک چہرے پر نرمی کے ساتھ لگائیں اور اچھی طرح بلینڈ کریں۔

3۔ بیس کو ہموار کرنے کے لیے پاؤڈر پف کے ذریعے چہرے پر لوز پاؤڈر لگائیں۔

4۔ چہرے پر ٹشو رکھ کر ہلکے ہاتھوں سے تھپتھپا کر بیس کو ہموار کرلیں۔

5۔ کنٹورنگ کرتے ہوئے ناک کے اطرافی حصوں پر اور جولائن یعنی جبڑوں سے ٹھوڑی تک اس طرح ڈارک براؤن بلشر سے لانگ اسٹروک لگائیں تاکہ چہرے کے نقوش نمایاں ہوسکیں۔

6۔ آنکھوں میں نفاست سے کاجل لگا کر آئی شیڈز لگائیں اور بلینڈ کریں پھر آئی برو کی شیپ (Shape) کے ساتھ ہائی لائٹر آؤٹ اسٹروک (Stroke) دیتے ہوئے لگائیں۔

7۔ آئی لائنر کے آؤٹ اسٹروک اس طرح سے لگائیں کہ اسے آنکھ کے بیرونی کونے کی طرف سے اوپر کی جانب خم دے کر بلینڈ کریں۔

8۔ چہرے پر کی گئی کنٹورنگ کو کیک بیس کے ساتھ بلینڈ کرلیں اور بیس کو فائنل ٹچ دیں۔

9۔ آئی بروز پر لگا پاؤڈر برش کی مدد سے صاف کرلیں اگر آئی بروز کو گہرا لک دینا چاہیں تو بلیک آئی پنسل سے آئی بروز کی شیپ واضح کریں۔

10۔ پلکوں پر احتیاط کے ساتھ مسکارا لگائیں۔ ایک کوٹ خشک ہوجائے تو مسکارے کا دوسرا کوٹ لگائیں۔ اس سے پلکیں گھنی نظر آئیں گی۔

11۔ رخسار پر ہلکے رنگ کا بلش آن چہرے کی بناوٹ کے لحاظ سے لگائیں۔

12۔ لپ پنسل سے ہونٹوں کی آؤٹ لائن نفاست کے ساتھ بنائیں۔

13۔ لپ برش کی مدد سے ہلکی پنک لپ اسٹک ہونٹوں پر لگا کر نرمی سے بلینڈ کریں۔

14۔ ہونٹوں پر چمک دار تاثر دینے کے لیے لپ گلوس احتیاط کے ساتھ لگائیں۔